

مجاہد پاکستان پینٹنگ چیمپین

سنگرزِ زشت

ستمبر 2017

نماںِ اعلیٰ
معراجِ اول



مستثنیٰ: اس شاعر کا قصہ جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا
ٹھکرائی ہوئی لڑکی: ایک ایسی سچ بیانی جو قابل تقلید ہے
لیڈی کلر: لا زوال اداکاری کرنے والے ہیرو کا زندگی نامہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

سرگزشت

یگانہ شاعر

ادارہ

خراج تحسین

آشفہ سیر

زین مہدی

شخصیت

متنبی

ضیاءتسنیم بلگرامی

کائنات و شہین

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

برصغیر کے ایک
بڑے شاعر کا تذکرہ

اس نے نبوت
کا دعویٰ کر دیا تھا

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

دلچسپ واقعات

پرانی کوکھ

کاشف زبیر

کھیل کھلاڑی

اسپاٹ فکسنگ

اعتزاز زریاب وھلی

تذکرہ

مشعل راہ

زویا اعجاز

اس نے ایک انتہائی
عجیب کھیل کھیلا تھا

مفتاد کی حسا طر ملک
کو بدنام کرنے والے کھلاڑی

علم کی شمع حیدار
انہوں نے مثال قائم کی

معلومات

بابائے جغرافیہ

طارق عزیز خان

فلم نگری

لیڈی کلر

انور فرہاد

دہشت گردی

ہلاکت خیز

شکیل صدیقی

معلومات حاصل کرنے
کے شوقینوں کے لیے تحفہ

پاکستان کے ایک
نامور اداکار کی کتھا

اسکول سین دہشت گردی
کا رونما ہونے والا واقعہ

تحقیق

دیوار گریہ

خالد ایوب

عالمی ادب

قلم کار کی بیگم

سلمیٰ اعوان

سفر کمانی

شمشال ٹونز

ندیم اقبال

اس ایوارڈ فاتحہ جس
نے ادب کا کوجہ کیا

ایک عالمی شہرت یافتہ
قسم کار کی سرگزشت

جواب دہانی کا شہر کا دل
الگ انداز کی داستان

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے مجملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی ادارہ یا اشخاص کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتیکہ ادارہ یا اشخاص کو مالی یا دینی نقصان نہ پہنچے۔ تمام اشتہارات یکے بعد دیگرے شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملہ میں ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ذکر خاص
نہ قصہ کہانی
افتخار مجاز

پاکل حسانے سے
ایک دلچسپ سبق

پہلی سچ بیانی
ٹھکرانی ہونی لڑکی
سیما

سسرال والوں نے
اے ٹھکرادیانت

معاشرت
ناسور
ذاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معصوم نوجوان کی خون
ریک لہو گرما لینے والی داستان

تحریر خاص
نظریہ
محمد ایاز راہی

ایسا ہی سریر جو
آپ کو چونکا دے گی

خاتمی سچ بیانی
سمندر
ذوالفقار

سبق سے بھری ایک
دلچسپ سچ بیانی

تیسری سچ بیانی
سیلانی
سید محمود حسن

ایک عاشق ناسرود
کی قربانی کا قصہ

دوسری سچ بیانی
فرشتہ انکل
شرجیل

ایک بچے نے اس
کی زندگی کا رخ بدل دیا

ساتویں سچ بیانی
سچ یہ ہے
خورشید شاہ

بدگمانی اس کی زندگی
تباہ کرنے والی تھی

چھٹی سچ بیانی
گناہ گار
عاطر شاہین

اس نے ایک انتہائی عجیب
فیصلہ کر کے سب کو حیران کر دیا

پانچویں سچ بیانی
جذبہ
افتخار حسین اعوان

مقبوضہ کشمیر سے
ایک دکھ بھری کہانی

سوغات
پاپے
قارئین / ادارہ

دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلومات انکشافانی پاپے

نہیں سچ بیانی
گرہ
وسیمین اشرف

اس نے اپنا حساب
خود بے باق کر لیا

آٹھویں سچ بیانی
لب باا
راحت وفا

اب بام پنج کر اس
نے خود کو روک لیا

ہر ان حاد م کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق برحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہنامہ سنگ مرشد

مدیرہ اعلیٰ

عذرا رسول



مدیر

پرویز بلگرامی

شعبہ اشتہارات

نیوز اشتہارت، مٹروپولیٹن 0333-2256789



قیمت فی پرچہ 60 روپے ♦ ذریعہ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروڈیوسر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایسٹیشن

ڈیفنس کراچی ایم این کوئٹہ روڈ

کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ایچ جسن پرنٹنگ پریس

ہالکی اسٹیٹیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 وکری 74200

Phone : 35804200 Fax : 35802551
E-mail : jdpgroup@hotmail.com



قارئین کرام!
السلام علیکم!

میں سال بھر کے اخبارات کی کاپی بنا کر ایک جگہ رکھ لیتا ہوں۔ آج تعطیل تھی اس لیے میں نے ایک پر ایک رکھے بنڈلوں میں سے ایک بنڈل نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ صرف سرخیاں دیکھ کر دوسرے دن کا اخبار نکال لیتا۔ تقریباً دو گھنٹے تک پڑھتا رہا۔ اس ایک سال کے اخبارات میں لگی خبروں کو دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ ملک عزیز میں بریلوی غیر محفوظ ہیں، شیعہ غیر محفوظ ہیں، دیوبندی غیر محفوظ ہیں، بلوچ غیر محفوظ ہیں، کشمیری غیر محفوظ ہیں، سندھی غیر محفوظ ہیں، پنجابی غیر محفوظ ہیں، پٹھان غیر محفوظ ہیں۔ یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے مجھے دہلا دیا۔ میں سوچ میں ڈوب گیا کہ ارض پاک میں محفوظ کون ہے۔ ذہن نے جواب دیا، VIP۔ اور میری نظر دیوار پر آ دی۔ اس قائد اعظم کی تصویر پر پڑی۔ ان کی آواز کانوں میں گونج اٹھی۔ ”میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔“ 69 سال قبل کہا گیا جملہ تازہ محسوس ہوا تو میں نے نظر کھائی، کمرے کے کونے میں بنے شیلف پر رکھے قرآن پاک پر نظر ٹھہر گئی۔ جندوان میں لپٹا قرآن فریاد کر رہا تھا کہ ”بھئی مجھے کھول کر مجھے کی کوشش تو کر لیتے۔“

اس افسانچے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے کہ کاش ہم احکام قرآن پر عمل کر لیتے تو قائد اعظم کا پاکستان آج جنتِ نظیر ہوتا۔ اداروں سے تصادم ہوتا نہ کسی کے مردودہ باد کے نعرے لگ رہے ہوتے۔

معراج رسول

یگانہ شاعر

صوبہ بنگالہ کو تقسیم کر کے ایک نیا صوبہ بہار بنایا جا چکا تھا۔ اسی صوبہ بہار کا صدر مقام عظیم آباد تھا۔ عظیم آباد جو اب پٹنہ کہلاتا ہے۔ اسی پٹنہ کے محلے نخل پورہ میں ایک معروف مغل خاندان آباد تھا جس کا سلسلہ نسب چنگیز خان سے جاملتا تھا، اس خاندان میں 1301ء کے ذی الحجہ (1884ء) میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس بچے کا نام واجد حسین رکھا گیا۔ اس کا خنبالی سلسلہ مرزا آغا جان تک پہنچتا تھا جو لکھنؤ سے عظیم آباد آئے تھے۔ ان کی رشتے داری مرشد آباد سے بھی تھی۔ گویا کہ دونوں جانب سے وہ نواب خاندان تھا۔ اس بچے کو ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی سے ملی پھر اسے محمد انیسکو عربک اسکول میں داخل کرایا گیا۔ بچہ ذہین تھا۔ ایک کے بعد ایک کلاس پاس کرتا چلا گیا۔ ہر کلاس میں وظیفے، تجزیے اور انعام حاصل کرتا رہا۔ پھر اسے مزید تعلیم کے لیے کلکتہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے اس نے 1903ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران اسے ماحول کی وجہ سے شاعری کا شوق ہوا اور اس نے سخن فہمی کے لیے سید علی جان بیتاب عظیم آبادی کا دامن تمام لیا۔ بیتاب عظیم آبادی اچھا کہتے تھے اور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ابتدائی تربیت کے بعد انہوں نے اسے اپنے استاد سید علی محمد شاد عظیم آبادی کے سپرد کر دیا۔ شاد عظیم آبادی کا سکسہ بہار و بنگالہ پر جما ہوا تھا۔ ان کے اشعار لوگوں کی زبان پر رہتے تھے۔ ان کے فیض نے اس کے ذہن رسا کو مزید ترقی کیا۔ پھر وہ کلکتہ چلا آیا۔ کچھ دنوں تک کلکتہ میں رہنے کے بعد وہ شیا برج منتقل ہو گیا۔ شیا برج میں مرزا محمد عظیم بہادر (سلطان عالم میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا معلم مقرر کیا گیا۔ شیا برج کی آب و ہوائ نے صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ بیمار ہو گیا۔ بحالت مجبوری اس نے شیا برج چھوڑ دیا اور عظیم آباد منتقل ہو گیا، یہاں بھی صحت سچ نہ رہی تو لکھنؤ چلا آیا۔ یہ واقعہ 1905ء کا ہے۔ لکھنؤ کی فضا نے جادو اثر دکھایا اور اس کی صحت بحال ہو گئی۔ وقتاً فوقتاً وہ عظیم آباد جاتے اور جائیداد کا کچھ حصہ فروخت کرتے اور لکھنؤ لوٹ آتے۔ بے فکری والی زندگی تھی۔ حسن اتفاق کہ نواب بیتاب صاحب موج عظیم آبادی اپنے علاج کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے ان کی لالہ بانی زندگی دیکھی تو انہیں فکر ہوئی اور انہوں نے لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے میں حکیم مرزا محمد شفیع کی صاحبزادی سے نسبت بھریادی۔ یہ واقعہ 1913ء کا ہے۔ اس وقت تک واجد حسین کی شاعری لکھنؤ میں اپنا مقام بنا چکی تھی اور یاس شخص کرنے لگے۔ ان کی شاعری ہی نے ”باہر“ کا ہوتے ہوئے بھی لکھنویوں پر فوقیت حاصل کر لی تھی۔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے ہی عظیم آباد میں واقع ایک بڑی جائیداد بیک چکی تھی۔ اب شادی ہوئی تو کمائے کی فکر ہوئی۔ لکھنؤ تو پہلے ہی اجڑا ہوا تھا یہاں دال روئی کا انتظام بھی مشکل تھا۔ اس وقت ہر ایک کی نظر وکن کی سلطنت کی طرف تھی کیونکہ اس پر آشوب دور میں دکن ہی ایک ایسی ریاست تھی جو اہل علم کی قدر کر رہی تھی۔ میرزا واجد حسین نے بھی دکن کی طرف کوچ کر جانا، اہم سمجھا۔ وہ دکن پہنچے تو انہیں رجسٹرار کا عہدہ مل گیا لیکن وہاں بھی زیادہ عرصہ تک نہ سکے اور 45-1944ء میں واپس لکھنؤ آ گئے۔ تب تک ان کا پہلا دیوان نشر یاس آچکا تھا۔ عروض و قوافی پر ”چراغ سخن“ بھی آچکی تھی۔ وہ شعراء میں اہم شمار ہونے لگے تھے۔ اسی سرزمین لکھنؤ میں 2 فروری 1956ء کو انہوں نے دنیا سے منہ موڑا۔ میرزا واجد حسین جیسے یگانہ نہ شاعر کو ہم سب یاس یگانہ چنگیزی کے نام سے پچھانتے ہیں۔



شہر خیال



☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا کورنگی کراچی سے غلوں نامہ۔ ”برصغیر کی ادبی تاریخ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ علامہ اقبال ہمارے حصے میں آئے اس کے بعد شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ خدا نے سخن میر تقی میر کے بعد غالب اور فانی بدایونی کے تذکرے کے بغیر یہ فہرست مکمل نہیں ہوتی لیکن فانی بدایونی کو اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے فوقیت حاصل رہے گی۔ ہمارا ماننا ہے کہ خدا نے بزرگ ویر ترکی اضافی نوازشات کے بغیر کوئی شخص شاعر نہیں ہو سکتا۔ چیف صاحب نزی، شائستگی، رواداری اور تحمل کیے مگر ہماری قوی زندگی کا حصہ بن سکتا ہے۔ ماضی میں اگر یہ میراث ہماری تھی تو ہماری تربیت کے لیے ہمارے رہبروں میں قائد اعظم، علامہ اقبال، راجا محمود آبادیاب و اب زیادہ لیاقت علی خاں اور ان کے رفقاء شامل تھے۔ آج ہماری تقدیروں کے مالک آپ کے سامنے ہیں جو رہنمائی تو بہادر و نمائی کے بھی قابل نہیں ہیں۔ یہ انہی کی کارگزاریاں ہیں کہ آج ہم بحیثیت قوم زبان و درازی، بدگیزی، خود غرضی اور جارحیت کا سہیل بن چکے ہیں۔ محترم آپ ہی انصاف کریں جس شخص کو انہی پاکستان کی خوش خبری دے کر اس کے گمروں میں بجلی کا ایک بلب بھی لوڈ شیڈنگ کے

محض نہ جلے اور بل ایسا آئے کہ جیسے وہ روشنیوں سے نہایا ہو تو محل کہاں سے لائے گا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم نہ ہو، اسپتالوں میں ڈھنگ کا علاج نہ ہو، دل کے مریضوں کو فوری آپریشن کی بجائے ایک ایک سال کی تاریکیوں میں جین تو اس کے لیے جس نئی، شائستگی کیسے باقی رہے گی۔ عام آدمی کی رواداری کس طرح روادارہ نکلی ہے جب اسے اپنے ہر جائز کام کے لیے ناجائز دیر لپٹانے کو کہا جائے۔ ”شہر خیال“ میں رانا محمد شاہد کا ادبی خطبہ بہت بھایا۔ سید امتیاز حسین بخاری کا دل ہی رکھ لیتے، آپ تو انہیں ڈاکو اور ریت پسند کا فرق سمجھانے لگے۔ ششی محمد عزیز ہم نے تو بچپن میں داستان امیر جڑو، ظلم ہوش ربا، اپنا مافی، نیم چھائی کے ساتھ ساتھ شجلی اور نازن کو بھی بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ آپ کو بھی بڑا حورہ آتا کہ آپ بھی پڑھتے، بہادر پورہ کے کلیم اللہ ایڈووکیٹ کا خط سب سے شاعرانہ تھا۔ تاریخ کی درنگ پر شکر ہے۔ ”سر جھانگل“ اور ”نام“ اپنے اندر موسیقیت لیے ہوئے تھیں نور جہاں کا تذکرہ تو نہیں اور بھی آئے بھلا لگتا ہے۔ ایاز راہی ہمیشہ کی طرح مختصر لیکن جامع انداز میں چھا لگے صاحب کی قوی ترانے کی دھن پر دھیان دے رہے تھے۔ جب ہم نے بھی دھیان دیا تو یاد آیا کہ کسی شاعری کے بغیر قوی ترانے کی دھن کا بن جانا اور جانندہ صری صاحب کی شاعری کا کسی دھن کا مہون مت ہونا کی بھڑے سے کم نہیں ہے۔ خدا کی تخلیق کسی کسی تخلیقات کو جنم دیتی ہے۔ ندیم اقبال صاحب امریکا کی رنگینوں میں قمار بازی سے حد اٹھا رہے تھے۔ سفر نامے کی شان ہی یہ ہے کہ داستان گو مسافر اپنی بشری کمزوریوں کا اعتراف بھی کرے اور ندیم صاحب اپنی بھی ہوتی ہر بات سے انصاف کر رہے ہیں۔ ”پچھپ دریاقت“ میں مذکور ایسے قلم کار کم ہی ہوتے ہیں۔ روزنامہ پیسہ، ازم، اونڈی ہستی تحقیق حق ادا کر رہی تھیں اور قلم ساز حسن حراج، زندگی کی جیت، باپ کے بغیر اپنے اپنے کوچیوں کی محنت پر داد طلب تھیں۔ نواب سہیل انتہائی جاندار اور شاعرانہ تجربہ بھی۔ ”قائد اعظم کی محبت اور پاکستان سے محقق نواب بہادر یار بگ کی محبت میں تھا، ہم ایسے، کتنے ہی انسان دوستوں کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔“ ”ناسور“ کا علاج بروقت ہو گیا اب بہتری کی طرف کا حورن ہے۔ ادا کا ندیم کی بے شمار گولڈن جوبلی قلموں کی طرح بحیثیت ادا کار بھی وہ اپنی نصف صدی مکمل کر چکے۔ خدا انہیں حریص محبت و دہی عمر عطا فرمائے۔ ہم ان سے کسی مرید جیل کیے ہیں۔ ندیم صاحب کی زندگی ان کی اہلیہ فرزانہ کی خالصتاً کوششوں کا ثمر ہیں لیکن ادا کا ندیم بھی پوری زندگی ایک بادشاہ پر رہے۔ کوئی اسکپٹلر ان کی زندگی میں نہیں ہے، انہوں نے غلوں کی قیمت اپنی وفا سے چکانی۔ دل لگی میں ندیم کی ادا کاری ان کے فن کا نقطہ عروج ہے۔ ”لا زوال“ میں ایک ولن کے روپ میں انہوں نے بتا دیا کہ مد حاضر میں انہیں صف اول سے نکالنا نامکن ہے۔ جناب مساجد احمد نے بچھلے ہاکی غیر حاضری کی کسپوری کردی نسیات دان سے ملا کہ فریڈیٹ سے فطرت کے اسرار و رموز کی تحقیقات میں اگر اسلام نہیں تو اپنے یہودی مذہب کا مطالعہ ہی کر لیا ہوتا تو اسے اپنے بہت سے نظریات کی تصحیح کرنے کا موع اپنی زندگی میں ہی مل جاتا۔ حج پیانو میں نقب، مقتول، سماجی براہنگ

میں فقیر غلام حسین ضیاء کی آمد بمکر سے۔ ”محمد عمران خان ڈیلی نامہ دار بمکر، محمد عارف بمکر، رضا احمد خان اہوان وریا خان بمکر سے، اور محاسن شاہ بمکر کے خطوط ”معجز خیال“ میں پڑھے اور لطف آیا۔ دنیا داری سے فرصت ملے تو یاد کر لیا کرو۔ سید امتیاز حسین بخاری نے طور اور مہر، دو مشہور کردار پر تبصرہ کیا ہے۔ بخاری صاحب نے لکھا ہے کہ طور خان اہوان چارٹ قد کے تھے بلکان کا سامی مہر و مضبوط جسم کا مالک چوٹ قد رکھتے تھے۔ امتیاز بخاری صاحب بات الٹ کر گئے ہیں۔ میں نے مہر و لوار جہ طور خان کا سامی تھا۔ واڈ ڈیل ریلوے اسٹیشن پر بمبیک ماکتے دیکھا ہے۔ وہ چارٹ قد اور انتہائی نحیف و زراعت اور کھجکی ہوئی عینک لگا کر کپڑوں کی حالت میں دیکھا تھا۔ ایک آدمی نے اس سے پوچھا تھا کہ مہر و چاندی والے کتنے روپے تم میں رہتے تھے تو اس نے کہا کہ میں روپے۔ طور خان پہلے بار گیا تھا مگر بی ایس بی نے مارا تھا۔ طور خان ایک کوٹھے میں بند تھا۔ ایس بی نے لکھا کہ طور اور امتیاز ڈال دو مارے جاؤ گے۔ وہ مقابلہ کرتا رہا جب کارٹوس ختم ہو گئے تب طور خان نے بندوق باہر نکالی لیکن گولیوں کی بوچھاڑ میں گر گیا اور کھیل ختم ہو گیا۔ مہر و کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ وہ شخص ہے جس کے نام سے لوگ ڈرتے تھے۔ آج تک حالت ہے۔ ”نفیات دان“ کے عنوان سے ڈاکٹر ساجد امجد نے ماہر نفسیات ڈاکٹر سکندر فرانیٹز کے حالات زندگی تحریر فرمائی ہے جس کی نفسیاتی و ریاضیاتی نے یورپ کے اخلاقی و عملی نظریات میں عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ فرانیٹز نے سب سے پہلے لاشعور کو دریافت کر کے انسانی افعال و کردار کی نئے انداز سے تعبیر کرتے ہوئے انسانی شخصیت کی بنیادیں کو قرار دیا اور یوں اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے وقتی بیماریوں کے علاج میں انقلاب برپا کر دیا۔ ”نواب بہادر باگ“ میر سے ہم نام غلام حسین (میں) کی تحریر ہے یہ ایک ایسے محب وطن کا تذکرہ ہے جس نے وطن عزیز سے موصول اور اگرچہ اس نے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہ میداد ہادیوں کے جاگیردار نواب یاور جنگ کے بیٹے تھے۔ ”خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طہت را“ کا شاعر اور صلہ نے گلزارِ جہاں کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ایک مشہور ادیب نے تو نور جہاں کو سرور جہاں کے نام سے یاد کیا ہے۔ بہر حال اپنے وقت کی مشہور مصنفہ تھیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سلسلہ ادبی کہانی ”ناسور“ کی ساتویں قسط جاری ہے۔ بھٹی صاحب بلاشبہ داد کے مستحق ہیں۔ ہر سوز پر ایک نئی کہانی ہے۔ عنوان کی کہیں عاصمہ اسمی تک دستیاب نہیں ہوئی۔ سب سے اب بھی قائم ہے۔ ”نقب“ انیلہ صاحبہ کی تحریر ہے۔ کہانی ایک انتہائی گھٹیا ذہن کے انسان کے گرد گھومتی ہے جو شادی شدہ ہوتے ہوئے دوسری عورتوں کا رسیا تھا۔ انجام سے عزت ہو کر اپنے گھر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ ”مختول سامی“ زین قمر کی مگر و سوچ کا ٹکس ہے۔ چوری کرنا بھی ایک پیشہ ہے اور اگر واردات سے بچھ حاصل نہ ہو تو بھرا پانی بدھتی کو کھوتے ہیں۔ ”انسان کو بچھ بنانے میں معاشرے کا کردار“ موضوع کے اعتبار سے بہت اچھا عنوان ہے اور جیل میں قیدیوں سے اپنے جرم کی وضاحت کا کوٹھ لگانا ایک خاتون کے لیے بڑی جرأت اور حوصلہ مندی کی نشانی ہے بھرا ایک بے گناہ کو قید سے آزاد کرنا بڑی بات ہے۔ مقبول اور اکرم کے ڈائلاگ بہت جاندار ہیں۔ ”راکب نمبر“ ڈاکٹر ظفر احمد خان کی تحریر ہے۔ ظفر صاحب نے بڑی اچھی فصاحت کی ہے۔ ہوسٹل فون پر محبت نہ کر سکیں۔ فون اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا۔ غلط استعمال کا انجام نقصان دہ ہے۔ برے کام کا انجام برائی ہوتا ہے۔ والدین تو بچوں کو اسکول یا کالج تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجتے ہیں ان کو خیر کر بھی چاہیے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ ”بدگمان“ درود خان کی تحریر ہے۔ اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ شک نہ کرو کہ بعض گناہ ہیں۔ اس کہانی کا نتیجہ بھی بدگمانی ہے اسی شک اور بدگمانی پر کتنے گھر روزانہ اجڑ رہے ہیں اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ ”سونا ڈبل“ عاشر شاہین کی ایک فصاحت آمیز کہانی ہے۔ آج کل اس موضوع کے مطابق عام وارداتیں ہوتی ہیں۔ سونا ڈبل ہونے کے لالچ میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھنا عام سی بات ہے۔ ”ادھورا رشتہ“ وسم بن اشرف کی تحریر ہے۔ اس کہانی کا تعلق اس ویس سے جوڑ کر دیکھیں جہاں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔ ”شریک سبز“ غلام رضا جعفری کی تحریر نہایت اچھی ہے۔ ایک بھولے ہنگلے انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بالکل بدل گئی اور پھر تنگ سیرت سامی ثابت ہوئی۔ ”نجات“ زویا اعجاز کی بگ بگائی ایک حقیقت ہے۔ اندھی عقیدت کا کھارلا رکھیں کو ڈرا دھکا کر عزت لوٹی جاتی ہے۔ بدعا خوں نے بڑی کال لایا وہ اڑھ رکھا ہے اور پارسائی کا ڈھونڈ رہا کہ شریف زاد یوں کی عزت سے کھیلنا شیطانی کام ایک آدمی کا نہیں بلکہ یہ عیم درک ہوتا ہے۔ حکومت چاہے تو اس برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے مگر اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔“

☆ سدرہ بانو ناگوری طبرکراچی سے لکھتی ہیں۔ ”یوم آزادی مبارک کے خوب صورت اشعاروں سے جھلکاتے سرورق کے ساتھ سرگزشت اس دفعہ جلد ہی مل گیا۔ ادارہ کی کہانی منفرد اور الگ ہی تھی۔ محترم بزرگ نے اچھی فصاحت کی۔ ”معجز خیال“ پر نظر دوڑائی تو رات شاہد صدارت کی کرسی پر کھائی دیئے، مبارک ہو اور ساتھ میں بیٹی کی سالگرہ کی بھی بہت بہت مبارک باد۔ آفتاب احمد اشرفی صاحب معراج انکل کو دل جلانے سے منع کرتے کرتے اپنا ہی دل جلا رہے تھے۔ بھی ایسا کیوں؟ دیکھ لیجیے سب کچھ نہ سہی مگر کچھ بدلا ہے، نئے پاکستان کا خواب دکھانے والے پرانے پاکستان میں بڑی بڑست تہذیبی لائے ہیں۔ بہت سے چہروں کے نقاب سر کے پیٹ تو بہت سی حقیقتیں بھی سامنے آتی ہیں جنہیں دیکھ کر دکھ بھی ہوا ہے کہ پاکستان سے محبت کا ڈرا مارا جانے والوں نے پاکستان کو کن حالات میں پہنچا دیا ہے۔ دل جلانے سے اچھا ہے کہ دعا کیا کریں، وطن کے لیے بھی اور وطن میں بسنے والوں کے لیے بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہماری تاج بوحانے میں ہمیشہ کی طرح اپنا کردار نبھایا

ادا کیا۔ ”نقیات دان“ لکھی اور بہت خوب لکھی باپ کے بغیر اچھی تحریر ہے لیکن ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں باپ کو خدا خراج نہیں ملتا جس کا وہ مستحق ہے اس کی قربانیاں ہمیشہ پس پشت ڈال دی جاتی ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جو باپ کی محنتوں کا اعتراف کرتے ہیں ورنہ شاعروں کی شاعری ہونا ادیبوں کا ادب ہمیشہ ماں ہی کو نمایاں رکھا جاتا ہے۔ فلم ساز پڑھ کر باوجود سیر کے ایک جملے کی یاد آگئی کہ ”محبت مرد کی زندگی کا محض ایک واقعہ نہ محرومت کی پوری زندگی کی داستان ہوتی ہے۔“ بریک اس جملے پر پوری اترا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ سام اگر کڑے حالات کا مقابلہ دیدہ دلیری سے کر سکتا ہے تو محبت کا مجرم رکھنا اسے بھی آتا ہے ”روزنامہ پیہ“ پڑھ کر حیرت ہوئی اخبار کو تو پیہ کسانے کا ذریعہ بنا جاتا ہے لیکن کسی اخبار کا نام پیہ ہونا واقعی حیرت انگیز ہے۔ ”ششال سے نو رنٹ“ میں ندیم اقبال کہاں شخص لکھے۔ اچھا بلا ستر نامہ جاری تھا ان کو روں نے سارا حراہ کر کر دیا۔ ندیم بھائی آپ کو روں کے چنگل سے توجہ کر نکال ہی جائیں گے مگر اتنا بتا دیجیے کہ امریکا یا کینیڈا کی شہریت لینے کے لیے جو حلف نامہ لیا جاتا ہے اس حلف نامے میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ یہ سب ذرا تفصیل سے بتائیے گا۔ ندیم صاحب نے فلم انڈسٹری میں اپنے کردار کو عمر کی سے بھمایا کچھ فلموں کے بارے میں اسی سے پوچھا اور کچھ معلومات ہمیں انور فرہادی زبانی بطور انور فرہادی ہو سکے تو اگلی تحریر ردی جانو پر لکھیے پلینز۔ ”ناسور“ میں جسے تھی موڈ کاٹنے کاٹنے نعمان ایسے موڈ پر آکھڑا ہوا ہے کہ ایک طرف تو اس کی عزت و ادب پر لگی ہوئی ہے تو دوسری طرف ان محنت دشمنوں کی سازشیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ ہیرہ دیکھیے دشمنوں کے عزائم خاک میں ملاتا ہے۔ پہلی جگہ بیانی ”نقب“ ”پرمی“ دوسروں کے گھروں میں نقب لگانے والے کے گھر میں بھی نقب لگ سکتی ہے۔ اگر نقب لگانے والے نقب لگانے سے پہلے یہ سب سوچ لیں تو بہت سے گھر نقب زنی سے بچ جائیں۔ زویا اعجاز کی ”نجات“ پڑھ کر دیکھیں کھڑے ہو گئے۔ دین اسلام جلی بیروں فقیروں کے پاس جانے کی سختی سے ممانعت کرتا ہے لیکن کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں کہ معصیت آتی ہے تو بچے خدا کو بھول کر نام نہاد خداؤں میں خدا کو ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ غلامی کی دلدل میں دھننے یہ پیر فقیر تو خوشحال ہیں، کوئی تو چٹا کیوں نہیں ہے کہ یہ بتا دیں جو کتنا جی کیسے دور کریں گے۔ زمانہ بدل گیا لیکن نظریے بدلے اور اسی نہ بدلنے کے نکلنے کیا کچھ بیل ڈالاکہ سکون کی تلاش میں ٹھکنے والے بے سکونی کو ہی اپنا مقدر بنا بیٹھے۔“

☆ مقدس جہاں کراچی کا اختصار۔ ”ہمیں رسالہ 25 تاریخ کو ہی مل گیا۔ اس بار سرگزشت میں ”اونٹنی ہستی“ سب سے زیادہ پسند آئی کیونکہ اس میں شاعر لطیف نے بالکل نئی معلومات دیں۔ سچ باتوں میں ”سونڈیل“ ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ باتوں میں نقب، شریک سفر اور متحول سماجی بہترین لگی۔“

☆ محمد ابراہیم درانی نے ڈی جی خان سے لکھا ہے۔ ”میں 1998ء سے آپ کا خاموش قاری ہوں۔ آپ کی تمام تحریریں زبردست ہوتی ہیں۔ آپ نے دیپ کمار کے متعلق بہت لکھا۔ میرے خیال میں یہ باتیں سننے والوں کے ساتھ ایک قسم کی زیادتی اور نا انصافی ہے (دیپ کمار پر صرف ایک تحریر شائع ہوئی ہے) آپ نثاران حیدر پانے والے تمام شہداء کے متعلق تحریر کریں۔ ٹھوکر کیش کے متعلق اگر شائع کیا ہے تو بتائیں (کیش پر ملی سفیان آفاق نے الف لیلا میں کافی لکھا ہے)۔ پاکستانی اداکارہ آسیہ کے متعلق بھی تحریر ضرور کریں۔ آخر میں میری طرف سے تمام سرگزشت اشاف کو دار قرین کو دلی عید مبارک۔“

☆ رانا محمد شاہد پورے والا سے آئے ہیں۔ ”یوم آزادی کی مناسبت سے سرورق بہترین رہا۔ تصور الہم کی شاعری کرنے والے فانی بد اپنی نے آخر میں اپنی موت کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ ادارے میں حب روایت ہمارے رویوں کے حوالے سے اہم پہلو کی نشاندہی تھی۔ انفرادی ہو یا اجتماعی، وہی لوگ اور تو میں ترقی کرتی ہیں جنہوں نے نری، شائستگی اور صلے سے کام لیا۔ ”معبور خیال“ میں سب سے پہلے ہمارا ہی خط تھا، شکر ہے۔ سید امتیاز حسین آپ تو خود ادبی و ثقافتی کام کر رہے ہیں۔ آپ میا نوالی کے ان حریت پسندوں پر لکھیں تو بہت سے قارئین کو ان کے کارناموں سے آگاہی ہوگی۔ شعی محمد عزیز کا خط بھی اچھا تھا۔ آفتاب احمد نصیر آپ نے صحیح لکھا۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ قانون صرف عام اور غریب آدمی کے لیے ہے۔ نزابت افشال سب سے پہلے تو جاہ کی مبارک بات قبول کریں۔ دوسرا تم مجازی کے بڑے ناول نگار ہونے میں کوئی شک نہیں۔ تاہم ان کے ناولوں میں خاصی حد تک مبالغہ آرائی اور دروٹا نوالی قصوں پر تحقیقات ضرور ہیں۔ سدرہ بانو حاضر نہیں۔ البتہ طاہرہ نگار اور بشری افضل تو کافی عرصے سے غائب ہیں۔ حکیم اللہ اللہ وکیٹ نے جماعت اسلامی کے میاں طفیل کے حوالے سے کچھ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ ان سے بھی گزارش ہے کہ اس حوالے سے کوئی تفصیلی آن لائن لکھیں تاکہ قارئین بھی ان حقائق کے متعلق جان سکیں۔ محمد عارف اعجازیہ تو ایک رائٹر کا بنیادی حق ہوتا ہے جو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ پڑھ کر خوش ہوئی کہ فخر عباس مرزا جیسے بزرگ بھی ذوق و شوق سے سرگزشت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ مختلف ڈائجسٹوں کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ بتاتے چلیں کہ رعایت اللہ صاحب کا حکایت رسالہ تمنا سیاہ ڈائجسٹ نہیں۔ وحید ریاست بھی کافی دنوں بعد نظر آئے۔ ان کے سالانہ تجزیے کا بھی کو انتظار رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو صحت کے ساتھ عمر طویل فرمائے (آمین)۔ ڈاکٹر ساجد امجد اس دفعہ صدی کے ایک بڑے نقیات دان سکندر فرانیڈ

کی زندگی کے مختلف گوشوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ سگند فرانیڈ کی اپنی زندگی بھی نفسیات کے بہت سے پہلوؤں کا احاطہ کرتی نظر آئی۔ غلام حسین یمن کی ”نواب ساجی“ انکس کے صبیحے کی مناسبت سے بہترین تحریر تھی۔ یمن صاحب نے نواب بہادر یار جنگ کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں کیا جو دل کو بھایا۔ دانیہ صدیقی کی دلچسپ دریافتیں ایک مختصر مصلواتی تحریر تھی۔ انور فراداس دفعہ پاکستان قلم انڈسٹری کے پرائڈ انعام کا زندگی نامہ لائے۔ جگ توپے کے کراپے بچپن میں جس پاکستانی ہیرو کی سب سے زیادہ فلمیں دیکھیں وہ ندیم علی ہے۔ پی ٹی وی کے اچھے دنوں میں جب ہر ہفتے فلم لگا کر ٹی وی تو اس کا بے چینی سے انتظار ہوتا تھا۔ اپنے وقت کے مشہور و معروف اخبارات کے حوالے سے مصلواتی سلسلہ بھی سرگزشت کا ہی خاصا ہے۔ اس دفعہ روزنامہ ”پنپہ“ پر کھیل صحافت کی مصلواتی و دلچسپ تحریر پڑھنے کو ملی۔ منظر امام کی ”ازم“ بھی منفرد موضوع پر تھی۔ شاہد لطیف اور شاد مقب کی تحریریں بھی دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ ندیم اقبال کا سفر نامہ حب روایت بہترین جا رہا ہے۔ کاشف زبیری ہالی ووڈ کے ایک بڑے فلم سازی مجدد ہے مگر یورپ کبھی اچھی لگی۔ اللہ سے دعا ہے کہ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ کشمال حسن کی ”ہاپ کے بغیر“ مختصر مگر منفرد موضوع پر تھی۔ قوی ترانے کی دھن تخلیق کرنے والے احمد چھاگلہ پر ایاز راسی کی تحقیق قابل ستائش ہے۔ ان کا یہ کام انہیں تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھے گا۔“

☆ قیصر خان کا خطہ بکھرے۔ ”اداریہ میں انگل نے فرض کی طرف توجہ دی ہے جو کہ ہمارے اسلامی معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے لیکن ہمارے ملک میں سرکاری یا پرائیویٹ اداروں میں چھڑا سی سے لے کر افرادوں تک نری سے خالی ہیں جو کہ بہت بڑا المیہ ہے۔ اس بار سب کے ”تہہ“ شائد اچھے۔ اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ سید امتیاز صاحب مصلواتی کو کیوں ہیرو دینگے؟ کلیم صاحب کا خطہ تاریخی نقطہ نظر سے بہت اچھا تھا، آپ آتے رہا کریں۔ بہت اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ ڈاکٹر ذوالعین، ڈاکٹر روبینہ، محمد عامر، مصلو، خالد صاحب، ناصر، ندیم، آپا طاہرہ، گلزار، ہونانی صاحب، ویرہ لوگ، اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ اے۔ مصلو پر فانی بدایونی صاحب تھے پڑھ کر مصلومات میں اضافہ ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے بہت اچھے طریقے سے فرانیڈ کی آپ اپنی مہمان کی۔ قلم کا ہاوا، انکس صاحب کا کمال ہے۔ پرے میں تمام مضمون بہت اچھے تھے۔ دلچسپ دریافتیں، نواب ساجی، گولڈ انڈیا، روزنامہ پیر، ازم، اوندھی بستی، قلم ساز، نام، ہاپ کے بغیر، سرجم، ادا، کارندیم کے بارے میں جاننے کو ادا امریکا کے قلم ساز سے ملے۔ ازم کے بارے میں جانا تو ہی ترانہ کے۔ خالق کے بارے میں پڑھا اور افسوس ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس محسن کو بھلا دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر قدیر خان کو لوگ آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے ہیں۔ ہم پاکستانی محسن کس قوم بچنے جا رہے ہیں۔“

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی خوش چینی قصور سے۔ ”خدا نہ داشت“ عظیم شاعر فانی بدایونی اپنی سن و قات بتا کر وقت کے مطابق رخصت ہو گئے۔ اللہ کے پیارے بندوں کو کہیں نہ کہیں الہام ہو جایا کرتا ہے اور اسکی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ بہر حال پچرا اور جاسر سرگزشت بہت اچھی لگی۔ انگل صراح کے مطابق ہمیں انفرادی اور معاشرتی طور پر نرم بننا ہو گا نہیں تو میں نہاؤ کی طرح ساری اکڑو مڑن تھکے ہو جائے گی اور پھر مدعا معاشرے کے چہرے مکمل اٹھیں گے۔ اس کی شروعات ہو گئی ہیں، بس پیاری عوام کو بکھنے کی ضرورت ہے۔ ”صبر خیال“ میں رانا محمد شاہد کصدا رت مبارک مصروفیات اچانک اتنی بڑھ گئی ہیں کہ سبھی سے رابطہ کٹ گیا ہے۔ مٹی عزیز، محمد عمران خان، آفتاب احمد نصیر اشرفی، نزات انشال، سعید احمد چاند، کلیم اللہ ایڈووکیٹ، حفیظ عباس مرزا اور وحید ریاست بھٹی کے تیرے بہت اچھے تھے۔ نفسیات کے محدود دائروں سے نکل کر انقلاب برپا کرنے والے نفسیات دان، سگند فرانیڈ کی سرگزشت لا جواب رہی، دلچسپ دریافتیں، اوندھی بستی اور روزنامہ پیر مصلومات انفرادی تحریریں تھیں۔ جس حراج نازل رہی جب کہ ازم نے سوچے پر لگا دیا۔ ”ہاپ کے بغیر“ بھی اچھی رہی اور ”نام“ کی تاسور نور جہاں کے شہر میں تو میں اس وقت موجود ہوں۔ مختصر اچھے تحریر۔ ”شمشال سے نورنو“ اچھی جا رہی ہے۔ ”تاسور“ میں تاسوروں نے بے جا چاری عاصد کو اغوا کر لیا جو بازیاں ہونے کے قریب ہے مگر فہیم غم سے ہی بے پنا ہو گیا۔ ”مستقل ساجی“ دلچسپ تھی۔ زیر قمر رہائی کا ذریعہ بن گئیں، زبردست، غلط حرکتوں کی مہاجر کوسرائی اور شاکلہ کا مہرنگ لایا۔ یوں ساجد کو لقب تو کی مگر شاکلہ کی زندگی بن گئی۔ مودے چکری نے تو مراد خان کو پکڑا کر رکھ دیا آخر اے بھی اپنی ”ناگن“ بیوی کی سمجھ آئی تھی۔ بھٹی ہوئی تحریر کو اچھا سا رملاتو دہی سدھر گئی۔ یوں شریک سنو کی کٹھالی سلجھی گئی۔ شفیات فروش پیر سرکار پر ہو کر لی آئیں بند کر کے اعتبار کرتا رہا اور ہر کوئی سکون حاصل کرنے کی غرض سے آستانے سے جڑ تاجلا گیا مگر ایک دن سبھی اس سیاہ کار بد بخت و دھوکے باز کی سمیٹ چڑھ گئے۔ معصوم لوگ دینا سے تو نجات پا گئے لیکن ایسے انسانیت دشمنوں سے نجات کب ملے گی؟ ”بیٹ ہازی“ سے حقت کریم، نیاز ملکھانی اور نائل منصور کے شعر عمدہ رہے۔“

☆ ڈاکٹر عبدالغفور کھیل کا تبرہ ملتان سے۔ ”سرگزشت کا تبرہ شادہ خاص شادہ ہوتا ہے۔“ خاص تبرہ“ کا اشتہار دیکھا۔ آپ اس اشتہار کے ذریعے جو کہنا چاہتے ہیں وہ بات سمجھا آئی ہے کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں خاص تبرہ شائع کرتے ہیں جنہوں نے اپنی عمر کی زندگی میں بہت کمایا سفر اور بڑے کام کیے۔ میرے خیال میں اس فہرست میں ایک نمایاں نام ممتاز قلمی اداکار نواب انصار چاکلیٹی پیر، ادا کی ہے۔

مراد کا ہے۔ میں نے ان کے بارے میں ایک تحریر افسانے کی شکل میں تیار کی ہے جس میں ان کی تمام فلموں کے نام آجاتے ہیں اگر آپ حکم کریں تو میں وہ تحریر آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں یا ان کے بارے میں مزید بہت کچھ لکھ سکتا ہوں وہ لکھ کر بھیج دوں (آپ نے دیر کردی، لیڈی کلر کی سوانح پڑھ لیں)“

☆ سیف اللہ ملک وال کا اظہار یہ۔ ”سگنڈ فریڈ“ ڈاکٹر ساجد کی تحریر نفیات دان پسند آئی تحریر میں صاحب مضمون کی محنت نظر آ رہی ہے۔ ”نواب سپاہی“ تحریر ہے پتا چلا کہ قائد اعظم کے ساتھیوں میں کیسے کیسے جاں نثار تھے۔ اس لیے تو کزور جسم والے آدمی نے دنیا کو وہ کر دکھایا کہ دنیا حیران رہ گئی۔ دانے صدیقی کی تحریر ”دلچپ دریافتیں“ واقعی دلچپ ہے اور ثابت ہوا کہ جو کچھ بھی ہوتا ہوتا ہے قدرت اس کا سبب بنا دیتی ہے۔ لیجیے انور فراد صاحب نے ”گولڈن اسٹار“ میں اپنی زیادہ معلومات (غیر ملکی فلمیں، ہیردوں کے نام، اعزازات کا گانے وغیرہ) لکھ کر حیران کر دیا ہے۔ ایک آدمی کے پاس اتنی معلومات!! اللہ نظر بد سے بچائے۔ روزنامہ ”پیپر“ اخبار میں کھیل صدیقی صاحب نے پیپر اخبار کی تفصیل سے تاریخ تو بتا دی ساتھ ہی مٹی محبوب عالم صاحب کے حالات زندگی سے بھی آگاہی ہوئی۔ ازم منظر امام صاحب کا اجماعا معلوماتی مضمون ہے۔ ”اونچی بستی“ شاید لطیف صاحب کی اور ”نئی دریافت“ مکی لکھی۔ لیس جی اب باری ہے ”شمشال سے ٹورنٹو“ تک کی ہر قسم پرندہ اقبال کی تحریف نہ کی گئیں لیکن ہر قسم ہونی قابل تحریف ہے۔ اس دفعہ قسط میں ڈرامائی انداز بھی نظر آیا اور پسند آیا۔ فلم ساز میں سام کی کہانی پر مبنی۔ لکھنے والے کا شغف زیر صاحب ہیں تو کیا یہ ان کی کوئی پرانی تحریر ہے (جی ہاں، سہلگ نہیں اپنی تھی) ویسے جس حراس خیر باب کے زندگی جیت گئی۔ ”سر جھانگل“ چھوٹی چھوٹی مکر معلوماتی تحریریں ہیں۔ ابھی ہیں لیکن ”زندگی جیت گئی“ میں لکھا ہے کہ درج حرارت منفی 18 ہے لیکن سمندر کی سطح جی نہیں بلکہ مٹی رانی کے لیے ٹھیک ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ مفر درج حرارت پرانی برف بن جاتا ہے۔ ”نام والی تحریر میں لکھا ہے کہ آج 2006ء کی تحریر ہے جو مکی ہوئی تھی۔) سدرہ بانو ناگوری، اختر علی، اختر شاہ کے شعرا اچھے لگے۔ ”پیش کو“ میں فانی بدایونی صاحب کے مختصر مگر جامع حالات زندگی کا پتا چلا۔ معراج رسول صاحب کی دانت، زبان والی مثال گہرے معانی رکھتی ہے۔“

☆ جینا کا شکوہ کراچی سے۔ ”کافی عرصے سے آپ کے رسالے کی قاری ہوں۔ خود بھی شوقیہ لکھتی تھی مگر کچھ حالات کی وجہ سے کافی عرصہ سے لکھنے سے دور ہوں۔ اب بہت دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ لکھ کر ادیبوں کی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑوں سوا یک کوشش کی ہے یہ کہانی حرف بہ حرف لکھی ہے (کہانی پڑھ کر فیصلے آگاہ کر دیا جائے گا)۔“

☆ شاہد نقوی کا تبصرہ کراچی سے۔ ”پہلے تو میری طرف سے بدیہ تہنیت قبول فرمائیے کہ آپ کی زبرداریت شائع ہونے والے ڈائجسٹ مختلف موضوعات اور دلچسپی کا سامان لیے ہوتے ہیں جو پڑھنا اس دور میں کہ جہاں کتب بنی قصبہ پاریہ ہوتی جا رہی ہے۔ رعب کا سامان ہیں۔ توجہ اس امر کی طرف دلائے متقدم ہے کہ جہاں ہم عمارت بہترین اشاعت لیے قاری پر اپنا اعتماد قائم کر لیں تو ہیں ڈراما، غلطی، ایک آدھ قسم قاری اور ادارے کے درمیان رشتے میں دراڑ ڈال دیتا ہے۔ اس ایک آدھ سال میں کئی مواقع ایسے تھے کہ جی چاہتا تھا احساس دلاتا چلوں لیکن اپنی کوتاہیوں مصروفیات میں ممکن نہ ہو سکا۔ آج سب سے کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ آپ اسے تنقید نہیں توجہ کے مترادف سمجھیں گے۔ مئی 2017ء کا شمارہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ مضمون ”بھوان“ ”کیا تیرا بھوتا“ میں جتنا مجھ شیرازم طراز ہیں۔ ”ایک اور جوان موت“ شاہان کی ہوئی تھی۔ بابر نام کے ایک نوجوان سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ کراچی سے حیدر آباد جاتے ہوئے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس حادثے میں دونوں ہی کا انتقال ہو گیا۔“ جناب کی توجہ چاہتا ہوں کہ بابر خان ایک اداکار ہے اور وہ اس حادثے میں بچ گیا تھا۔ وہ بید حیات ہے (جی ہاں مجھ کا بہنو یا بابر کا نام چلا گیا تھا)۔ اسی طرح عبدالرؤف خالد ایک بیرو کریت تھے اور حادثاتی موت کے وقت ان کی عمر تقریباً 50 سال تھی جب کہ مضمون نگار نے نہ صرف ان کی عمر غلط لکھی بلکہ مرحوم کی شہرہ آفاق میریل ”انگاروادی“ کا ذکر بھی لکھا جس نے کشمیریوں اور غائب بھارتیوں کا پول کھول کر دنیا میں پھیل چادی تھی۔ اسی طرح اس اہم مضمون میں چند اہم نام ذکر سے محروم رہے جنہوں نے اگلے جہان میں منجلی سے لڑا بہت تھوڑے عرصے میں دھوم مچائی۔ مثال کے طور پر آئس جین کے جسے جوش صاحب نے نکلس کا خطاب دیا تھا۔ آئس نے کم عمری میں خودکشی کی تھی۔ رزاق راجو کہ جس کی نامتک نے تھیمز اور ٹی وی کے بڑے بڑے فنکاروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈیٹاکس کی بروقت ادائیگی پھر دیکھنے میں نہ آئی۔ اداکارہ طاہرہ نقوی جس نے سنجیدہ اداکاری کو نیا رنگ دیا اداکارہ خالدہ ریاست کہ رومی بانو کے ساتھ اس کی ویڈیو بکس پوتا انسٹی ٹیوٹ کے کورس کا حصہ ہے۔ اداکار حرام قاضی کی عمر مکی میں انتقال کر گئے۔ نامور فلمی کامیڈین منور ظریف بھی زیادہ عرصے زندہ نہ رہے اور بھی شخصیات ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس اہم مضمون کے لیے مفصل تحقیق کی ضرورت تھی۔“

☆ شاہد اقبال شاہد کا تجزیہ کراچی سے۔ ”ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد ”معبّر خیال“ میں داخل ہو رہا ہوں۔ یک مٹی مرکز شت میں اردو کے عظیم شاعر فانی بدایونی کے بارے میں پڑھا۔ غالب ان کی مکمل سرگزشت ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ لہذا محترم

ساجد احمد سے اس سلسلے میں گزارش ہے کہ قافی بدایونی کے بارے میں مفصل تحریر کریں (ہوجی ہے)۔ ادارے میں آپ نے زبان اور دانت کے حلق کو بڑے فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور کے سب سے بڑے نفسیات دان پچھنڈ فرانیڈ کی شخصیت پر محترم ڈاکٹر ساجد احمد نے اپنے کتب خانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے جو کہ انہی کا طرہ امتیاز ہے۔ غلام حسین عیمن نے تحریک پاکستان کے شعلہ بیان مقرر محمد بہادر خان کی سرگزشت تحریر کی جو کہ تاریخ پاکستان میں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے جانے جاتے ہیں اور جن کی تقریر کی فراہمی پانی پاکستان کا نام اہم بطور خاص کیا کرتے تھے۔ انور فربانے کوئلن اشارہ ندیم کی داستان لکھ کر ثابت کر دیا کہ ندیم واقعی سنہری ستارہ یعنی کوئلن اشارہ کے لقب کے قابل ہیں گو کہ اس سے قبل محترم انور فربانے دسمبر 1993ء میں ہنگامہ شادی کے نام سے نذیر بیک اور فرزانی کی خفیہ شادی کا احوال بیان کیا تھا اور جولائی 1992ء میں علی سفیان آفاقی مرحوم نے انوکھا اداکار میں نذیر بیک کی حالات زندگی بیان کی تھی اور اب زیر نظر شمارے میں اس الوکے اداکار کے بارے میں ایک بار پھر پڑھ کر کافی لطف آگیا۔ ایسی کوشش آئندہ بھی ہونی رہنا چاہیے۔ ”قلبی الف لیلہ“ کی کمی انور فربانہ احسن طریقے سے پوری کر رہے ہیں جس کے لیے وہ بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری ان سے گزارش ہے کہ ٹیلی ویژن کے مقبول مطلوبی پر پروگرام غلام مگر کے میزبان کے بارے میں بھی تفصیلاً لکھیں، جی ہاں میرا اشارہ طارق عزیز کی طرف ہے جو پاکستان ٹیلی ویژن کے پہلے ناؤ نسیمی تھے اور میری پسندیدہ ترین شخصیت بھی۔ میں نے ان کے متعدد پروگراموں میں شرکت کی جن کی ریکارڈنگز اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مٹی محبوب عالم کے چہرہ اخبار کے بارے میں کھیل مدہ ملی کی نو بہادر نے اپنا دل اور ہمہ گیر کے اس سفر و اخبار کے بارے میں معلومات سے بہرہ مند ہوئے۔ دنیا کے مختلف مذاہب کے بارے میں اسلام، ہندو، عیسائی، زرتشتی، الہی، ہس سے ہیں مختلف ازم کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ ”ہاپ کے بغیر“ میں کشمیر نے ان لوگوں کے متعلق بتا دیں۔ اس سے ہاپ کا مابین میں انہ کا گمان کے کارنامے راقی اہم ایک بار کھے جائیں گے جن میں سرپرست حسین انسانیت ضرور اکرم ہیں جن کی عظمت سے کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ ”وہاں سے نور“، ”پہلے کچھ نامہ ساروج کو ایل دکھانا ہے۔ ایاز راہی نے ”سرجا چکل“ میں قوی ترانے کی مین کے خالق کے بارے میں گراں قدر معلومات ہم پہنچائیں۔ ”ناسور“ کا نظارہ انداز کر کے جی بکائیوں کی جانب بڑھ گیا کیونکہ قسط وار سلسلے سے مجھے بھی بھی دلچسپی نہیں رہی۔ میرے خیال میں اس سرچ جی بکائیوں میں پہلے بکر پر متقول سامی، دوسرے نمبر پر نقب اور تیسرے نمبر پر بدنگان رہی۔ ویسے اپنا اپنا خیال ہے میری اس ترتیب سے دوسروں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ موجودہ شمارے میں آپ نے ”خاص نمبر کا“ شائع کرنے کا بھی عندیہ دیا ہے۔ میں اس شمارے کے لیے جان کھیں گے کہ بارے میں لکھ رہا ہوں۔ جس نے صرف 26 سال کی عمر پائی اور گریزی ادب میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا (ان پر تحریر موصول ہوگئی ہے)۔ مجھے اُمید ہے کہ سرگزشت کے دیگر خاص نمبروں کی طرح ”یہ نمبر“ بھی ایک یادگار دستاویز ثابت ہوگا۔“

☆ محمد ایاز راہی کی خیال آفرینی ہمسہرے۔ ”اک عمر سے بعد دوستوں نے یاد کیا تو حاضر ہوں۔ پہلے سرگزشت کا ذکر ہو جائے۔ ماہ نامہ سرگزشت اس کھنے سادہ یا پتھیل کی مانند ہے جہاں ہر ماہ گاؤں (Global Village) کی چوٹی چلتی ہے اور جس کے سامنے تلے خاص دعاء بھی ہم کلام ہوتے ہیں۔ سرچ مدیر سرگزشت ہی ہوتے ہیں جو سب کو برابر توجہ دیتے ہیں خواہ وہ مدعو گھمٹانی ہو یا بندہ صحرائی و میدانی۔ یقیناً سرگزشت ایک علمی اور ادبی پرچہ ہے جو ہر خاص و عام کا محبوب ہے، وہ محبوب جس کا باقاعدہ انتظار کیا جاتا ہے جس کی ہر ہر ادا (تحریر) کو سراہا جاتا ہے، نہ صرف حواری بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں بھی اسے بھرپور پذیرائی ملتی ہے اور یہ سب مدیر سرگزشت کی کوشش اور تیشہ آزاری کا ثل ہے کہ سرگزشت جوئے شیر کی مانند ہر پیا سے کویرا ب کرتا ہے۔ اس علمی، ادبی اور حواری چوٹی میں مجھ جیسا اناڑی بھی کچھ نہ کچھ کہہ کے داد یا تا اور جوش و جذبے سے سرفراز ہوتا ہے۔ اس ہاشمہ خیال کے جن دوستوں نے مجھ کو تیار کیا اللہ انہیں تادیر سلامت اور خوش حال رکھے (آمین)۔

☆ کوگی (کراچی) کے آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب! یاد آوری کا از حد شکر ہے۔ میں تواب بھی شہر خیال کا مستقل باشندہ ہوں۔ عرض کیا تا کہ کبھی بھاری کوئی بات کر جاتا ہوں ورنہ تو میرے مضامین مدیر سرگزشت کی کمال توجہ سے لکھتے ہی رہتے ہیں۔ میں ایک ضرور آدمی ہوں تم روزگار اور تم جاناں دونوں ہی کندھوں پہ سوار رہتے ہیں۔ ایک سے انکار تو دوسرے سے راہ فراموش نہیں۔ اُمید ہے آپ سب اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں گے کہ یہی حاصل ہے۔ مہورہ (مخ جنگ) کے نزابت افشاں صاحب! آپ کی مثبت تنقید نے دل میں ضد و کڑی ڈال دی۔ یقیناً مضمون کے بہاد میں جملہ قسط بندہ گیا۔ فیض احمد فیض مرحوم یاد آگئے ایک بار شاعرے میں انہوں نے اپنا شعر پڑھا کہ اب بھار آئی ہے اس طرح کہ جیسے قاصد کوچہ یار سے بے نسل و دماغ آتا ہے۔ تو سامعین میں سے کسی نے اٹھ کے کہا کہ ”حضرت! درست ترکیب، بے نسل مرام ہے۔ فیض نے مسکرا کر تسلیم تم کر دیا۔ نزابت جی! اردو سے مجھے عشق ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ”آتی ہے اردو زبان آتے آتے“ پھان ہوں ناں معاف کر دیجئے گا۔ راحت و فارا جوت صاحب! ایش بہ نذر۔ آپ کا غلام ناہ۔ ناہین (کراچی) میں میرا پہلا افسانہ عین سکھ۔ پڑھ کے تبصرہ بھی کر چکی ہیں۔ کراچی کی بہن سدرہ بانو ناگوری بھی یاد کر لیں ہیں پشاور کے انور اعجاز صاحب، پورے والا کے رانا محمد شاہد صاحب، بہاولپور کی بختری افضل صاحبہ اور خصوصاً وحید ریاست بھی صاحب۔

کا شکر گزار اور دعا گو ہوں۔ ہاں البتہ میرے علاقے شہر ہمسہ کے علی زمان مغل، وزیر خان (مغل) ذوالفقار احمد دانش اور دیگر ساتھی محرمہ سے مسلسل چپ ہیں شاید دنیا کے تکبیزوں نے جکڑ رکھا ہے انہیں۔ بہر حال کسی سے کوئی گنہ نہیں۔ سرگزشت کی باتیں سب کے لیے وائیں اور ہمیشہ رہیں گی۔“

✽ سعید احمد چاندراچی سے رفقہ از ہیں۔ ”پرچملا۔ سروقہ پند آیا۔ شاعر شاہی امیر خسرو کے بارے میں پڑھا۔ معراج رسول صاحب کا ادارہ پڑھا۔ ایک بات میں آپ کے گوش گزار کرتا چاہتا ہوں کہ پچھلے دنوں ایک نیٹ میں ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میرا سیدھا تھوڑی سی گمیا تھا۔ اس لیے تحریر میں صفائی نہیں ہے، معذرت خواہ ہوں۔ ”عصر خیال“ کے جن دوستوں کے ہنرے پند آئے ان میں اعجاز احمد ستار، عبدالبجاری، ملک شادخانی، غلام حسین فیاض، رانا محمد شاہد، انور عباس شاہ، محمد عمران خان، عریضہ، آفتاب احمد نصیر اشرفی، منشی عزیز مئے، انجم فاروق ساحلی، فیض ادیب شامل ہیں۔ انم اے راحت صاحب کے لیے دعا گو ہوں اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطایت فرمائے، (آمین)۔ (ابھی ابھی سعید احمد چاند کے صاحبزادے محمد انیس اختر نے فون پر اطلاع دی ہے کہ سعید چاند اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے۔ تمام احباب سے درخواست ہے کہ ایک مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر انہیں بخش دیں۔“

✽ اعجاز حسین ستھار نور پور قریل سے لکھتے ہیں۔ ”ایک بار پھر محکمہ ڈاک نے روائیہ کا کردگی سے دوستوں کی محفل سے دور کر دیا۔ تمام پابندیوں سے بالاتر ہو کر تفصیل سے تیرہ لکھا تھا۔ اب رونے پینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ سرفری تیار کرتے ہیں۔ سید امتیاز حسین بخاری مدت بعد تشریف لائے ہیں۔ منشی محمد عزیز مئے، عمران ذیلی ناہار اور ہنر کے تمام شرماء کو پڑی ہوئے کے ناٹے خوش آمدید کہوں۔ بس روپینہ نفس انصاری کی کمی رہ گئی ہے۔ ”مولانا استاد“ میں ندیم کے مرزا نذیر بیگ سے شروع کیے گئے سفر کا احوال پڑھا جس میں محنت کے ساتھ ان کی خوش قسمتی کا بڑا حصہ رہا اور وہ سدا بہار ہیر دین کر پاستانی عوام کے لیے قابل فخر بن گئے۔ ”اوندمی ہستی“ کا شکار لطیف کا سفر دشوار گزار اور خطرات سے مبرا تھا لیکن مجھے خاص دلچسپ نہ لگا۔ ”شمشال سے نورنٹ“ میں ندیم اقبال کپسول کی وجہ سے پھنسے اور پریشانی الگ اٹھانا پڑی لیکن مجھے یہ معاملہ حاصل دل بھانے والا لگا۔ انہوں نے خود اعتمادی سے سامنا کیا ہے۔ اس لیے صاف نکل آئیں۔ لیکن کبھی سے خبری میں کتنی مشکلات کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ”ناسور“ اب مکمل توجہ حاصل کر چکی ہے تمام کردار اپنے چہروں کے ساتھ سامنے آچکے ہیں۔ بیچ بیچوں میں ”نقب“ میں ماسک کو اس کی بیوی نے جیسی چوٹ دی ہے امید ہے وہ باقی زندگی سنبھل کر اور تھلا لے ہوئے گزارے گا لیکن جیسا سابق اٹلا دیتا جا ہی تھی یہ راستہ ہی غلط تھا۔ ایسے معاملات پر مردان بچا کر صاف بیچ جاتا ہے اور عورت کی ذات شک کی زد میں آ جاتی ہے۔ ”مستقل سامتی“ میں کئی جھول ہیں واقعات حقیقت اور قانون سے بے محاذ ہیں۔ مقبول کو چھ سال سزا ہوئی حالانکہ چوری کی دفعات میں انتہائی سزا کم ہے جب وہ عدالت سے سزا یافتہ ہو کر اپنی سزا بھگت رہے تھے تو مقدمات، الزامات اور دفعات کیسے بدل گئیں اور سزا میں کمی کی پیش ہوئی ایسے میں تو وکیل کیس کی بنیادیں ہی ہلا دے اور اپنے موکل کو صاف بری کرالے۔ یہاں عدالتی کارروائی کو بچوں کا کھیل بنادیا گیا ہے۔ ”راکب نمبر“ میں کاشف کا قسمت نے ساتھ نہ دیا وہ زندگی بھر کے لیے سزاوار بن گیا۔ ”بدگمان“ میں وردہ خان ذرہ برابر قصور وار نہیں ہیں ایسے پر اسرار حالات میں ہر ذہن میں شک کا کیڑا اگلنے لگتا ہے اور ایسا منظر باپ، بھائی اور شوہر دیکھ لے تو نوبت کارکنائی بلکہ قتل تک آ جاتی ہے۔ طیش کے وقت عقل ساتھ چھوڑ دیتی ہے لوگ آنکھوں دیکھی اور کانوں سننے پر اعتبار کر کے اپنی اور دوسروں کی زندگی جہنم بنا دیتے ہیں۔ ”ناگن“ کے واقعات افسوس ناک ہیں لیکن پیش کرنے کا انداز مضحکہ خیز ہے اگر کیا یہ طرز پر لکھی جاتی تو درد ناک حالات اصل حقیقت کے ساتھ سامنے آکر ہمدردی کے جذبات کو جگا دیتے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ عورت ناگن ہے تو بھی مرد بھی ایسا کو برا بن جاتا ہے کہ ڈس لے تو دوسرا سانس بھی لینا نصیب میں نہیں ہوتا۔ بس یوں کہیں کہ اپنی اپنی فطرت کی بات ہے پوری صنف کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ ”سونا ڈبل“ میں عذرا کو لا لالچ اور بھولپن میں نقصان اٹھانا پڑا حالانکہ نیک سالوں سے ایسے واقعات اخبارات، رسائل اور میڈیا کی زینت بنتے رہے ہیں۔ بھڑکی کوئی ایسے حالات کا شکار ہوگا تو اس کی عقل پر ماتم کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے۔ ”ادھر اور رشتہ“ میں شاہن کو میں قصور وار نہیں سمجھتا۔ سارا کھیل ہی قسمت کا ہے اس نے گھر کی جگہ جگ سے نکل آکر حافیت کا گوشہ تلاش کیا۔ دنیاوی اور شرعی تقاضے جھائے اگر سکندر نے دھوکا کیا ہے تو اللہ کی عدالت میں وہی جواب دہ ہے۔ شاہن گھر بسانے والی اور وفا دار عورت ہے۔ سکندر کے بعد کسی دوسرے مرد کی طرف نہ دیکھا لیکن اگر مرد کے دل میں چور ہو تو عورت کیسے کھوج لگا سکتی ہے اب اس کا ذہنی رجحان اور سکندر سے پہلو تکی نیک فطرت ہونے کی دلالت کرتی ہے۔ ”شریک سبز“ میں مدد عظیم انسان ہے جس نے خیر غم کا کردار سامنے ہونے کے باوجود شریک سبز بنالیا۔ وہ جوان، بقول صورت اور ہاؤز گار تھا بھلا لڑکیوں کی کیا کمی تھی والدین کا بھرم رکھنے اور احسان اتارنے والے اعلیٰ ظرف جوان کم ہی ملیں گے۔ ”نجات“ میں ہمارے اندر سے اعتقاد، کمزور ایمان اور بشری کمزوریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ سب ہمارے ارد گرد کے مناظر ہیں، ہم بھی کہیں کم کہیں زیادہ کردار

رکتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں زہریں اور تباہی کا سامان آپ مہیا کریں تو کسی کی طرف شکوہ بھری نظر سے دیکنا انصاف کے ذمے میں نہیں آتا۔ زویا اعجاز نے بھلائی کا حق ادا کر دیا ہے لیکن ہم نے سماعت سے بچتا ہے تو آج سے غور و فکر کرنی ہوگی۔“

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے۔ ”بڑی خوشی ہوئی کہ میرا خط شائع ہوا۔ شوکت علی فانی بدایونی پیش کو کا ایک مٹھی تعارف خوب سے خوب تھا۔ ”عمر خیال“ میں سب خطوط اچھے تھے اور تیرہ خوب تھا۔ نفسیات دان ڈاکٹر ساجد احمد لکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ ان کے قلم میں رویا کی سی روانی ہے اور خوب جادو بیانی ہے۔ ”نواب سابعی“ غلام حسین یمن کی ایک مطبوعات افزا اور یادگار تحریر ہے۔ ماہ اگست کے شمارے میں یہ مضمون یوم آزادی کا ماحول تھوڑے۔ ”دلچپ رویا نیتیں“ دانہ صدیقی کی منفرد پیشکش تھی، پسند آئی۔ قلم نگری میں ”مولانا اسرار“ اور فرہاد کی تحریر سب سے زیادہ منفرد اور دلکش تھی جس نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ انور فرہانے اداکار ندیم کی زندگی کا گوشہ گوشہ نگاہ میں بند کر دیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ”روزنامہ صبر“ اخبار لکھل صدیقی کا ایک تاریخی اور معلوماتی مضمون ہے۔ فشی محبوب عالم کے نام سے تو ساری دنیا متحارف ہے اور ان کی صحافتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ”ازم“ منظر امام کی حراش سے لبریز عمدہ تحریر ہے اور کافی حد تک معلوماتی ہے۔ ”ادو عمی ہستی“ شاہد لطیف کی بھرپور تحریر ہے۔ معلومات میں اضافہ ہوا۔ ”ششال سے نورنو“ ندیم اقبال کی ہر قسط کا جواب ہے پڑھنے میں بے حد لطف آتا ہے۔ ”زندگی جیت گئی“ فرزانہ جعفر کی زبردست تحریر تھی، پڑھ کر بہت لطف آیا۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا فرمان مقدس ہے ”موت زندگی کی محافظ ہے“ لاکھوں امام ہیں۔ انیس۔ اللہ والہ۔ لہ۔ امیں۔ اللہ کو ہاں ملیں۔ سب تک زندگی ہے کوئی حادثہ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔ ”نام“ عائشہ انور کی خوب صورت اور معلوماتی تحریر ہے۔ ”آغا شہزاد میری لے لیک“ کہا تھا اور نام نور جہاں رکھ دیا جو آج ملکہ زہرا نور جہاں کے نام سے عالمی سطح پر معروف ہے۔ ”سر جھانگل“ ایاز راہی کی تحریر بھی سب سے منفرد اور بے مثل تھی احمد علی چھاگہ ایک منفرد و عظیم موسیقار تھے۔ جس طرح خواجہ خورشید انور تھے۔ ”نقب“ انیل کی واقعی عمدہ تحریر تھی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ دوسروں کو بھی غور و فکر کرنا چاہیے۔ کہانیوں میں سب سے زیادہ موثر اور بہترین کہانی ”سجات“ زویا اعجاز کی تھی۔ اس میں جھلی جیروں کا پردہ فاش کیا گیا جو تصوف کی آؤ میں اپنا تپا پاک و حننا جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ”بیت بازی“ میں اشعار معیاری تھے۔ اقتباسات بھی کافی معلوماتی اور حوصلہ افزا تھے۔ میری طرف سے آپ کو خصوصی دعا و سلام، انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گے۔“

☆ بشری افضل کی تشریف آوری بہاولپور سے۔ ”کچھ عرصے کے لیے ہم سرگزشت سے بچھڑ گئے تھے۔ مصروفیت نے لکھنے کی فرصت نہ دی کہ ہم اس کو پڑھتے ضرور رہے مگر نہ نہ سکے۔ دیر سے حاضری کی معافی کی طلب گار ہوں۔ اگلے نے بڑی خوب صورت بات کی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اب ہم ”عمر خیال“ میں داخل ہو چکے ہیں۔ السلام علیکم تمام ساتھیوں کو سوائے ایک ساتھی کے جس نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ وہ ساتھی ہیں محمد سلیم قیصر۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ رانا محمد شاہد کرسی صدارت پر براجمان تھے، مبارکباد۔ تیرہ واقعی قابل حسین تھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تمبرہ بھی خوب صورت تھا۔ اریشہ محمد عمران خان، سید امتیاز حسین، فشی محمد عزیز نے، ودادی واہ ہمارے شہر کے وکیل عظیم الدینی اس محفل میں براجمان ہیں۔ ہمارے شہر کا اللہ نظر بد سے بچائے (آمین)۔ پہلی کہانی ”نقیب“ پڑھی کہانی خوب صورت انداز لیے ہوئے تھی۔ انیل نے اپنی دوست کا ساتھ دیا اور خود کو بھی بچائے رکھا۔ خدا نے اس کا نام رکھ لیا۔ نور جہاں کا ”نام“ ہمیں اس مختصر صفے پر معلوم ہوا۔ ”سونا ذلیل“ اس طرح کے واقعات بہت سے لوگوں کے ساتھ پیش آئے۔“

☆ حنیف ادیب لاہور سے لکھتے ہیں۔ ”سرگزشت لے کر آیا تو سب سے پہلا کام جو کیا وہ رسالے کی ورق گردانی کا تھا اور سب سے پہلی ترجیح وہی پہلا مضمون تھا جس پر آپ کسی نہ کسی شخصیت کے تعلق بیان کرتے ہیں اور پھر وہی جی ہاں! آپ ٹھیک مجھے نورنو کا سفر نامہ کہ جس نے قارئین کو ایک محور کن حرم میں بٹھ کر رکھا ہے کہ پڑے بغیر چین نہیں آتا۔ اس بار بھی ناشاء اللہ ندیم صاحب کے قلم نے وہ جو ہر دکھائے کہ رہے نام اللہ کا۔ ”سری“ کا دلچپ اور دلکش کردار کہ بھلا لگتا تھا کہ اب مطب اللہ خان نے بھی اپنی جانب قارئین کی آنکھوں کا رخ کر رکھا ہے اور انکھیں ہیں کہ اس چہرے سے بٹھنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ مگر کومنٹ بنا کر پیش کرنا ان کے ہاں کتاہ کا کھیل ہے۔ ہمارے اکثر خان بھائیوں کی بول چال ایسی ہوتی ہے کہ نہ چاہے ہوئے بھی وہ اردو زبان کی ایسی سرجی کر دیتے ہیں کہ سننے والے کے کان میں رس گھول دیں اور مسکراہٹ بے اختیار لبوں پر آجائے۔ شہباز کا ”سیا“ بھی کچھ کم حریف انہیں اور چٹاڑوں سے بچتا ہوتا ہے۔ اقبال ندیم کا یہ سفر نامہ ان کے دلکش اور دلچسپ انداز بیان اور الفاظ کی جج و جج کے باعث کسی سمجھے ہوئے انشا پر داز کی تحریر لگتی ہے۔ اس کا پڑھنا والا اس وقت دم لیتا ہے جب قسط ختم ہوتی ہے۔“

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

اعظمی، کوثر پروین، اختر الجیری، نشاط خان، کراچی۔ ناہیدہ یا یمن، عباس یضوی، لاہور۔ زاہد حسین، فیصل آباد۔ خورشید ناہاری، بہلم
الغاس علی سہ، ملتان۔

متنبی

ضیاء تسنیم بلگرامی

حضور اکرمؐ نے صاف لفظوں میں احکام خداوندی سنا دیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا لیکن اس شاعر نے جو خطہ عرب میں یکتا تھا، جس کے اشعار زبان زد عام تھے جسے امرا و حاکم سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ جس کے اشعار کے دلدادہ اک دنیا تھی، بادشاہان بھی اس کے اشعار سے لرزتے تھے کہ کہیں وہ اس کی بچو نہ کہہ دے وہی ایک معمولی ڈاکو سے شکست کھا گیا۔ لوگوں نے سنا تو بے ساختہ کہہ اٹھے کہ اس کی موت خدا کا عذاب ہے، اس کے گناہوں کی سزا ہے۔

عرب کے ایک بہت بڑے شاعر کے عبرت ناک انجام کی کتھا

کوفے میں زندہ نامی ایک محلہ تھا۔ یہاں 303ھ (915 عیسوی) میں حسین نامی ایک بھتیجے کے گھر میں بیٹا پیدا ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام احمد رکھا۔ یہ کوئی خوش حال گھرانہ نہیں تھا لیکن حسین کا تعلق عرب خاندان سے تھا اور اسے شرفاء میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے ہاں بیٹے کی پیدائش ہوئی تو اس کو بڑی خوشی ہوئی۔

اسی محلے میں ایک کتب تھا اور اس کتب میں شرفائے



کونڈ کی اولاد تعلیم پاتی تھیں۔

جنتی بہت خود پسند اور جاہ طلب واقع ہوا تھا جبکہ اس نے ہوش سنبھالنے ہی اپنے غریب گھرانے کو دیکھا تھا اس کا باپ ستا گیری کرتا تھا حالانکہ ان کے معاشرے میں پیشے کی وجہ سے عزت یا ذلت نہیں ملتی تھی بلکہ انہیں اگر خاندانی نجابت اور شرافت میسر ہوتی تو وہ شریف گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح معمولی حقیر سا پیشہ ان کی شرافت کو داغ دار نہیں کر سکتا تھا۔

جنتی نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کی غربت اور افلاس کو دیکھ کر اسے شرمندگی اور عداوت محسوس ہوتی رہی۔ جنتی کو اپنے باپ کا اس طرح محلے کے گھروں میں جانا پسند نہیں تھا۔ وہ لوگوں پر حکومت کرنے کی خواہش رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔

خانہ بدوشوں میں بھی وہ حکومت کرنے کا قائل رہا اور یہی چاہتا تھا کہ لوگ اس کا حکم مانیں اور وہ اپنے آس پاس کے لوگوں اور اپنے ماحول پر حکومت کرے۔

سادہ کے صحرائیں جو قبیلے آباد تھے۔ جنتی ان میں خاصا مشہور ہو چکا تھا اور لوگ اس کے کلام کو بڑے بڑے شاعروں کے کلام پر ترجیح دیتے تھے اور وہ جنتی سے اس لیے بھی خوش رہتے تھے کہ جنتی ان میں رہتا تھا اور اس کی وجہ سے یہاں کے قبائل کو بڑی عزت اور فضیلت حاصل ہو گئی تھی۔

جنتی اپنی شاعری پر بھرپور توجہ دیتا رہا۔ مضمون آفرینی پر اس کی خاص توجہ رہتی اور وہ دوسرے شاعروں کو کمتر سمجھنے لگا تھا۔

اس کے دل و دماغ شب و روز ای غور و فکر میں گئے رہتے کہ ایک نامور انسان بہتوں کو اپنی پیروی کرنے پر کس طرح آمادہ کر لیتا ہے اور ایک بڑا آدمی خود کو کس طرح بڑا قرار دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے خلفا تھے اور نبیوں کے بارے میں بھی وہ غور و فکر میں لگا رہتا اور ان دونوں میں جو خصوصیات اور اوصاف جنتی کو نظر آئے ان میں سے ایک یہ وصف اور خوبی پائی جاتی تھی کہ ان کا تعلق عرب کے مشہور خاندانوں سے تھا۔ خلفائے خواہم بھی اپنی خاندانی سادت کی وجہ سے دوسروں پر حاوی آگئے تھے اور ان کے تابعی گرامی عامل اور بڑے عہدے دار بھی اس لیے کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ بہترین اثاثہ پرداز ہونے کے ساتھ بہت اچھے شاعر یا بہت اچھے مقرر یا خطیب ہوتے تھے۔

بچہ محبت و شفقت سے پرورش پاتا رہا اور جیسے ہی اس نے شعور سنبھالا باپ نے اس کو محلے کے اسی کتب میں داخل کر دیا۔ یہ بچہ انتہائی لگن اور محنت سے تعلیم پانے لگا۔

اس زمانے کے مدرسوں میں عموماً ادب شاعری اور لغت کی تعلیم دی جاتی تھی چنانچہ احمد نامی اس بچے نے بھی مذکورہ موضوعات میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی بعد میں اس بچے نے اپنے اصل نام کے بجائے اپنے تخلص سے شہرت حاصل کی اور آگے چل کر اس بچے نے کنیت ابو طیب اور تخلص جنتی اختیار کیا اور اپنے اسی تخلص سے شہرت پائی۔

عربوں میں یہ رسم تھی کہ جب ان کا بیٹا لائق تربیت ہو جاتا تھا تو وہ اسے خانہ بدوشوں میں پہنچا دیتے اور وہ ان کی دلیری، آزادی اور زور و قہر پر جیسی خصوصیات اور اوصاف حاصل کر لیتے۔ زبان والی بھی انہی بدوی قبائل میں رہنے سے آجاتی تھی۔

جنتی نے چند سال اپنے محلے کے کتب میں تعلیم پائی تھی اور کتب سے اسے بہت کچھ حاصل ہوا تھا مگر جنتی کا باپ کتب کی تعلیم سے زیادہ مطمئن نہیں تھا وہ اپنے بیٹے کو خانہ بدوشوں میں چھوڑ دینا چاہتا تھا لیکن بیٹے کی محبت اسے کچھ عرصہ روکے رہی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے جنتی کے ساتھ خود بھی خانہ بدوشوں میں رہے گا چنانچہ وہ بیٹے کو لے کر خانہ بدوشوں میں پہنچ گیا۔

یہ خانہ بدوش عرب بھی ایسے لڑکوں سے بہت خوش ہوتے تھے اور نہایت محبت اور لگن سے ایسے بچوں کی تربیت کرتے تھے چنانچہ جنتی کو ان لوگوں نے نہایت خوشی سے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ یہ لوگ بھی یہاں ہوتے بھی وہاں، ان کا زیادہ وقت سفری میں گزرتا تھا۔

جنتی کا باپ اس کو بدوؤں میں آزادی اور دلیری کی تربیت میں مشغول دیکھتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی ایسا لگتا جیسے جنتی کو بدوؤں کی روش اختیار کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔ خانہ بدوشوں میں جو بچے پہلے سے زیر تربیت تھے جنتی ان پر آسانی سے حاوی ہو جاتا۔ یہیں اس نے شاعری بھی شروع کر دی اور خانہ بدوش اس کی شاعری سے بہت لطف اندوز ہوتے۔

آہستہ آہستہ اس کی شاعری کا چرچا خانہ بدوشوں سے نکل کر شہروں تک جا پہنچا۔

جنتی میں شاعرانہ برتری اور عظمت موجود تھی اور وہ اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر قبضہ کر سکتا تھا۔

خلیفہ کے علاوہ بیوں کے احوال پر غور کیا تو وہاں بھی اسے یہی خوبی نمایاں نظر آئی کہ نبی اپنے دلکش کلام کی وجہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ کر لیتے تھے۔ اسے اپنی شاعری پر ناز تھا اور سادہ کے قائل نے بھی جنتی کی شاعرانہ عظمت اور برتری کو دل سے تسلیم کر لیا تھا۔

جنتی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ خانہ بدوشوں کو جمع کر کے اپنے کلام سے محفوظ کرتا اور سننے والے بھی اس کے کلام کی دل کی گہرائیوں سے داد دیتے۔ اس کے جوار اور اسے جھے ان ۔۔۔ وہ لوگ واقف تھا لیکن سادہ کے قہیلے والے انہی لے اراہوں سے واقف نہیں تھے۔ ذہین اور چالاک انہی سادہ لوح قبائلیوں کے مزاج اور دل و دماغ کا اپنی معین نظروں سے جائزہ لیتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا جو عظیم تر منصوبہ ہے اگر وہ ان قہیلے والوں پر ظاہر کر دے تو کیا یہ سادہ لوح لوگ اس کے دعوے کو مان لیں گے۔

اس نے کچھ عرصے بعد یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی شاعری نے سادہ کے قبائلیوں کے دل و دماغ کو مخر کر لیا ہے، اب اگر وہ ان سب کے سامنے کوئی غیر معمولی دعویٰ کرے گا تو یہ لوگ اسے دل و جان سے قبول کر لیں گے۔

شام ہوئی اور قہیلے کے ہر عمر کے لوگ اسے گھیر کر بیٹھ جاتے اور اس سے کلام سنانے کی فرمائش کرتے اور جنتی نہایت جوش و خروش سے اپنا کلام سنانا اور سننے والوں سے داد اور تحسین وصول کرتا۔

اب جنتی کو اندازہ ہوا کہ اگر وہ اپنے ان عقیدت مندوں میں کوئی غیر معمولی دعویٰ کرے گا تو یہ بھولے بھالے سادہ لوح قبائلی اسے قبول کر لیں گے لیکن اس کے دعوے کو صرف قبول کر لینا اس کے لیے سودمند بات نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چاہ طلب اور ثروت پسند شاعر تھا جس نے غربت، حسرت اور افلاس میں آنکھ کھولی تھی اس کا باپ لوگوں کے گھروں میں پانی پہنچا کر روزی کما تا تھا اسی لیے اس کے باپ کی کوفے میں عزت نہیں تھی۔ خاندانی نجابت اس کے بھی کام نہیں آئی اب وہ زمانے بھر کے لوگوں میں لہاں رہ کے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ لوگوں کے دل و دماغ پر اتنا شدید اثر ڈالنا چاہتا تھا کہ اس کے ماننے والے اس کے لیے جانیں قربان کر دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ وہ پھر عرصہ لوگوں کو اپنی شاعری سے متاثر کرتا رہا اور

آخر کار ایک دن اس نے غیر معمولی حوصلے سے کام لے کر لوگوں کو بتایا۔ ”میری شاعری اتنی غیر معمولی ہے کہ آج میرا اس محلے میں کوئی مد مقابل نہیں، لوگوں کا تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔“

لوگوں نے یہی جواب دیا کہ وہ عرب ہے اور اس کا باپ ہاشمی تھا اور اب جنتی عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

جنتی نے کہا۔ ”مجھے اپنی شاعری کے بارے میں تم سے زیادہ معلوم ہے۔ میں شاعر ہوں اور جو کچھ میں اپنے اشعار میں کہتا ہوں وہ میرا کلام نہیں کلام ربانی ہے۔“

سننے والوں نے اقرار کیا کہ بے شک جنتی کا کلام، کلام ربانی ہے کیونکہ اسے یہ غیر معمولی شاعرانہ لیاقت، قابلیت اور صلاحیت رب کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اس عہد میں دوسرا کوئی شاعر جنتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

جنتی اپنے سننے والوں کو جو باد کرانا چاہتا تھا یا ان کے دل و دماغ میں جو بات بٹھادینا چاہتا تھا وہ اس میں ابھی تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقصد کی حصول یابی کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا وہ جانتا تھا کہ یہ خانہ بدوش کی زندگی بسر کرنے والے لوگ بھی غیر معمولی عزت اور آسائش کے خواہش مند ہوں گے، یہ بھی اپنے زمانے میں نمایاں رہنا پسند کریں گے۔

جنتی نے کہا۔ ”تم لوگ سادہ میں خانہ بدوش کی زندگی بسر کرتے ہو جب کہ شہروں میں تمہارے ہی جیسے لوگ انجھا کی خوش حالی، آسودگی اور ناموری کی زندگی بسر کر رہے ہیں کیا تمہارے دلوں میں یہ خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی کہ تم بھی اس زمانے میں بلند مرتبہ حاصل کر لو۔“

ان لوگوں نے کہا، ہم یہیں بہت خوش ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ہمیں دربار خلافت سے کوئی نمایاں مقام نہیں مل سکتا۔ ہم خلافت کے ماحول کے پروردہ لوگ بھی نہیں ہیں۔ ہمارا دربار خلافت تک پہنچنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔“

جنتی نے کہا۔ ”آج جنہیں خلافت اور خلیفہ سے اعلیٰ مناصب اور عہدے حاصل ہیں یہ ماضی میں تمہارے ہی جیسے لوگ تھے اور یہ بھی تمہاری طرح خانہ بدوش کی زندگی گزارتے تھے مگر ان میں ان کی خوش قسمتی سے ایک نبی پیدا ہو گیا اور اس نبی نے اپنے بہت سے ماننے والے پیدا کر لیے اور آہستہ آہستہ نبی کے قریب رہنے والوں نے اور

پھر اس کے خاندان نے نبی کی رشتہ داری سے فائدے اٹھائے اور عباسی خلیفہ وجود میں آنے لگے۔ وہ کوئی خاص لوگ نہیں تھے مگر نبی سے ان کی رشتہ داری ان کے کام آئی اور ان چالاک لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان کے خلیفہ نے اپنی برتری بڑھانے اور قائم رکھنے کے لیے دنیا بھر کے لائق لوگوں سے کام لینا شروع کر دیا اور ان کی طاقت اور ضرورت میں اضافہ ہوتا رہا، تو چاہو تو تم بھی اسی طرح ترقی کر سکتے ہو تم بھی ایک نئی حکومت کو وجود میں لا سکتے ہو۔“

منتہی کی یہ عجیب و غریب سمجھ میں نہ آنے والی باتیں سننے والوں کے دل و دماغ میں بھجوان پیدا کرتی رہیں اور انہوں نے منتہی سے پوچھا۔ ”ہماری سمجھ میں تیری صرف اتنی سی بات آئی ہے کہ آج جو لوگ خلیفہ بنے بیٹھے ہیں، ان کا تعلق نبی کے خاندان سے ہے لیکن آج ہمارے زمانے میں تو کوئی نبی بھی نہیں جس کی ہم خدمت کریں اور ہمیں بلند و بالا مقام حاصل ہو۔“

منتہی نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ نبی کی 23 سالہ جدوجہد سے واقف ہو؟“

کئی بزرگوں نے جواب دیا۔ ”بہت اچھی طرح۔“
منتہی نے کہا۔ ”میں بھی تمہیں اسی راستے پر ڈال سکتا ہوں اور تم بھی ایک طاقت ور حکومت کے قیام میں میری مدد کر سکتے ہو مگر ابھی میں اپنے ارادے اپنے مقصد اور اپنے مستقبل کے منصوبے کے بارے میں کل کے تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

سننے والوں نے کہا۔ ”واہ جناب! یہ کیا بات ہوئی ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ تو جو کہے گا ہم وہ کریں گے اور اگر ہم سے طاقت ور حکومت وجود میں آسکتی ہے تو ہم اسے وجود میں لانے کے لیے بے قرار ہیں۔“

منتہی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”دوستو، بھائیو اور بزرگوں میں تم سے جاں فروشی کا مطالبہ کروں گا، تمہیں اپنا عظیم الشان مقصد حاصل کرنے کے لیے اپنی جائیں قربان کر دینا ہوں گی۔ تم عصر حاضر کی طاقت ور ترین حکومت سے ٹکرو گے، اگر تم نے میری پیروی کی اور میری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔“

قبائلی بزرگوں میں سے ایک نے جھنجھلائے لہجے میں کہا۔ ”اے منتہی! ہم سے اشاروں اور کنایوں میں باتیں

منت کر کیونکہ جب تک ہم تیرا پورا منصوبہ بن کر سمجھ نہ لیں اور یہ اندازہ نہ لگا لیں کہ اس سے ہم قبائلیوں کو کتنا فائدہ پہنچے گا ہم تیری پیروی کس طرح کریں گے، میں تو اسے جتنی سمجھ کر مشورہ دیتا ہوں کہ تو سادہ کے جملہ قبائل کو یہاں کے بڑے میدان میں جمع کر ہم تجھ کو ان سب سے اونچی جگہ پر بٹھادیں گے اور تو ان سب کو بلندی سے مخاطب کرے گا اور ان سب کو بتائے گا کہ تو کیا چاہتا ہے اور اگر ہم تیری ہدایات پر عمل کرتے رہے تو ہم بھی عباسی خلافت کی طرح ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈال دیں گے۔“

منتہی نے اس بزرگ کا یہ مشورہ قبول کیا اور کہا۔ ”اب یہ تم لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ تم مجھے جس طرح چاہو کسی اونچی جگہ پر بٹھا دو یا کھڑا کر دو، میں وہاں سے تم سب کو بتاؤں گا کہ میں کیا ہوں، کیا چاہتا ہوں اور تم کس طرح اپنے دے دینے میں نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، تو کو تم یقین نہیں کرو گے کہ میں تمہیں کتنی بلندی تک لے جانا چاہتا ہوں۔“

قبائلی باتوں نے سننے والوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا وہ اس عظیم شاعر سے بہت کچھ سمجھ چکے تھے اور مزید سمجھنا چاہتے تھے انہیں عباسی خلافت کے دبدبے کا جتنا حال معلوم تھا اس سے انہیں یہ اندازہ ہوا تھا کہ دنیا بھر میں ان سے زیادہ طاقت ور کوئی دوسری حکومت نہیں تھی اب اگر منتہی ان کے مقابلے پر سادہ والوں کے تعاون اور چال بازی سے کوئی بڑی حکومت قائم کرنے کا خواہاں ہے تو سادہ والوں کو اس کا ساتھ ضرور دینا چاہیے۔

اس ہجوم میں یہ بات تو طے پا چکی کہ اب اسی میدان میں سادہ کے تمام قبائل جمع ہوں گے اور منتہی کے لیے ایک اونچا تخت بنوایا جائے گا۔ اس پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر منتہی اپنے دل کی باتیں کہے گا اور پھر اس کی باتیں سب کی سمجھ میں آئیں گی منتہی عباسیوں کے مقابلے میں ایک نئی طاقت ور حکومت کی بنیاد ڈال دے گا۔

سامعین نے یہ ساری باتیں سادہ بھر میں پھیلا دیں اور منتہی کی عزت اور توقیر میں بہت اضافہ ہو گیا۔

اب لوگوں نے منتہی کو گھیرنا شروع کر دیا اور وہ اس کی دلچسپ اور خرد افروز باتیں سن کے دل و دماغ میں محفوظ کر لیتے اور انہیں دوسروں تک پہنچا دیتے۔

وقت مقررہ پر سادہ کے قبائلی میدان میں پہنچ گئے۔ انہوں نے منتہی کے لیے ایک اونچا تخت بچھا دیا تھا اور اس

تخت پر جیتی قالین اور شاہانہ انداز کے گاؤں کیے رکھ دیئے گئے۔ وہ جیتی تخت پر چڑھنے کے بعد بیٹھنے کے بجائے کھڑا رہا اور درپیک عباسی خلیفہ کی جاہ و چشم پر تقریر کرتا رہا۔ اس نے اب قابلیوں کو بتایا کہ یہ عباسی بھی تمہارے ہی جیسے خانہ بدوش ہوا کرتے تھے مگر نبی کی قربت داری نے ان کو اس مقام تک پہنچا دیا۔ اب اگر تم لوگ عباسی خلافت جیسی حکومت قائم کرنے کے متنبی ہو اور چاہتے ہو کہ تم بھی دنیا بھر میں نمایاں رہ کر زندگی گزار دو تو میری پیروی کرو میں تم سب کو خلیفہ بننے کے بعد اعلیٰ عہدے اور مناصب دوں گا تم بھی عباسی خلفاء کی طرح پیش کرو گے۔“

سامعین نے متنبی کی یہ تقریر بہت پسند کی مگر انہیں متنبی کا منصوبہ کوئی خاص اس لیے نہیں لگا کہ اگر ساوہ والے اس کی خلافت کے لیے بیعت کر لیں گے تو ایک نئی خلافت فوراً وجود میں آجائے گی مگر متنبی کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ عباسی خلافت اس نئی خلافت کو کس طرح گوارہ کرے گی۔ خانہ بدوش قابلی ان انجمنوں اور مصیبتوں کا خیال اپنے دلوں میں نہیں لاسکے جو آگے چلنے کے انہیں پیش آنے والی تھیں۔

اس میدان میں جو کچھ طے پایا اس کی جزئیات پر عمل کرنے کی منصوبہ بندی متنبی کو کرنا تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے خلافت سے ٹکرانے کے لیے ایک زبردست عسکری قوت درکار ہوگی۔ اس کے علاوہ اس عسکری قوت کے لیے ایک اعلیٰ پائے کا ذہن، ہوشیار رہنما بھی ہونا چاہیے مگر اب اسے یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ رہنمائی کے فرائض جیتی خود انجام دے گا اور وہ اپنی نوجوانی ہی میں ساوہ کے قابلیوں پر حکومت کرے گا۔

جلنے کے خاتمے کے بعد متنبی نے سبھی سے اپنی خلافت کے لیے بیعت لی اور ان سب کو یہ یقین دلایا کہ اگر ساوہ کے لوگوں نے اس کی جاں نثاری کے ساتھ پیروی کی اور اس کے احکامات ماننے رہے تو وہ ان سب کو فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دے گا۔

کئی دن تک متنبی ان سب سے بیعت لیتا رہا اور یہاں کی خبریں اس علاقے کے عامل تک پہنچتی رہیں اور خلیفہ کو بھی اس نئے فتنے سے خبردار کر دیا گیا اور اوپر سے اس علاقے کے عامل کو حکم دیا گیا کہ اس فتنے کو عسکری قوت سے کچل دیا جائے اور متنبی کو قید خانے میں ڈال دیا جائے۔

ساوہ والوں کو اس وقت بڑی پریشانی پیش آئی جب ساوہ کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا اور جنگ و جدل کی نوبت تک نہیں آئی۔ متنبی کو کسی مزاحمت کے بغیر گرفتار کر لیا گیا جب اسے پکڑا گیا تو وہ ساوہ والوں کو حسرت سے دیکھتے ہوئے ان سے مدد کا طالب ہوا لیکن ساوہ کا ایک شخص بھی متنبی کی مدد نہیں کر سکا۔ ان کی سب سے بڑی مجبوری یہ تھی کہ ان لوگوں نے خلیفہ کی عسکری قوت سے ٹکرانے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا۔

متنبی کو قید خانے میں ڈال دیا گیا اور ساوہ کے لوگ معمول کی زندگی بسر کرنے لگے۔

قید خانے میں متنبی کئی دن تک صرف یہی سوچتا رہا کہ ساوہ کے لوگ تو اس پر جان قربان کر دینے کا وعدہ کر چکے تھے اور اس کے ہاتھ پر نئی خلافت کی بیعت بھی کی گئی تھی پھر عین وقت پر لوگ اس کا ساتھ کیوں چھوڑ گئے اور وہ خود تنہا اور بے سہارا کیوں رہ گیا۔

عباسی عامل نے متنبی پر کوئی سختی نہیں کی اور صرف قید تنہائی کی سزا پر قائم رہا۔ متنبی جو کل تک ساوہ کی کھلی فضا میں لوگوں کو اپنا کلام سنانے کے داد و تحسین وصول کیا کرتا تھا۔ اب وہ قید خانے کی دیواروں کے درمیان سننے والوں سے محروم خاموشی کے شب و روز گزار رہا تھا وہ دیواروں کو اپنا کلام سنانا اور ان سے داد و تحسین پا کے بے چین ہو جاتا۔

اسے اس قید خانے میں قید تنہائی میں پہلا تجربہ یہ ہوا کہ اسے بیعت لینے سے پہلے ساوہ کے قابلیوں کو فوجی تربیت دلوانی چاہیے تھی اور ان کے لیے اعلیٰ ہتھیار بھی فراہم کرنا اس کی ذمہ داری تھی اور اسے اپنا منصوبہ ابھی راز میں رکھنا چاہیے تھا۔

مگر اب قید خانے میں اسے یہ فکر پریشان کر رہی تھی کہ یہاں سے اسے نجات کس طرح ملے گی اسے یہاں سے نکالنے کے لیے باہر کوئی طاقت بھی موجود نہیں تھی۔ ساوہ کے لوگ بھی اسے اس لیے بھول چائیں گے کہ وہ خلافت کے طاقت ور نظام سے ٹکرانے کی ذہنی، فکری اور عسکری قوت سے محروم تھے۔ اب وہ اس دنیا میں تنہا رہ گیا تھا اسے غیر معمولی شہری قوت جو خدا کی طرف سے ملی ہوئی تھی میں اسی سے وہ کوئی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔

یہاں تو اسے بالکل بھلا دیا گیا تھا قید خانے کے لوگ بھی اسے دو وقت کا کھانا اور پانی پہنچا دیتے تھے، ان سے لیکن وہ اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا تھا۔

آخر کار اس نے رہائی کا ایک طریقہ سوچا مگر اسے اپنے اس طریقے کے سودمند ہونے کا یقین نہیں تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا بس وہ کافی غور و خوض کے بعد یہی سمجھ سکا تھا کہ اس کی شاعری کا چرچا یہاں کے عامل تک ضرور پہنچا ہوگا اور اب اس کی شاعری ہی اسے کوئی فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

قید خانے میں جو مختلف خدمات پر مامور لوگ تھے ان سے کام لینے کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے ان آنے جانے والوں کو اپنا کلام سنایا تو اسے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھی اس کی شاعرانہ عظمت سے واقف تھے مگر وہ جتنی سے اس لیے لائق اور بے گناہ رہتے تھے کہ انہیں خوف تھا کہ اگر وہ جیل میں دھکیلیں گے تو عامل ان پر عتاب نازل کرے گا۔ اب جیل میں آئے ان کو اپنا کلام سنائے ان کی طرف سے کام لینے کے مخلصانہ ارادے سے اس نے فیصلہ کر لیا۔

جتنی نے کچھ دنوں بعد جب یہ سمجھ لیا کہ اب ان خدمت گاروں سے کام لیا جاسکتا ہے تو اس نے ایک خدمت گار سے رازداری سے پوچھا۔ ”دوست! تم دیکھ رہے ہو کہ وقت اور زمانہ کچھ جیسے یگانہ شاعر پر کیسے تم توڑ رہا ہے اور لوگ مجھ سے کس طرح بے مروتی سے پیش آ رہے ہیں۔“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”اے جتنی! ہم تو تجھے اپنے سر پر بٹھا لیں مگر تو خلیفہ کا معتب ہے اب اگر ہم تجھ سے اچھی طرح پیش آئیں گے تو خلیفہ ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ خلیفہ کی ملازمت نے ہمیں مجبور کر رکھا ہے۔“

جتنی نے پوچھا۔ ”میں تجھ سے ایک انتہائی معمولی کام لینا چاہتا ہوں وہ اگر کر دو گے تو مجھے اس قید خانے سے رہائی مل سکتی ہے اور اگر رہائی نہ ملی تو میں اپنی قسمت پر صبر کر کے تمہارا شکر گزار رہوں گا۔“

خدمت گار کو ڈر محسوس ہوا کہ کہیں یہ شاعر قید خانے سے فرار ہونے کا منصوبہ تو نہیں بنا رہا ہے اور اسے اس منصوبے میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔

خدمت گار نے صاف صاف بات کر لی اور کہا۔ ”میں تیرا ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے میں خود معصیت میں پڑ جاؤں۔“

جتنی نے کہا۔ ”میں نے یہاں کے عامل کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے تو اس قصیدے کو عامل تک پہنچا دے اگر میرا کام بن گیا تو مجھ کو کچھ فائدہ ضرور پہنچیں گے۔“

خدمت گار کچھ دیر سوچتا رہا کہ شاعر کا قصیدہ عامل کو

پہنچانا چاہیے یا نہیں۔

اس نے پوچھا۔ ”اے جتنی! پہلے میں اس قصیدے کو خود پڑھوں گا اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا کہ مجھ کو تیرا یہ کام کرنا چاہیے یا نہیں۔“

جتنی نے اس کو اپنے سامنے بٹھالیا اور قصیدہ اس کو پڑھنے کے لیے دینے کی بجائے خود پڑھ کے سنانے لگا۔

یہ قصیدہ عامل کی شان میں لکھا گیا تھا اور اگر اسے عامل تک پہنچا دیا جائے تو اس کے خدمت گار کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

خدمت گار نے وعدہ کر لیا کہ وہ جتنی کا یہ کام کر دے گا۔

جتنی نے اپنا قصیدہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا۔ ”رات جب عامل بالکل تنہا ہو تو میرا نام لیے بغیر میرا یہ قصیدہ اس کے حوالے کر دینا اور خود سامنے سے ہٹ جانا، امید ہے کہ اس قصیدے کا غلو اثر پڑے گا اور عامل تجھ کو ضرور بلوائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہو مجھے اس سے آگاہ کر دینا۔“

خدمت گار قصیدہ لے کر چلا گیا اور اس بار جتنی کو قبل از وقت یہ بھی سوچنا پڑا کہ قبضہ خانے سے نکلنے کے بعد وہ کہاں جائے گا اور کیا کرے گا۔

قصیدہ عشاء کی نماز کے بعد عامل کے حوالے کر دیا گیا اور عامل نے اسے پڑھا اور بہت متاثر ہوا پھر خدمت گار سے پوچھا۔ ”جتنی نے اس قصیدے کے علاوہ تجھے کوئی پیغام بھی دیا ہے؟“

خدمت گار نے جواب دیا۔ ”نہیں جناب! وہ اسی سے خوش ہو جائے گا کہ آپ نے اس کا قصیدہ پڑھا، پسند کیا اور اسے احتیاط سے محفوظ کر لیا۔“

اس قصیدے میں جتنی نے خوشامدانہ روش اختیار کی تھی۔ ”اے میرے آقا! آپ کا کام ہی دولت بخش اور غلاموں کو آزاد کرتا ہے۔ میں آپ سے امید منتظر ہونے کے بعد اور اپنا گاموت کے ہاتھ میں بچھ جانے کے وقت آپ سے مدد کی درخواست کرتا ہوں میری حالت خستہ ہو چکی ہے اور میری انگلیوں کو بیڑیوں کے بوجھ سے کمزور کر دیا ہے۔ ابھی سے مجھ پر حدود قائم کی جارہی ہیں حالانکہ ابھی تو مجھ پر نماز بھی فرض نہیں ہوئی ہے۔“

عامل کے لیے یہ بڑی عزت افزائی کی بات تھی کہ جتنی نے اس کی شان میں کئی اشعار لکھے تھے اور اس سے رمی

درخواست کی تھی چنانچہ عامل نے اسے معاف کر دیا اور اسے رہا کر دینے کے بعد اپنے ساتھ رکھا۔
قید خانے سے نکلنے کے بعد جتنی کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی کیونکہ جس جرم میں اسے قید کیا تھا اس کی وجہ سے لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے اور احتیاط کرتے تھے کہ جتنی سے دور رہو کہیں سادہ والوں کی طرح جتنی نہیں بھی کسی مصیبت میں نہ پھنساوے۔

جتنی کی معاشی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ عامل نے بھی اس پر زیادہ توجہ اس لیے نہیں دی کہ کہیں جتنی کی وجہ سے وہ کسی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائے۔
جتنی دولت مندوں کی شان میں قصائد لکھتا اور ان سے انعام حاصل کر کے گزر بسر کرتا رہا۔ یہ انعام و اکرام بہت زیادہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ انشیا بہت زیادہ مخنی اور فضول خرچ نہیں ہوتے۔

اسی دوران جتنی کی شہرت ہوتی چلی گئی اور قسمت نے یادری کی، شام کا فرمانروا سیف الدولہ، جتنی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ عربی النسل حکمران تھا۔

ان دنوں ایشیائے کوچک میں قیصر روم کی حکومت تھی اور سیف الدولہ اس پر حملہ آور ہوتا رہتا تھا اور اسے ان حملوں میں مسلسل کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں۔

سیف الدولہ علم و فضل کا بھی بڑا قدر دان تھا۔ خود بھی کثیر رنج تھا اس کے بارے میں مؤرخین کا متفقہ فیصلہ یہ رہا ہے کہ اس عہد کے شعراء اور مصنفین اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے سوا کسی اور کے دربار میں اتنا مجمع نظر نہیں آئے گا ابوالفضل فارابی اور حکایات آغانی کا مصنف اسی کے دربار سے فیض یاب ہوئے۔ سیف الدولہ کے امراء میں ابوالعشار نامی ایک قدر دان امیر تھا۔ جتنی نے اس کی مدح میں چند قصیدے لکھے اور اس کو اپنا گرویدہ کر لیا۔

ابوالعشار سیف الدولہ کی طرف سے اٹھا کیہ میں عامل کے فرائض انجام دے رہا تھا اور خود سیف الدولہ حلب میں رہتا تھا۔ لوگوں نے سیف الدولہ کو جتنی کے بارے میں بتایا کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے اور پریشان حالی کی وجہ سے وہ ادھر ادھر بھٹک رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی حکمران اس کی سرپرستی کرے اور اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لے تاکہ یہ حکمران بھی جتنی کے قصیدوں میں موجود رہے اور اسی کی طرح شہرت دوام

حاصل کرے۔

سیف الدولہ نے پوچھا۔ ”یہ وہی جتنی ہے جس نے نجف کے جنوب میں سادہ والوں میں رہ کے ایک نئی خلافت کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر اپنے ارادوں کی تکمیل سے پہلے ہی وہ گرفتار ہوا اور مدتوں قید خانے میں پڑا رہا۔“
لوگوں نے اقرار کیا کہ ہاں یہ وہی جتنی ہے۔
سیف الدولہ نے خطرہ ظاہر کیا۔ ”یہ شخص یہاں بھی کوئی خرابی نہ پیدا کروے۔“

لوگوں نے سیف الدولہ کے اثر و اقتدار کے حوالے سے بتایا۔ ”جتنی اس دربار سے وابستہ ہونے کے بعد سرکشی اور بغاوت کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتا۔ اس کے علاوہ قید خانے میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد اسے سبق مل گیا کہ وہ کبھی بھی اپنے مذموم ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

سیف الدولہ نے اٹھا کیہ کے عامل ابوالعشار کو لکھا۔ ”میں نے سنا ہے کہ جتنی تیرے دربار سے وابستہ ہو گیا ہے میں نے اس کا کلام دیکھا اسے میرے دربار میں ہونا چاہیے اس سے بات کر اور اس کو بتا کہ میں اسے اپنے دربار سے وابستہ کرنا چاہتا ہوں مگر وہ یہاں آنے کے بعد من مانی کرنے کے ارادوں سے باز رہے۔“

ابوالعشار نے جتنی کو خوش خبری سنائی۔ ”اے جتنی! تیری خوش قسمتی تجھے بہت بلندی کی طرف لے جا رہی ہے خوش ہو جا کہ سیف الدولہ کو تیری ضرورت محسوس ہوئی اور تجھے طلب کیا گیا ہے۔“

جتنی نے خود پندی اور اپنی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر ابوالعشار سے کہا۔ ”تو نے جیسے میری خوش قسمتی کہا ہے میں اس وقت تک اسے اپنی خوش قسمتی نہیں سمجھوں گا جب تک سیف الدولہ سے میری بات نہ ہو جائے اور اس کے بعد وہ مجھے اپنے دربار سے وابستہ کرے۔“

ابوالعشار نے پوچھا۔ ”تو سیف الدولہ سے کیا بات کرے گا تیرے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تجھے سیف الدولہ تیری خواہش اور درخواست کے بغیر اپنے دربار سے وابستہ کر رہا ہے۔“

جتنی نے جواب دیا۔ ”میں ایک خاص شرط سیف الدولہ کے سامنے رکھوں گا، اگر وہ اسے مان لے گا تو میں اس کے دربار سے وابستہ ہو جاؤں گا نہیں مانے گا تو میں تیرے ہی دربار سے وابستہ رہوں گا۔“

ابو العشار لکرمند ہو گیا کہ یہ عجیب و غریب شاعر معلوم نہیں کیوں ناز و نخرے دکھا رہا ہے حالانکہ اس کی جگہ کوئی اور ہو تو وہ سیف الدولہ کے دربار سے وابستگی کو ہی اپنی عزت افزائی سمجھتا۔

ابو العشار نے پوچھا۔ ”تو اپنی شرائط بتا میں سیف الدولہ کو وہ شرائط لکھ کر بھیج دوں گا اگر سیف الدولہ نے انہیں مان لیا تو میں تجھ کو خود اپنے ساتھ حلب لے جاؤں گا اور اگر امیر نے تیری شرائط درخور اعتنا نہ سمجھیں تو تو میرے پاس ہی پڑا رہے گا۔“

حتبتی نے کئی شرطیں لکھ کر دے دیں ان میں ایک شرط ایسی تھی جو ابو العشار کے خیال میں سیف الدولہ کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ درباری شعراء اپنے قصائد اور اشعار دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے اور حتبتی اسے اپنے لیے بے عزتی کی بات سمجھتا تھا وہ اپنی جگہ بیٹھ کے ہی قصیدہ یا اشعار سنانے کا خواہش مند تھا۔

ابو العشار نے جملہ شرائط سرسری نظر سے دیکھیں مگر بیٹھے بیٹھے قصیدے اور اشعار سنانے کی شرط پر اعتراض کرتے ہوئے کہا۔ ”اے حتبتی! تیری تمام شرائط قابل قبول ہو سکتی ہیں لیکن بیٹھ کے اشعار سنانے والی شرط امیر سیف الدولہ نہیں مانے گا۔“

حتبتی نے کہا۔ ”مگر میں اس شرط کو مانے بغیر امیر کے دربار سے وابستگی کو قبول نہیں کروں گا۔“

ابو العشار نے مایوسی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے! میں تیری شرائط لکھ کر بھیج دوں گا اور وہاں سے جو جواب آئے گا اس سے تجھ کو آگاہ کر دوں گا۔“

ابو العشار نے حتبتی کی شرائط لکھ کر امیر سیف الدولہ کو بھیج دیں اور یہ بھی لکھا کہ حتبتی کو اپنی شاعرانہ عظمت اور فعالیت کا اتنا زیادہ احساس ہے کہ اگر اسے بیٹھ کر اشعار سنانے کی اجازت نہ دی گئی تو وہ آپ کے دربار سے وابستگی کو وادہ نہیں کرے گا۔“

کچھ عرصہ بعد امیر سیف الدولہ کی طرف سے جواب آ گیا۔ اس نے ابو العشار کو لکھا تھا۔ ”تو حتبتی کو اپنے ساتھ میرے پاس لے آجیے میں اس کا کلام سنوں گا اس کے بعد فیصلہ کروں گا کہ مجھے حتبتی کی یہ شرط ماننا چاہیے یا نہیں۔“

ابو العشار نے امیر کا جواب حتبتی کے سامنے رکھ دیا اور کہا۔ ”اب تو کیا کہتا ہے کیا تو میرے ساتھ حلب جانا پسند کرے گا۔“

حتبتی نے جواب دیا۔ ”ہاں! میں امیر سیف الدولہ سے ملوں گا اور مجھے یقین ہے کہ میرا کلام امیر کو میری شرط ماننے پر مجبور کر دے گا۔“

ابو العشار نے حلب جانے کی تیاریاں کیں اور حتبتی کو لے کر حلب چلا گیا۔

امیر سیف الدولہ کو خبر کر دی گئی کہ ابو العشار حتبتی کو لے کر پہنچ چکا ہے اور بار باری کا امیدوار ہے۔

اس وقت امیر کے دربار میں کئی لائق لوگ موجود تھے۔ ان سب کو حتبتی سے ملنے، دیکھنے، باتیں کرنے اور اس سے اس کا کلام سننے کی آرزو تھی۔

ان دونوں کو امیر کے سامنے پہنچا دیا گیا۔ درباریوں کی نظر سب حتبتی کی طرف گئی۔ امیر نے بھی نیچے سے اوپر تک حتبتی کو دیکھا اور اس کے بعد کسی تمہید کے بغیر حتبتی کو حکم دیا۔ ”اپنا کلام سنا تا کہ میں فوراً فیصلہ کروں مجھے دربار میں بیٹھ کر اشعار سنانے کی اجازت دی جائے یا فوراً رخصت کر دیا جائے۔“

حتبتی نے اس دربار کے لیے جو اشعار کہہ رکھے تھے انہیں امیر کے سامنے کھڑے ہو کر سنایا۔

اس کے کلام نے امیر کو اتنا متاثر کیا کہ وہ کچھ دیر گم سم رہا درباری بھی حیرت زدہ معلوم ہوتے تھے۔

ابو العشار نے اس کیفیت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا تھا کہ حتبتی کا کام ہو گیا۔

سبھی کو امیر سیف الدولہ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کا انتظار تھا۔

امیر سیف الدولہ نے ہوش میں آتے ہی حتبتی کی تعریفیں کیں اور ابو العشار کو بطور خاص مخاطب کیا۔ ”اے امیر ابو العشار! حتبتی کا کلام اتنا پُر فعالیت ہے کہ اسے شرائط پیش کرنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا اور اسے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنا کلام سنانے کی اجازت دی گئی۔“

ابو العشار نے اطمینان کی سانس لی اور حتبتی اپنی جگہ بے حد خوش تھا کہ اس نے میدان مار لیا ہے۔

امیر سیف الدولہ نے سادہ اور وہاں کے قبیلے بنی کلب کا بطور خاص ذکر کیا اور پوچھا۔ ”اے حتبتی! سادہ کا قبیلہ بنو کلب تو اپنی جرأت، شجاعت اور بہادری میں ثانی نہیں رکھتا تو نے ان سب کو جو عجیب و غریب دعوت دی گی تو اس میں تجھے ناکامی کی وجہ کیا نظر آتی؟“

جنتی نے سادہ کے ذکر سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”امیر اس خوشی کے موقع پر میرے تکلیف دہ ماضی کا ذکر نہ کریں تو بہتر ہے۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”اگر تم نا تجربے کار نہ ہوتے اور بنو کلب میں لائق اور دور میں چند افراد بھی ہوتے تو خلافت عباسیہ کے لیے مصیبت بن جاتے تم لوگوں نے اتنا بڑا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبے کے پیچھے تجربے اور فکر و تدبیر کی کمی تھی جس سے تم ناکام رہے اور مجھے محض کے عامل امیر لولونے قید خانے میں ڈال دیا۔“

جنتی نے دوبارہ درخواست کی۔ ”امیر محترم! مجھے اپنی اس حماقت پر آج بھی عداوت محسوس ہو رہی ہے۔“

امیر سیف الدولہ نے جنتی کی رشک آمیز صحت نمائیاں قہار لاف اور شاندار ایل اول کا ہارہ لینے کے بعد پوچھا۔ ”اے تو بہت اچھا ہاں ہی ہونا چاہیے تھا، کیا تجھے فنون سپاہ گری بھی آتے ہیں۔“

جنتی نے جواب دیا۔ ”نہیں! خانہ بدوشوں میں رہ کر مار دھاڑی عادت تو پرزگئی مگر فنون سپاہ گری باقاعدہ سیکھنے کا نہ تو موقع ملا اور نہ وہاں کوئی ایسا ماہر تھو جس سے میں فنون سپاہ گری سیکھتا۔“

امیر سیف الدولہ نے پوچھا۔ ”اگر تجھے نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی کے ماہرین کے حوالے کرو یا جائے کہ تو ان سے سپاہ گری سیکھ لے تو تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

جنتی نے جواب دیا۔ ”یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں فنون سپاہ گری سیکھ کر مرد میدان بن جاؤں لیکن اے امیر! مجھے تو اس دربار میں بحیثیت ایک شاعر جگہ دی گئی ہے پھر یہ آپ کے دل میں مجھے فنون سپاہ گری سکھانے کا خیال کیوں آیا۔“

امیر سیف الدولہ نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ میں کبھی بھی جہاد کے لیے ایسیاے کو چیک بلیج جاتا ہوں اور وہاں مجھے کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ میں تجھے سرفروصہ میں اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔“

جنتی کے لیے یہ اور زیادہ خوشی کی بات تھی کہ امیر اس سے اتنا خوش اور متاثر ہوا تھا کہ اسے سرفروصہ میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔

امیر نے جنتی کو فنون سپاہ گری کے ماہرین کے سپرد کر دیا کہ وہ اسے فنون سپاہ گری سکھائیں۔

جنتی اتنا ذہین تھا کہ اس نے ان فنون میں بھی کمال حاصل کر لیا۔ امیر سیف الدولہ، جنتی کے استادوں سے اس کے بارے میں پوچھتا رہتا اور وہ لوگ یہی بتاتے تھے کہ جنتی میں سیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔

جنتی دربار میں بیٹھے بیٹھے اپنے اشعار اور قصائد سناتا رہا اس وقت بھی امیر کا ذہن گہمیں اور ہوتا۔ وہ دیکھنے میں یوں لگتا جیسے شاعری میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن اس کے ذہن میں کچھ اور کچھ ہی پک رہی ہوئی، جنتی امیر سیف الدولہ کے دل و دماغ پر بری طرح چھا گیا تھا۔

امیر نے ایسیاے کو چیک پر حملہ آور ہونے کا قصد کیا اور جنتی سے پوچھا۔ ”اب تو تو مجھے میرے ساتھ جہادوں میں حصہ لے سکتا ہے۔“

جنتی نے کہا۔ ”ہاں! امیر محترم اب میں بھی جہاد میں حصہ لینے کے لائق ہو چکا ہوں۔“

امیر سیف الدولہ نے ایسیاے کو چیک پر حملہ آوری کی تیاریاں کیں تو جنتی کو پیش پیش رکھا۔ اس سے مشورے بھی کئے تو جنتی نے جواب دیا۔ ”میں اپنے اشعار سے سپاہیوں میں مکرری اور جوش و خروش پیدا کروں گا۔“

امیر سیف الدولہ، جنتی کی مالی مدد کرتا رہا اور اسے اب اتنی آسودگی میسر آگئی تھی کہ وہ اس کا اپنے شعروں میں ذکر کرنے لگا تھا۔ اس کے کئی اشعار خاصے مقبول ہوئے اور ان شعروں کو دوسروں کی زبانوں سے بھی سنا گیا تو امیر سیف الدولہ کو بڑی خوشی ہوئی کہ جنتی اس کے دوبارے وابستگی کے بعد خوش حال زندگی بسر کر رہا ہے۔

کسی درباری نے بھی یہ شعر امیر سیف الدولہ کو سنائے۔ ”میں نے راتوں کا سفر اپنے پیچھے ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا جن کے پاس مال کی کمی ہے اور میں نے تیرے (امیر سیف الدولہ) کے احسانات کی وجہ سے اپنے کھوڑوں کو سونے کی نالیں لگوا دیں اور میں نے تیرے لطف و کرم کی وجہ سے اپنے آپ کو تیری محبت میں محصور اور مقید کر دیا اور جو بھی خود کو احسان کی بیڑی میں پاتا ہے وہ قید ہو جاتا ہے۔“

دربار میں جنتی کے پہنچنے سے پہلے ابو العباس نامی شاعر بڑا رسوخ رکھتا تھا لیکن جنتی کی شاعرانہ حرکاتوں نے اس کا رنگ پیکا کر دیا۔

ابو العباس کو جب بھی موقع ملتا جنتی کی عدم موجودگی میں امیر سے اس کی شکایت کرتا۔ ابو العباس کو سب سے

شعر میں لفظوں کی جو مناسب بندش کی گئی ہے اس سے شعر دل میں اترتا چلا جاتا ہے اور سننے والے کو عجیب سی کیفیت محسوس ہوتی ہے، تو بھی اقرار کرے گا کہ میں اس شعر کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں کتنی صداقت موجود ہے۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”اے امیر! میں اس سے بہتر شعر کہوں گا اور آپ اس شعر کی بھی اسی طرح تعریفیں کریں گے۔“

لیکن امیر کے پاس سے اٹھنے کے بعد ابوالعباس کو یہ یقین ہو گیا کہ جتنی نے امیر کے دل و باغ پر ایسا قبضہ ہمارا کیا ہے کہ اگر وہ جتنی کے اس شعر سے بہتر شعر کہے گا تب بھی امیر اس کے شعر کی تعریف نہیں کرے گا۔

کچھ دنوں بعد امیر سیف الدولہ بھی جتنی کے طور طریقوں سے اکٹا گیا، اس کے دربار میں بد نظمی اور بے دلی پیدا ہو گئی اور اکثریت رشک و حسد میں مبتلا ہو گئی، کچھ تو جتنی کی باتیں گوارہ کر رہے تھے اور حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے مگر اکثریت نے جتنی کے خلاف باتیں شروع کر دیں اور ان سب نے امیر سیف الدولہ کو مجبور کیا کہ وہ جتنی کی زبان کو لگام دے۔

امیر سیف الدولہ نے انہیں اجازت دے دی کہ وہ بھی جتنی پر جوابی حملے کریں اور سب مل جل کے جتنی کو عاجز کر دیں۔

امیر کی اس اجازت کے بعد دربار میں بڑی بد مزگی پیدا ہو گئی ایک طرف جتنی تھا اور دوسری طرف جتنی کے حریف تھے اور ان سب نے اپنی مجموعی قوت سے جتنی کو عاجز کر دیا۔ وہ ان سب کا کب تک مقابلہ کرتا آخر جتنی نے سب کی امیر سے شکایت کی۔ ”اے امیر! مجھے افسوس ہے کہ آپ نے درباری احمقوں اور زبان درازوں کی میری شان میں گستاخیاں برداشت کر لیں میں ذلیل و خوار ہوتا رہا اور آپ خاموشی سے میری ذلت گوارہ کرتے رہے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”تجھے اپنی عزت کر دانے کا سلیقہ نہیں آتا تو نے بھی اپنی ان حرکتوں کا جائزہ لیا۔ تیرے رویوں سے دوسروں کو شکایتیں پیدا ہوئی رہیں اور میرے درباری معزز لوگ تیری زیادتیاں برداشت کرتے رہے۔ میں نے جس طرح تجھے آزادی سے بولنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اسی طرح دوسروں کو بھی تیرے خلاف بولنے کی اجازت دے دی گئی اگر وہ تیرے حملے برداشت کرتے ہیں

بڑی شکایت یہ تھی کہ جتنی اسے حقارت کی نظروں سے دیکھتا اور اس کو مخاطب کیے بغور نظر کرتا اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ ابوالعباس یہ اذیت کچھ عرصہ جھیلتا رہا اسے جب بھی موقع ملتا وہ جتنی کی امیر سے شکایتیں کرتا اور کہتا۔ ”جتنی خود کو معلوم نہیں کیا سمجھتا ہے کہ وہ دوسروں کی بالکل عزت نہیں کرتا۔ آپ اس کو سمجھائیں کہ جب ہم اس کی عزت کرتے ہیں تو اسے بھی ہماری عزت کرنا چاہیے۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”میں جتنی کو کیا سمجھاؤں جب کہ مجھے خود بھی یہ احساس ہے کہ وہ اپنے عہد کا بے مثال شاعر ہے لیکن افسوس کہ اس کی خود ستائی اور اس کے بے جا غرور نے مجھے کیا سبھی کو کھوکھو شکایت پر مجبور کر دیا ہے، میں اسے سمجھا بھی دوں گا تب بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”ہم اسے اتنا بڑا شاعر نہیں مانتے جتنا وہ خود کو سمجھتا ہے، ہم اس سے بہتر شعر کہہ سکتے ہیں۔“ امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”اے ابوالعباس! اس قسم کی باتیں مت کر وہ واقعی اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر ہے اور تم میں سے کوئی بھی شعر و شاعری میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

ابوالعباس نے زیادہ ہمت اور جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ مجھے اس کے کچھ اشعار سنائیں ہم اسی موضوع پر اس سے بہتر اشعار کہہ دیں گے۔“

امیر سیف الدولہ مسکرایا۔ ”نہیں ابوالعباس! ایسا دعویٰ نہ کر کیوں کہ اس کے جو اشعار میں تجھے سناؤں گا تو اس سے بہتر شعر نہیں کہہ سکے گا اور جب یہ تفصیل جتنی سنے گا تو تیرا بہت زیادہ مذاق اڑائے گا۔“

ابوالعباس کا اصرار جاری رہا۔ ”آپ اس کے کچھ اشعار سنائیں تو سہی میں ان سے بہتر شعر کہہ دوں گا۔“

امیر سیف الدولہ نے کہا۔ ”میں صرف ایک شعر سنا تا ہوں اگر تو اس کے جواب میں اس سے بہتر شعر کہہ سکا تو میں تجھے اس سے بہتر شاعر سمجھوں گا۔“

ابوالعباس نے کہا۔ ”آپ مجھے وہ شعر سنائیں تو سہی۔“

امیر نے اس کو شعر سنایا۔ ”وہ فتح فتح حاصل کرتا ہے لیکن اس میں غرور نہیں پیدا ہوتا جالانکہ جب وہ لڑائی کے لیے چلا تھا تو کچھ تیری بھی نہیں کی تھی۔“

سیف الدولہ نے یہ شعر سنانے کے بعد کہا۔ ”اس

تو تجھے بھی امی کی باتیں سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔“

جنتی نے امیر کے ساتھ بھی گستاخانہ رویہ رکھا اور کہا۔ ”اے امیر! جب میں اس دربار میں بلایا گیا تھا تو میں نے آنے سے پہلے کچھ شرطیں رکھی تھیں اور آپ نے میری وہ شرطیں قبول کر لی تھیں، کیا اس دربار کا کوئی دوسرا شاعر میری جیسی آن بان سے اس دربار میں آیا تھا۔“

امیر سیف الدولہ نے جنتی کو منع کیا کہ وہ ایسی گستاخانہ باتیں مت کرے، دربار میں دوسرے شاعروں کی بھی عزت کی جاتی ہے اور جنتی کو آئندہ ان شاعروں کے خلاف گفتگو کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

جنتی نے کہا۔ ”اے امیر! یہ میرے ساتھ زیادتی اور ایسا ہمارے درباری شاعروں کے خلاف قرار دینا ہے۔ ہمارے دربار میں کوئی گناہ نہیں کرتا۔“

امیر سیف الدولہ نے جنتی کی یہ باتیں گراں گزرتی رہیں اور اس نے جنتی کے جانے کے بعد تمام دوسرے شاعروں کو اجازت دے دی کہ وہ بھی جنتی کے ساتھ رو رعایت سے کام نہ لیں اور اس کے اشعار کا بھی بھرے مذاق اڑائیں۔

اب امیر کے دربار میں جنتی کی وہ عزت نہیں رہی جتنی جو کچھ دنوں پہلے پائی جاتی تھی۔

جنتی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اشعار سناتا تو دوسرے شاعر بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے شعر سناتے دیکھ کر گویا اب اس کے دربار میں سبھی شاعر مساویانہ درجہ رکھتے تھے۔

یہ صورت حال جنتی کے لیے کچھ دنوں تک گوارہ رہی مگر پھر وہ اتنا بے زار ہوا کہ دربار میں آنا جانا کم کر دیا۔

امیر نے دفتر مالیات کو ہدایت کی کہ اب تک جنتی کو انعام و اکرام میں جو کچھ دیا جا چکا ہے اس کی تفصیل سے امیر کو آگاہ کیا جائے۔

دفتر مالیات نے حساب کتاب کر کے بتایا۔ ”دفتری حساب کتاب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ جنتی کو چار برس کی مدت میں 35 ہزار اشرفیاں دی جا چکی ہیں۔“

امیر سیف الدولہ نے دفتر مالیات کو خفیہ حکم بھیجا کہ جنتی کو آئندہ کچھ بھی نہ دیا جائے۔

امیر سیف الدولہ کا بھائی امیر ابو فراس بھی جنتی کو ابھی اس اہم واقعہ سے مطلع نہیں کیا تھا کہ وہ خود امیر سیف الدولہ کے

بھائی کا مد مقابل سمجھے۔ امیر کا بھائی ہونے کے علاوہ وہ خود کو بہت بڑا شاعر بھی سمجھتا تھا۔

امیر سیف الدولہ نے خود تو اپنے بھائی سے کچھ نہیں کہا مگر ابو العباس کو مشورہ دیا کہ وہ ابو فراس کے ساتھ اس کی سرپرستی میں جنتی پر حملے کرے گا تو اس کا اثر ہوگا۔

جب ابو فراس کو جنتی کی مخالفت پر آمادہ کیا گیا تو اسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ جنتی انتہائی خود پسند اور مغرور شاعر ہے اسی لیے وہ ابو فراس کے مقابل آنے پر اس کی بھی بے عزتی کر دے گا تو ابو العباس نے اسے بتایا کہ اس کا بھائی امیر سیف الدولہ بھی جنتی سے عاجز آچکا ہے اور اس کی خواہش پر ابو فراس کو جنتی کے مقابل لایا جا رہا ہے۔

جنتی نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے کچھ شعر سنائے تو ابو فراس اپنے بھائی امیر سیف الدولہ کے پاس جا بیٹھا اور وہیں سے شعر سناتے شروع کر دیے۔ پورا دربار جنتی کے شعروں پر خاموش رہا مگر ابو فراس کے شعروں پر مدح ستائش کے ڈوگرے برسے۔ جنتی کو اپنی بڑی بے عزت محسوس ہوئی۔ وہ دربار میں تو بالکل خاموش رہا مگر باہر نکل کے وہ ابو فراس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ امیر کے بھائی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔

دربار سے رخصت ہونے والے شاعروں نے جنتی کو راستے میں ٹھوکرے پر کسی کے انتظار میں دیکھا تو مسکراتے ہوئے اس کے پاس سے گزر گئے۔

کچھ دیر بعد ابو فراس بھی اس کے پاس سے گزرا۔ جنتی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا۔ ابو فراس کا گھوڑا اس کے برابر رک گیا۔

جنتی نے پوچھا۔ ”اے ابو فراس! پہلے تو کبھی دربار میں تو نے آج کی طرح اپنے اشعار نہیں سنائے تھے۔ مجھے سچ بتا کہ ایسا کیسے کی سازش ہے ہوا۔“

ابو فراس نے جواب دیا۔ ”یہ سوال تو دوسرے شاعروں سے کر سکتا تھا۔ میں امیر سیف الدولہ کا بھائی ہوں۔ تجھے ہم دونوں کے اس رشتے کا احترام کرنا چاہیے۔“

جنتی نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ ”اے ابو فراس! دربار میں اگر تجھے امیر کے بھائی کی حیثیت سے آنا تھا تو تجھے اس کے پاس بیٹھ کے اپنے شعر نہیں سنانا چاہیے تھے تو کیا ہے اس عہد کے جملہ شاعروں کے بھی میرا مقابلہ کریں گے تو منہ کی کھانیں گے۔ آج میں نے امیر کے خیال سے

۲۰۱۱ء میں اس رشتے کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔
نہ۔ اسی دوسرے درباری شاعروں کی طرح پیش
اوں گا۔“

ابو فراس کو بے حد غصہ آیا اور اس نے جواب دیا۔
”جے دفتر مالیات سے تین ہزار اشرفیاں سالانہ مل رہی
ہیں۔ میں نے اپنے بھائی کو بتا دیا ہے کہ یہ رقم بہت زیادہ
ہے اتنی رقم میں بھائی کو نہیں شاعر مل سکتے ہیں۔“
حتیٰ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”تب پھر تیرے
بھائی نے مجھے کیوں تین ہزار اشرفیاں سالانہ پر رکھا ہوا ہے تو
میں شاعروں کی بات کر رہا ہوں وہ میں شاعر تیرے جیسے
ہوں گے بلکہ تیرے جیسے پینتیس شاعر میری حتیٰ قیمت میں
مل سکتے ہیں۔“

ابو فراس غصے میں بے قابو ہو گیا اور کہا۔ ”اے حتیٰ!
تجھے آسودگی اور عزت افزائی اس نہیں آرہی ہے، کیا تجھے
سلاوہ کے قائل یاد آ رہے ہیں جہاں لوگ تجھ سے تیرے شعر
تو سنتے تھے مگر انعام میں کچھ بھی نہیں دیتے تھے۔ وہاں بھی
تیری اتنا غرور اور خود پسندی نے تیرا دماغ خراب کر دیا تھا
اور تو ایک نئی خلافت وجود میں لانا چاہتا تھا اس کی ناکامی
میں تجھے قید خانے کی ہوا کھانا پڑی اور تو ایک عرصے بیڑیاں
پہنے قید خانے میں پڑا رہا۔“

حتیٰ نے اپنا سر پکڑ لیا اور کہا۔ ”خدا کے لیے اب کچھ
نہ کہنا میرے دماغ کی رگیں پھول رہی ہیں اور میں غصے
سے پاگل ہو جاؤں گا تم لوگ مجھے سچ بتاؤ کہ کیا میں اس
دربار کو چھوڑ کر نہیں اور چلا جاؤں؟“

ابو فراس نے کہا۔ ”تو دوسروں کی عزت نہیں کرے گا
تو دوسرے تیری عزت کیوں کریں گے میں تجھے یہی مشورہ
دوں گا کہ تجھے اب کسی اور دربار کا رخ کرنا چاہیے تو نے مجھ
سے جھگڑا کر کے اپنے لیے اچھا نہیں کیا میں تجھ سے کمزور
شاعر نہیں ہوں اور میں تیری شاعرانہ عظمت کو خاک میں ملا
دوں گا۔“

حتیٰ کے لیے اب یہ ماحول ناقابل برداشت ہو گیا
تھا اس نے ابو فراس سے باتیں کرنے کے بعد یہ اندازہ لگا
لیا تھا کہ اس کے پیچھے سیف الدولہ کی مرضی اور خواہش کا
فرمانظر آرہی ہے آخر ابو فراس کو یہ بات کس نے بتائی کہ حتیٰ
کو سالانہ تین ہزار اشرفیاں مل رہی ہیں۔

حتیٰ نے دفتر مالیات سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی
کہ وہاں سے اسے کچھ جو ملتا رہا ہے اس کی درست تفصیل کا

علم ابو فراس کو کیونکر ہو گیا۔
دفتر مالیات میں حتیٰ کے قدر دان موجود تھے اور
وہیں سے اس کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ امیر سیف الدولہ نے
کچھ دن پہلے اس شخص سے پوچھا تھا کہ چار سالوں میں حتیٰ کو
کتنی رقم دی جا چکی ہے۔
حتیٰ نے اپنے قدر دان سے اتنی تفصیل جاننے کے
بعد فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا۔

سیف الدولہ کے دربار سے رخصت ہونے سے
پہلے اس نے سیف الدولہ کی ناقدر دانی، نا انصافی اور اپنی
خودداری کا اپنے قہیدے میں نہایت آزادی اور دلیری
سے نظم کر دیا۔

اے سب سے زیادہ عادل بجز میرے معاملے کے
تیرے ہی بارے میں نزاع ہے اور تو ہی دشمن تو ہی
حالت ہے

انسان کو آنکھ سے کیا حاصل اگر آنکھ تاریکی اور روشنی
میں فرق نہ معلوم کر سکے (یعنی سیف الدولہ کو نیک و بد کی چیز
نہیں)

مجھ کو گھوڑے، راتیں، صحراء، تلوار، نیزے، کاغذ اور قلم
سب پہنچاتے تھے۔

کاش یہ بادل (سیف الدولہ) جہاں برستا ہے وہیں
جا کر گر جتا بھی۔

جب یہ قہیدہ دربار میں پڑھا گیا تو تمام درباری
برہم ہو کر کھڑے ہو گئے۔

سیف الدولہ نے اس وقت تو خاموشی اختیار کی لیکن
اطلا کیہ کے امیر ابوالعشار کو حتیٰ کی شکایت لکھ بھیجی کہ حتیٰ
گستاخیوں پر اتر آیا ہے۔

ابوالعشار نے اطلا کیہ سے دس آدمی حتیٰ کو سزا دینے
کے لیے بھیج دیے۔

سیف الدولہ کے محل کے باہران کی حتیٰ سے ٹک میٹر
ہوئی۔ ایک نے حتیٰ کی باگ پر ہاتھ ڈالا۔ حتیٰ نے تلوار کا
بھر پور دار کیا جو کمان کو کاٹ کر ہاتھ تک جا پہنچا اور وہ ڈنچی ہو
کر مر گیا بقیہ نو نے حتیٰ پر تیر برسائے لیکن حتیٰ صاف بخ کر
کل گیا۔

اب اس نے دمشق کا رخ کیا۔
دمشق میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد قاہرہ پہنچا اور
کافور خواجہ سرا کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔
کافور اپنے مالک ابو بکر کے بعد یہاں کا حکمران ہو

جدید سکھ مت

اگرچہ دنیا کے بیشتر حصوں میں سکھ برادر یاں موجود ہیں۔ البتہ جدید سکھ مرکزی طور پر ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔ جدید سکھ مت کے مرکزی ڈھانچے میں تین فرقے ہیں۔ ہر فرقہ نانک کی مرکزی تعلیمات کو قبول کرتا ہے۔ گرنٹھ کو مقدس مذہبی تحریر مانتا اور دس گروؤں کو الہام یافتہ سمجھتا ہے۔ پہلا فرقہ اداسی کہلاتا ہے اور یہ بنیادی طور پر مقدس افراد کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سکھ بہت سے ایسے اصولوں اور قواعد پر عمل کرتے ہیں جو ہندومت، بدھ مت اور جین مت کے ریتائضوں کے ہاں بھی نافذ العمل ہیں۔ وہ بیشتر مجدد رہتے اور بدھ بکشوؤں کی طرح کھردرے پہلے کپڑے پہنتے یا جین جوگیوں کی طرح برہمنہ پھرتے ہیں۔ ان کی زیر ملکیت واحد شے سکھول ہے۔ عموماً وہ سرگرم مبلغین ہوتے ہیں اور دیگر عقائد رکھنے والوں کو اپنے مذہب سے متعارف کرانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ اداسیوں کو نانک پتر بھی کہتے ہیں۔ گرو نانک کا سب سے بڑا بیٹا ان کا جد امجد تھا جسے گرو امرا اس نے برادری سے خارج کیا تھا۔ وہ گرو گوہند کے گرنٹھ کو مسترد کرتے جب کہ گرو نانک کے آدی گرنٹھ کو مانتے تھے۔ سکھوں کا دوسرا فرقہ کچ دھاری سکھ (ست رو) ہے۔ بحیثیت سکھ ان کی ترقی گوہند سکھ سے پہلے بعض مواقع پر ختم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ جارحیت پسندی کو مسترد کرتے ہیں جو کہ زیادہ تر سکھ مت کی خصوصیت بن چکی ہے اور داڑھی منڈوانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا لیس مور
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

کیا تھا حالانکہ پہلے یہ اس کا غلام تھا۔
جنتی چاہتا تھا کہ کافور اسے کسی صوبے یا ضلع کی حکومت دے دے تو وہ آزادانہ زندگی بسر کرے اور اسی امید میں اس نے کافور کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا مگر اس قصیدے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

کافور نے صلے میں گراں قدر انعام دے دیا۔
کچھ دنوں اسی طرح کام چلتا رہا مگر کافور کو انعام و اکرام کے علاوہ کسی قلعے یا صوبے کی حکومت دینے میں اس لیے تامل تھا کہ جنتی کی حوصلہ مندی کے قصے سن چکا تھا۔ اس لیے اب تک وہ اسے اپنے دربار میں صرف شاعری حیثیت سے رکھے ہوئے تھے۔

”اے ہاری یکسانیت سے عاجز آگیا اور اس نے اپنی لاش کا اظہار ایک قصیدے میں کر دیا۔“

”یہ لاش ہاں میرے سپرد کر دیں کیونکہ میں آدی کی صورت میں ہوں۔ میرا دل بادشاہ کا دل ہے کہ میری زبان شاعروں کی ہے۔“

ایک دوسرے قصیدے میں لکھا۔
”اے کافور! پیالے میں کچھ باقی بھی ہے جو میرے کام آئے۔“

بڑی دیر سے میں گار ہا ہوں اور تپتی رہا ہے۔
تو نے جو دیا وہ زمانے کے ہاتھوں کے انداز سے دیا۔

لیکن میں تو تیرے ہاتھ کے اندازے سے چاہتا ہوں۔

اگر تو نے مجھ کو کوئی جاگیر یا کہیں کی حکومت نہ دی تو تیری سخاوت مجھ کو کپڑے پہنائے گی اور دربار کی حاضری اس کو مجھ سے چھین لے گی۔“

اس قصیدے نے بھی کافور کے حراں میں کوئی تبدیلی نہیں آنے دی اور جنتی کو یقین ہو گیا کہ اسے اس دربار سے کوئی جاگیر نہیں ملے گی۔ اس نے دربار میں جانا چھوڑ دیا اور کافور سے تعلقات منقطع کر لیے۔

کافور کو یہ باتیں گراں گزریں اور اس نے جنتی پر پھرے بھاد دینے کہ اسے کہیں جانے نہ دیا جائے۔

دربار میں جنتی کے خلاف کافور جو باتیں کرتا جنتی کے اہل دربار جنتی تک پہنچانا چاہتے مگر کافور کے خوف سے وہ جنتی کے پاس نہیں گئے۔

جنتی نے خود کو پھرے میں گمراہ ہوا دیکھا تو اس نے

کا۔ لی اللہ دی۔ ”یہاں ایک خواجہ سرفرازی غلاموں کا امام۔ آزاد غلام بن گئے اور غلام معبود بن گیا ہے۔ میں بے لیاں کرتا تھا کہ میں ایسا زمانہ دیکھوں گا۔ جس میں ایک کتا مجھ کو ستائے اور پھر مجھ کو اس کی تعریف کرنی پڑے۔“

اب حجتی کو یقین ہو چکا تھا کہ اس جھوٹے بعد وہ مصر میں نہیں رہ سکے گا۔

اس نے یہاں سے بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا اور اپنے آدمیوں کے ذریعے راستے میں جگہ جگہ بھاریاں دیوا دیئے۔

دس دن کی خوراک اپنے ساتھ لی اونٹوں پر پانی کے مشکیزے رکھوائے اور مسلح غلاموں کے ساتھ عید کے دن مصر سے فرار ہو گیا۔

کانو کو خبر ہوئی تو ہر طرف، ناکا بندیاں کروادیں راستے میں آباد عرب قبائل کو قاصد دوڑا دیئے گئے کہ حجتی جہاں ملے اس کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دیا جائے۔ راستے میں غلاموں نے بے وفائی کی اور اس کا ساتھ چھوڑ گئے لیکن حجتی کو نے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

کچھ دن کھنے میں قیام کرنے کے بعد وہ بغداد چلا گیا اس زمانے میں بغداد و علمویں (ایرانیوں) کے زیر اثر تھا اور مہملی، معز الدولہ کا وزیر تھا۔ حجتی نے اس کے دربار میں حاضری دی اور کئی دن تک مہملی اس انتظار میں رہا کہ حجتی اس کی شان میں کوئی قصیدہ لکھے گا لیکن حجتی نے ایک شعر بھی اس کی مدح میں نہیں کہا۔

مہملی نے دوسرے شاعروں کو حجتی کے پیچھے لگا دیا کہ وہ سب مل کے حجتی کا مذاق اڑائیں۔

حجتی اپنی جھوٹ دوسرے شاعروں کے اشعار ستارہا مگر کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے حامیوں نے کہا۔ ”اے حجتی! یہاں کے بہت سے شاعر تیری جھوٹ میں اشعار کہہ رہے ہیں تو ان کا جواب کیوں نہیں دیتا۔“

حجتی نے اپنا ایک شعر سنایا۔ ”اسے میں اپنے ایک شعر میں کہہ چکا ہوں۔ اب سب شاعروں کے جھوٹے اشعار کا جواب میرے اس شعر میں موجود ہے۔“

”جب کم درجے کے لوگ میری برائیاں بیان کریں تو یہی دلیل ہے کہ میں کامل ہوں۔“

بغداد میں اپنی ناقدر دانی دیکھ کر اس نے فارس اور

شیراز جانے کا ارادہ کیا یہ عہد الدولہ کا پانچویں تخت تھا اور یہ اپنے زمانے کا سب سے بڑا بادشاہ تھا اس کے درباریوں میں محمد بن الحمید بذات خود صاحب علم و فن تھا اور علم و فن کا نہایت قدردان بھی۔

اسے بتایا گیا کہ حجتی مہملی سے ناراض ہو کر اس کے پاس آ رہا ہے اور حجتی نے مہملی کی بہت بے عزتی کی ہے۔ ابن الحمید گھبرایا کہ کہیں یہ شاعر اس کے ساتھ بھی مہملی کی طرح نہ پیش آئے۔

اس نے حجتی کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کا نام حذارت سے لینا شروع کر دیا۔ وہ حجتی کی برائیاں کرتا رہا لیکن ایک دن ابن الحمید کے درباریوں میں کسی نے اس کو نہایت مقوم اور اداس سر جھکائے بیٹھے ہوئے دیکھا۔

درباری نے پوچھا۔ ”حضور والا! بہت شکر نظر آ رہے ہیں خیریت تو ہے۔“

ابن الحمید نے جواب دیا۔ ”کئی دن پہلے میری بہن کا انتقال ہوا اور اب تک اس کی تعزیت میں میرے پاس ساتھ خلیا آچکے ہیں اور ہر خط حجتی کے کسی شعر سے شروع ہوتا ہے ایسے شخص کی شہرت کو میں کس طرح مٹا سکتا ہوں۔“

ان دنوں ابن الحمید فزویں کے ارکان نامی قلعے میں مقیم تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ حجتی اس کے پاس آ رہا ہے تو وہ قلعے سے نکل کر آبادی سے دور ایک جگہ قیام پزیر ہوا اور حجتی کا انتظار کرنے لگا۔

ابن الحمید کے قریب پہنچنے کے بعد حجتی نے اپنا ایک غلام ابن الحمید کے پاس بھیجا۔

اس وقت ابن الحمید سونے کی تیاری کر رہا تھا اور اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ حجتی آچکا ہے تو وہ کھڑا ہو گیا اور نہایت حیرت سے پوچھا۔ ”کیا واقعی حجتی یہاں تک آ گیا؟“

حجتی کا غلام ابن الحمید کے سامنے پیش کر دیا گیا اور ابن الحمید نے اپنے خاص حاجب کو حجتی کے استقبال کے لیے بھیجا۔

یہ صاحب بھی خوب تھا کہ اسے راستے میں جو بھی ملا اس کو اپنے ساتھ لے لیا اور پھر حجتی اس کے ساتھ بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا اسے فوراً ابن الحمید کے سامنے پہنچایا گیا اور ابن الحمید نے اس کی بے حد تعظیم کی اس نے پہلے سے اپنے قریب ہی حجتی کے لیے کرسی چھوادی تھی اس کرسی پر خواب کا گداز ہوا تھا۔

جنتی نے اجازت دے دی اور ابن الحمید نے جنتی کی مجبوریاں اور شرائط عقد الدولہ کو لکھ کر بھیج دیں۔
چند دنوں بعد عقد الدولہ کا جواب آ گیا۔ ”جنتی کو ہر

بات کا پورا اختیار ہے گا۔“
اب جنتی کو ابن الحمید کی محبت چھوڑ کر عقد الدولہ کے پاس جانا پڑا۔

ابھی شیراز بارہ میل دور تھا کہ عقد الدولہ کا ابو عمر صباغ نامی نمائندہ جنتی کے استقبال کو پہنچ گیا۔

دونوں ایک ساتھ شیراز کے لیے چل پڑے۔ راستے میں صباغ نے فرمائش کی۔ ”اے جنتی! تو نے مصر کے کافور سے متعلق حقیقت پر مبنی کوئی قصیدہ لکھا تھا اگر اس کے چند اشعار راستے میں مجھے سنا دیے جائیں تو میرے لیے یہ بات بڑے فخر کی ہوگی۔“

جنتی نے قصیدہ مصر سنا دیا۔

شیراز میں جنتی کے لیے پہلے سے ایک آراستہ مکان تیار رکھا گیا تھا وہ کئی دن تک سفر کی ٹکان دور کرتا رہا۔ اس کے بعد عقد الدولہ کے دربار میں حاضری دی۔ یہاں دربار میں پیش ہونے والوں کو تخت شاہی کے متصل پائندہ کو بوسا دینا پڑتا تھا۔ جنتی نے بھی درباری قاعدے کے مطابق بوسا دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سواری کا ممنون ہوں جو مجھ کو یہاں تک لائی۔“

عقد الدولہ نے گر گجوشی سے سفر کے حالات پوچھے اور دونوں میں کچھ دیر گفتگو ہوئی رہی۔

کچھ دنوں کے بعد جنتی قصیدہ لکھ کر لے گیا اور درباری قاعدے کے مطابق کھڑے ہو کر قصیدہ پڑھنا چاہا لیکن عقد الدولہ نے اس کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور کہا۔ ”تو بیٹھ کے قصیدہ سنا سکتا ہے۔“

جنتی بے طلب ملنے والی عزت افزائی سے بہت خوش ہوا اور قصیدہ سنا تا رہا۔

عقد الدولہ نے انعام میں خیر، منک، عود، اسب خاصہ، کتواب کے استری کا چادر، امامہ جس کی قیمت پانچ ہزار دینار تھی۔ ہندوستانی مرغ تلوار جس کا قبضہ سونے کا تھا ان سب کے علاوہ اشرافیوں کے توڑے صلے میں دیئے۔

جنتی کی یہ قدردانی سابقہ قدر دانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن یہاں جنتی کے کلام میں پہلے جیسا زور نہیں پایا جاتا تھا۔ عقد الدولہ نے بھی اسے محسوس کیا اور اس نے کسی سے کہا۔ ”جب تک جنتی عرب میں رہا اس کے

ابن الحمید نے بے ساختہ کہا۔ ”میں تجھ سے ملنے کا بے حد مشتاق تھا۔“

جنتی نے ابن الحمید کے خلوص کا جواب چند اشعار میں دیا۔

بدوں سے میرا یہ پیغام کون جا کر کہے گا
کہ میں نے ارسطو اور سکندر دونوں کو دیکھا
میں نے بطلمیوس کو درس دیتے سنا
جو فرماں روا بھی ہے بدوی بھی اور شہری بھی
دونوں گرم جوشی سے دینک باتیں کرتے رہے۔

ابن الحمید نے جنتی کو خوش رکھنے کے لیے اس کی شاعری کا تعیار کیا۔ جنتی نے خاص اپنی تحقیق اور پیمان بین
۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳

کلام میں بلا کا زور پایا جاتا تھا۔“

جنتی نے جب کسی سے عقد الدولہ کی یہ بات سنی تو کہا۔ ”جیسے مخاطب ہوتے ہیں ویسا ہی شعر بھی کہا جاتا ہے۔“

اب جنتی کا دل یہاں سے بھی اچاٹ ہو گیا۔

عقد الدولہ کو معلوم ہو گیا کہ جنتی اس کی کسی بات سے ناخوش ہے اس نے کسی کے ذریعے جنتی سے معلوم کیا۔ ”اے جنتی! سچ بتا کہ تجھے عقد الدولہ سے جو بخشش اور انعام مل رہا ہے وہ گراں قدر ہے یا سیف الدولہ کا عطا کیا ہوا انعام واکرام۔“

جنتی نے جواب دیا۔ ”یہ عقد الدولہ نے ابھی تک جو مجھے دیا ہے وہ نہایت گراں قدر اور عظیم تر ہے لیکن میں نے اس میں کچھ تکلف بھی محسوس کیا ہے جب کہ سیف الدولہ کی بخشش میں اس کا اندرونی جوش و جذبہ محسوس ہوتا تھا۔“

جب جنتی کا یہ جواب عقد الدولہ کے گوش گزار کیا گیا تو اسے بے حد غصہ آیا مگر اس نے اپنے وعدے کے مطابق جنتی کو شیراز میں قیام کے رہنے پر مجبور نہیں کیا۔ جنتی نے ایک وداعی قصیدہ لکھا اور عقد الدولہ سے رخصت ہو کر گونے روانہ ہو گیا۔

ابو اوز بکھ کے قیام کیا راستے میں تیز بارش ہو جانے کی وجہ سے اس کا سامان بھیک گیا تھا اور کپڑے بھی نم ہو گئے تھے۔

یہاں اس نے صندوق کھلوا کر کپڑے دھوپ میں پھیلا دیئے میدان میں رنگ برنگے پیش قیمت پھیلے ہوئے کپڑوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف چمن ڈار کھل گیا ہے۔

یہیں کہیں قریب ہی بدوؤں کا سردار فائیک اسدی اپنے قبیلے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا جب اسے معلوم ہوا کہ جنتی بھی یہاں آرام کر رہا ہے تو وہ جنتی سے ملنے کے لیے آیا۔ جنتی نے فائیک اسدی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

فائیک اسدی نے نہایت ادب سے درخواست کی۔ ”اے جنتی! آگے راستہ پر خطر ہے اگر آپ کہیں تو میں اپنے قبیلے کے کچھ آدمی آپ کے ساتھ کچھ دوں آپ ان کو ان کی خدمت کے صلے میں کچھ انعام دے دیجیے گا۔“

جنتی کو اپنی بہادری اور سپاہ گری پر ناز تھا اس کے

علاوہ وہ بخیل بھی تھا اس نے فائیک اسدی کو حقارت آمیز نظروں سے دیکھا اور کوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جب تک یہ میرے ہاتھ میں ہے میں آسمان کے نیچے کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔“

فائیک اسدی نے کوئی جواب دیئے بغیر واپسی اختیار کی اور اپنے قبیلے میں پہنچ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”میں نے تو جنتی کو بہت عقل مند سمجھا تھا مگر وہ بخیل ہونے کی وجہ سے احمق بھی ہے۔“

فائیک اسدی اپنے ستر آدمیوں کے ساتھ چھپ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور پھر جیسے ہی جنتی سامنے سے گزرا تو یہ سب اس پر حملہ آور ہو گئے۔

جنتی دیر تک لڑتا رہا اور جب اسے اپنی شکست نظر آئی تو جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی۔

لیکن جنتی کے غلام نے اس وقت اس کا یہ شعر سنایا ”بھگ کو کھوڑے، راتیں، صحراء، جنگ و جدل، کاغذ اور قلم سب پہناتے ہیں۔“

یہ شعر سن کر غلام نے کہا۔ ”اب اگر آپ شکست اٹھا کے بھاگ کھڑے ہوئے تو اس سے آپ کی بڑی بے عزتی ہوگی۔“

وہ آخر تک لڑتا رہا اور مارا گیا۔

اس کی دولت پر فائیک اسدی کا قبضہ ہو گیا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جنتی نے بھی اس کے قبیلے کی جو کھلی تھی۔

جنتی کے ساتھ اس کا بیٹا اور غلام بھی مارا گیا۔

جنتی کا لغوی معنی نبوت کے دعوے دار کے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ کبھی اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا اور بہت سے لوگوں کو اپنا مرید بنالیا تھا۔ جب اس سے یہ کہا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ وآلہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ”لانی بعدی (میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) پھر تو نبوت کا دعویٰ کیوں کر رہا ہے؟“

”جنتی نے جواب دیا کہ میرا نام آسمان میں لا ہے اور آنحضرت نے فرمایا تھا کہ میرے بعد لانی شخص نبی ہوگا۔“

اس دعوے کے بعد اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا اور جب اس نے توبہ کر لی اور نبوت کے دعوے سے دستبردار ہو گیا تو اسے چھوڑ دیا گیا۔

لیکن شکی نعمانی اسے یاروں کا لطیفہ قرار دیتے ہیں۔



آشفہ سیر

زین مہدی

ہر صغیر میں اردو شاعری کو اوج پر پہنچانے میں کوشاں شعراء میں ایسے کئی نام ہیں جنہوں نے آزادی کے بعد انتھک کوشش کی اور اردو ادب کا دامن لبالب بھر دیا۔ انہی میں سے ایک بڑا نام علامہ جمیل مظہری کا بھی ہے جنہوں نے اپنا جہان خود پیدا کیا۔

اردو کے ایک بڑے شاعر کا تذکرہ خاص

انہی میں سے ایک بزرگ سید سالار غازی تھے جن کی سرکردگی میں غازی پور کا علاقہ فتح ہوا جو آج بھی مشرقی یوپی میں ایک مردم خیز خطہ سمجھا جاتا ہے۔ انہی سید سالار کی نسل میں ایک بزرگ سید تاج الدین گزرے ہیں جن کے نام سے قصبہ تاج سالار موسوی مدینے سے نکل کر بغداد اور وہاں سے ایران کے علاقے سبزوار پہنچے۔ سبزہ دار سے ان کی اولاد دوسرے ممالک میں پھیلیں ان میں سے کچھ آٹھ سو سال پہلے اور شاہان دہلی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔

پورا باد ہوا جو غازی پور سے دو تین اسٹیشن کے فاصلے پر آباد ہے۔ سید تاج الدین کی اولاد میں آس پاس کی بستیوں میں منتشر ہوئیں، نو نہرہ پارہ، کامون پور، زنگی پور وغیرہ چند ایسی بستیاں ہیں جہاں ان کی نسل کے سادات آباد ہیں۔ انہیں خاندان میں سے ایک خاندان مولانا سید ریاض الحسن کا تھا جو شہر غازی پور کے محلہ قاضی ٹولہ میں آباد ہوا۔ محلہ غازی باغ پٹنہ کی مشہور مخیر خاتون امام باندی بیگم نے اپنے شوہر کی تربیت بخیر اور مسجد کی امامت کے لیے منتخب کیا اور وہ تمام عمر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے دو صاحب زادے سید فیاض حسن اور سید مظہر حسن اور ایک صاحب زادی تھیں۔ سید فیاض حسن بھی عرصہ تک عظیم آباد میں ملازم رہے۔ سید مظہر حسن نے اپنے والد مرحوم کا علم اور ذوق شعر و ادب ورش میں پایا جسے زمانہ تعلیم میں لکھنؤ اور غازی پور (کلکتہ) کے قیام نے اور اس کے بعد عظیم آباد (پٹنہ) کی علم پرور فضا نے جلا بخشی۔ زمانہ طالب علمی میں ہی جب وہ لکھنؤ میں تھے ان کی قوت بصارت چمن علی صرف 32 سال کی عمر میں وہ ناپینا ہو گئے۔

انہی مولانا سید مظہر حسن کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ حسین آباد شیخ پورہ ضلع موکیر بہار کے نواب علی خان کی ریاست کے وہ مدار الحاح تھے اور ان کی آنکھیں بے نور تھیں مگر غرضی میں ملکہ حاصل تھا۔ کبھی کبھی سریشوں کو بھی دیکھ لیتے اور زبانی نئے بتا دیتے یا پھر مصاحبین و احباب سے خوش گہریوں میں وقت گزار دیتے۔ اس دن بھی وہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب آئے کچھ دیر باتیں کیں اور چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایک ہم نشین نے پوچھا ”مولانا! آپ کچھ شکر ہو گئے تھے۔“

انہوں نے جواب دیا کہ ابھی جو صاحب اٹھ کر گئے ہیں ان کی آواز کی نقابہت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہفتہ دو ہفتہ کے مہمان ہیں۔ سوال کرنے والے نے استہزاء کیا کہ مولانا! آپ کی بھی باتیں وہ تو اچھے خاصے بٹے کئے ہیں۔ اس وقت تو بات آئی مگر وہی ہو گئی مگر دسویں دن خبر آئی کہ جن صاحب کے متعلق انہوں نے حکم لگا یا تھا ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس واقعے کے کچھ ہی دنوں بعد کی بات ہے کہ مولانا سید مظہر حسن قبلہ چھڑی جیتے چلے جا رہے تھے۔ جاننے والے جانتے تھے کہ ان کی آنکھوں کا کام حس کر رہی ہیں اس لیے ناپینا کوا کیلے جاتے دیکھ کر بھی کسی نے ٹوکا نہیں۔ راستے میں ایک میدان تھا اس میدان میں دربار کے شہسوار جگن خان نیا خرید کر وہ گھوڑا پھرا رہے تھے۔ مولانا رک کر بے بصیرت

آنکھوں سے ادھر ہی دیکھنے لگے کچھ دیر تک گھوڑے کی ٹاپ سنتے رہے پھر پکار کر کہا ”خان صاحب! گھوڑے کا پچھلا پیر غلط پڑ رہا ہے۔“ خان صاحب نے دھیان نہ دیا۔ سمجھے کہ مولوی آدی پھر اترے گھوڑے کی چال کیا تمہیں گئے خواہ خواہ ٹانگ اڑا رہے ہیں۔ قصد انہوں نے پاؤں ٹھک کر کے اگلا پاؤں بٹکا دیا۔ مولانا نے فوراً ٹوکا، اب اگلا پاؤں بٹک رہا ہے۔ خان صاحب گھوڑے سے کودے اور مولانا کے پیر پکڑ کر بولے ”مولوی صاحب! ہم تو آپ کو ناپینا سمجھتے تھے مگر آپ تو روشن نمبر ہیں۔“

مولانا نے مسکرا کر کہا ”میاں! خدا نے آنکھوں کے ساتھ کان بھی دیے ہیں۔ میں آنکھوں کا کام کان سے لے رہا ہوں!“

مولانا مظہر حسن کے بارے میں نواب علی خان کا کہنا تھا کہ اکبر کے پاس نورتن تھے میرے پاس ایک اور یہ ایک رتن ہی نو کے برابر ہے۔ مولانا کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ مشیوں سے حساب سنتے اور زبانی میزان کر کے حساب کی غلطی پکڑ لیتے، بٹے کو خود پڑھا کرتے اور بتاتے جاتے دیکھو فلاں صفحہ کی فلاں طرح کے سامنے حاشیہ پڑ فلاں نوٹ لکھا ہوا ہے پڑھو۔ حالانکہ کتابوں سے الگ ہوئے چالیس سال گزر گئے تھے۔ وہ حاشیہ کے الفاظ پڑھتے تو بعینہ وہی الفاظ ملتے۔

فن تاریخ گوئی میں بھی انہیں ملکہ حاصل تھا کہ مختلف صنعتوں کے ساتھ تاریخ نکالتے، ایک ایک فقرے سے اٹھارہ اٹھارہ طریقے سے مادہ ہائے تاریخ نکالتے۔ دیگر اصنافِ سخن میں قصیدے، مثنوی، مرثیے، رباعیاں، قطعے، سلام اور نوحے کہتے۔ ان کے بیٹے مولانا خورشید حسین خورشید کو بھی وراثت میں مگروں کا شوق ملا اور وہ اپنے بڑے بھائی سید اطہر علی اطہر کی طرح خوش گوشا شاعر ثابت ہوئے۔ مولانا خورشید حسین کی شادی ہادی علی خان ڈپٹی مجسٹریٹ مغلیہ پٹنہ کی بیٹی سے ہوئی۔ شادی کے دوسرے یا تیسرے سال یکم جنوری 1905ء ان کے بطن سے مغلیہ میں میر کاظم علی پیدا ہوئے۔ کاظم علی کی والدہ سب سے چھوٹی تھیں اس لیے اپنے گھر والوں کو زیادہ پیاری تھیں اور میکے میں ہی زیادہ وقت گزارتی تھیں لیکن جب کاظم علی چار سال کے ہو گئے تو انہیں ان کی دادی نے اپنے پاس لایا۔ اب وہ دادی کے پاس ہی رہنے لگے۔ کاظم علی کی سن پیدائش میں اختلاف ہے۔ وقار راشدی نے ”شاعر“ آگرہ شمارہ اپریل 1946ء میں 1904ء جب کہ رضا مظہری نے ”سمائل“ گمیا بھارت کے جمیل مظہری نمبر

جلد دوم میں کم جنوری 1960ء لکھا ہے۔ میر کاظم علی جوان کا تاریخی نام ہے اس سے تاریخ ولادت 1321ھ ملتی ہے اور اسکول شوقیت برکھلی سے یکم جنوری 1905ء درج ہو گیا تھا جس کا ذکر ”جیل مظہری“ از مالک رام ”آج کل دہلی“ اگست 84ء اجتماع ضدین از رضا مظہری ”آج کل دہلی“ ”نقوش“ لاہور خضیات نمبر۔ ”بیسویں صدی میں مغربی رنگال کے اردو شعراء“ از مشتاق احمد ”مسلم شعراء بہار“ از حلیم سید احمد اللہ ندوی۔ ”سہیل“ گیا جیل مظہری نمبر فردی مارچ 82ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سید محمد رضا کاظمی ”جیل مظہری“ مختصر حالات زندگی میں تحریر کرتے ہیں خاندانی روایت کے مطابق ان کی پیدائش 1904ء میں ہوئی لیکن اسکول کے بابو نے 1906ء کی سالگرہ 1906ء لکھا اور یہی تاریخ والدین کی اصلی تاریخ اصل ہوئی۔

پہلے بھائی: ناہ رضا مظہری ”آج کل دہلی“ اگست 82ء کے جیل مظہری نمبر میں لکھتے ہیں ”بھیا (جیل مظہری) جب چار سال کے ہوئے تو دادی نے انہیں اپنے پاس رکھ لیا اور اتنے لاڈ پیار سے پرورش کرنے لگیں کہ خود اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے الگ کھانا پکاتیں اور سب سے پیچھا کر کھاتیں۔ نماز روزے طہارت وغیرہ کی بے حد پابند تھیں۔ ان کے بستر پر ان کے صاحب زادوں کو بھی بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر یہ لاڈ لے پوتے ضد میں آ کر آنگن میں لوٹ لگاتے اور آکر بستر پر دراز ہو جاتے۔

جب بھیا نے پانچویں سال میں قدم رکھا تو ان کا کتب ہوا۔ موضع عشری کے مولوی سید طالب حسین ان کے معلم مقرر ہوئے۔ پڑھائی شروع ہوئی۔ بھیا بھی جانے میں کچھ تامل کرتے تو اماں انہیں زبردستی بھیجتا چاہتیں۔ وہ ماں کے ڈر سے جانے لگتے تو دادی کہتیں کیا لڑکا ہے کہ دس سر میں ارد بے جا کے لیٹ رہا۔ اس صورت حال کو دیکھتیں تو اماں بڑبڑہاتیں مگر اس کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتیں۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے تھا جو پنڈت کا گرجو بیٹ خاندان کہلاتا تھا اس لیے وہ تعلیم کو مقدم سمجھتی تھیں۔ وہ موقع کی تلاش میں تھیں کہ کسی طرح ہرمون شائستہ دادی کو پوتے سے الگ کر دیں۔ حسن اظہار یہ یہ موقع انہیں 1910ء میں مل گیا۔ والد مرحوم کو ملا، والدہ بی اوق بہت تھیں۔ زمیندار خاندان سے تھے۔ اس لیے ملازمت کی ضرورت نہ تھی مگر مختلے ماموں خان بہادر سید احمد علی خان ملیم نے ان کی علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کو

رائیگاں جاتے دیکھ کر انہیں مشورہ دیا کہ وہ پنڈت اینگو عربک اسکول میں اردو فارسی اور عربی کے معلم مقرر ہو جائیں۔ والد نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔ اب والدہ کو مستقل پنڈت بننے کا موقع ملا تو بھیا کو دادی سے جدا کر کے پنڈت لے آئیں۔ مولوی صاحب جو بھیا کے معلم تھے وہ بھی ساتھ آئے تاکہ تعلیم کا حرج نہ ہو۔ وہ انہیں گھر میں پڑھاتے پھر بھیا کو مدرسہ سلیمانیہ چچم دروازہ پنڈت کی ابتدائی جماعت میں داخل کر دیا گیا مگر وہ زیادہ دن وہاں پڑھ نہ سکے کیونکہ والد صاحب کا تبادلہ موٹہاری ضلع اسکول میں ہو گیا۔ اسی دوران میں یعنی 1912ء میں دادی کا انتقال ہو گیا پھر مولوی طالب حسین نے بھی پنڈت چھوڑ دیا اور اپنی جگہ اپنے ایک عزیز مولوی سید امداد امام عشری کو رکھوا گئے۔ مجبوراً 1914ء میں والدہ صاحبہ کو بھی موٹہاری منتقل ہونا پڑا۔ وہیں کے ضلع اسکول میں بھیا کو پانچویں جماعت میں داخلہ دلوادیا گیا مگر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکے اور 1915ء میں ان کی والدہ صاحبہ سب کو لے کر پنڈت لوٹ آئیں۔ بہانہ تھا ان کے میکے کی ایک شادی کا۔ 1916ء میں والد صاحب کا پھر ایک بار تبادلہ ہو گیا۔ اس بار انہیں ضلع مظفر پور اسکول میں مقرر کیا گیا تھا۔ بھیا کو بھی اسی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسی سال انہوں نے سالانہ امتحان میں اردو کے پرچے میں گھوڑے پر مضمون لکھا اس مضمون میں انہوں نے میر انیس کے ایک مرثیے کے وہ اشعار بھی لکھے جو گھوڑے کی تعریف میں تھے۔ کاپی چیک کرتے ہوئے مولانا شعیب عربک پنچر نے اس مضمون کو پڑھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ پورے شہر میں اس کاپی کو فخریہ دکھاتے پھرے کہ یہ ایک بارہ سال کے بچے نے لکھا ہے میری پیش گوئی ہے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر بھینا بہت بڑا ادیب بنے گا۔

1916ء کی ہی بات ہے۔ شہر کے ایک رئیس جناب امام الدین خان نے اپنی امام منزل میں ایک طرحی مشاعرہ منعقد کیا۔ یہ مشاعرہ اس لیے منعقد ہوا تھا کہ رام پور کے ایک تاجر عطر ثابت رامپوری ان دنوں مظفر پور آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے فخریہ کہا تھا کہ شاعری تو بولی والوں کا حصہ ہے بہار والے شاعری کیا جانیں۔ حالانکہ عظیم آباد (پنڈت) جو دلی اور لکھنؤ کے بعد اردو شاعری کا تیسرا گہوارہ تربیت تھا شاد عظیم آبادی مبارک عظیم آبادی مولانا فضل حق آزاد نواب امداد امام اثر میر یاقرب حسن کے متعلق داغ نے مثنوی ”فریاد داغ“ میں لکھا ہے۔

میر یاقرب کے گھر قیام ہوا

ہوا اسی میں علامہ جمیل مظہری کی پہلی نظم ”بادل کی بیٹی“ چھپی۔ اسی رسالہ میں انہوں نے کئی درس ٹریول کا ترجمہ ”خوردک آباد کی سیر“ کے عنوان سے کیا۔

مشہور ادیب مالک رام ”آج کل“ دہلی میں لکھتے ہیں۔ ”اس کے بعد انہوں نے 1925ء میں سان زیویرس کالج کلکتہ سے انٹر اور 1928ء میں اسلامیہ کالج اور بنگ ہاشی کالج کلکتہ سے بی اے کیا۔ اسی دوران میں ان کی زندگی توس قرح سے حزن ہو گئی۔ اب تک ان کی شاعری صرف اور صرف تحفہ کے سہارے رواں دواں تھی مگر اب اس میں رنگ بھر گئے تھے جس نے ان کی شاعری پر گہرے نقوش مرتب کرنا شروع کر دیے۔

بقول ماہ ”میر“ ”میرے بھیا (جمیل مظہری) بھی کبھی جوان تھے ان کی شاعری بھی جوان تھی ان کے دل کی صدا میں بھی کبھی سہانے گیت بنا کرتی تھیں۔ ان کی تمنائیں بچپن کے گھر وندوں میں خوب خوب کھیل رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے آنسوؤں کے آچل میں موتی بن رہے تھے۔ دھانی سائے اور گلابی دھوپ میں انہوں نے بھی پگھٹ کا نظارہ کیا۔ پازیب کی جھنکار سے انہوں نے ہوا کو جھومتے سنا۔ شعلی دکھ بھری آنکھوں میں نیند کو کھیلنے بھی دیکھا۔ میرے بھیا کی زندگی شاید اسی جوانی کا سوگ ہے۔“

لیکن بدقسمتی سے یہ عشق پروان نہ چڑھ سکا اور 1938ء میں اس پر خطِ پنج مچ گیا۔

اسی دوران میں جمیل مظہری کی مشہور نظم ”ڈرو خدا سے ڈرو“ سامنے آئی اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ شائقین ادب کے علاوہ عام لوگوں میں بھی اس نے جگہ بنائی اور فلمی گانوں کی کتابوں، ایسی دو درتی کتاب کلکتہ کے ایک صاحب نے چھاپ کر ہاتھوں ہاتھ بیچی۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

سنو جمیل سنو تم سے یہ گزارش ہے
یہ آرزو نہیں دل سے نظر کی سازش ہے
سمجھ لو یہ کہ محبت بھی ایک خواہش ہے
اے جنوں نہ بناؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو
ادھر ادھر نظر اٹھے تو سامنے تم ہو
میں ہوا سے جو پردے تو سامنے تم ہو
کروں خدا کو جو سجدے تو سامنے تم ہو
نماز میں نہ ستاؤ! ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

خوب دعوت کا اہتمام ہوا
مذکور بالا شعرا کے علاوہ یاس یگانہ چنگیزی، صغیر بلکرائی، شہید اعظم آبادی وغیرہ جیسے مشہور شاعر بھی بہار کے تھے)
امام الدین صاحب کو یہ بات گراں گزری اور انہوں نے صرف یہ دکھانے کے لیے کہ بہار کے اس چھوٹے سے شہر میں اردو کے اچھے شاعر موجود ہیں۔ والد مرحوم نے اپنی غزل طرح میں کہہ کر بھیا کو دے دی کہ وہ مشاعرہ میں پڑھ آئیں۔ اس غزل کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔
رو گئے گئے وہ زار زار میرا حذر ادھر

بھیا نے اس غزل کو ایک خاص انداز سے لہک لہک کر پڑھی۔ لوگوں نے خوب داد دی۔ اس کے بعد تو بھیا کو ہر مشاعرے میں بلایا جانے لگا۔

مظفر پور میں بھیا کی غزل خوانی کا یہ سلسلہ 1920ء تک چلتا رہا پھر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ چلے گئے۔ اس کے بعد کاذکر رضا مظہری ”سہیل“ گیا جمیل مظہری نمبر 1960ء میں اس طرح کرتے ہیں ”1920ء میں بھیا نے کلکتہ کا رخ کیا۔ حسن اتفاق سے ہمارے ماموں زاد بھائی مولوی سید زاہد علی خان اس زمانے میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے۔ والد مرحوم نے بھیا کو انہیں کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا۔ 1921ء میں بھیا درجہ نہم سے درجہ دہم میں آئے۔ ان دنوں مدرسہ عالیہ کے ہیڈ ماسٹر خان بہادر مولوی محمد یوسف تھے۔ وہ ”بینٹ اپ“ کرنے کے معاملے میں کسی سے رعایت نہیں کرتے تھے۔ بھیا ہمیشہ سے ریاضی میں کمزور تھے۔ انہوں نے رعایت نہ ملنے کے خوف سے ٹیسٹ سے دو تین مہینے پہلے ہائی اسکول میں اپنا نام لکھوایا۔ اسی اسکول سے انہوں نے 1922ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ (جبکہ وہ کلام حیدری کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ میں نے مدرسہ عالیہ سے میٹرک پاس کیا؟) مدرسہ عالیہ کے دوران تعلیم میں بھیا نے گویا شاعری شروع کی۔ ان کے ہم درس ایک صاحب اطہر قادری تھے جو چشمہ قدہ میں تو مٹھی تھے مگر قدتہ انگیزی میں بلا کا سلیقہ رکھتے تھے چنانچہ بھیا نے ان کی جو کبھی۔

چلو اے گا کلاس میں تو ارقادری
مگر باضابطہ شعر کوئی انہوں نے اس کے دو تین سال بعد شروع کی، ہاں مشاعروں میں سامع کی حیثیت سے ضرور شریک ہوتے۔“
1922ء میں دفتر عمر جدید سے ایک رسالہ ”نثر“ شائع

علامہ وحشت کلکتوی لکھتے ہیں

”جیل مظہری کے کلام کی دلکشی کا راز ان کی انفرادیت میں مضمر ہے۔ ان کا کہا ہوا پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں جیل مظہری کی تحقیق ہوں۔ ان کے خیالات ایک خاص انداز کے لفظ طلب کرتے ہیں جو ہمیشہ ان کی خدمت کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ خیالات کی ندرت اور الفاظ کی مناسبت اعجاز کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔“ پروفیسر جنوں گورکھ پوری رقم طراز ہیں کہ وہ شاعر تھا اور شاعر کے عام تصور سے بلند تھا، وہ مفکر تھا اور مفکر کے عام تصور سے بلند تھا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کے ساتھ اتنا وسیع تاریخی و ادبی علم رکھتے ہوں۔ گویا جیل مظہری کی شخصیت شعر اور علمی فضیلت دونوں کا خوشگوار جوہر تھی۔“

علامہ نیاز فتح پوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”جیل مظہری ملک کے ان خصوص شعراء میں ہیں جو اردو شاعری میں اس وقت استادانہ بلکہ مرشدانہ حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی شاعری ایک مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔“ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اظہار خیال کرتے ہیں ”مقبولیت حاصل کرنے والے شعراء میں کسی کی پرواز جیل مظہری تک نہیں۔ فکر فن کے اعتبار سے ان کا کوئی ہم عصر ان کے حریف ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“ جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں ”لکھنؤ سے خط آیا تو وہاں کے کئی کوپے اور کوٹھے نظروں کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے لیکن جیل مظہری کے انتقال کی خبر پڑی تو تصورات کا یہ محل مگر گر تباہ ہو گیا۔ ہائے جیل مظہری! کیا کہوں، کیا لکھوں کیا کروں؟ سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کس کس کا ماتم کروں۔ اب تو میری موت پر انسو بہانے والا پرانا دوست شاید ہی بکائی ہو۔“

جو پاس چولے کے اماں کے ڈر سے جاتی ہوں
تو خود بھی جلتی ہوں سان کو بھی جلاتی ہوں
نمک سمجھ کے شکر وال میں ملاتی ہوں
نہ یوں دیوانہ بناؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو
میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں تمہیں خدا کی قسم
فلکتہ حائی عذرائے بے وفا کی قسم
جو جل رہی ہں بتدریج اس چٹا کی قسم
ہوس کی آگ بجھاؤ ڈرو خدا سے ڈرو
مجھے نہ یاد کرو

54 مصرعوں کی اس نظم کے بارے میں جیل مظہری خود لکھتی ہیں ”لوگوں نے اسے میری آپ بیتی سمجھ لیا جو میرے اہل بھری کامیابی کی دلیل ہے کیونکہ میرے خیال میں شاعری نام ہے اس شعور کا جو دوسروں کی بیتی ہوئی کو آپ بیتی بنا کر اس طرح پیش کرے کہ ہر سننے والا یہ سمجھے کہ کہنے والا اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ آپ کو سن کر یہ حیرت ہوگی کہ اس نظم کے پیچھے جو واقعہ ہے وہ میرا نہیں ہے میرے ایک عزیز دوست کا ہے جسے ایک ایسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی جو سولہ سترہ سال کی عمر میں ایک بوڑھے سے بیاہ دی گئی تھی مگر اپنے دل میں ایک استغلوں بھرے دل کے ساتھ ایک شدید احساس فرض بھی رکھتی تھی۔ عشق فرض کہ یہ ذہنی کش مکش اس کے ان خطوط میں نمایاں ہوتی رہتی جو اپنے چاہنے والے کو لکھا کرتی۔“

جیل مظہری کی اس بات کو اکثر نقادوں نے غلط سمجھ لیا ہے اور اس نظم کو انہی کی آپ بیتی قرار دیا ہے۔ جیل مظہری نے اس نظم کا جواب بھی لکھا تھا جس میں محبوب جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی محبوبہ کو سمجھاتا ہے۔

جوانی کی ایک چھاؤں تھی گزرتی نکل گئی
ہمارا انتظار کر کے وہ پہر بھی ڈھل گئی
لیکن ”عشق نا تمام“ نامی نظم کو اتنی مقبولیت نہیں ملی جو پہلی نظم کو ملی۔ جیل مظہری نے 1931ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ وہ خود لکھتے ہیں ”پہلے میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور پھر بنگو پاشی کالج میں۔ وہیں سے میں نے بی اے کیا۔ فارسی اور تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔“

ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ ذہن ادبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ انہیں کسی ایسی نوکری کی تلاش تھی جو روح کو بھی غذا فراہم کر سکے۔ مگر دوستوں نے مدد دی اور کچھ اپنا شوق روزنامہ الہند

کے مدبر بن گئے۔ اپنے کلام کی اصلاح کے لیے وہ علامہ وحشت کلکتوی کے پاس جا چکے تھے۔ طوطی بنگال علامہ وحشت نے دو تین غزلوں پر اصلاح بھی دی مگر بعد میں انہوں نے کہہ دیا۔

”میاں جمیل! تمہاری زبان دانی مستند ہے عروض و قوافی سے بھی واقف ہو چکے ہو انہیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔“
علامہ وحشت کا حکم تھا اس لیے وہ اپنے اشعار انہیں برائے اصلاح نہیں دیتے لیکن بد دل سے انہیں اپنا استاد ماننے۔ صرف لکھنے کی چند غزلیں اصلاح کروائی تھیں پھر بھی دل میں عقیدت رکھتے تھے۔

جمیل مظہری اس دور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔
”ایم اے کا امتحان دے کر کلکتہ کی صحافتی زندگی میں داخل ہوا اور رفتہ رفتہ کلکتہ کی ادبی اور علمی مجلسوں تک جا پہنچا۔ میری عمر کا وہی حصہ جس کی یاد آج بھی میرے دل کو ایک روشن کنول بنائے ہوئے ہے۔ ماضی کی تاریکی میں مجھے پہلا روشن چہرہ جو نظر آتا ہے وہ اپنے شفیق ترین استاد مولانا رضا علی وحشت کا سنجیدہ اور محکمیر چہرہ ہے لیکن عام مولویوں کے چہرے کی طرح خشک اور سہاٹ نہیں بلکہ متبسم، محبت انگیز اور عقیدت آموز ان کے نام سے اس وقت سے واقف تھا جبکہ میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میں ”تمدن“ اور ”مخزن“ کے رسالوں میں ان کی غزلیں پڑھا کرتا تھا“ وغیرہ۔

چار پانچ سال بعد جب کلکتہ آیا تو میں نے انہیں ”مسلم انشٹی ٹیوٹ“ کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھنے دیکھا۔ پھر ویلسلی اسکوائر کی سڑکوں پر آتے جاتے دیکھا اور ادب سے سلام کرتا اور وہ شفقت سے جواب دیتے رہے لیکن گفتگو کی ہمت نہ ہوئی۔ یہ ہمت اس وقت ہوئی جب وہ کلکتہ کے نئے اسلامیہ کالج میں بحیثیت پروفیسر اور میں بحیثیت طالب علم کے داخل ہوا۔ ۱۹۱۶ء دوران میں ان کے شاگردان خاص ابو الحسن نیکل اور قمر صدیقی سے میری ملاقات ہوئی اور انہیں کے توسط سے میں بھی بھی اتوار کو ان کے دولت کدے پر حاضر ہونے لگا۔ ہر اتوار کو ان کے دولت کدے پر منعقد ہونے والی یہ نشست ادب اور فن کا ایسا مدرسہ ہوتی تھی جوں بجے دن سے دو بجے تک کھلا رہتا۔ ارباب ذوق اور یاران ادب آتے رہتے اور بہترین زعفرانی چائے، ٹیکہ اور سوسے سے ان کی ضیافت ہوتی رہتی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی ذات سے بعزل نواب امداد امام اشرمیتانہ غالب کے تنہا ساتھی تھے میں اس میخانے کا جرہ نوش

بن کر کاظم سے جمیل مظہری بنا۔ استاد مرحوم بحیثیت شاعر کے ہندوستان کے ہر عظیم شاعر کے مقبول و محترم ہم عصر تھے۔ ان کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کے علاوہ آغا حشر کاشمیری اور نواب خیال نے میرے ذہن اور اس کی تعمیر میں مساوی حصہ لیا تھا۔ میں نے ہی ان دونوں (آغا حشر) کے بزرگوں کی ملاقات کرائی تھی لیکن اس ملاقات کا سلسلہ بڑی تلخ کلائی پر ختم ہوا اور آغا حشر کے ڈراموں کا انگریزی ترجمہ کرانے کی جو جو بیزاری وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اس کی داستان یوں ہے کہ داستان اردو (تاریخ ادب اردو) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے بعد نواب خیال نے ایک مقالہ فردوسی کی ڈرامائی رزمی نگاری پر لکھا اور جو یہ ہوئی کہ ایک بڑے جلسے میں وہ اسے پڑھ کر سنائیں۔ چنانچہ جلسہ ہوا۔ بڑی ہجوم دھام سے ہوا۔ نواب امام نے اپنے رسوخ سے کلکتہ میوزیم کا ایک بڑا ہال مخصوص کر دیا۔ صدارت کے لیے نواب صاحب نے آغا حشر کو موزوں ترین سمجھا۔ حالانکہ میں نے دلی زبان سے اس کی مخالفت کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ آغا صاحب فردوسی (فارسی کا شاعر) کے قائل ہی نہیں بلکہ بدترین دشمن ہیں۔ وہ مجھ سے بار بار یہ کہہ چکے تھے کہ فردوسی شاعر نہیں بھانڈ تھا جو لوگ میرا نفس کو فردوسی ہند کہتے ہیں وہ انیس کی توہین کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جلسے میں نواب صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ سامعین نے ان کی تعریف میں بار بار تالیاں بجائیں اور آغا حشر کی صدارت پر بیٹھے بیچ و تاب کھاتے رہے صدارتی تقریر کے لیے اٹھے، آندھی کی طرح چٹکھائے اور بادل کی طرح گرجے، برسنے لگے۔ خطابت کے ساتھ ایکٹنگ کے کرشمے بھی دکھائے فردوسی کو کبھی کھول کر کوسا، محمود فرزند کی شرافت اور فردوسی کی ذلالت کی نئی نئی کہانیاں سنائیں اور سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ نواب صاحب کے مقالے کا ادبی حیثیت سے تعارف بھی نہیں کرایا جو بحیثیت صدر ان کا فرض منصبی تھا۔ ان کا غضب ناک چہرہ اور نواب خیال کی تحمل متغزل صورت وہ تصویریں تھیں جن کی عکاسی کی قوت میری زبان میں ہے اور نہ میرے قلم میں۔ بہر حال جلسہ بڑی ناگواری کے ساتھ ختم ہوا۔ نواب زادہ عبدالحی اور علامہ وحشت پانیاں جلسہ میں تھے منہ لٹکانے ہوئے ہال سے باہر نکلے۔ آغا حشر ذوق تلخ آبادی کے کانڈھے پر ہاتھ دھرے کچھ مسکراتے اور کچھ شرماتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ تیسرے دن نواب خیال کا مراسلہ روزنامہ ”ہند“ میں شائع ہوا جس میں شرکانے جلسہ کی

غزل

بقدر پیمانہ قہقیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب ہیتم تو دم نکل جائے آدی کا
بس ایک احساس نارسائی نہ جوش اس میں نہ ہوش اس کو
جنوں پہ حالت ربودگی کی خرد پہ عالم غنودگی کا
ہے روح تاریکیوں میں حیراں بجا ہوا ہے چراغ منزل
کہیں سراہہ یہ مسافر پنگ نہ دے بوجھ زندگی کا
خدا کی رحمت پہ بھول بیٹھوں یہی مانتی ہے اس کے واعظ
وہ ابر کا خضر کھڑا ہو مکان جلا ہو جب کسی کا
جیل حیرت میں ہے زمانہ مرے نقول کی مقلی کا
نہ جذبہ ابجائے رضوی نہ کیف پردہ شادی کا
☆☆☆☆

پچھ تو گرد راہ گرد کارواں بنتے رہے
کچھ غبار ایسے بھی تھے جو آسماں بنتے رہے
ہم نے یہ عالم بھی دیکھا اے جنوں خود گری
کہ چمن اجڑا کیا اور آشیاں بنتے رہے
تارے سورج ہو گئے لمحات صدیاں بن گئے
اور خلا میں آسماں پر آسماں بنتے رہے
کارواں وقت آگے کی طرف بڑھتا رہا
اور ہم انسان گرد کارواں بنتے رہے
ہم نے اس دنیا میں آکر کیا بنایا کیا بنے
ہاں مگر کچھ عالم وہم وگماں بنتے رہے
ایک وہ جو بے چش کرتے رہے اظہار نور
ایک ہم جو سوز رکھ کر بے زباں بنتے رہے
ہم نہ سمجھے کچھ چمن کا راز اچھلا کی نسیم
پھول کھل کھل کر مشیت کی زباں بنتے رہے
منظری جلا رہا یوں ہی میرے دل کا الاؤ
کوئی پاس آیا نہیں شعلے دھواں بنتے رہے
(جیل منظری)

شرکت کا شکر یہ ادا کرتے ہوئے آغا حشر کی گرم گرفتاری کے
سلسلے میں چبوتا ہوا جمل لکھتا تھا کہ تماشا اچھا تھا اور آپ لوگوں
کی شام دوپہی سے گزر گئی۔ آغا حشر نے جو اس مراٹے کو بڑھا
تو آدی سے سلکتا ہوا تنور بن گئے۔ آغا حشر جائیں تو جائیں
کہاں۔ سیدھے عصر جدید کے دفتر پہنچے۔ شوخی تقدیر سے
جناب خیال پہلے ہی سے میری میز کے سامنے ایک کرسی پر
تشریف فرما تھے۔ آغا صاحب انہیں دیکھتے ہی مریختے بیڑی کی
طرح چومیں مارنے لگے۔ لیکن نواب صاحب حلم جسم بنے
بیٹھے رہے۔ ادھر شعلگی ادھر رخ نیگی ادھر خاموش اضطراب
بڑی مشکل سے مولانا شائق احمد عثمانی نے آغا حشر کے ہاتھ
کا ہاتھ دیکر انہیں رخصت کیا۔ حالات بدترین شکل اختیار
کئے۔ نواب زادہ عبدالغنی نے سلسلہ کرا دی۔

منظری نے ایم اے کرتے ہی سماجی زندگی کی
شرور مائل لڑی تھیں۔ طبع آبادی کے روزنامہ "الہند" کی
ادارت خیال کی بنا ہوش تھا۔ مولانا تھا۔ یہ اسی فنون میں
کری تھی۔ حکومت برطانیہ نواب نواب لڑا شروع کر دیا۔
غلام ملک کا ایک معمولی اخبار اس حکومت پر تنقید کرے جس
کے راج میں سورج کبھی غروب ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات
حکومت برطانیہ کو بہت بری لگی اور اس نے باک اخبار کو صرف
اداریوں کی وجہ سے ایک ماہ کے اندر بند کر دیا گیا۔ اخبار
بچانے کے لیے طبع آبادی نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی
الہند سے لفظ تو فری لانسر کی حیثیت سے مختلف پرچوں میں
لکھنے لگے۔ قلم میں ٹیکھا پڑھا غضب کی کاٹ تھی۔ ان کے
مضامین کو شائق احمد عثمانی بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی اسی
خاصیت پر شائق احمد عثمانی نے انہیں جھپٹ لیا تاکہ ان کے
روزنامے "عصر جدید" میں لکھیں حالانکہ شائق احمد عثمانی اور
جیل منظری کے درمیان نظریاتی اختلافات کی گہری کھائی تھی
پھر بھی دونوں میں خوب فہم فہمی تھی۔ اس اختلافات کی بنا پر جیل
منظری نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں فکاہی حصہ لکھوں گا اور آپ
سیاسی۔ چنانچہ وہ "کوچہ گرد" کے قلمی نام سے مہلات نامی کالم
لکھنے لگے۔ اسی دوران میں ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکلا مگر وہ
جیل نہ لکھیں ان کا کالم بدستور چلتا رہا۔

مختلف اوقات میں زمانہ ہمدرد شفاعت اللہ خان نے
ہاری کیا ان میں بھی وہ بہ حیثیت جوائنٹ ایڈیٹر کے کام کرتے
تھے۔ اب صدیق انصاری نے "سچ" شروع کیا تو انہوں نے
اس اہمار کے ذریعے اپنا ایک الگ "روپ" قارئین کے
سامنے پیش کیا۔ مشہور طنز نگار رضا نقوی داعی اس دور کا نقشہ

فلمی صحافیوں کے پیچھے لٹے کر دوڑنے کی ایک وجہ اور تھی۔ 1933ء میں آغا شہر کا شیری اور دانش کے درمیان مقدمہ بازی چھڑ گئی تھی۔ اس مقدمہ بازی کے نتیجے میں ادبی رسالوں اور فلمی رسالوں کے درمیان بھی ٹھن گئی۔ جمیل مظہری نے ادبی رسالوں کے ترجمان بن کر جو کے کو لے دانے شروع کر دیے تھے۔

گلگت کی معنوں میں اہم مقام رکھتا تھا۔ آبادی کے لحاظ سے اس دور میں بھی سب سے بڑا شہر تھا۔ انگریزوں نے 1875ء کے بعد سے ہی دہلی کو پایہ تخت بنایا تھا۔ دار الحکومت منتقل ہو جانے کی وجہ سے اس شہر کو اجڑ جانا چاہیے تھا مگر ایسٹ انڈیا کمپنی کی وجہ سے اب تک یہ شہر اہمیت کا حامل بنا ہوا تھا۔ ہندوؤں اور کرچوں کی مجموعی آبادی کے برابر مسلمانوں کی آبادی تھی۔ ”چوہن پرگنہ“ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے شہر میں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی تھی۔ شہری اور دیہاتی مسلمانوں میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ دیہاتیوں کی زبان بنگالی اور شہریوں کی اردو سی وجہ سے 1935ء میں خلافت کمیٹی نے مسلم کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کانفرنس کے ساتھ اردو لٹریچر کانفرنس کی بھی داغ بیل ڈالی اور حسین شہید سہروردی و ملا جان محمد نے اصرار کر کے مجلس استقبالیہ کی صدارت جمیل مظہری کو سونپ دی۔

اس کانفرنس میں انہوں نے ایک ایسا خطبہ پڑھا جو خاصا انقلابی تھا۔ اس خطبے میں انہوں نے صاف اور واضح الفاظ میں کہا کہ ادب برائے ادب کے نظریے سے انحراف ضروری ہے۔ اردو ادب اگر آزادی کی تحریک کے کام نہیں آ سکتی تو اس کے یہی معنی ہیں کہ یہ اپنا فرض پورا نہیں کر سکتا۔ اسے تحریک آزادی کو آگے بڑھانے کا مقدس تاریخی فرض انجام دینا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے اس خطبے پر بخت تنقید کی لیکن خواجہ حسن نظامی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ وطن عزیز کی آزادی کے لیے ضروری ہے کہ ہر سطح پر کوشش ہو۔ ادب تو ہمارا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔

جس وقت جمیل مظہری انچ سے اترے مولانا شوکت علی نے مجمع کے درمیان سے انہیں کھینچا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ انہیں بار بار چوم رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے۔ ”مظہری تم نے میرے دل کی بات کہہ دی خدا تمہارے قلم اور زبان کو مزید تقویت دے۔“

اس کانفرنس نے انہیں مولانا ابوالکلام آزاد سے زیادہ

میں بہت زیادہ زمانہ تھا جب کلکتہ کی اردو صحافت پر زیادہ فلمی و معنوی کی چھاپ رہتی تھی۔ ہفتہ وار اخبارات تو انصرمی طور پر فلمی شخصیتوں ہی کے ذکر و افکار سے معمور رہتے تھے بعض فلمی صحافیوں نے صحافت کو ابتدائی کی اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ ان کی قدر وانی کے سلسلے میں فلمی ایکٹریوں کو خاتم اور نیکم بنا ڈالا۔ کسی نے کسی کو سیدانی ثابت کرنا چاہا تو کسی نے کسی کو جوش محبت میں اپنی بہن لکھ ڈالا۔ عام طور پر فلمی صحافی ایکٹریوں کے مستقبل اور بار بار ہو گئے۔ جمیل مظہری نے بعض دوستوں اور بزرگوں کے اشارے پر اس طرف توجہ کی اور ان کی طبیعت میں خود جو انقیاض تھا وہ سب سے پہلے ایک قطعہ کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہی قطعہ جمیل مظہری کی طرافت نگاری یا جو نگاری کی ابتدا ہے فرماتے ہیں۔

کل ملنے آئے مجھ سے مرے ایک عزیز دوست مشروب روف و بہ ایمان صابری زیر بغل خطوط و تصاویر مہ رخاں ورد زباں حدیث سبیا و باھری قطعہ کے بعد غزل کی ابتدا اور اس ہزل کے چند شعر لیکن خطا معاف مجھے پوچھتا ہے یہ کس روگ کی دوا ہے یہ فلمی ایڈیٹری آئینہ سامنے ہے ادھر دیکھیے ذرا سجدوں کا داغ اور جبین ایڈیٹری دس شعر کے سوال کے بعد دس شعر کا ہی جواب کہنے لگے بگڑ کے کہ حاسد ہیں آپ لوگ پوچھا ہے صاف صاف تو سنئے کھری کھری عزت ہماری دیکھیے بازار حسن میں مس مہ جبین بوہاتی ہیں پانوں کی طشتری

اسی دور میں جمیل مظہری نے مسدس ”شہر آشوب“ لکھا تھا۔ یہ مسدس مسدس حالی کی پیروڈی تھی۔ اس دور میں صحافت کس درجے پر چکی تھی اس کا انہوں نے پورا نقش کھینچا تھا۔ مشہور ادیب و صحافی خواجہ حسن نظامی نے ایکٹریوں کے فلمی چہرے لکھے تھے۔

وہ دلی کے مشہور عہد نظامی تصوف میں رشک ستانی و جای ہے خواجہ حسن جن کا اسم گرامی قلم ان کا دے ایکٹریوں کو سلائی لکھے فلمی چہرے ہوا اپنی کھودی صحافت کی خواجہ نے لٹیا ڈیودی

قریب کر دیا اور بعد میں یہ قربت اتنی زیادہ مضبوط ہو گئی کہ انہوں نے بہار کے محکمہ نشر و اشاعت میں بطور پبلیٹی افسر تقرر کے لیے پروفیسر عبدالباری کو ہدایت کر دی۔ پٹنہ میں عبدالباری کو طیلیدی اہمیت حاصل تھی۔ انہوں نے فوراً جمیل منظمی کو پٹنہ بوالیا۔ مولانا ابوالکلام بھی پٹنہ آ گئے اور انہوں نے بھی سفارش کر دی۔ اس طرح 2 دسمبر 1937ء سے وہ بطور پبلیٹی افسر مقرر ہو گئے لیکن 1939ء میں انگریز حکومت سے اختلاف کے باعث دیگر لوگوں کے ساتھ انہوں نے بھی اپنا استعفیٰ پیش کر دیا لیکن راجندر پرادت سنگھ جو بہار کے تھے اور سماس ش چندر بوس کی مستعفی ہو جانے کی وجہ سے بہار صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بن چکے تھے۔ انہوں نے استعفیٰ مانع کر دیا کہ ابھی تمہارے ایسے نوجوان کی ملک کو ہمارے ہمارے جمہور حکومت برطانیہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے لاری کر دیا کہ یہ ایک اہم محکمہ ہے جس سے آزادی کی قیادت ملے گی۔ انہوں نے انہیں ہمارے لیے ایک غیر ذمہ دار شخص اس کے لیے نام لے کر دیا۔ جمیل منظمی نے ان کی بات مان لی۔

وقت گزرتا رہا اور پھر ہندوستان کی سیاسی کشمکش کا سب سے اہم سال آ گیا۔ دوسری عالمی جنگ اپنے شباب پر تھی۔ اتحادیوں کو ہر محاذ پر ہزیمت کا سامنا تھا۔ جاپان نے پرل ہاربر پر امریکی اور انگریزی بحری بیڑے کو شدید نقصان پہنچایا تھا اور جرمنی اٹلی کے محور کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کر کے اتحادیوں کے خلاف میدان جنگ میں کود پڑا تھا۔ اس نے سنگاپور ملایا برما کو برقی رفتاری سے روند ڈالا تھا اور اب کلکتہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مسلم لیگ کی کامیابی بہت نزدیک آ چکی تھی کہ کانگریس کی مجلسِ عالمہ نے 8 اگست 1942ء کو اپنے اجلاس میں وہ مشہور قرارداد منظور کی جو اپنے مرکزی خیال کے باعث Quit India یا بھارت چھوڑ دو قرارداد کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے رد کردوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ ان حالات میں جمیل منظمی کے لیے ملازمت میں رہنا ناممکن ہو گیا اور انہوں نے استعفیٰ داغ دیا۔ اس استعفیٰ پر انہوں نے اپنے خون میں قلم ڈبو کر دستخط کیا تھا۔ یہ استعفیٰ کئی مہینوں میں انوکھا تھا۔ اس میں نوکری چھوڑنے کی وجہ جو بتائی گئی تھی اس میں فنی اصطلاحات کی جگہ سخت و درشت الفاظ کا استعمال کیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک ماہ تک وہ قید رہے۔ رہائی ملنے ہی انہوں نے انجم آباد (پٹنہ) سے باہر نکلنے کی ٹھان

لی۔ کلکتہ کے دروازے پر جاپانی دستک دے رہے تھے۔ وہاں ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ کہاں جانیں وہ بھی اسی الجھن میں تھے کہ بمبئی سے جوش ملیح آبادی کا بلاوا آ گیا۔ انہوں نے جمیل منظمی کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ان کی خود اعتمادی مجروح نہیں ہوگی اور اس یقین دہانی پر وہ بمبئی روانہ ہو گئے۔ جوش پہلے انہیں فصلی برادرز کے پاس لے گئے لیکن وہاں کلکتہ سے آرزو کھنوی آ کر ڈے واری سنبھال چکے تھے۔ اس کے بعد وہ انہیں محبوب اور کاردار صاحب کے پاس لے گئے۔ محبوب صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ انہوں نے جمیل منظمی سے اپنی ایک فلم کے لیے معاہدہ بھی کر لیا لیکن ایک سین پر دونوں کا اختلاف ہو گیا اور وہ جوش کے ساتھ پونا چلے گئے۔ بمبئی آ کر جمیل منظمی مشہور نقاد محمد رضا کلمی کے والد موسیٰ رضا کلمی کے گھر گوبائی ہاؤس ہائی کل میں ٹھہرے تھے۔ پونا میں ان کا قیام جوش کے ساتھ ظاہر نہیں میں رہا۔ انہی دنوں جمیل منظمی کی ملاقات پوٹنی فلز کے ربیت شرما کے ساتھ ہوئی اور وہ انہیں اپنے ساتھ واپس کلکتہ لے آئے۔ یہیں انہوں نے ”کر دیشتر“ کے گانے لکھے جسے سہیل نے گایا اور کافی مقبول ہوئے۔ انہوں نے ”کھوتی دنیا“ کی کہانی لکھی مگر قلم مکمل نہ ہو سکی۔ بقول جمیل منظمی ”خاندان“ کا بوجھ تھا۔ بے کار رہے نہیں سکتا تھا۔ کلکتہ میں بھی اس لیے رہا اور بمبئی میں فکر معاش سمجھنے لگے اور اس میں 43ء سے 47ء تک فلمی دنیا سے وابستہ رہا۔ فلم آرزو کے مکالمے اور کر دیشتر کے گانے لکھے۔ وارث شاہ کی زندگی سے متعلق ایک ڈراما لکھا مگر قلم بننے کے بعد کارکنان کا جھگڑا ہو گیا۔ مقدمہ تک بات پہنچی اور پھر بتا نہیں اس قلم کا کیا بنا۔ مجموعی طور پر فلمی دنیا مجھے پسند نہیں آئی اس کی چمک دکھ آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے مگر طمانیت نہیں دے سکتی۔ ظاہر داری نصن کے علاوہ مجھے پورا ماحول بڑا عامیانہ معلوم پڑا۔“

فلمی دنیا سے بے زاری کا اظہار وہ اپنی مشہور نظم ”بھاگ شاعر بھاگ“ میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کرتے ہوئے فلمی دنیا سے بھاگ آئے۔ اسی دور کا ذکر ہے علامہ جمیل منظمی نے اس وقت تک شادی نہیں کی تھی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہیں اختلاجِ قلب کا عارضہ تھا۔ اسی اختلاجِ قلب کی وجہ سے ایم اے کے امتحان میں ایک پرچہ چھوڑ آئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بجائے فرسٹ کے سیکنڈ ڈویژن ملا حالانکہ جس دوست انہوں نے فارسی ادب پڑھایا تھا وہ فرسٹ

۱۔ ان میں پاس ہوا۔ اختلاف کی اس شدت کو بعض اعزاء نے ان سمجھا اور اسی غلط فہمی نے 1928ء میں بچپن سے منسوب پہلی رازکار شہینہ شقیق کر دیا۔ اسی سال چھوٹی بہن کی شادی ہوئی لیکن وہ کم نصیب صرف ساڑھے تین سال سہاگن رہی۔ ان دو حادثوں کا انہوں نے اتنا اثر لیا کہ شادی نہ کرنے کا عزم کر لیا۔ بہن کے بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ 1938ء میں انہیں شادی کا خیال آگیا اور محمود طرزی سے استدعا کی کہ ان کے لیے دلہن دیکھی جائے۔ عمر پینتیس چھتیس ہونا چاہیے۔ محمود طرزی نے تلاش شروع کر دی۔ کافی تلاش کے بعد انہیں ایسی ہی ایک عورت مل گئی۔ انہوں نے علامہ سے ذکر کیا۔ علامہ نے اب ایک نئی بات کر دی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ اس عورت کو دیکھیں گے۔ 1945ء میں ایسی بات ناممکن تھی پھر بھی محمود طرزی نے اپنے طور پر کوشش کی اور اس عورت کو دکھا دیا۔ اسے دیکھنے کے بعد علامہ نے مسترد کر دیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ تلاش جاری رہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مجھے ڈاکٹروں نے تاکید کی ہے کہ جلد شادی کر لوں ورنہ میری شاعرانہ صلاحیتیں نامہ پڑ جائیں گی۔ محمود طرزی نے جھلکار کر مٹوب لہجے میں کہا کہ اب کیا میرا یہی کام رہ گیا ہے کہ ہر گھر میں گھس کر لڑکیاں دیکھوں اور پھر آپ کو دکھاؤں۔ یہ ناممکن ہے اس کا انجام یہ ہوگا کہ محلے والے میری اور آپ کی ایسی مہرمت کریں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

بات معقول تھی۔ علامہ خاموش ہو گئے۔ اور پھر اپنی تلاش کارخشاں بیابان کی جانب موڑی اور کامیاب بھی ہو گئے۔ محمود طرزی نے جس خاتون کو دکھایا تھا وہ خود کو یوں مسترد کیے جانے کو اپنی جگہ سمجھنے لگیں مجبوراً ان سے محمود طرزی کو شادی کرنا پڑی۔

جبئی سے 1947ء میں لوٹنے کے بعد ان کا تقریر بہ حیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر پبلیشنگ اینڈ فلم کمیشن گورنمنٹ آف بہار ہو گیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر صرف تین سال رہے اور پھر جنوری 1950ء میں پڑنے کاغذ میں پروفیسر کی آسای پر چلے گئے۔ اس دور کا ذکر کرتے ہوئے منجیں لکھتی ہیں۔

”پروفیسروں میں عام طور پر علمی رکھ رکھاؤ ضرورت سے زیادہ متانت عالمانہ شان اور اپنے کو ہمہ وقت لیے دے رہنے کا انداز اپنایا جاتا ہے۔ علامہ بمثل مظہر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ علم کے ایک بحر ذخائر تھے مگر ہمہ دانی کی شان اپنے اندر پیدا نہیں ہونے دی۔ ان کے پڑھانے کی تعریف کرنا دشوار ہے۔ ان کے کلاس کی منظر کشی کرنا ناممکن ہے“

کلاس میں داخل ہوتے ہی وہ منہ بھاڑ کر اور آنکھیں پھیلا کر چند منٹوں تک ادھر ادھر غلامیں دیکھتے مگر آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ بعد ازاں ٹوپی اتار کر میز پر رکھتے ہوئے ایک خاص انداز سے اپنی کرسی پر رواں ہوجاتے پھر جیب سے سگریٹ کا ڈبا نکال کر مرغولہ بناتے اس دوران میں آنکھیں بند رکھتے اور یہ سلسلہ اس وقت تک رہتا جب تک کوئی ان کے ہاتھوں میں رجسٹر دے کر چونکا نہ دیتا۔ اگر کسی روز لڑکے پڑھنے کے موڈ میں نہ ہوتے تو ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیتے ایسی حالت میں جب یکا یک علامہ اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آتے تو ایک خاص انداز سے کہتے ہاں بھی حاضری بخواؤ اور جب ان کو معلوم ہوتا کہ وقت ختم ہوا ہے تو پیشانی پر ہنسن ڈال کر کہتے آپ لوگوں نے مجھے قبل ہی کیوں نہیں کہا اور پھر جلدی جلدی پڑھانا شروع کر دیتے اور اس طرح ڈوب کر پڑھاتے کہ وقت ختم ہونے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ جب ہم میں سے کوئی ڈرتے ڈرتے کہتا کہ سر وقت ختم ہو گیا تو اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتے کہ آپ لوگوں نے قبل ہی کیوں نہیں کہا۔ علامہ چچا شاگردوں کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے ان کی تعریف کرتے ہمت افزائی کرتے ان کے دکھ درد میں کام آنا اتنا فرض سمجھتے نہایت بے تکلفی سے اپنے شاگردوں کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر باتیں کرتے اور جب غصہ آتا تو دوسرے مولوی صاحب کی طرح گوشائی کرتے۔ کلاس میں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع ہوتا تو یکا یک ایسا محسوس ہونے لگتا گویا ہم سب اس محفل میں سامعین کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ علامہ چچا ہم میں ہر ایک سے فردا فردا باتیں کر رہے ہیں۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کر رہے ہوں الفاظ وحشی کا ایک سمندر سا امنڈ پڑتا۔ غور و فکر کی نئی شاہراہیں ابھرتی نظر آتیں۔ نیا شعور انگڑائیاں لے کر اٹھتا ہوا نظر آنے لگتا۔ خرد آگہی کے تقاروں پر چوٹ پڑتی سنائی دینے لگتی۔ لیچر کے دوران میں گرج دار آواز شاعرانہ الفاظ انوکھا انداز بیان شاعرانہ تشبیہیں اور فنکارانہ استعارے استعمال کرتے۔ وہ اقوال اور اشعار کا حوالہ اس طرح دیا کرتے جیسے کسی مشہور اخبار میں شائع شدہ مضامین کو پڑھ کر نارہم ہوں۔ ان کے پڑھانے کے انداز میں بڑی گرم جوشی ہوتی جیسے ادب کی تعلیم اس شخص کے لیے صرف روزی کمانے کا ذریعہ نہ ہو بلکہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ بیٹی میں چاہتا ہوں کہ تیرے اندر علم کا بیج ذوق پیدا ہو۔ ذریعہ تو سبھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن طالب علم بہت کم

ماہنامہ سرگزشت

اہل: 74ء) دو اقبال (علامہ اقبال سے ممتاز منعقدہ کنونو
20 دسمبر 77ء) غالب کے نقش قدم پر (ماہنامہ ”منگ
ہمن“ کانپور اپریل 76ء اور آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر شدہ)
شاو عظیم آبادی کی استعاراتی شاعری (ماہنامہ زبان و ادب
پٹنہ شاو عظیم آباد نمبر مارچ 79ء) مٹی لکھنؤ کی جغرافیائی
شاعری (آج کل نئی دہلی ستمبر 80ء) ایک مثالی کردار
(آکاش والی کا ترجمان پندرہ روزہ آواز) مقدمہ طریبات
انجم مانپوری۔ دانش کی شاعری پر ایک نظر (1954ء)
مکاشفات کشفی (1958ء) واحد پری پری کا گل پو (1967ء)
منظر حیدری کا جام جم (1967ء) قاسم شبیر نقوی کی میری
غزلوں میں آثار کر بلا (سرفراز لکھنؤ مئی 1970ء)۔

قاسم شبیر کی نقش مشیر (سرفراز
لکھنؤ 27 دسمبر 1973ء) فضا شکی کا دیوان بکثت و غلبہ
(1974ء) تقریظ۔ ساز و آواز (1975ء) علاقہ شلی کا
حرف و صوت (1975ء) تجزیہ۔ وہ جو شاعری کا سبب ہوا
(مجموعہ کلام کلیم عاجز ”بزم کاف“ 1946ء) منیر بلکرای
حیات و کارنامے (1976ء) تعارف و حرف آگہی
(1977ء) محمد عسکری جدید کے چھ مرثیے اعجاز ناظم
(1978ء) تبصرہ و تقریظ اعلیٰ عظیم آبادی کی صہبائے بقا
(1979ء) مقالہ۔ کلکتہ اک رباب (1966ء) تعارف۔
بکھری کرئیں (1980ء) تعارف۔ حکایت ہستی
(1980ء) میرا نظریہ شعر اور میری شاعری (خودنوشت۔
ماہنامہ کائنات مرزا پور جمیل مظہری نمبر جون 1982ء اور جمیل
مظہری نمبر ماہنامہ صبح نو پٹنہ مارچ 1963ء) غبار کاروان
شعر و شاعری اور برکات اسلام (کائنات جمیل مظہری نمبر)
”اسلام اور نازیت کا فرق“۔ اجتماع صدیق (روزنامہ عصر
جدید سلور جوبلی نمبر) قومیت کے وقتی سانچے (بہار کی خبریں
اگست 71ء) یاد ماضی (خودنوشت، آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے
نشر اور کائنات مرزا پور اپریل تا جون 82ء میں طبع) اس کے
علاوہ بھی بے شمار تنقیدی مضامین و مفاہیم مختلف ادبی جریوں
میں چھپے یہ سارے مضامین زبان خود ان کی تنقیدی صلاحیت
کی آئینہ دار ہیں۔

جمیل مظہری نے ایک اور صنف سخن کو معراج دی۔ وہ
ہے مرثیہ نگاری۔ بقول کلیم الدین احمد ”اردو شاعری کے دامن
میں صرف ایک ”مرثیہ“ ہے جسے مانگتے کا نہیں کہا جاسکا ورنہ
تمام صنف سخن عربی و فارسی سے مانگی ہوئی ہیں۔“
میر ضمیر نے صنف مرثیہ کو مسدس کا قالب دیا اور اس

کے عناصر بھی مقرر کر دیے مثلاً چہرہ رخصت آمد جنگ
شہادت بین وغیرہ۔ اس لیے مرثیہ کو مسدس سے الگ چیز مان
لیا گیا ہے۔ فن مرثیہ گوئی میں دور حاضر کے جن بڑے مرثیہ گو
کا نام لیا جاتا ہے وہ ہیں آل رضارضا، نیم امر و ہوی، جوش صبح
آبادی، وقا پکپوری، مظہر بیتا پوری، نجم آفریدی اور جمیل
مظہری۔ جمیل مظہری کے مرثیوں میں ادبیت بھی ہے اور فکر کا
سندھ بھی۔ محمد رضا کاظمی ”جدید اردو مرثیہ“ میں لکھتے ہیں۔
”جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کی ابتداء قومی مقاصد ہی کے
تحت ہوئی۔ جمیل مظہری خود بیان کرتے ہیں کہ ان کا پہلا
مرثیہ ”عرفان حقیق“ 1930ء میں ترقی پسند تحریک اور مولانا
آزادی کی تقاریر سے متاثر ہو کر کہا گیا تھا۔ سیاسی اغراض کی
موجودگی کے باوجود ان کے مرثیوں میں سیاسی عنصر نمایاں نہیں
ہے۔ انہوں نے نادانستہ طور پر ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جدید
مرثیہ کے مبادیات کو مرکب کرنے تک محدود رہ جائے۔“

سب سے اہم بات یہ ہے کہ جوش نے اپنے سیاسی
منہک کی تشکیل میں مولانا محمد علی جوہر سے اثر قبول کیا تو جمیل
مظہری مولانا ابوالکلام آزاد سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ محمد علی
جوہر کے مزاج کا جوش، دلول، بلند آہنگی، جذباتی سیلاب اور عزم
سرفروشی کی جھلک جوش کے ابتدائی مرثیوں میں ملتی ہے اس
کے برخلاف ابوالکلام آزاد کی ملکی ستانت، رفتار کی استقامت
اور مصلحت کوئی تھی اس کے عناصر کی پر چھائیاں جمیل مظہری
کے ہاں ملتی ہیں۔ اسی لیے دونوں کو جدید مرثیہ نگاری کا میر
اور امیر کہا گیا ہے۔ جمیل مظہری نے جدید مرثیے کو ایک نیا رخ
دیا تو جوش نے اسے وسعت دی۔ جمیل مظہری نے امام حسین کو
بطور نجات دہندہ تاج مشرقین کہا لیکن جوش کے مرثیوں اور جمیل
مظہری کے مرثیوں کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو جوش کے الفاظ
تراشی کو نظر انداز کر کے حاصل یہ ہوگا کہ جمیل مظہری نے مرثیوں
کو بطور پیمانہ زیادہ موثر انداز میں عام کیا ہے۔

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلک
ایمان کی ہو رہی ہے تجارت ابھی تلک
جاگیر اہرن کی ہے جنت ابھی تلک
ابلیس ہے معلم فطرت ابھی تلک
پالائی حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا ایک تل عام ہے

جمیل مظہری کے مرثیوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ
انہوں نے جو بیحدھے نظم کیے ہیں ان میں یہ برابر خیال ملحوظ

رکھا ہے کہ گریہ و بکا کی فضا تخلیق کرتے وقت امام حسین یا ان کے اعزاء احباب یا محدثات عصمت و طہارت کا ایسا کردار پیش نہ ہو کہ جس سے ظاہر ہو کہ مصائب و آلام نے ان کے عزائم میں شکست و مانگی پیدا کر دی تھی اور آپ کے عین کا یہ ابھی ایک بڑا وصف ہے کہ ان میں رقت و دلدوزی بھی خوب ہے یعنی ایک جانب بشری تقاضے بھی ہیں اور دوسری جانب الہوی تقاضے بھی پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جمیل مظہری کے ایک مرثیے سے جانبِ زہدیت کے مطمئن نفس کو دیکھیں۔

بیٹھ کر لاش پہ آنسو نہ بہایا اس نے
مہرِ مخدومہ گوئین دکھایا اس نے
مَن میں آن کے سجادہ بچھایا اس نے
بدہ شکر میں سر اپنا جھکایا اس نے
بانتا دل لہ مسنے جو گئی بات یہ کی
قہرِ قرائے ۱۱ نے ۱۱ منوں سے مناجات یہ کی
اے میرے پائے ۱۱ نے ۱۱ مرا ندہ یہ قبول
میری قربانی احقر مرے سولا ہو قبول
آل احمد کا یہ ناچیز ہدیہ ہو قبول
تپش داغ دل دختر زہرا ہو قبول
کیا ہے اعدا نے میری کوکھ جو ویراں کر دی
تیری بخشش تھی تیری راہ میں قرباں کر دی
جمیل مظہری کا مزاج فلسفیانہ ہے جو کائنات کے اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی خاص نقطہ نظر کا سہارا لے کر نہیں کرتا بلکہ یہ حقیقت کی ذاتی تلاش و تاویل کا نتیجہ ہے کہ جمیل مظہری نے فطرت کی کھلی کتاب کو اپنے علم و وجدان اور تجربے کی روشنی میں واقعات کر بلا کا جائزہ لے کر مذہب اور خالص فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے بلند کیا اور یہ ذہن نشین کر لیا کہ ہم اس سانچہ میں انسانی قدروں کو مکمل طور پر جلوہ گرد کیے سکتے ہیں۔ جمیل مظہری کا حکیمانہ شعور اخلاقی و روحانی پیکروں کو سامنے رکھتا ہے جس سے زندگی کے لیے جوش و حرارت کا پیغام مل سکے۔

حیف وہ قوم جو ہو ملت شاہ شہدا
وہ حکومت کی کینری میں ہو حیرت کی ہے جا
زندگی میت احساس ہے دل مردہ ہیں
جتنے جذبات ہیں قوی وہ سب افسردہ ہیں
جمیل مظہری کے مشہور مرثیوں میں عرفانِ حقیق، مضربِ شہادت، شامِ غرباں افسانہ ہستی عزمِ حکم، حقیقتِ نوروز

رومیوں کے بعد قرون وسطیٰ میں صرف عرب قوم ہی ایسی تھی جس نے علمِ قانون کو ترقی دی اور دنیا کے سامنے قانون کا ایک جداگانہ نظام پیش کیا۔ یہ نظام بنیادی طور پر قرآن اور سنت پر مبنی اور یونانی و رومی قانون سے متاثر تھا اور تمام احکام الہی جو قرآن میں پیش کیے گئے ہیں اور احادیثِ نبویؐ میں ان کی تعبیر و تشریح کی گئی ہے، شریعتِ اسلامیہ کے ذریعے ان کو بعد کی نسلوں تک پہنچایا گیا۔ شریعت کے فرائض مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں کو منظم کرتے ہیں۔

چاہے یہ شیعہ دینی ہوں کہ سیاسی یا سماجی۔ یہ احکام مسلمانوں کے ازدواجی اور مدنی تعلقات پر حاوی ہونے کے سوا ان کے غیر مسلموں سے تعلقات پر بھی حاوی ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی کے تمام ادا و نواہی اسی مقدس قانون سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ قانونی اعتبار سے انسان کے تمام اعمال کو پانچ اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) فرض: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور نہ اس کا ترک کرنا قانوناً مستوجبِ عذاب ہے۔ (۲) مستحب: وہ عمل جس کے کرنے سے ثواب ملتا ہے لیکن نہ کرنے سے کوئی عذاب نہیں ہوتا۔ (۳) جائز و مباح: وہ اعمال جن کے کرنے کی اجازت ہے اور قانون ان میں حائل نہیں کرتا۔ (۴) مکروہ: ایسا عمل جو ناپسندیدہ ہے لیکن اس کے کرنے سے عذاب نہیں ہوتا۔ (۵) مایہ اعمال: ایسے اعمال جن کے کرنے سے عذاب ہوتا ہے اور ان کا کرنے والا سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

مرسلہ: قرقۃ العین حیدر۔ اقراء شی، کراچی

لہ غور، علم دار کر بلا اور مرانی کی دوسری جلد وجدانِ جمیل کے مرثیے وغیرہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جمیل مظہری کی جگہ اردو کے ان شعرا میں ہے جنہوں نے اردو شاعری کی روایت میں توسیع کی ہے۔ نئے العباد اور جہتیں پیدا کی ہیں۔ انہوں نے اردو شاعری کے معنوی دائرے کو جس حد تک وسیع کیا ہے وہ یقیناً ان کا ایک اہم اور قابلِ قدر کارنامہ ہے اور اسی میں ان کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔ اس انفرادیت کا ثبوت ان کی لوریاں بھی ہیں۔ جس طرح دو بے اور برے گیت کے ایل میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لوری کو بھی اس کے تحت جانا پڑتا

میڈیکل سائنس مسلسل ترقی کر رہی ہے۔ نئے نئے آلات اور دواؤں سامنے آرہی ہیں۔ ایک طرف انسانوں کو قتل کرنے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک اسلحہ ایجاد ہو رہا ہے تو دوسری جانب انسانی زندگی کو بچانے کے لیے طبی آلات و نئی نئی دواؤں بھی لائی جا رہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں طبیب مختلف جانوروں سے بھی علاج کے لیے مدد لیتے تھے۔ جیسے بادی خون کو نکالنے کے ”جوئک“ کا استعمال، کمر درد کے لیے سنگھی پھلی سے ریڑھ کی ہڈی پر پھلی کو چکنا اور بھی بہت سے جانوروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر کتوں سے علاج میں پہلی بار کام لیا جا رہا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ کتوں میں سوکھ کر شاخت کرنے کی صلاحیت بہت تیز ہے جو کینسر کا پتا چلانے میں بھی استعمال ہو سکتی ہے، جاپانی ٹیصے کا نیما کے 6000 سے زائد رہائشی ایک انوکھے مطالعے میں حصہ لے رہے ہیں جس کا مقصد یہ جاننا ہے کہ کیا کتے واقعی سوکھ کر کینسر کا پتا چلا سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ مطالعہ بین میڈیکل اسکول کے پروفیسر ماساؤ میاشیتا اور ان کے ساتھیوں کے زیر نگرانی کیا جا رہا ہے جبکہ اس مطالعے کے لیے مذکورہ قصبے کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہاں رہنے والے لوگوں کی بڑی تعداد معدے (پیٹ) کے سرطان میں مبتلا ہے۔ مطالعے میں شریک تمام افراد سے پیشاب کے نمونے لے کر ادارے کو بھجوائے جائیں گے جہاں خصوصی تربیت یافتہ کتوں کو ان کی بدبو سٹھکانی جائے گی۔ یہ کتے اگر کسی نمونے کی بدبو سوکھ کر شدت سے بھونکنے لگیں گے تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ متعلقہ فرد کو یا تو پیٹ کا کینسر ہو چکا ہے یا پھر وہ اس مرض میں مبتلا ہونے کے قریب ہے۔ البتہ اس بات کی تصدیق دوسرے طریقوں سے بھی کی جائے گی اور یہ دیکھا جائے گا کہ ان تربیت یافتہ کتوں نے پیٹ کے سرطان کی تشخیص درست طور پر کی ہے یا نہیں۔

اس طول بیاں سے یہ غرض ہے
نفرت بھی تمہاری ایک مرض ہے
دشمن سے جو دشمنی کرو گے
اس قرض کا سودا بھی بھرو گے
(آب و سرب)

اب آخر میں ان کی غزل پر بھی دو باتیں کر لی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک فطری شاعر تھے، ان کی شعری تخلیقات قاری کو دعوت فکر و نظر دیتی ہیں۔ ایک فکری شاعر اپنا ایک نظریہ حیات رکھتا ہے۔ وہ اس عالم کو ان و فساد کو اپنی مخصوص نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کی شاعری اس کے نظریے کی فن کارانہ ترجمانی کرتی ہے۔ اس کا نظریہ حیات اس کی تخلیقات میں ایک ربط پیدا کرتا ہے جس کی بنیاد پر قاری کچھ مثبت نتیجہ اخذ کر کے اس کے نظریے کو رد یا قبول کرتا ہے۔

جلیل مظہری نے اردو شاعری کی عام اور مروجہ روایت کے مطابق محض نظم نما غزلیں یا غزل نما نظمیں لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو شاعری کی مختلف اصناف اور فارموں کو استعمال کر کے ان کے ذریعہ اظہار و بیان میں دستیں پیدا کیں اور اپنے تجربوں کو نیا گداز اور نکھار عطا کیا۔ ان کے ہاں موضوع

جاتا رہا ہے۔ کافی بعد لوری آزاد صنف کی حیثیت سے تسلیم کی گئی۔ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ شعرانے اس صنف سے بے توجہی رہی اور اردو کا دامن لوری سے خالی رہا۔ جمیل مظہری نے جہاں بڑی تعداد میں بچوں کی نظمیں لکھیں وہیں لوریوں سے بھی اردو کی مانگ سمجائی۔ جمیل مظہری کی لوریوں کا کیسوں کا کافی وسیع ہے۔ ان کے مخاطب اگرچہ بچے بچیاں ہیں لیکن زندگی کے مسائل، رموز و نکات، عصری سیاست، عالمی عصری صورت حال، امیر و غریب کے امتیاز و فرق کے زیریں لہریں بھی لوریوں میں مدغم ہیں۔ یہ انداز فکر لوریوں کو نئے رنگ اور نئی جلوہ سمانیاں عطا کرتا ہے۔

جاگتی سنسار کی پرچھائیاں بھی سو گئیں
شام سے بجتی ہوئی شبہائیاں بھی سو گئیں
خند پروانے لائی اور جگنو سو گئے
سو گئیں سارنگیاں محفل کے محکرو سو گئے
جلتے جلتے سوئی صبح شبستاں سو رہو
جان جاناں سورہو
لوریوں کی طرح جمیل مظہری نے مثنوی کو بھی حیات نو بخشی، ان کی مثنویوں میں صرف مربوط داستان ہی نہیں ایک پیغام بھی پایا جاتا ہے۔

ماساؤ میاھیتا کا دعویٰ ہے کہ ان کے تربیت یافتہ کتوں میں صرف سوگھ کر سلطان کو درست طور پر شناخت کرنے کی صلاحیت تقریباً 100 فیصد ہے اور یہ مطالعہ اسی بات کی باضابطہ تصدیق کرے گا۔ واضح رہے کہ کتوں کی قوتِ شناسہ (سوگھنے کی طاقت) دوسرے تمام جانوروں میں سب سے زیادہ سبھی جاتی ہے اور مشیات سے لے کر دھماکا خیز مواد تک کو سوگھ کر تلاش کرنے کے لیے مختلف ادارے باقاعدہ تربیت یافتہ کتوں کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان ہی باتوں کی بنیاد پر برٹنی ماہرین کا کہنا ہے کہ جس طرح کتوں کو مشیات وغیرہ سوگھ کر شناخت کرنے کے قابل بنایا گیا ہے اسی طرح انہیں تربیت دے کر سرطان جیسی خطرناک اور جان لیوا بیماریاں کھوجنے کے قابل بھی بنایا جاسکتا ہے۔

گزشتہ دو عشروں کے دوران امریکا، برطانیہ اور جرمنی میں کتوں کے ذریعے کینسر کی تشخیص کے مختلف تجربات کیے جا چکے ہیں اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ کتوں نے مریضوں کی سانس، جلد اور پیشاب کی بدبو سوگھ کر کئی اقسام کے سرطانوں کی 90 فیصد سے بھی زیادہ درستگی کے ساتھ تشخیص کی جبکہ بیماری کے ظاہری آثار بالکل بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے باوجود ماہرین یہ بتانے سے لاسر ہیں کہ سرطان زدہ خلیات آخریسا کون سا مادہ خارج کرتے ہیں جسے سوگھ کر کتے مبینہ طور پر متعلقہ شخص میں سرطان کی موجودگی کا پتا چلا لیتے ہیں۔ دوسری جانب ناقدین کا کہنا ہے کہ اوائل تو کتوں کے ذریعے سرطان کی تشخیص ابھی تک حتمی طور پر ثابت شدہ نہیں اور دوم یہ کہ اگر کسی طرح کتوں کو صرف سوگھ کر سرطان شناخت کرنے کی تربیت دے دی جائے تو یہ ایک طویل اور مہنگا عمل ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسے کسی بھی ایک کتے کی تیاری میں 4 سے 5 سال کا عرصہ لگ جائے گا اور 45000 ڈالر خرچ آئے گا۔

مرسلہ: دویم بن اشرف - ملتان

کے محسوسات و خیالات کی ایک الگ شخصیت بن گئی ہے لیکن افسوس اس شخصیت کا رقبہ آج پورے برصغیر میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاعر بنانے میں دلچسپی نہ لینا بھی ہے۔ جو بذاتِ خود ان کی شاعر کی لیے پہنچ جاتے انہیں جلد ہی میدان چھوڑنا پڑتا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اشعار پر اصلاح نہیں، قطع برید کرتے تھے۔ اتنی زیادہ کاٹ پیٹ ہوتی کہ شاعر کی غزل غائب ہو کر استاد کی غزل رہ جاتی۔ اس بات سے سبھی آگاہ تھے نتیجتاً لوگ اس شخص کی غزل کو مشکوک نظروں سے دیکھتے جو خود کو جمیل منظری کا شاعر کہتا۔ شاید اسی وجہ سے جمیل جمیل بھی بعد میں سبیل عظیم آبادی بن گئے۔ وہ اپنا کلام سانے میں بھی بھلے سے کام لیتے۔ بقول جوش ملیح آبادی ”میرے محبوب دوست پروفیسر جمیل منظری کہ جب تک انہیں جسمانی زرد کوکب کا اندیشہ نہ ہو شعر نہیں سناتے۔“

کہتے ہیں ہر بڑا شاعر ناؤ نوش سے دلچسپی لیتا ہے مگر جمیل منظری اس لعلت سے محفوظ تھے۔ جبکہ انہیں جوش ملیح آبادی کی قربت بھی حاصل تھی۔ جوش کا ایک شعر خاص طور پر انہی کے لیے ہے۔

الحمد للہ جوش اس بد مذاقی کے زمانے میں

اور ہیبت دونوں اعتبار سے خاصی جدت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں کیساں اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں کسی ایک کو بھی دوسرے پر آسانی سے فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ جس طرح ان کی نظموں کے تین واضح مدارج اور اقسام ہیں۔ رومانی، انقلابی اور قومی فکری و فلسفیانہ۔ اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تین نمایاں رنگ رومانی، انقلابی اور فکری و فلسفیانہ دکھائی دیتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جمیل منظری اپنی غزلوں کو انکار منکوم کا نام دیتے ہیں اور انہیں رواجی تغزل کے معیار کو پیش نظر رکھ کر غزل قرار دینے سے بچچکتے بلکہ انکار کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں کے مجموعے کو ”فکر جمیل“ کے نام سے شائع کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنی غزلوں کو فکر و فلسفہ جیسی چیز سمجھتے تھے۔

تمہی زندگی خدا کا غضب اور منظری موت اک خدا کا پیار ہے، اس کا پیار دوست لیکن نقادوں کی رائے ہے کہ جمیل منظری نے غزل کوئی کو ایک نیا حراج ایک نیا آہنگ بخشا ہے اور غزل کی روایتوں کو ایک نئی سمت دی ہے۔

ان کی غزلوں میں اپنے غدو خال اتنے واضح ہیں کہ جن

۱) مظہری سا قدر واں بخشا گیا مجھ کو
ایام میں وہ خود سے اتنے بے پروا ہو گئے تھے کہ
میل "ایم آبادی آل انڈیا ریڈیو پنڈت کا کٹر لیٹ بھیجا
لا اور وہ اسے سم کر دیتے۔ مجبور ہو کر سہیل عظیم آبادی
لنڈٹ ڈاک سے بھیجنے کی بجائے خود جا کر دستخط کروالیا
کرتے تھے۔ کراہیشہ بے ترتیب رہا کرتا۔ ڈھیلی چارپائی پر
گندی میٹلی تو شک وہ بھی جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی۔ بستر کی
چادر چبے برسوں سے بدلی نہ تھی ہو۔ گرمیوں میں بھی سوئچر جم
سے چکار ہوتا۔ مڑے ترے کاغذوں کا ایک ڈیر سا تو شک
کے پیچھے تہا جن پر کلام لکھتے، قلم برداشت پوری پوری نظم یا
غزل مثنویں میں کہہ ڈالتے۔ اساتذہ قدیم کے جکڑوں اشعار
یاد رکھتے مگر اپنا کلام بھول جاتے۔ ان کی زندگی میں شائع
ہونے والے مجموعے مندرجہ ذیل ہیں۔

حکمت و فتح طویل افسانہ (کلکتہ 1950ء) نقش جمیل
(پنڈتوں کا مجموعہ 1952ء) فکر جمیل (غزلیات
ورباغات پنڈت 1959ء) آب و صراہ (فلسفیانہ مثنوی کلکتہ
1970ء) عرفان جمیل (مراتی و قصائد لاہور 1970ء۔ الہ
آباد 1979ء) وجدان جمیل (مراتی ولی نظمیں لاہور
1979ء)

جمیل مظہری کی زندگی میں ماہنامہ سہیل (گیا، بہار)
نے دوصفوں میں جون جولائی 60، مجلہ جشن جمیل مظہری پنڈت
نے 1975ء میں خصوصی شمارے شائع کیے اور انتقال کے بعد
ماہنامہ "کائنات" (مرزا پور بونی) ماہنامہ "آج کل" (دہلی)
اور سہیل (گیا) 1982ء میں خصوصی شمارے اور طلوع افکار
(کراچی) نے گوشہ شائع کیا۔

آخری ایام میں جمیل مظہری کو پنڈت یونیورسٹی نے خصوصی
لیکچرر کی حیثیت سے مقرر کر لیا تھا وہ 1969ء سے 1974ء
تک کبھی کبھی درس دینے چلے جایا کرتے تھے لیکن جب پیرانہ
سالی نے پیروں کو جکڑ لیا اور کثرت امراض نے پریشان کرنا
شروع کر دیا تو انہوں نے خود ہی سبکدوشی حاصل کر لی اور اپنے
جھوٹے بھائی رضا کاظمی مظہری کے ساتھ کلکتے میں رہنے
لگے۔

وہ مئی 1980ء میں بھیکن پور (مظفر پور) سفر پر روانہ
ہوئے۔ کسے جڑ تھی کہ وہ ہمیشہ کے لیے کلکتہ چھوڑ رہے ہیں۔
بھیکن پور کے قیام کا مشہور نقاد جناب سید محمد کاظمی "تنقیدی
ورثہ" میں یوں نقش ثبت ہے "میں کاظمی ماموں کی جانب مڑا
ان کی آنکھیں بند تھیں اور ان پر زندگی طاری تھی۔ میں نے

ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ تین چار مرتبہ آواز دی۔ جواب نہ پا کر میری
گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں اپنا نام لے کر ان کو متوجہ کرتا رہا۔
آخر بہت دھیمی آواز میں بولے "میں سمجھا ہا ہا!" انہیں ہاتھوں
باکر کچھ غصہ دینے کی کوشش کی وہ نہ مانے۔ اس گھر کے اخلاق
کے مطابق ایسے شخص وقت میں بھی مہمان کی فیاضیت مقدم
تھی۔ میرے لیے دسترخوان بچھ گیا "اس پریشانی میں کیا کیا تا"
پھر بھی بیٹھ گیا۔ اس دوران امیر رضا ماموں اپنی خالہ اور دیگر
رشتے داروں کے ساتھ ہاتھیں کرتا رہا اور پاکستانی آعرہ کی
خیریت بتاتا رہا۔ آخر جب میری بے تابی کم نہ ہوئی تو ان کا
ہاتھ پکڑ کر میں نے کہا "مگر کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف
کر دیجئے۔" یہ جملہ بھی بار بار دہرائتا پڑا کچھ دھیمی آواز میں
بولے "معاف کیا ہا ہا!" اور لوگوں سے میری حالت دیکھی
نہیں جا رہی تھی۔ مجھے باتوں میں لگا لیا۔ کچھ دیر بعد انہوں
نے سگریٹ مانگا دو ایک کش یوں لیے کہ امیر رضا ماموں کے
ہاتھ میں سگریٹ بھی جوان کے ہونٹوں پر لگا دیتے۔ دس منٹ
بعد انہوں نے کرکٹ لی اور تیکہ پر کچھ بلند ہوئے۔

میں نے امیر رضا ماموں سے کہا "ان کو جلدی سے اچھا
کر دیجئے" میں آیا ہی ہوں ان کو کراچی لے جانے کے لیے۔
وہاں ان کے چاہنے والے بہت ہیں۔ ان کے شاگردوں کی
وہاں اتنی پذیرائی ہوتی ہے یہ خود بخود جائیں تو دھوم مچ جائے
گی۔ ان کو تو سب مانتے ہیں صرف میں ان کے خلاف لکھنے لگا
ہوں۔

کاظمی ماموں نے یہ جملہ سنا تو ان کے چہرے پر
مسکراہٹ جمیل گئی۔ اب کسی قدر قوت کے ساتھ کاظمی ماموں
(جمیل مظہری) بولے "رات بھر تو ٹھہر جاتے۔" میں نے عذر
پیش کیا کہ صبح آؤں گا۔ آخر جب اٹھا تو صاف اور بلند آواز
میں "فی امان اللہ" کہہ کر کاظمی ماموں نے رخصت کیا۔ یہ ان
کی آخری آواز تھی جو میں نے سنی تین دن بعد وہ خود اللہ کی
امان میں چلے گئے۔"

23 جولائی 1980ء کو رات کے گیارہ بجے وہ رانی
ملک عدم ہوئے۔ جنازہ اگلے دن ساڑھے چار بجے سپر
میں اٹھا اور انہیں ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں سپرد خاک
کر دیا گیا۔ اپنے مرنے کی تاریخ انہوں نے خود ہی "مظہری
مرڈ" سے (1399ھ) نکال لی تھی لیکن دس مہینے بعد رضا
کاظمی مظہری نے "از سر آہ" سے ایک کے چھپنے سے
(1400ھ) تاریخ نکالی۔

مشعل راہ

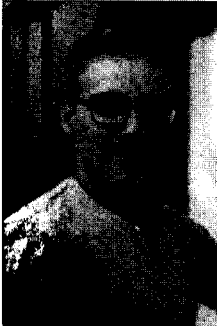
زویا اعجاز

علم کی ترسیل عبادت سے کم نہیں، لوگ اس اہم نکتے سے آگاہ ہیں پھر بھی کوشاں نہیں جب کہ مسلمانوں کو علم کی شمع جلانے کا حکم خاص ہے۔ جسے یورپیوں نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ خود بھی سیراب ہو رہے ہیں اور دیگر احباب کو بھی ترغیب دے رہے ہیں۔

ان افراد کی روداد جنہوں نے مشعل علم تھام کر ایک مثال قائم کی

1972 میں پیدا ہوا۔

اس کی زندگی بہت سی مشکلات اور کٹھنائیوں سے



عبارت رہی۔ روایتی انداز میں تعلیمی سفر جاری رکھتے ہوئے اس نے 'میڈرڈ پولی ٹیکنک یونیورسٹی سے ٹیلی کمیونیکیشن سسٹم میں انجینئرنگ گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تعلیم اپنے اخراجات اور دیگر ضروریات پوری

کرنے کی غرض سے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے اس نے کبھی یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ قدرت نے مستقبل بعید میں اس مقدس پیشے سے وابستگی اس کے لیے مقوم کر رکھی ہے۔

اس وقت اگر احباب ڈیوڈ سے مستقبل کی بات کریں

قرآن کا حکم ہے کہ ”پڑھو“ گویا تعلیم حاصل کرنے اور تعلیم دینے کا کام اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک اچھا عمل ہے۔ جب تک ہم نے علم و فن میں دلچسپی لی تو ہم علم و عرفان میں سب سے آگے نظر آئے۔ بغداد ہو یا ہسپانیہ، علم کی ترویج و تبلیغ میں

سب سے آگے تھے۔ اس وقت جب یورپ و امریکا میں لوگ بہتر معاشرے سے قطعی لاعلم تھے۔ ہم میدانِ علم میں راج کر رہے تھے لیکن آج؟ آج ہم علم سے دور بہت دور نظر آ رہے ہیں اور یورپ و امریکا علم و فن کا مرکز بنا ہوا ہے۔ وہی لوگ جو ہم سے علم کے باب میں استفادہ کرتے تھے۔ اب ہمیں علم حاصل کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ بہترین عالمی اساتذہ کا تعین کر رہے ہیں۔ اس بار ”گلوبل ٹیچرز“ کا انعام جن دس امانتہ کو دیا گیا ان میں سے ایک سلیمہ ہے جس کا تعلق اپنے اہل اتان سے ہے۔ ان کی سوانح آپ ”روایتِ جمن“ کے ”ان سے پڑھیں گے“ آپ باقی کے نو اساتذہ کا تذکرہ بھی ملاحظہ

الان کے تاریخی شہر میڈرڈ سے تعلق رکھنے والا ڈیوڈ

ماہنامہ مسرگورشت

ستمبر 2017ء

دریافت کرتے تو اس کی چمکنی آنکھوں، لبوں پر کھلی مسکراہٹ اور کھویا ہوا انداز بجا بلک و دل ایک ہی عہد پر دیتا کہ وہ انجینئر بن کر دولت، شہرت، کامیابی کی بلندیاں چھونے اور ٹیلی ویژیشن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا خواہشمند ہے۔ ڈگری مکمل ہوتے ہی اسے Florentino Perez, Xfera نامی مقامی کمپنی میں نوکری مل گئی۔ زندگی بہت سہل نہ تھی لیکن مشکل بھی نہیں رہی تھی۔

اپنے خوابوں کی تکمیل کے تعاقب میں اندھا دھند بھاگتے ہوئے ڈیوڈ کو پہلی شوگر اس وقت لگی جب 2005 میں ٹیلی ویژیشن سیکٹر میں مالیاتی بحران کی وجہ سے اسے بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بحران کی زد میں آ کر ہزاروں ملازمین در بدر ہو گئے۔

خاندانی ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے لیے اس نے چاروٹا چار ایک بار پھر زمانہ طالب علمی کے ساتھی کا ہاتھ تمام لیا اور عائشی سہارے کی غرض سے اسی ادارہ میں تدریس کا آغاز کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے میڈرڈ کے مضافات میں چھوٹے پیمانہ پر اپنی اکیڈمی قائم کر لی۔

دو سال بعد ٹیلی ویژیشن شعبہ میں استحکام سے ڈیوڈ جیسے ہزاروں افراد کے لیے خوشحالی، معقول تنخواہ اور سہولیات کی نوید پیدا ہو گئی۔ یہ وقت اس کے لیے بہت ٹھکان تھا۔ وہ ایک ایسے دور ہے پر کھڑا تھا جہاں ایک راہ گذار اسے اپنے خوابوں کی منزل تک لے جانے کے لیے ہاتھیں دایکے پکار رہی تھی۔ اس منزل تک رسائی کے بعد دولت، تفریبات اور شاندار طرز زندگی پر دسترس پائی تھی۔ لیکن ایک وجدانی جذبہ کے زیر اثر اس نے دوسری راہ اپنانے کا فیصلہ کیا اور شعبہ تدریس سے وابستہ رہتے ہوئے مزید جذبہ، لگن اور خلوص سے نسل نو کی تربیت کا بیڑا اٹھا لیا۔

بحیثیت طالب علم ڈیوڈ نے نصابی دسترس کے لیے بہت کٹھنایوں کا سامنا کیا تھا۔ ریاضیات، طبیعیات، کیمیا اور ٹیکنالوجی جیسے مضامین اس سمیت ہزار ہا طلبہ کے لیے کومین جیسے تھے جنہیں لگنا محض ایک مجبوری تھی۔ اساتذہ کا روایتی طریقہ تدریس خشک، غیر دلچسپ اور بے کیف ہوتا۔ ان مضامین میں معمولی غلط جتنش پر تمام تر جوابی مواد میں ناکامی طلبہ کو مزید خائف اور پیرا کر کے رکھتی ہے۔ یہ اہم ترین سائنسی مضامین محض اچھے نمبر اور گرگیڈز کے حصول کے لیے طوعاً و کرہاً پڑھے جاتے تو لامحالہ طور پر عملی زندگی میں ان پر دسترس اور اطلاقی ایک بیدار قیاس امر تھا۔

میڈرڈ کے گرد و نواح میں واقع کبھی تعلیمی ادارے روایات کے پابند تھے۔ اس جماعت کا محدود مٹھن زدہ ماحول طلبہ کی صلاحیتیں اجاگر کرنے کی بجائے خوابیدگی کی طرف مائل کرتا تھا۔ طلبہ کی اکثریت معاشی دباؤ کا شکار بھی تھی جس کے باعث اضافی کوچنگ کلاسز اور اکیڈمی میں داخلے کا تصور بھی محال تھا۔ اسے اپنی اکیڈمی میں ایسے طلبہ سے واسطہ رہتا جو کتابوں کو بوجھ گردانتے۔ ان میں خود اعتمادی کی شدید کمی تھی۔ بیزاری کا یہ سفر اس موڑ پر آن پہنچا تھا کہ وہ ریاضی کیمیا اور طبیعیات سے نفرت کرنے لگے۔

ڈیوڈ کی دورانہ پیش نظر اس اپنے ملک و قوم کے لیے مستقبل میں ذہانت، اہلیت اور حقیقی صلاحیتوں سے مبرا نسل نو کی ایک بڑی کھپ تیار ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے وسیع تر قومی مفاد کے لیے ذاتی مفاد ترک کر دیا اور ایک ایسی سپاہ کی تیاری میں جت لیا جو سائنسی مضامین کی اہمیت اور اس کی اصل روح سمجھ سکے۔ اس کی ذاتی رائے میں سائنس ہی انسانی زندگی کی بہتری، قومی اقدار کی تعمیر اور پرامن عالمی زندگی بسر کرنے کا واحد ذریعہ تھا۔ ضرورت محض اس بات کی تھی کہ ان بے کیف مضامین کے لیے طلبہ کے دلوں میں شریک، محبت اور حقیقی جذبہ اجاگر کیا جائے تاکہ وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے ایسی طویل مسافت اختیار کریں جو بالآخر قومی ترقی پر منتج ہو۔ ڈیوڈ نے اس جنگ کے لیے اپنے تمام تر تھکاوٹ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ قدرتی طور پر شیریں دہن اور نرم مزاج تھا۔ اس کی گفتگو کی تاثیر مخاطب کے دل میں گھر کر لیتی۔ دیگر اساتذہ کی طرح وہ اپنی علیت جھاڑنے سے گریز کرتا اور طلبہ کو ان کی ذاتی سطح کے مطابق تعلیم دیتا۔ اس کا تھوڑی انداز اور دوزمرہ زندگی سے غفلت مثالوں کے ذریعہ مشکل ترین سائنسی تصورات کا بیان اس قدر سادہ ہوتا کہ طلبہ دنگ رہ جاتے۔ یہ حیرانی بتدریج تجسس، کھوج اور جستجو میں ڈھلنے لگی۔ ہم عصر اساتذہ کے برعکس کرائے جماعت کا ماحول خوشگوار بنائے رکھنا ہی اس کی اولین ترجیح تھی۔

ڈیوڈ کو بخوبی علم تھا کہ ان مضامین میں طلبہ کن مقامات پر تفصیلی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے سادہ انداز بیان نے ان سبھی مسائل کا خاتمہ کر دیا۔ طلبہ کی سوچ اور ترجیحات میں توازن تبدیلیاں نظر آنے لگیں لیکن ڈیوڈ کی پیشہ وارانہ سوچ اب بھی مضطرب تھی۔

2011 میں یہ اضطراب مزید شدت اختیار کر چکا

فاروق قیصر

زندگی ایک تماشا ہے۔ ہم سب اس کا حصہ ہیں۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر اور کہیں بڑے پیمانے پر کچھ نئی تماشا جاری ہے۔ کس مسئلے کا حلق کس بات سے ہے، کس بات کا کیا مطلب ہے؟ اس طرح کے سوالوں کے ذریعے زندگی کی باریکیوں کو مزاح کے انداز میں پیش کرنے والی ایک ہی شخصیت ہے جس کو ہم فاروق قیصر عرف اکل سرم کے نام سے جانتے ہیں۔ فاروق قیصر بہت اچھے اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ لی وی کی تاریخ میں جب بھی مزاحیہ پروگراموں کی تاریخ لکھی جائے گی، اس میں اکل سرم کا پروگرام ”کلیاں“ سرفہرست ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ روزنامہ جنگ میں فکر انگیز کالم لکھتے ہیں، نیشنل کالج آف آرٹس کی وزٹنگ فیکلٹی میں بھی ہیں۔ ملائیشیا میں یو سیف کی طرف سے انہیں ”ماسٹر پیٹ آف دی ریجن“ کا خطاب بھی ملا۔ ان کے کیریئر پر بہت سی بہترین تحریریں اور گفتے چلے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ مزاح کی دنیا میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں، ایک شاعر کی آکھی بھی آپ کی شخصیت کا حصہ ہے۔ ان کی گفتگو میں کئی ہے مگر کچھ ہے۔ ان کے زندگی کو دیکھنے کے زائے بہت مختلف مگر اچھے ہیں۔

انتہاس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے

از: خرم جمیل

مقبول ہو گیا۔

اس چینل کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ دسمبر 2012 میں اس کا شمار یورپ میں گوگل پر تلاش کیے جانے والے 25 سرفہرست چینلوں میں ہونے لگا اور اگلے دو سال میں یوٹیوب کوسو بہترین عالمی چینلوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ 2014 میں ڈیوڈ نے tunicoos.com فری آن لائن اکیڈمی کا اجراء کر دیا۔ اس کے لیے طلبہ کا ڈیجیٹل بہت خوش کن اور مثبت محرک تھا۔ اسے عوامی مقبولیت یا کسی بھی سرکاری انعام و کرام سے غرض نہ تھی۔ اس کے پیش نظر تو صرف ان سبکی بچوں کا بہتر مستقبل تھا جنہیں آئندہ زندگی میں اپنے خاندان، ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنی تھی اور یہ مقصد واضح تر سائنسی تصورات اور ٹیکنالوجی پر دسترس کے بنا حاصل کرنے کی سوچ دہانے کا خواب تھی۔ اس پیکلٹ جماعت اور ڈیوڈ میں وہ طلبہ کو ہار ہا

تھا۔ اسکول اکیڈمی میں گزارے گئے چند گھنٹے ان طلبہ کے لیے ناکافی تھے۔ علاوہ ازیں وہ ان لاکھوں طلبہ کے لیے بھی آزدہ رہتا جو وی اور بین الاقوامی سطح پر اب بھی روایتی طریقہ تدریس سے جنگ آزماتے۔ ڈیوڈ رنگ نیشنل قوم کے فرق سے قطع نظر سب طلبہ کو یکساں مواقع دینے کا قائل تھا۔ اس کی دانست میں مساوات اور وسائل کی یکساں تقسیم ہی عالمی افق پر یقینی مثبت تبدیلی کا واحد حل ہیں اور یہی وہ وقت تھا جب اس کے حواس ذہن میں ایک ایسے اچھوتے خیال نے جنم لیا جس نے عالمی تعلیمی تاریخ میں انقلاب برپا کر دیا۔

ڈیوڈ نے اپنی کلاشوں کی ترویج کے لیے اپنے مختصر لیچرز ویڈیو کی صورت میں ریکارڈ کیے اور پھر انٹرنیٹ اکاؤنٹ کے ذریعہ یوٹیوب پر سبھی ویڈیوز اپلوڈ کر دیں۔ مخصوص سادہ ڈنشین

اور غیر روایتی انداز میں بنائی گئی یہ ویڈیوز شخص دس منٹ کے دورانیہ میں طلبہ کو وہ تصورات سمجھا دیتی جنہیں وہ دوسے تین ماہ کی روایتی تدریس کے بعد بھی سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ طبیعات کیسے اور ریاضی اب ایک من پسند اور دلچسپ صورت اختیار کرنے لگے۔ ڈیوڈ کی یہ ویڈیوز اکیڈمی کے بچپن میں طلبہ کو مد نظر رکھ کر نہیں بنائی گئیں بلکہ اس کی سوچ آفاقی تھی۔ وہ اپنا جدوجہد بھاری ذمہ داری تلے با محسوس کرنے لگا تھا۔

خلوص اور لگن کی راہ کبھی بھی متوازی نہیں رہ پائی۔ مخالفت اور سازشیں ایک آزمائش بن کر لازماً قوت پر واز آرماتی ہیں۔ ڈیوڈ کو بھی روایت پرست اداروں اور اساتذہ کی محاذ آرائی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں اس انتہائی قدم سے اپنے اداروں کی بقاء اور معاشی برتری خطرہ میں نظر آنے لگی تھی اس لیے مختلف الزام تراشیوں اور افواہوں کا ایک بازار گرم ہو گیا۔ اس کے لیے یہ صورت حال نہایت افسردہ اور دل شکن تھی۔ اس کے خلوص نیت پر شبہ بظاہر بے غرض جذبات کی توجہ تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے مخالفین کو دو ٹوک موقف سے واضح کیا کہ اس کی بنائی گئی ویڈیوز کڑے جماعت اور اساتذہ کا تبادلہ کسی صورت بھی نہیں ہو سکتیں۔ اس کی یہ کاوشیں محض اساتذہ کی مدد کا ذریعہ ہیں تا کہ وہ بھی طلبہ کو بہترین تعلیمی تصورات فراہم کر سکیں۔

ان دشمن حالات اور مخالفت کے باوجود اس نے اپنا سفر جاری رکھا اور Unicoos نامی ایک آن لائن تعلیمی چینل کا آغاز کیا۔ اس چینل تک رسائی ہر لحاظ سے بلا معاوضہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے یوٹیوب کوسو آئین اور لاطینی امریکا میں بے حد

بات دہراتا۔ ”امید کا دامن کبھی مت چھوڑو۔ اپنی امید کبھی بھی ترک مت کرنا۔ آج کل، زندگی میں کسی بھی مقام پر نہیں۔“ وہ ان طلبہ کو ناکامی اپنی ذات پر عدم اعتمادی کے آسیب سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا تاکہ زندگی میں کسی بھی موڑ پر وہ معاشی خواری کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکیں۔

یونیویسٹوں کی کامیابی کے باوجود متعدد افراد کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ اسے اپنی اکیڈمی کی توسیع کے لیے کوئی شراکت دار میسر نہ آسکا۔ اس افسوسناک امر کی وجہ محض یہ تھی ’یونی کون‘ ٹیک نیٹی پر مبنی ایک ایسا تعلیمی چینل تھا جس میں کوئی مالی منفعت شامل نہ تھی۔ ڈیوڈ نے اس رویے پر بھی حرف شکایت تک ادا نہ کیا۔ ہاں! اس کے دل میں ایک خواہش ضرور تھی کہ اگر وہ معاشی طور پر محکم ہوا تو اپنی رقم اساتذہ کی تربیت پر صرف کرے گا۔

ابتدائی مخالفت کے باوجود یونی کون‘ کی مقبولیت نے نئی ریکارڈ قائم کیے۔ اس کی بنائی گئی تقریباً 700 ویڈیوز استعمال کرنے والے افراد کی تعداد سو ملین تک پہنچ چکی ہے۔ یونیویٹ پر 700,000 افراد اس کے چینل سے مستفید ہوتے ہیں جبکہ فیس بک پر استعمال کنندہ کی تعداد 170,000 ہے۔ فی الوقت یونیویسٹوں نے اسپین کے تین بہترین چینلوں میں رسائی حاصل کر لی ہے اور کئی اساتذہ اپنی تدریس میں ان ویڈیوز کا استعمال کرتے ہیں۔ قومی سطح پر ڈیوڈ کے اس منفرد سلسلہ کی اہمیت اب مسلمہ ہے۔ چند ماہ قبل اسے بہترین یوٹیوبر کا ایوارڈ دیا گیا۔ مگر اعلیٰ اخلاقیہ کی جانب سے یونیویسٹ کو ہسپانوی معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرنے پر نہ صرف ایک خصوصی ایوارڈ سے نوازا گیا بلکہ ڈیوڈ کو یورپی پارلیمنٹ میں اپنی طویل جدوجہد کی داستان بیان کرنے کے لیے بھی مدعو کیا گیا۔ یونیویسٹ واحد ہسپانوی چینل ہے جسے قومی سطح پر کئی بار خصوصی اعزازات ملے ہیں۔ تیس سے زائد ممالک میں پندرہ ہزار افراد اس کے باضابطہ رجسٹر شدہ صارفین ہیں۔

ان مگر انقدر کامیابیوں کے باوجود اس کی کئی خواہشات اب بھی تشہ ہیں۔ وہ برٹس ’فانس‘ حیاتیات، شہریات کے طلبہ کے لیے بھی اس انقلابی مہم کا آغاز کرنا چاہتا ہے۔ اس کی پُر خلوص کاوشیں مستحق اور نادر طلبہ کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ بولیویا سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی نے کسی بھی تعلیمی ادارہ کی مدد کے بغیر محض ویڈیوز سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے امتحانات میں کامیابی حاصل کر لی۔ اسپین ہی کا ایک نابینا محکم بصارت سے محروم کی باوجود انہی ویڈیوز کے بل بوتے پر سائنسی تصورات میں کسی بھی نادر ملال علم سے کمتر نہیں۔

ڈیوڈ کی اس کٹھن جدوجہد کا لامتناہی سفر اب بھی جاری ہے۔ وہ طلبہ کا مکمل نفس شناس ہے۔ بحیثیت معلم وہ طلبہ سے شخص چند نمٹنے کے تعامل کا قائل نہیں۔ طلبہ شب و روز میں کسی بھی وقت واٹس ایپ پر رابطہ کر کے اس سے اپنے تعلیمی مسائل کا حل دریافت کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ پیشانی پر کوئی بھی جھکن لائے بغیر انھیں فوری رہنمائی فراہم کر دیتا ہے۔

ڈیوڈ اپنی اکیڈمی کے طلبہ کو اسباق میں مسائل کے حل کی نشاندہی کرنے کے بعد غیر محسوس طریقہ سے ان کی انگلی تھامے ایک ایسے مقام پر لے آتا ہے جہاں وہ خود ان مسائل کو حل کرنے کے قائل ہو جاتے ہیں۔ امتحانات کے دوران ان کے شکوک و شبہات خوف زائل کرنے کے لیے وہ اپنی تدریس کا دورانیہ بھی بڑھانے میں متامل نہیں رہتا اور یہ بھی اقدام بلا معاوضہ ہوتے ہیں۔

ریمنڈ برطانوی نژاد ہے۔ زمانہ طالب علمی ہی سے وہ بہت ذہین جدت پسند اور ذمہ دار تھا۔ کمپیوٹر کی جادوئی دنیا تغیر کرنا اس کا جنون تھا لیکن لوح تقدیر میں اس کے لیے کچھ اور ہی مقوم تھا۔ وہ حادثاتی طور پر شعبہ تدریس سے وابستہ ہوا۔ پھر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس میدان میں دریافت اور تغیر کا ایک وسیع جہان آباد ہے۔ اس وقت برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی کمپیوٹر کی تدریس روایتی اور غیر ترقی یافتہ تھی۔

انفارمیشن اینڈ کمیونیکیشن ٹیکنالوجی (ICT) سے منسلک ریمنڈ کے لیے یہ صورت حال بہت مایوس کن تھی۔ جدید ٹیکنالوجی کے اس دور میں جب زندگی کے ہر شعبہ میں کمپیوٹر کا چارہ داری ہے، غیر ترقی یافتہ اور روایتی انداز میں طلبہ کے ذہن میں بھاری بھر کم اصطلاحات زبردستی ٹھونس انھیں اس تئیں کے تابع بنانے کے مترادف تھا۔ ریمنڈ نے شب و روز کی محنت کے بعد Microsoft Kinect استعمال کرتے ہوئے

تدریس میں تنوع پیدا کیا جس کی رو سے آنی سی ٹی لیکچرزم خشک اور بے حد دلچسپ بن گئے۔

اس نے روایتی طریقہ کار ترک کرتے ہوئے اپنی جماعت میں ہلکا پھلکا انداز رائج کیا۔ طلبہ کو ہمہ وقت مختلف عملی سرگرمیوں میں



شریک کرنے کے بعد خاطر خواہ نتائج میسر آنے لگے۔ اس کے ذیلی مؤقف کے مطابق معلم روشنی اور توانائی کا منبع ہے۔ روشنی کی رفتار پر حد طاقتور ہوتی ہے۔ اسی طرح جب معلم اپنے طلبہ کی زندگیاں روشنی سے منور کرتا ہے تو ظلمت کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ ریمینڈ چیمبرز بھی ایسی ہی روشنی بننے کا خواہشمند تھا۔

اس کی تحقیقی سرگرمیوں سے تدریسی عمل میں تبدیلیوں کی لہر آئی تو اس نے اپنے تجربات قوی سطح پر دیگر اساتذہ تک پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ آئی ٹی کو اپنا اختیار بنانا ایک خصوصی بلاگ قائم کیا۔ اپنا تحقیقی مواد اور وسائل سے متعلق معلومات اس بلاگ پر اپلوڈ کرنے کے علاوہ وہ ٹویٹر پر بھی آئی ٹی سی اساتذہ سے رابطہ قائم رکھتا۔ اس کے غیر روایتی نظریات ترقیاتی طرز فکر اور جدت پسندی نے بہت جلد تعلیمی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی۔

ریمینڈ کی اہلیت کی گونج عالمی سطح پر بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ 2012 میں اسے یورپی اساتذہ کی ایک خصوصی کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ اس کانفرنس کے کچھ ہی عرصہ بعد حکومت برطانیہ نے ثانوی سطح پر آئی ٹی سی کا نصاب کمپیوٹر سائنس میں تبدیل کر دیا۔ اساتذہ کی اکثریت اس تبدیلی سے بہت خائف اور کسی حد تک عدم تحفظ کا شکار بھی تھی۔ ان معتمدین کی معاونت اور پیشروانہ قابلیت میں اضافے کے لیے ریمینڈ کی خدمات حاصل کی گئیں۔

بعد ازاں اس نے اپنے ہم پیشہ افرادی مزید اعانت کے لیے ایک یوٹیوب چینل کا اجراء کیا۔ اس کی لگن، شجیدگی اور جدت پسندانہ سوچ نے کمپیوٹر سائنس کے میدان میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس چینل کے 250,000 سے زائد صارف ہیں۔ اس کی روایتی تکنیکی اور جدید طریقہ تعلیم کی بدولت برطانوی نسل نو نے کمپیوٹر سائنس کے شعبہ میں اکثر یورپی اقوام پر برتری حاصل کر لی ہے۔ طلبہ کی شاندار کامیابی اور طرز فکر میں تبدیلی ریمینڈ کے لیے مزید تحریک کا باعث بننے لگی۔ اس نے اپنی تخلیق اور تحقیق کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب 'بی بی سی' نے قومی سطح پر اساتذہ کے لیے 'ٹائیکرو بٹ' وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے اسے معاونت کی پیشکش کی۔

ریمینڈ چیمبرز کی 'بروک ویشن' اکیڈمی میں زیر تعلیم طلبہ اسی کی صلاحیتوں کا پرتو تھیں۔ حادثاتی طور پر تدریس سے منسلک ہونے والے ریمینڈ کے لیے اپنا کام عشق اور جنون کی حیثیت

اعتبار کر گیا ہے۔ اسے اپنے طلبہ سے بھی بہت محبت ہے۔ معلم محترم میں تا عمر برقرار رہنے والا یہ رشتہ اپنی طرز میں منفرد ترین ہے۔ اس کے لیے تدریس ایک مکمل طرز فکر و طرز زندگی ہے۔ تعلیم کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور معلم بھی ہر روز ایک نئی چیز سیکھتا ہے۔ وہ اپنے ملک و قوم کے لیے مثبت سوچ، کردار اور لگن سے لیس سیاہ تار کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

ریمینڈ کی ذاتی زندگی بھی توازن، خوشیوں اور نظم و ضبط سے گندمی ہے۔ بہترین سوچ سے لیس شریک حیات نے اس کے جنون اور تجو کے سفر میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی۔ ان دونوں نے باہمی رضامندی سے ایک کیلنڈر مرتب کر رکھا ہے۔ یہ خصوصی کیلنڈر موبائل فون کی یادداشت کے علاوہ گھر کی دیوار پر بھی آویزاں ہیں جس میں معمولی ترین امر کی منصوبہ بندی بھی پہلے سے ہی طے شدہ ہے۔ نظم و ضبط کے سلسلہ میں وہ کسی بھی سمجھوتے کا قائل نہیں اس لیے اکثر ویڈیو ایسے لوگوں سے نالاں رہتا ہے جو تدریس جیسے مقدس اور ارفع شعبہ میں درپیش مسائل کا حل تلاش کرنے کی بجائے شخص زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔

اس جواں سالہ معلم کو قومی سطح پر کئی ایک ایوارڈز سے نوازا گیا۔ 2013/14 میں اسے جدید مستعد اور ذہن ترین ماہر تعلیم کا اعزاز دیا گیا جبکہ 2015 میں ٹیکنالوجی میں جدت اور آسانی پیدا کرنے کے لیے برطانوی قومی تدریسی ایوارڈ کا قریحہ فال بھی ریمینڈ ہی کے نام رہا۔

نیری کرکسٹن قوم وطن پرستی ایک جہلی جذبہ ہے جو ہر انسان کی رگوں میں سایا ہوتا ہے۔ تاہم رنگ و نسل و قوم سے مبراہہ کر مکمل انسانیت کی بھلائی کے لیے سرگرم رہنے والے افراد بہت کم ملتے ہیں۔ ایسے ہی نادر افراد میں جرمن کی 33 سالہ معلمہ 'نیری کرکسٹن' بھی شامل ہے۔

نیری ایک توانا، غیر متعصب اور مقناطیسی شخصیت کی حامل ہے۔ میونسروپوندرستی سے ریاضی اور کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنی زندگی درس و تدریس سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ روایتی تعلیمی نظام بچوں کے نرم و نازک وجود اور لطیف نفسیات پر کتنا بھروسہ کی طرح لا درائیں بیزاراں اور جیتی جاتی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ان روایتی طریقوں سے شعوری بنوائے کرتے ہوئے اس نے اپنے طلبہ کو تعلیم بذریعہ کھیل سے متعارف کروایا۔

جرمن خُدا بچوں سے باسانی مصلحت مل گئے ہیں۔ اپنی ہزاروں اور اجنبیت فراموش کیے وہ بہترین زندگی کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔

نمیری کرشناؤں کا ذاتی اور پیشہ وارانہ فلسفہ زندگی بہت سادہ ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ تعلیم ہی واحد تھیار ہے جس کے ذریعہ معاشرتی ناہمواریوں کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ کھیل کود کے ذریعہ بچوں میں قوت برداشت، ٹھنک تسلیم کرنے کی جرأت اور باہر جیت کے جذبہ سے قطع نظر جہد مسلسل کی لگن پروان چڑھائی جاسکتی ہیں۔ سماجی رتبہ سے محروم بچوں کو مہاجر طلبہ کے علاوہ افریقی ممالک میں سیاست و استحصال کی بجائے چڑھنے والے محصلین کو زندگی کی رنگینوں کی طرف واپس لانے کا سہرا صرف نمیری ہی کے سر ہے۔

اس کی سحرانہ شخصیت قومی اور بین الاقوامی سطح پر یکساں مقبول ہے۔ جرمنی، نائیجیریا اور دیگر افریقی اسکولوں کے باہمی تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے انتظامیہ کا پہلا انتخاب نمیری ہی ہوتی ہے۔ اُمید بخشی اور مساوات کا درس دینے والی اس خاتون کی کاوشیں انمول ہیں۔ گھول نچر پر اُترنے میں نامزدگی کے علاوہ اسے سرکاری طور پر بہترین رہنما مطع کے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔

ٹریسی۔ این ہال

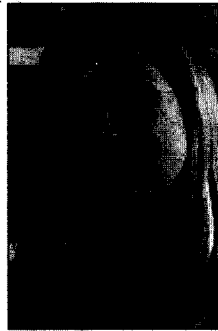
اس روئے ارض میں ہی انسانییت میں مظلوم ترین قوم بلاشبہ سیاہ فام افراد ہیں۔

ماضی بعید سے تادم تحریر ان کی حالت زار میں کمی کوئی انقلابی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ماضی میں سیاہ فام غلاموں کے لیے باقاعدہ منڈی لگائی جاتی اور ان مجبوروں کے کس افراد اس طرح خرید و فروخت کی جاتی گویا وہ انسانیت کے درجہ میں شمار ہی نہیں ہوتے۔ مغربی سامراجی طاقتوں نے افریقی اور دیگر سیاہ فام ممالک میں تو آبادیاں قائم کر کے یہاں استحصال اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا تھا۔ ان ممالک کے وسائل پر مکمل قابض ہونے کے بعد مقامی آبادی کو حقیر کچھوں سے بدرجہ زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔

مختلف ادوار میں ان محنت درد مند افراد نے ان مظلوموں کی سیاسی کاہنہ اٹھائی۔ بہتری و ترقی کی رفتار سے ہی سہی لیکن ہر خطہ میں اب بھی جاری ہے۔ سچائش ٹاؤن، بیکاس میں یہ کام خیر ٹریسی۔ این ہال نے سنبھال رکھا ہے۔

جیسا کہ مسرت زدہ بنیادی ضروریات سے محروم زندگی کسی سے مخفی پوشیدہ نہیں۔ ٹریسی کا بچپن اور تعلیمی حالات بھی

اس روایت فکری کے نتائج نمیری کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوئے۔ طلبہ میں گہری دلچسپی اور تجسس پروان چڑھنے لگا۔ اسکول کو جنیل اور قید خانہ تصور کرنے والے محصلین ان غیر روایتی طریقوں کے سحر میں جکڑے کتب سے محبت میں مبتلا ہو گئے۔



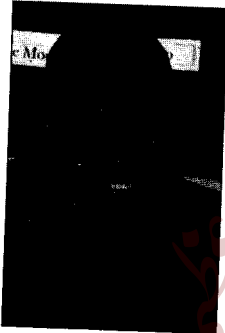
نمیری کرشناؤں قدرتی طور پر ایک عظیم رہنما کی تمام تر صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ اس کے بچہ طلبہ پر فسون طاری کر دیتے ہیں۔ طریقہ تعلیم میں جدت کی قائل ہونے کے ساتھ اسے ختمے بچوں کی نفسیات پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ اس کے کہنا بجا جماعت چمچیرے کے حال کی مانند ہیں جس میں ایک بار جکڑ لیے جانے کے بعد رہائی کسی صورت بھی ممکن نہیں ہوتی۔

طلبہ گروہی سرگرمیوں کی صورت میں کام کرتے معاشرتی تعامل سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ نمیری کی شخصیت ان کے لیے کسی سچاے سے کم نہیں۔ وہ اسے اپنے گھر بیلو اور ذاتی مسائل بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتے اور اس کے فراہم کردہ مشورہ اور تجاویز پر دل و جان سے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ نمیری کرشناؤں کی ذات کا ایک اور خوبصورت پہلو مہاجر بچوں سے دل لگاؤ اور ہمدردی ہے۔ اپنی شخصی شناخت اسباب زندگی، گھریلو اور خواتین سے منہ موڑنے کی نئی سرزمین میں بسا بلاشبہ ایک بہت صحن امر ہے۔ اس کے بعد مہاجر کی قسمت ایک نئی آزمائش کا آغاز کر دیتی ہے۔ نئے لوگ، ماحول، اقدار و ثقافت اور سرزمین میں اس کا مزاج اور فطرت کی جڑیں پیوست ہونا بھی قطعی پہل نہیں ہوتا۔

ہجرت کے اس دردناک عمل میں بچے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور اگر وہ اپنے نئے ماحول میں معاشرتی تعامل حاصل نہ کر پائیں تو شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت ذہنی شکستگی اور خود اعتمادی سے محرومی کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ نمیری کی خصوصی توجہ بھی انہی بچوں پر مرکوز رہتی ہے۔ وہ اپنی محبت شفقت اور خدا داد صلاحیتوں سے انہیں زندگی کی طرف دوبارہ مائل کر کے ذاتی وقار اور کردار کی نئی بنیادیں تک لے جاتی ہے۔ اس کی انہی کوششوں کے نتیجہ میں ایران اور دیگر ممالک کے مہاجر بچے

تعلیمی تاریخ میں پہلی بار ٹریس کی اس جماعت نے 95 فیصد سے زائد نمبر حاصل کیے۔

تعلیمی برتری سے قطع نظر سیاہ فام ٹریس اپنے طلبہ کے دلوں میں انسانیت کی خدمت اور تڑپ بھی پیدا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے طلبہ کے باہمی تعاون و تعامل سے بے گھر نمروں اور گلیوں میں رہائش پذیر افراد کے لیے طعام کی فراہمی کا آغاز کیا۔ جو بھی خود حرکتی کلب اور اسکول میگزین کمیٹی کے لیے اس کی محنت و کوششیں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔



گذشتہ سالوں میں ٹریس کے طلبہ اس سے سیکھی گئی تمام تر پیشہ وارانہ اقدار سمیت جیسا کہ مختلف شعبوں میں مختلف عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں۔ پولیس افسران اسکول، ڈائریکٹر، ہوٹل مینجری اور شیف کے علاوہ خود حرکتی صنعت میں موجود ہیں۔ طلبہ اپنی اس

روایت شکن عقل سے کیے گئے چند وعدوں پر آج بھی کار بند ہیں۔ زندگی میں ہمیشہ ترنی کی جانب گامزن اور مزید اعلیٰ تعلیم کے حصول کا درس وہ بھی فراموش نہ کر پائے۔

ٹریس کے لیے لکھنے جماعت اپنی ورکشاپ کے مترادف ہے۔ کرے کی چار دیواری میں جا بجا ایسے چارلس آویزاں کئے گئے ہیں جن پر سابقہ طلبہ کی شاندار کامیابیاں اور حالیہ محکمہ تعلیم کے مقاصد زندگی خواب اور ارادے جلی حروف میں رقم ہیں۔ ان طلبہ کے مابین دوستانہ مقابلوں میں بہتر گریڈز اور نمایاں بہتری حاصل کرنے والے بچوں کو ٹریس ذاتی سطح پر تحائف اور انعام و کرام سے سزا دیتی ہے۔

وہ اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں بہت سے اداروں سے منسلک رہی۔ اور ہر ادارہ میں اس کی لگن، ہمت، محنت اور کامیابی کا تناسب یکساں رہا۔ اس نے خود حرکتی مشینی صنعت سے وابستہ با اختیار اور اثر و رسوخ کے حامل افراد تک ذاتی رسائی کے بعد انہیں ہر ممکن طریقہ سے قائل کیا کہ ذہین اور متفکر طلبہ کے لیے وہ فائدہ فراہم کیے جائیں۔

وسائل کی شدید کمی کے باوجود اس نے انتہائی خوش سلیقگی سے تدریسی مواد کی فراہمی میں بھی تھقل نہ آنے دیا۔ لگن و غلوں کا یہ عالم ہے کہ تعطیلات گرام میں کمتر معاشی

نہایت دگرگوں تھے۔ وہ ”ڈسلیکیا“ نامی بیماری کا شکار تھی۔ اس بیماری میں طالب علم متوازن ذہانت کے باوجود بہت سے مسائل میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسے الفاظ کے چکر کرنے، ان کی شناخت، تلفظ کی ادائیگی الفاظ کی لکھاؤ، ذہن میں ان کے تلفظ کی گونج محسوس کرنے میں پریشانی کے علاوہ پاکواز بلند ادائیگی میں بھی بہت دشواری ہوتی ہے۔ ڈسلیکیا کا قوت سماعت و بصارت میں عدم توازن سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ ایک جینیاتی اور ماحولیاتی مسئلہ ہے۔ عموماً یہ منفرد بیماری اسکول میں ابتدائی طور پر ہی تشخیص کر لی جاتی ہے لیکن ٹریس کی بد قسمتی دیکھیے کہ اسے کوئی میکانہ ملا۔ اپنی غیر تشخیص شدہ اس محرومی کے لیے کوئی بھی سہولت و علاج میسر نہ آسکا۔

پڑھائی لکھاؤ میں حائل ان ناقابل عبور رکاوٹوں سے جنگ آزمائشی نے اسکول تعلیم مکمل کرنے کے بعد خود حرکتی مشینوں (Automotive) کے ایک کیراج میں فنی تعلیم سیکھنے کا آغاز کیا تو اسے علم ہی نہ تھا کہ چھوڑی کے عالم میں لیا گیا یہ فیصلہ مستقبل قریب میں اس سمیت سینکڑوں طلبہ کی زندگیوں کا رخ تبدیل کر دے گا۔

کیراج میں ملنے والی اس فنی تربیت نے ٹریس کے دل میں تدریس کے لیے محبت اجاگر کر دی۔ اپنی علمی صلاحیت میں اضافہ کے لیے اس نے جیسا کہ ایک ایسے کالج میں داخلہ لیا جہاں پیشہ وارانہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اگلے تین سال میں وہ اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑی گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔

ٹریس کے مثبت رویہ اور طرز فکر نے آغاز ہی سے اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ اولین طور پر اسے جن طلبہ پر مشتمل جماعت کی تدریس تفویض کی گئی، ان کا سابقہ ریکارڈ بے حد خراب تھا۔ اساتذہ کے نقطہ نظر میں وہ ناقابل اصلاح بچے تھے۔ ان 30 لڑکوں پر پٹنی جماعت کے لیے ٹریس نے ان تھک محنت کی۔ ان کی ذہنی سازی، کردار کی تعمیر اور پھر شاندار تعلیمی نتائج کا حصول ایک بے مثال کارنامہ تھا۔

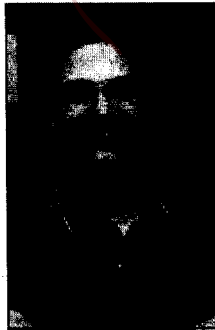
اس نے اپنی جماعت میں ایک کتب خانہ قائم کر لیا اور ہر کتاب کی تکمیل کے بعد طلبہ سے تہہ و بالا بھی گفتگو کے لیے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ دسویں گریڈ کے وہ بھی بچے مثبت تبدیلیوں کی زد میں آ گئے۔ اگلے گریڈ میں منتقلی کے بعد یہ تبدیلی ان پر اس قدر حاوی ہوئی کہ آٹھ لڑکوں نے اسکول طائفہ میں شمولیت اختیار کر لی اور ایک طالب علم اسکول ہیڈ بن گئے۔ کے عہدہ پر فائز ہو گیا۔ خود حرکتی پیشہ وارانہ امتحانات میں اسکول کی

خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کے لیے وہ خصوصی سرکپ منعقد کرتی ہے۔ ٹریسٹی کا مقصد زندگی صرف اپنی قوم اور نسل نو کی وحشی مضبوطی اور تعلیمی برتری ہے۔ اس کی کاوشوں کو خاطر خواہ پذیرائی تو نہ مل سکی لیکن محدود وسائل کے مطابق مقامی و قومی سطح پر اس کی خدمات مختلف ایوارڈز کی صورت میں سراہی جاتی رہی ہیں۔

گلوبل ٹیچرز براؤز کے لیے نامزدگی بلاشبہ اس کے خوش کن خوابوں کی تعبیر تھی لیکن ٹریسٹی یہ انعامی رقم حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

ویمرسن داسیلوا نوکیرا Wemerson Dasilva Nogueira

ویمرسن 1990 میں برازیل کے علاقے ”نوا وینھیا“ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین کا تعلق کاٹاکار طبقے سے تھا۔ سات بہن بھائیوں میں ویمرسن سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی زندگی میں اضافی لاڈ پیا اور ناخوشی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس کے سبھی بہن بھائی سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم رہے۔ ویمرسن کی دلچسپی کا محور حیاتیاتی سائنس تھا۔ اس نے گریجویشن کی ڈگری کے فوری بعد ہی تدریس کا آغاز کر دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے مضافاتی علاقہ میں واقع جس اسکول میں پڑھانے کا موقع میسر آیا، وہاں جرائم کی شرح بے حد بھیا تک تھی۔ اسکول میں زیر تعلیم طلبہ کے والدین کا سکہ بند مجرم تھے۔ انہی کے نقش قدم پر چلے ہوئے بچے بھی کم عمری ہی سے اسی راہ پر گامزن تھے۔ اسکول اساتذہ انتہائی مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔ تشدد اور منشیات کی ترسیل ایک ناسور کی طرح اس معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ کم عمر بچے بھی منشیات کی خرید و فروخت میں ملوث رہتے۔



پرائمری جماعت کے بعد اسکول چھوڑنے کی شرح پچاس فیصد سے بھی تجاوز کر جاتی تھی۔ اس صورت حال میں باقی ماندہ طلبہ کو پڑھائی میں دلچسپی دیتی تھی تو کیکر؟

ویمرسن ان حالات میں شخص انفرادی

اور آزدی محسوس کرنے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا

قابل نہ تھا۔ وہ عملی سوچ کا حامل شخص تھا۔ اس نے دیگر اسکولوں کے سربراہان اور اساتذہ سے کئی ملاقاتیں کیں اور ایک نئے سماجی فلاحی منصوبہ 'New Future' کے مندرجات پر کام کرنے کا آغاز کیا۔ اس منصوبہ کا مقصد طلبہ میں یہ احساس اجاگر کرنا تھا کہ اسکول اچھا شہری بننے کی تربیت کے لیے ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ان کے کردار میں تبدیلیوں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس منصوبہ سے قطع نظر ویمرسن نے ذاتی طور پر بھی سائنسی مضامین کی تدْرِیس و لکھن، موز اور دیرپا بنانے کے لیے نئے نئے تجربات کا آغاز کر دیا۔

اپنی تدریس کی عمل میں تحریک اور طلبہ میں توانائی و اتحاد پیدا کرنے کے لیے اس نے نصاب میں نیچر و ڈی گائے شامل کر دیے۔ کمزور جماعت میں 'دوری جدول' (Periodic Table) کی بور اور خشک ترین سرگرمی میں دلچسپی کے لیے وہ طلبہ کو نزدیکی و ریا کی علاقہ میں لے گیا تاکہ انہیں آبی آلودگی، مگد لے کچڑ سے پیدا ہونے والی ماحولیاتی آلودگی کا براہ راست مشاہدہ کر سکیں۔

بعد ازاں پانی میں موجود کیمیکلز کے تجربے کے لیے مطلوبہ نمونے اسکول لیبارٹری میں لے جائے گئے۔ اس پانی سے پیدا ہونے والے طبی و ماحولیاتی مسائل سے واقفیت کے لیے مقامی آبادی کا انٹرویو بھی لیا گیا۔ ان حقائق کی روشنی میں وفاقی یونیورسٹی UFES کی لیبارٹری میں بھی کئی ایک دورے کرنے کے بعد ساحلی علاقوں میں رہائش پذیر آبادی کے مسائل کا ماحولیاتی حل تلاش کر لیا گیا۔

ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اگلے چار سال میں توڑے فیصد طلبہ منشیات و جرائم کی دلدل سے آزاد ہو گئے۔ ویمرسن کا یہ اسکول برازیل کے بہترین اداروں میں شامل ہو چکا ہے اس اسکول ہی کی بدولت ایسے ملحقہ علاقہ کی شہرت میں مثبت تبدیلی پیدا ہوئی ہے جہاں منشیات کی ترسیل، پسماندگی اور تشدد کے باعث دیگر علاقوں کے رہائشی قدم دھرنے سے بھی سخت خوفزدہ رہتے تھے۔

ویمرسن نے پیشہ وارانہ زندگی میں اپنے فرسودہ تعلیمی نظام کی روایت کھنسی کرتے ہوئے تاریخی اقدام اٹھائے۔ اس نے معاشی دباؤ کے شکار طلبہ کو ہر قسم کی اخلاقی اور مادی دفرائیم کرنے کے علاوہ ہم پیشہ افراد کی تربیت میں بھی کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ اس کی زندگی محض حیاتیاتی سائنس پر کامل عبور اور اپنے معاشرتی نظام میں اصلاح کے لیے وقف ہے۔ ویمرسن نے

اپنے گھر میں بھی ایک سائنس لیب بنارکھی ہے جہاں نت نئے تجربات کرتے رہنے سے ہی اس کے اضطراب میں کمی ہوتی ہے۔

ستائیس سالہ یہ معلم محض چوبیس سال کی عمر میں ہی برازیل کے دس بہترین اساتذہ کی فہرست میں شمولیت اور خصوصی ایوارڈ اپنے نام کرچکا ہے اور فرانسیسی بتاتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس کی مخلص جدوجہد برازیل میں تعلیمی انقلاب کا سبب بن جائے گی۔

مائیکل دمایا

افریقی نژاد مائیکل کے لیے زندگی محض تاریکی پریشانیوں اور کالیف کا دورانا تھی۔

تاریک بڑا عظم سے تعلق رکھنے والے مائیکل کے سبھی خواب یکے بعد دیگرے منتشر ہوتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کا خواب تو بچپن ہی سے اس کی آنکھوں میں بسا تھا۔ وہ مشہور افریقی ’کنویریہ جمیل‘ کے نزدیک ایک اسکول میں اس خواب کی تجویز پانے کے لیے سرگرداں تھا۔

اسکول آمدورفت کے دوران جمیل کے شفاف پانی کا منظر اکثر اس کے قدم ساکت کر دیتا اور وہ کتنی ہی دیر اس میں خوبصورت، خوشحال اور مثالی زندگی کے عکس دیکھتا رہتا۔ قسمت کی قسم طرہی نے اس کی یہ دیرینہ آرزو بھی لمبا میٹ کر دی۔ ہائی اسکول کے بعد مزید تعلیم کے اخراجات اس کی استطاعت میں ہی نہ تھے۔ اس لیے پڑھائی ترک کرنی پڑی۔ وہ بہت دلیرا داشتہ ہو گیا۔

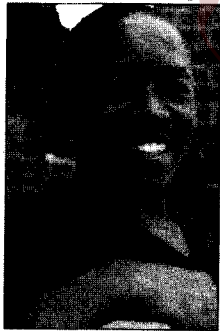
انھی دنوں کینیا کا ایک ثقافتی طائفہ افریقی دورہ پر موجود تھا۔ مائیکل اپنے ماحول سے فرار کا خواہشمند تھا۔ اس نے اس طائفہ میں ایک کامیاب آڈیشن دیا اور رقص کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے نیروبی منتقل ہو گیا۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد وہ 2009 میں ایک فلاحی منصوبے سے منسلک ہو گیا۔

اس خصوصی منصوبے سے وابستہ برطانوی انتظامیہ پر اساتذہ افریقی ممالک کے تہیہ بے آسرا بچوں کے لیے نونو لطیفہ کی تعلیم عام کرنا چاہتی تھی۔ کینیا کی غربت، پس ماندگی اور بدترین معاشی حالات تو ویسے بھی مسئلہ ہیں۔ نیروبی سے پانچ کلو میٹر دور ”کمپور“ کا علاقہ اس ضمن میں سرفہرست ہے۔ جی آبادی پر مشتمل یہ علاقہ انسانیت کی تذلیل اور بے بسی کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ 700,000 نفوس انتہائی غربت میں رہنے پر مجبور ہیں۔ بے روزگاری کی شرح آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ عوام کی یومیہ اُجرت ایک ڈالر سے بھی کم ہے۔ اچھ آئی

وی اینڈز میں جیلا لوگوں کی تعداد ناقابل شمار ہے۔ دیگر شہریوں پر چائی اور جیسی حملے تو ایک معمول بن چکے ہیں۔ چنیدہ تعلیمی ادارے طلبہ کی راہ نکلنے رستے ہیں کیونکہ والدین کے لیے بچوں کے تعلیمی اخراجات کا تصور کسی عیاشی سے کم نہیں۔ زندگی کی بنیادی سہولیات نایاب ہیں۔ بجلی صاف پانی اور طبی سہولتیں ان کے لیے ایسے خواب کی مانند ہیں جس کی تعبیر ناممکن ہے۔

ان حالات میں مائیکل کا بچوں کو ”بیلے رقص“ (ایک ایسا رقص جس میں قصے کا روپ دھار کر پروں کا ناچ دکھایا جاتا ہے) کی تعلیم دینے کا تصور ہی انتہائی مضحکہ خیز لگتا تھا۔ لیکن وہ اپنے اس خواب سے دستبرداری کے لیے کسی صورت بھی تیار نہ تھا۔ وہ کمپور، میٹھر اور نیروبی کی دیگر کئی آبادیوں میں ٹین کی چوٹی چھتوں تلے برہنہ پائیں رقص سکھانے لگا اور پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب اس کے طلبہ کینیا ٹیلی ویژن، جیسے کئی قومی شہرت یافتہ مقامات پر رقص مقابلوں میں فاتح قرار پانے کے بعد اپنی مزید تعلیم کے لیے وظائف حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہرے۔

مائیکل ایک ساحر اتالیق اور رہنما تھا۔ اس نے غربت، جبر، احتیصال اور پس ماندگی کی دلدل میں گھرے بچوں کو زندگی



میں ایک نیا اور منفرد مقصد عطا کر دیا۔ وہ پیشہ وارانہ رقص کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں سماجی و اخلاقی ضوابط سے بھی آگاہی فراہم کرنے لگا۔ مسافت کھنسن ہی سہی لیکن ناممکن بہر حال نہ تھی۔ اس کی محنت اور لگن رنگ لانے لگی۔ نفسیاتی اعصابی

شکستگی اور اخلاق باختگی کا خاتمہ ہونے لگا اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ناخوش بچپن میں حمل کی شرح میں واضح کمی کے علاوہ طلبہ میں مایوسی افسردگی اور عدم اعتمادی اپنے وجود پر شرمسار ہونے لگی۔

مائیکل دیاما کی لامتناہی جدوجہد آج بھی اسی جذبہ اور لگن سے جاری ہے۔ Valley View Academy میں تقریباً آٹھ سو طلبہ کو پیشہ وارانہ تعلیم دینے کے ساتھ وہ انہیں ذاتی وقار خود شناسی، خود اعتمادی اور مقاصد زندگی کے حصول کی راہیں بھی متعین کر رہا ہے۔ زیر تعلیم طلبہ ثقافتی طائفوں سے

ساتھ مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہیں اور کامیابی سیٹھ کے بعد مزید تعلیم کے لیے وظائف حاصل کر کے مائیکل کے خواب جی رہے ہیں۔

ڈاکٹر کین سلبرن Ken Silburn

چھکدار و نایاب بہرے ہمیشہ کولوں کی کان میں ملے ہیں۔ سڈنی کے مضافاتی علاقہ سے تعلق رکھنے والا کین سلبرن بھی ایسا ہی ایک بہرا ہے۔ اس کا بچپن معاشی تنگدستی اور مسائل کے انبار میں چپکے سے بیت گیا۔ عہد شباب میں خوش قسمتی کے باعث اسے بہت جلد لندن اور ڈچین اساتذہ کی قربت میسر آئی۔ وہ اخلاقی طور پر ان معلمین کی محبت و شفقت کا مقروض بن چکا تھا اس لیے شعبہ تدریس اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کین نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز 'شعبہ امراضیات' (pathology) سے کیا۔ کچھ عرصہ فوج کے ساتھ کام کرنے کے بعد اس کا اضطراب شدید ہونے لگا۔ اس قرض کی ادائیگی کے لیے وہ اپنے پیسے سینکڑوں طلبہ کے لیے ایک میسا بنانا چاہتا تھا۔ سماجی و معاشی مسائل سے نبرد آزما خاندان اور بچوں کی محرومیوں کا کرب کین سے بہتر بھلا کون سمجھ سکتا تھا؟

آسٹریلیوی نظام تعلیم میں ایک انقلاب در آنے کے لیے پوری قوت سے پر توجہ رہا تھا۔

سائنسی مضامین کی تدریس میں موجود تنوع، مشکلات، دلچسپیاں اور کٹھنائیاں سر کرنے کے لیے اس نے پندرہ سال قبل سڈنی کے جنوب مغربی مضافاتی علاقہ میں

Casula High School میں شمولیت اختیار کی تو مسائل کا ایک انبار اس کا منتظر تھا۔ اس وقت بارہ سال سے متجاوز اکثر بچے سائنس سے شدید بیزاری اور نفرت کا

شکار تھے۔ اس اسکول میں محض آٹھ عدد بچے سائنسی شعبہ میں موجود تھے۔ طلبہ کا یہ مجموعہ رویہ ایک ترقی یافتہ اور بہترین آسٹریلیوی مستقبل کے لیے شدید خطرہ کی علامت تھا۔

ان مشکلات سے نمٹنے کے لیے کین نے

ماہنامہ مسرگزشٹ



بچوں کا گہرا نفسیاتی مشاہدہ شروع کیا اور پھر اسے علم ہوا کہ سات سال کی عمر میں بچپن کے بعد کسی بھی طالب علم کی ذہنی نشوونما میں تین تغیرات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ڈائنوساز خلائی علم اور دھماکا خیز مواد میں گہری دلچسپی لینے لگتا ہے۔ ڈائنوساز کی سلسلہ تابو دھونے تو اب صدیاں بیت چکی ہیں مگر نئے جماعت اور تعلیمی اداروں میں دھماکا خیز مواد کی تیاری اور اطلاق بھی کسی صورت ممکن نہ تھا۔ کین نے 'خلائی علم' کے ذریعہ ان کی ذہنی انجمنیں اور سائنسی مضامین سے متعلقہ نفسیاتی گھٹیاں و خوف زائل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

برسہا برس کین سلبرن اپنے اسباق میں سبھی و بصری معاونات کا استعمال کرتا رہا۔ اس کے موضوعات میں تنوع ہوا کرتا۔ ماحولیات اور خلائی سائنس سے متعلق مسائل سے آگاہی دیتے اس کی سحرانہ تدریس نے آسٹریلیوی نسل نو کو کردار اور پیشہ وارانہ زندگی میں ایک نئے اوج تک پہنچا دیا۔ محنت شکاری ان کا وتیرہ بن گئی۔ اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب سائنسی شعبہ میں طلبہ کی تعداد 86 سے متجاوز کر گئی۔

اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور ذہانت کے ثل بوتے پر ان محنت طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے قومی یونیورسٹیوں کی جانب سے وظائف مہیا کیے جانے لگے۔

کین سلبرن کی تدریس میں 'تعلیم برائے عمل' نے ہی طلبہ کو نئے تجربات کی طرف مائل کیا۔ ان کا رجحان آبی میزائل بنانے کی طرف بڑھنے لگا۔ سالہا سال سے وہ Casula High School میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سائنسی پیشہ وارانہ اہلیت میں کامل و یکساں اساتذہ کی ایک ٹیم کا سربراہ ہے۔ اس ٹیم کے ارکان نے باہمی مشاورت اور محنت سے ہائی اسکول طلبہ کے لیے ایک افزودگی منصوبہ iSTEM (invigorating Science, Technology, Engineering and Mathematics) تشکیل دیا۔ لیکن اس منصوبہ کے مندرجات صرف مقامی طلبہ تک محدود نہ تھے بلکہ آسٹریلیا کے طول و عرض میں دیگر اداروں اور جامعات کو بھی شامل کیا گیا۔ یہ سبھی طلبہ جب ایک مخصوص مقام پر اکٹھے ہوتے اور اپنے ہم عمر افراد کے علاوہ دیگر تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے بھی اپنی تحقیق و ایجادات پر بحث و مباحثہ کرتے تو ان کے ذہنی افق میں وسعت اور کئی ایک تبدیلیاں رونما ہونے لگتیں۔

اس اسکول کے طلبہ کو 'اسٹریٹ خلائی اکیڈمی' میں واقع 'خلائی کیپ' میں شمولیت کے مواقع کی فراہمی نے ان کے

ہیں لیکن 2015 میں ”پرائم سمنر سائنس ایوارڈ“ میں فتح اور رواں برس ”گلوبل نیچرز پرائز“ کے لیے نامزدگی کے لحاظ سے اس کی زندگی میں بعد ازاں ہوئی۔

بویا یانگ Boya Yang

تدریس سے محبت اور خلوص چینی نژاد بویا یانگ کی تین سلوں پر محیط ہے۔

اس کے دادا دادی اور والدین کے بعد سیمائی کی تربیت بویا کے لہو اور خیر میں شامل ہے۔ اسکول اس کے لیے دوسرا گھر تھا۔ کم عمری کے باوجود وہ ذہانت اور چہرہ شناسی کی خوبیوں سے مالا مال تھی۔

اسکول کے کمرلے جماعت میں بیٹھے طلبہ اور پھر اس کے گھر میں رہنمائی کے لیے آنے والے بچوں کے معصوم چہروں اور آنکھوں میں جھٹکنے والی پریشانی، اضطراب اور عدم اعتمادی اس سے کبھی بھی پوشیدہ نہ رہی۔ کم عمر بویا ان کی اس حالت زار پر بہت افسردگی و آزر دیکھ کر محسوس کرتی۔ دھیرے دھیرے اس کی ذہانت نے اسی کے ہم عمران نئے فرشتوں کی وقتی کشیدگی کا راز دریافت کر لیا۔

وہ کبھی طلبہ امتحانات سے خائف رہتے تھے۔ امتحانات کا آسیب ان کے اعصاب پر اس شدت سے حاوی رہتا تھا کہ اساتذہ کا پڑھایا گیا نصابی مواد ان کے ذہنوں سے کسی حرف



غلط کی طرح مٹ جاتا۔ نتائج میں تیزی اور ناکامی بے اوقات انہیں زندگی سے بے کوسوں دور لے جایا کرتی تھی۔

دوسروں کے مشاہدہ اور رہنمائی کے برعکس کسی بھی انسان کا ذاتی مشاہدہ اور غور و فکر سے اخذ کیے گئے نتائج

فطری طور پر بہت چرچا اور گہرے ہوتے ہیں۔ آگہی کا عذاب اپنی ذات پر پھیلنے والے افراد ہی اکثر دوسروں کے درد کا درماں بنتے ہیں۔ طلبہ کی چٹنی کشش اس آگہی نے بویا کی زندگی کا رخ بھی بدل دیا تھا۔

ان حالات میں پروان چڑھنے والی اس نرم و نازک چینی گڑبانے اپنے مستقبل کا فیصلہ آگہی کے اسی لوح میں کر لیا تھا۔ اپنے ہم قوم افراد کی سیمائی کے لیے وہ نفسیات کی مصلحہ بن گئی۔ اور پھر

سابقہ خوف و خدشات حریف زائل کیے۔ اس کیمپ میں حمدون کا قیام ایک یادگار تجربہ ہوتا تھا۔ انہیں خلائی علم کی عملی بازیکیاں سکھائی جاتیں۔ ایڈی کے مخصوص ماحول میں وہ ذہنی طور پر ’ظلام باز‘ کے روپ میں ڈھل جاتے ہیں اور یہ یادگار تجربہ تا عمر ان کے ذہن پر ثبت تحریک بن کر حاوی ہو جاتا ہے۔

آسٹریلیائی حکومت اور محکمہ تعلیم کین سلبرن کی ان صلاحیتوں کے ہمیشہ سے قدردان رہے ہیں۔ اسے تین کئی آسٹریلیائی اساتذہ کی اس ٹیم میں بھی شامل کیا گیا جو ناسا خلائی پروگرام اور مرصع میں مہم جوئی کے لیے تشکیل دی گئی سوسائٹی میں امریکی انتظامیہ کی معاون تھی۔

بین الاقوامی خلائی منصوبوں میں شمولیت کے باوجود کین کا دل اپنی نسل نو کے مسائل سے مضطرب رہتا۔ ثانوی سطح پر طلبہ میں تبدیلی پیدا کرنے کے بعد اس نے پرائمری نظام تعلیم کے بنیادی ڈھانچے میں ’جراحی‘ کا آغاز کر دیا۔ پرائمری اسکول کی تعلیم ہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جب طلبہ کو باہمی سائنسی مضامین کی طرف مائل کیا جاسکتا ہے۔ ان کے ذہن بہت زیادہ تجسس ہوتے ہیں۔ ذاتی تجربات انہیں بے حد بہاتے ہیں۔ اس موقع پر اگر ان کی ذہنی تازہ کاری شروع ہو جائے تو اس کے کمرات ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح تک پہنچ کر انقلاب برپا کر دیتے۔

مقامی پرائمری اساتذہ کی مدد کے لیے کین اور اس کی ٹیم نے انہیں مکمل رہنمائی فراہم کی۔ نصاب میں مجوزہ تبدیلیوں کے علاوہ مہل انداز میں تدریس کے لیے ان اساتذہ کو خصوصی تربیت فراہم کی جاتی۔ کین ذاتی طور پر ان اسکول کے دورے کرتا تھا۔ ان نو عمر بچوں کو پڑھانا، سوالات کے تلی بخش جواب دے کر انہیں مختلف سرگرمیوں کی طرف مائل کرنا اس کے لیے سستی خیز اور یادگار لمحات ہوا کرتے تھے۔

ڈاکٹر کین سلبرن اپنی انہی صلاحیتوں کے بل بوتے پر تیس سال قبل آسٹریلیا کی Regional Science Teachers Association کا حصہ بنا اور گلدنشہ بارہ سال سے وہ اس تنظیم میں صدارتی عہدہ پر بھی فائز ہے۔ آسٹریلیائی نظام تعلیم میں اس کی حیثیت ریڈھ کی ہڈی سے کسی طور بھی کم نہیں۔ دیگر سائنس اساتذہ کو باقاعدگی سے تربیتی ورکشاپ میں کمرلے جماعت میں اسباق دینے کے طریقہ کار سکھانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ نو منتخب شدہ اساتذہ بھی اس کی تربیت کے بغیر اپنی پیشہ دارانہ زندگی کا آغاز کسی صورت نہیں کر سکتے۔

قومی سطح پر کین سلبرن نے بے شمار ایوارڈز حاصل کیے

اسے طلبہ کی اس وقتی اذیت کی اصل وجوہات کا علم ہوا۔

چینی نظام تعلیم میں امتحانات پر بے حد زور دیا جاتا ہے۔ طلبہ اپنے روزمرہ وقت کا تین چوتھائی سے زائد حصہ پڑھائی اور کتب بینی میں صرف کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ نتیجتاً وہ اعصابی دباؤ اور وقتی تھکاوٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس خارجی دباؤ کے علاوہ انہیں ایک داخلی انتشار کا سامنا بھی رہتا تھا۔ اور بلاشبہ یہ ایک ایسا آفاقی المیہ ہے جو روئے ارض کے ہر خطہ میں یکساں موجود ہے۔

”نیم ارب“ (13 تا 19 سالہ عمر) کی تباہ کاریاں، جذباتی اور نفسیاتی مسائل کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اس جذباتیت سے زندگی میں کم از کم ایک دفعہ تو ضرور گزرتا ہے۔ ماہرین نفسیات کی دانست میں یہ انسانی زندگی کا مشکل ترین دور ہوتا ہے۔ بچپن کا جھٹکن ختم ہونے کے بعد نوجوانی کی آمد ہوتی ہے تو بچہ اپنی ذات کو بے حد معتبر اور عقل فعل تصور کرنے لگتا ہے۔

اصل کشش اور المیہ اس وقت جنم لیتا ہے جب والدین دیگر اقارب اپنے سابقہ جذبات کے پیش نظر ان سے بچوں ہی کی طرح برتاؤ جاری رکھتے ہیں۔ انہیں روک ٹوک اور مختلف پابندیوں کے دائرہ میں مقید رکھ کر اپنے تئیں ان کی بھلائی کرتے ہیں لیکن یہی برتاؤ اور پابندیاں بچوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں۔ مناسب رہنمائی کی عدم موجودگی انہیں مزید تباہی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ والدین اور خاندانی اقدار سے متنفر ہوتے ان بچوں کا رجحان دوستوں کی طرف کی گناہوں جاتا ہے۔ وہ کسی آزاد چمکی کی طرح فضاؤں میں اڑان بھرنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

مخالف جس کے لیے کشش میں اضافہ بھی اسی مخصوص عمر کی ایک سوغات ہوتی ہے۔ نوجوانی کے خوار میں مبتلا یہ نادان بچہ جنگلی قاضوں سے مغلوب ہو کر مصنف مخالف کی طرف مائل ہوتے ہیں اور تخریر کا جنون انہیں جنسی لذت کی وادیوں کا راہی بنا دیتا ہے۔

بویا کے لیے سب سے کرہ ناک لمحہ یہی تھا کہ چینی کم عمر لڑکیوں میں بغاوت کا تناسب خطرناک حد تک بڑھنے لگا تھا۔ جنسی بے راہ روی کی بدولت اسقاط حمل کی شرح بھی کم پریشان کن نہ تھی۔ مناسب رہنمائی، شفقت، توجہ اور محبت کا فقدان ہزار ہا لڑکوں اور لڑکیوں کو جرائم کی دلدل میں دھکیل رہا تھا۔ اس نے انتہائی عمل اور حکمت عملی کے تحت ان تمام عناصر سے چھٹکارا پانے کے لیے دوسرے اقدام طے کیے۔

پہلے مرحلہ میں اس نے کرائے جماعت کے ماحول میں تبدیلی پیدا کی۔ طلبہ کو اعتماد اور محبت کی دولت بخشی تو وہ اس کی محتاط طبی شخصیت کی طرف لوہے کے ذرات کی مانند کھینچے آنے لگے۔ بویا نے اپنی ذات کو ایک اسٹیج کا روپ دے دیا۔ وہ ان طلبہ کے سبھی کھلے شکوکے شکایات، تنہائیاں اور اذیت ناک سوچیں اپنے وجود میں جذب کر لینے کے بعد اپنے علم کی روشنی اور تعلیم برائے کھیل کے سحر سے ان کے دل و دماغ منور کرنے لگی۔ ان کا وقتی انتشار، نفسیاتی الجھنیں اور گھٹیاں اس کی نرم مزاجی کے سامنے بالکل موم ہو گئیں اور دھیرے دھیرے نوجوان نسل اپنے مدار میں لوٹنے لگی۔

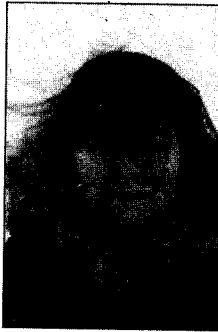
دوسرا مرحلہ طلبہ کے والدین سے تعامل تھا۔

منظم منصوبہ بندی کے تحت اس نے اسکول میں والدین سے ملاقات اور محققین کی تعلیمی ترقی، گھریلو مسائل اور برتاؤ کی بابت باہمی گفت و شنید کا آغاز کیا کیونکہ والدین کو بھی وقتی تربیت کی بے حد ضرورت تھی۔ وہ ان بچوں سے گھریلو مسائل سننے اور پھر اپنی نئی لگن سے حل تلاش کرنے میں جت جاتی۔ برف پھیلنے لگی۔ منہی جذبات، تنفر، بیزاری، خود ترسی، خود اذیتی، جنسی کشش میں بے لگام خواہشات سے مغلوب تباہی کی اندھی وادیوں میں گامزن چینی بچے اپنے گھر اور اسکول میں ناقابل یقین مثالی کردار کے مالک بن گئے۔

کمرلئے جماعت کے آزادانہ اور دوستانہ ماحول میں ڈراما، اوپرا، موسیقی، آرٹ سمیت طلبہ کی ذاتی پسند پر مبنی سرگرمیوں سے انہیں نصاب سے متعلقہ اعصابی تناؤ اور امتحانی خوف سے بھی رہائی مل گئی۔ بویا کی جماعت میں حاضری کی شرح میں ناقابل یقین اضافہ ہوا تو اسے بھی محسوس ہوا کہ ان بچوں کے وجود میں ہنر، توانائی، خیل اور ذہانت کا ایک بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ وہ بہت حیران و خوش تھی اور بے والدین، ان کی سرقتوں کی تو کوئی انتہائی نہ تھی۔ اکھڑ مزاج اور ناقابل برداشت بچے موسم کی ناک بن گئے تھے جو ان کے حکم و خواہش کے مطابق یا آسانی مڑ جاتے۔

اس کامیابی نے بویا کا اعتماد اور حوصلہ پہلے سے کئی گنا بڑھا دیا۔ اس نے دیگر ہم خیال اساتذہ کے ساتھ مل کر ایک خصوصی گروہ تشکیل دیا جس کی مدد سے مقامی اسکولوں میں نفسیاتی تربیت کے کئی ایک پروگرام شروع کیے گئے۔ تعلیمی اداروں کے علاوہ یہ سلسلہ جیل میں مقید ان بچوں تک دراز کر دیا گیا جو باضی میں رہنمائی کے فقدان کی بدولت کسی نہ کسی قانونی اور اخلاقی جرم میں سزا بھگت رہے تھے۔

ہے۔ حالیہ سالوں میں گلوبل وارمنگ کی بدولت برف قدرے کم تو ہوئی ہے لیکن اب بھی یہاں موسم سرما ہڈیوں میں گودا نجد کر دینے والی ٹھنڈک لیے نازل ہوتا ہے۔ موسم گرما کے تیز چمک



جیسے کبھی لیکن رہائشیوں کے لیے برف سے رہائی کسی صورت بھی ممکن ہی نہیں۔ بارش بھی برفباری ہی کی صورت میں ہوتی ہے اور ہوا میں اس قدر تیز اور ٹوکیلے برفانی ذرات لیے جاتی ہیں کہ بصارت کو برفباری ہی کا گمان ہونے لگتا ہے۔

وجہ حرارت موماً متنی چالیس ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے، تاہم موسم سرما میں منفی 68 ڈگری سینٹی گریڈ تک بھی آسانی پہنچ جاتا ہے۔

Nova Scotia کینیڈا کے تین ساحلی صوبوں میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ اس کا شمار چار صوبوں میں بھی ہوتا ہے جن سے اٹلانٹک کینیڈا تشکیل پایا ہے۔ اس سرد ترین علاقہ میں زندگی بھی سہل نہیں ہوتی۔

میکینی نے انہی آزمائشوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گر بجوشن مکمل کرنے کے بعد افریقی علاقہ Sub Sahara میں رضا کار کی حیثیت سے کام کا آغاز کر دیا۔ یہ علاقہ غربت، افلاس اور بیماریوں کی آماجگاہ ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2011 میں ایچ آئی وی ایڈز میں مبتلا 69% افراد کا تعلق اسی خطہ سے تھا۔ یہ لاچار لاعلم اور اپنی بیماری کے اسباب سے ناواقف افراد اس بیماری کے مزید پھیلاؤ کا سبب بن رہے تھے۔ میکینی پانچ سال تک ان افراد کی طبی خدمات سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ آگہی و شعور کے در بھی وا کر رہی۔

بعد ازاں وہ شمالی امریکا کی ایک سو کیوٹی Salluite منتقل ہو گئی۔ یہ کینیڈا کے نزدیک ہی ایک دیہاتی علاقہ ہے۔ بمشکل تیرہ سولہ سو پر مشتمل اس آبادی میں بھی مسائل کا ایک بہت بڑا طوفان اس کا خطرہ تھا۔ اس علاقہ میں زمینی راستے محدود ہوتے ہیں۔ کسی بھی سڑک کے ذریعہ رسائی ناممکن امر ہے۔ یہاں صرف ہوائی رستے ہی آہد ممکن ہے۔ ایک سو آبادی کے انتہائی مشرقی سمت میں واقع اس خطہ ارض کو ناظر

اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑائی جائے تو کوئی بھی انسان طویل محنت سا لہا سال کے معمول اور اپنی پیشہ وارانہ زندگی میں یکسانیت سے اکثر آکتا جاتا ہے لیکن بویا یا بگ کی لغت میں صحن اور پڑاری کے الفاظ ناہید ہیں۔ ہر گذرتا لمحہ ہر گذرتا دن اس کی توانائی اس قدر مثبت طریقہ سے ہمیز کرتا کہ یہ غیر مرئی شعاعوں کی طرح دیگر اساتذہ پر بھی براہ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔

طلبہ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرتے بویا کی مخلصانہ اور روایت شکن کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ صفر سے شروع ہونے والا یہ سفر مستقل حجازی سے اپنے پڑاؤ پار کرتا ”پچاس ہزار“ تین ایچ، بیچوں اور ان کے والدین کی وقتی تربیت تک آن پہنچا۔

اس کی پیشہ وارانہ اہلیت کا ڈنکا قومی سطح پر بھی بجتے لگا تھا۔ اسے کئی ایک قومی کانفرنسز میں خطاب کے مواقع دیئے جانے لگے۔ برنی اور پریس میڈیا اس کے انٹرویو اور مستقبل کی حکمت عملی جاننے کے لیے بے تاب رہتے۔ اور خود اس کے خلوص اور نیک نیتی کا عالم یہ تھا کہ 2016 میں Harvard SEED (عوامی جمہوری چین کی ایک تنظیم جس میں سماجی خدمت، تعمیر اور جدت کی بنیاد پر ہر سال ایک نمایاں کارکردگی کے حامل نوجوان منتخب کیے جاتے ہیں) کے تحت ”سماجی تخیل کی بھاری بھر کم انعامی رقم بھی اس نے اپنے تربیتی پروگرام کی چین کے طول و عرض میں پھیلاؤ کے لیے سرف کر دی۔

میکینی مکڈونل Maggie Macdonnell 2017 میں گلوبل نیچرڈ پرائز کی فاتح ”میکینی میکڈونل“ کی زندگی اگر ایک لفظ میں بیان کی جائے تو بلاشبہ وہ لفظ ”مسیحا“ ہی ہوگا۔

1980 میں روئے ارض کے سرد ترین خطہ میں پیدائش کے بعد میکینی نے ہمیشہ اپنے ارد گرد وحشت کشنائیوں اور فطرت سے کشش کی ایک لامتناہی جنگ دیکھی۔ Nova Scotia کے دیہاتی علاقہ میں پرورش نے اس کی فطرت میں چٹائی تپتی پید ا کر دی۔

میکینی کے حالات زندگی سے آگاہی کے لیے اس کے ماحول اور طبی علاقہ سے واقف ضروری ہے۔ قطب شمالی زمین کے انتہائی شمالی علاقہ میں واقع ہے۔ بحر منجمد شمالی دیگر ملحقہ بحیروں ”الاسکا کینیڈا“ فن لینڈ گرین لینڈ“ آئس لینڈ“ نائروے“ روس اور سوئیڈن پر مشتمل اپنی علاقہ ”برفانی جہنم“ بھی کہلاتا ہے۔ ٹھنڈا کے خطہ میں مہولیت کے باعث یہاں نباتات کی افزائش ممکن ہی نہیں۔ بحیروں کے علاوہ زیر زمین سطح بھی برف سے منجمد رہتی

نفوس بھی کہا جاتا ہے کیونکہ جنگلی حیات کی کمی کے باعث مقامی باشندے اکثر و بیشتر قاتلہ کا شکار رہتے ہیں۔

موسمی حالات کی ختیان جھیلانا بھی ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ مئی 25 ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت میں برف کسی نیزے کی انی کی مانند جسمانی اعضا کو تختہ مشق بناتے رہ گئی ہے۔ اس علاقہ میں آمد کے بعد میکی میکڈونل کے سامنے دو بڑی رکاوٹیں موجود تھیں۔

قلب شمالی کے تعلیمی نظام کا سب سے بڑا البیہ تو یہ ہے کہ سخت ترین موسمی حالات کے باعث اکثر اساتذہ وہاں قیام ہی نہیں کر پاتے۔ کئی ایک معلم تعلیمی سال ادھورا چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں یا محکمہ میں اپنے اعصابی تناؤ کی طبیی درخواست دائر کرنے کے بعد دیگر پرسکون علاقوں میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ فی الوقت میکی میکڈونل جس اسکول سے منسلک ہے وہ اپنے سربراہ سے محروم ہو چکا ہے۔ اسکول پرنسپل نے محض چھ ہفتے بعد ہی طبیی درخواست دے کر ادارے سے عارضی رخصت اختیار کر لی تھی۔

ان حالات میں ماتحت اساتذہ کا جذبہ برقرار رہے بھی تو کیونکر؟

معاشرتی حالات بھی انتہائی قاتلہ افسوس ہیں۔ موسم کی شدت و تباہی ہمارے مقامی باشندوں میں وحشت پزیری تنہائی یا سیت خود اذیتی اور زندگی جیسی نعمت سے متفر پیدا کر رکھا ہے۔ چاندی جیسی برقیلی چادر اوڑھے گلیوں میں جنس کا دیوانہ پانی تمام تر بربریت سے چنگھاڑتا نظر آتا ہے۔ تنہائی بنیادی ضروریات سے محرومی اور یا سیت کی تپش دور کرنے اور راہ فرار حاصل کرنے کے لیے مردم عمر لڑکیوں کو نشانہ بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ ٹین اینج لڑکیوں میں حمل کی شرح ناقابل یقین ہے۔

نوجوان نسل میں خود اذیتی کے جذبات بھی اپنی انتہا پر ہیں۔ ذاتی سکون اور وقتی خود فراموشی کے حصول کی خاطر وہ اپنے ہی وجود کو بے طرح رگید ڈالتے ہیں۔ 18 تا 25 سالہ افراد میں زندگی کی خواہش ختم ہونے لگتی ہے۔ انہیں موت کی وادی میں سکون محسوس ہوتا تو خود کشی کا رجحان بھی افسوسناک حد تک بڑھ گئے۔

ان تمام تر حالات کو نظر رکھتے ہوئے میکی نے Life Skills Programme کی بنیاد رکھی اور آغاز ہی میں بے شمار لڑکیوں نے اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان سب نے کمیونٹی کے افراد کے لیے گرم کھانوں کی تیاری و ترسیل ممکن بنانے کی کوششیں شروع کر دیں تاکہ پیٹ کا جہنم اپنے شعلوں

کی تپش سے ان کے دماغ پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

بعد ازاں میکی نے شرابی بنیادوں پر ڈے کیر سینٹر کی بنیاد رکھی جہاں طلبہ کمرلئے جماعت میں تجربہ کار ڈے کیر کارکنان کے ساتھ کام کر سکیں۔ یہ خیال منفرد لیکن بے حد سودمند بھی تھا۔ طلبہ ابتدائی عمر میں تعلیم دینے کے نت سے طریقیے کیٹنے لگے۔ اسی دوران میکی نے تقریباً بیس ہزار ڈالر محفوظ کر لیے جن کی مدد سے اس نے اسکول میں ایک غذائی پروگرام شروع کر دیا۔ اس نئے منصوبہ کے تحت طلبہ اپنے دیگر ساتھیوں کے لیے ہلکے ہلکے اسٹیکس تیار کیا کرتے۔

نسل نو میں مٹی جذبات کے خاتمہ کے لیے اس نے بلا تاخیر ”فنٹس سینٹر“ قائم کیا جو دھیرے دھیرے نابالغ نوجوان اور ادھیڑ عمر افراد کے لیے یکساں طور پر صحت مند طرز زندگی کا حصول کا اہم مرکز بن گیا۔ ان کا اعصابی تناؤ دور کرنے کے بعد ذہنی و جسمانی مضبوطی میکی کی اولین خواہش تھی۔

میکی میکڈونل نے مسائل کو اپنے اعصاب پر بالکل بھی حاوی نہ ہونے دیا بلکہ ان مسائل کے حل کی عملی کوششوں میں مختلف سرگرمیوں کا آغاز ہی مناسب سمجھا۔ اس کا مہربان رویہ اور عملی سوچ طلبہ کی ذہنی تربیت میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ اسکول میں حاضری کی شرح بڑھنے لگی۔ کیفی پکن میں مصروفیت خوشی کے رجحانات میں کمی کے نتیجے میں مراکز میں آمد و رفت کا ہلکا سا اور فطری مناظر کی دلکشی نے ان کے وجود سے مٹی جذبات کا خاتمہ کر دیا۔

ذاتی مسائل میں گھرے رہنے کے باوجود طلبہ نے میکی کی تحریک پر ذیابیطس کے مریضوں کے لیے 37,000 ڈالر کے فنڈز کا حصول یقینی بنایا۔ اپنی ذات کے دائرے سے قطع نظر انسانیت کی خدمت ہی ان کا تیرہ زندگی بننے لگی ہے۔

محدود ترین وسائل کے باوجود مختصر عرصہ میں اسی گراں قدر جذبہ اور محنت کے لیے ورکی فاؤنڈیشن انتظامیے نے گلوبل ٹیچرز پرائز کی ”ایک ملین ڈالرز“ کی خطیر رقم کی فاتح ”میکی میکڈونل“ کو قرار دیا۔ قلب شمالی کے دیگر سترین علاقوں میں زندگی سے منہ موڑتے افراد کو اس کائنات کی رنگینیوں کی طرف واپس لانے کے لیے یہ انعام اس کے لیے کسی معجزاتی مدد یا من و سلوٹی سے کم ہرگز نہیں۔ اپنے ہم قوم افراد کو ایک نارمل زندگی جیسی تمام بنیادی سہولیات فراہم کرنے کا رویہ نہ خواہ اپنی تعبیر کے مراحل میں داخل ہو چکا ہے جس کا سہرا میکی کی روایت ممکن کاوشوں ہی کے سر ہے۔

گل اور میں۔ موضوع کرکٹ تھا۔ اس لیے سب میری طرف متوجہ تھے۔ میں نے جملہ ختم کر کے ان کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ”اعزین کرکٹ ٹیم کے بہترین بلے باز اور کپتان محمد اظہر الدین اسپاٹ فکسنگ میں ملوث ہو کر تاحیات پابندی کا شکار ہو چکے ہیں۔ سن 2000 میں سی بی آئی نے اظہر الدین پر اسپاٹ فکسنگ کا الزام لگایا۔ اظہر الدین کا کہنا تھا کہ انہیں مسلمان ہونے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا ہے مگر بعد میں انہوں نے خود بھی یہ جرم تسلیم کر لیا۔ 2000 کے سلاٹھ افریقا انڈیا ٹور کے بعد ساٹھ افریقین کیپٹن ہنسی کروچے نے بیان دیا کہ اظہر الدین نے انہیں بکس سے متعارف کروایا ہے جس کے بعد اظہر الدین نے جرم کا اعتراف کر لیا اور ان پہ تاحیات پابندی لگادی

”کرکٹ“ دنیا کا ایک مقبول کھیل ہے لیکن بچے بوڑھے جوان سبھی کے دل پر اس کا راج ہے آصف نے کہا۔ کرکٹ میں جہاں کھلاڑی اپنے ملک کی دنیا بھر میں نمائندگی کرتے ہیں اور ملک کا نام روشن کرنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں وہیں کچھ کھلاڑی پیسے کے لالچ میں ملک کا نام بدنام بھی کرتے ہیں۔ اسپاٹ فکسنگ نے کرکٹ کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ پچھلے کچھ دنوں میں اسپاٹ فکسنگ کا بہت بول بالا رہا ہے۔ اسپاٹ فکسنگ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پھر بھی ہم ایسے چند کھلاڑیوں کا ذکر کریں گے جو اسپاٹ فکسنگ میں ملوث رہے اور اس کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے۔

اس وقت کرے میں ہم چار دوست آصف، عمیر، نذر

اسپاٹ فکسنگ

اعتزاز زریاب و صلی

کرکٹ نے ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ ہر تیسرا شخص کرکٹ کے جنون میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی نے ہی مفاد پرستوں کو شائقین کے جذبات سے کھیلنے کی راہ سجھائی اور بہت سے مقبول کھلاڑیوں نے چند روپوں کی خاطر یہ ایمانی کا راستہ چن لیا۔

اسپاٹ فکسنگ کے گرداب میں کئی کھلاڑیوں کی شہرت ڈوب گئی



کئی۔ 2012 میں اندھرا پردیش ہائی کورٹ نے اس پابندی کو ختم کر دیا۔ آٹھ فروری 1963 کو بھارت کی ریاست حیدرآباد کنٹن میں پیدا ہونے والے اظہر الدین نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز انیس دسمبر 1984 کو انگلینڈ کے خلاف اکیس سال کی عمر میں کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے تین ٹیسٹ میچوں میں لگاتار تین سنچریاں اسکور کر کے ریکارڈ قائم کر دیا۔ اظہر الدین تین سو دن ڈے کھیلنے والے دنیا کے پہلے کرکٹر تھے۔ ہندوستان کے بعد یہ انڈیا کرکٹ ٹیم کو سب سے زیادہ (نوے) ون ڈے جتوانے والے دوسرے کپٹن ہیں۔ اظہر الدین اسپاٹ فلکسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہونے والے دنیا کے پہلے کھلاڑی ہیں۔ ان کا شاندار کیریئر ایک وارغ کے ساتھ ختم ہو گیا۔

میں نے بات ختم کر کے ان کی طرف دیکھا۔
”بھائی میاں!“ آصف نے میری طرف رخ کر کے کہا۔ ”جب بتا ہی رہے ہو تو یہ بھی بتا دو کہ اظہر الدین کے علاوہ اور کون کون اس الزام کی زد میں آیا؟“

میں نے حکاکر کر گھلا صاف کیا پھر بولا۔ ”جنوبی افریقا اور انڈیا کی 2000 کی تنازعہ سیریز کے بعد صرف اظہر الدین ہی پابندی کا شکار نہیں ہوئے، سلاواہ افریقن کپٹن فنی کروپے اسپاٹ فلکسنگ اسپینڈل کا دوسرا نشانہ تھے۔ سات اپریل 2000 میں فنی کروپے پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے سچے چاولہ جو کہ ایک مشہور بلی تھا، سے رابطہ کیا ہے۔ اس کے بعد انٹرین کپٹن اظہر الدین کی طرح ان پر بھی تاحیات پابندی لگادی گئی۔ ستمبر 2001 میں انہوں نے اس پابندی کے خلاف کورٹ میں درخواست عاید کی مگر اکتوبر 2001 میں یہ درخواست مسترد کردی گئی۔ جون 2002 میں فنی کروپے جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ 25 دسمبر 1969 کو جنوبی افریقا کی ریاست بلوم فونٹین میں پیدا ہونے والے فنی کروپے نے اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز 1992 میں کیا۔ فنی کروپے کی قیادت میں جنوبی افریقا نے آسٹریلیا کے علاوہ دنیا کی ہر ٹیم کو شکست دی۔ کریم اسمتھ کے بعد سلاواہ افریقا کے سب سے زیادہ ون ڈے سچ جیتنے والے کپٹن ہیں۔ فنی کروپے نے ستمبر 1995 سے مارچ 2000 تک لگاتار ایک سو بائیس ایک روزہ سچ کھیلے جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ یہ دنیا کے واحد کھلاڑی ہیں جنہوں نے لگاتار سو سے زائد ایک روزہ سچ اپنی کپتانی میں کھیلے۔ 1998 میں ان کی کپتانی میں جنوبی افریقا نے ٹاک آؤٹ کپ کا ٹیٹل جیتا جس کے

بعد آج تک جنوبی افریقن ٹیم کوئی ٹورنامنٹ نہیں جیت سکی۔ اس طرح اسپاٹ فلکسنگ نے دنیا کے ایک اور بہترین کھلاڑی کو گل لیا۔“

میں نے ایک اور کھلاڑی کا تعارف کرانے کے بعد میز پر رکے جگ سے گلاس میں پانی بھر کر گھات کیا پھر سلسلہ کام کو جوڑا۔ ”پاکستان کے مشہور ٹیسٹین سلیم ملک اسپاٹ فلکسنگ کا نشانہ بننے والے ایک اور کھلاڑی ہیں۔ سلیم ملک پر رشوت خوری کا الزام لگایا گیا جس میں وہ بے قصور پائے گئے لیکن مئی 2000 میں دوبارہ انکوائری پر جسٹس قیوم نے ان پر تاحیات پابندی لگادی۔ سلیم ملک 16 اپریل 1963 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ سلیم ملک نے پانچ اپریل 1982 کو اپنا پہلا ٹیسٹ سچ سری لنکا کے خلاف کھیلایا اور سچری اسکور کیا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ٹیسٹ ڈیبیو پر سچری اسکور کرنے والے یہ 1982 میں دنیا کے دوسرے کم عمر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے بارہ ٹیسٹ اور چونتیس ایک روزہ میچوں میں قومی ٹیم کی قیادت بھی کی۔ اس طرح ایک اور بہترین کھلاڑی اسپاٹ فلکسنگ کی سمیٹ چڑھ گیا۔“

میں نے ان کے علاوہ سلمان بٹ بھی اسپاٹ فلکسنگ کا شکار ہوا۔ ”2010 میں ہونے والی انگلینڈ اور پاکستان کی ٹیسٹ سیریز کے دوران اسپاٹ فلکسنگ اسپینڈل نے دنیا بھر کی توجہ حاصل کی۔ اس فلکسنگ اسپینڈل کا مرکزی کردار سلمان بٹ تھے۔ 27 اگست 2010 کو سلمان بٹ پر سچ فحش کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اس کے بعد انیس اگست کو ٹیسٹ کرکٹ کی کپتانی سے ہٹادیا گیا اور ایک روزہ اسکاؤڈ سے بھی باہر کر دیا گیا۔ آئی سی سی نے سلمان بٹ پر دس سال کا بین لگایا۔ نومبر 2011 میں سلمان بٹ کو مجرم کی حیثیت سے تیس مہینے قید کی سزا سنائی گئی۔ 22 جون 2012 کو وہ جیل سے رہا ہو گئے۔ اگست 2015 میں سلمان بٹ سے پابندی ہٹائی گئی اور 2 ستمبر 2015 سے انہیں انٹرنیشنل کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ سات اکتوبر 1984 کو لاہور میں پیدا ہونے والے سلمان بٹ نے اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز دسمبر 2003 میں بنگلہ دیش کے خلاف کیا۔ بارہ جولائی 2010 کو شاہد آفریدی کی ٹیسٹ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں قومی ٹیم کا کپتان بنادیا گیا اور انہوں نے اپنی قیادت میں پہلے ٹیسٹ سچ میں ہی آسٹریلیا کو شکست دی۔ سلمان بٹ نے 33 ٹیسٹ میچوں میں 33.46 کی اوسط سے 1889 رنز بنائے جس میں تین سنچریاں اور دس نصف سنچریاں شامل ہیں۔“

حصہ لیا اور قومی ٹیم کو ٹائیکل جتوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ عامر نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز 4 جولائی 2009 کوسری لنکا کے خلاف کیا۔ محمد عامر سٹائیکس ٹیسٹ میچوں میں اکیاسی وٹکس حاصل کر چکے ہیں جبکہ سترہ ایک روزہ میچوں میں انہوں نے تیس وٹکس حاصل کی ہیں۔ محمد عامر دنیا کے واحد باؤلر ہیں جنہوں نے پانچ وٹک میڈن اور پچھٹا جس میں دو بولڈیک میچ آؤٹ اور دوران آؤٹس شامل ہیں۔

اسی دوران چائے آگئی تھی۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک چسکی لی پھر کہا۔ ”اسپاٹ فٹنگ میں ملوث ہو کر پابندی کا شکار ہونے والے ایک اور کھلاڑی پاکستان کے لیگ اسپنر دانش کمر یا ہیں۔ انگلش کلاؤنی کھیلنے کے دوران دانش کمر یا اور ان کے ایک ساتھی تیز باؤلر مروان ویٹ فیلڈ پراسپاٹ فٹنگ کا الزام لگا۔ الزام ثابت ہونے پر ویٹ فیلڈ پانچ سال اور دانش کمر یا پرتاحیات پابندی عاید کردی تھی۔ یہ پابندی انگلش بورڈ کی طرف سے لگائی گئی۔ سولہ دسمبر 1980 کو راجی میں پیدا ہونے والے دانش کمر یا نے اپنے کیریئر کا آغاز 27 نومبر 2000 میں انگلینڈ کے خلاف کیا۔ دانش کمر یا نے اسٹمٹ میچوں میں چوتیس کی اوسط سے 261 وٹکس حاصل کیں۔ ان کا بہترین باؤلنگ فگر 7177 تھا۔ دانش کمر یا بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی طرف سے کھیلنے والے دوسرے ہندوستانیوں میں غیر مسلم کھلاڑی تھے۔

”ای جی جناب آپ نے تو پاکستانی کھلاڑیوں کو منتخب کر لیا ہے۔ کیا کسی دوسرے ملک کے کھلاڑی اس جرم میں شریک نہیں ہیں؟“ تو کوہن نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

میں نے شروع ہی ایک ہندوستانی کھلاڑی سے کیا ہے۔

اب ایک اور نام ہیں۔

2013 کی انڈین پریمیر لیگ میں اسپاٹ فٹنگ کا بہت چرچا رہا۔ اس فٹنگ اسپیکٹرل کامرکزی کردار ادا جستان رائٹ کی نمائندگی کرنے والے انڈین فاسٹ باؤلر شانتا کماران سری ساتھ تھے۔ سری ساتھ پرائیز پولیس نے میچ فکس کرنے کا الزام لگا کر انہیں ان کے دوست کے گھر سے گرفتار کیا۔ گرفتاری کے فوراً بعد راجستان رائٹ نے ان کا کنٹریکٹ منسوخ کر دیا۔ سری ساتھ کے ساتھ ساتھ دو اور کھلاڑیوں اور چودہ بکیز گرفتار کیا گیا۔ ان سب کو جون 2013 کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔ 2013 میں بی سی آئی نے سری ساتھ پرتاحیات پابندی لگادی۔ چھ فروری 1983 کو انڈیا کی ریاست کرالا میں پیدا ہونے والے سری ساتھ نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز یکم مارچ 2002 کو انڈیا کے خلاف کیا۔ سری

میں نے رک کر سب کے چہروں پر نظر ڈالی اور پھر بولا۔ ”2010 کے فٹنگ اسپیکٹرل کا دوسرا کردار محمد آصف تھا۔ محمد آصف جو کہ اپنی شاندار باؤلنگ سے دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال چکا تھا اور جس کے سامنے بڑے بڑے بلے باز جانی بھرتے نظر آتے۔ اپنے کیریئر کے عروج پر ہی اسپاٹ فٹنگ کا نشانہ بن گیا۔ 27 اگست 2010 کو سلمان بٹ کے ساتھ ساتھ ان پر بھی میچ فکس کرنے کا الزام لگا گیا۔ تین نومبر 2011 کو محمد آصف کو ایک سال کے لیے جیل بھجوا دیا گیا۔ ان پر لگائی گئی پانچ سال کی پابندی 14 اگست 2015 کو جانی گئی اور انہیں ہر طرح کی کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ محمد آصف 20 دسمبر 1982 کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنا ٹیسٹ ڈیبیو 3 جنوری 2005 کو آسٹریلیا کے خلاف کیا۔ محمد آصف نے 23 ٹیسٹ میچوں میں 23.18 کی اوسط سے 105 وٹکس حاصل کیں۔ جب ان پر بین لگایا گیا تب یہ آئی سی سی کی ٹیسٹ رینٹنگ میں دوسرے نمبر پر تھے۔ محمد آصف ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ میں میڈن اور پچھٹنے والے دنیا کے پہلے باؤلر تھے۔ 2007 میں محمد آصف نے سلوا تھافریٹھ کے خلاف سیریز میں شاندار باؤلنگ کی اور انیس وٹکس حاصل کیں۔ محمد آصف کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے پاؤں پر خود کلبازی ماری گئی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

کمرے میں جمع تینوں ساتھی بہت توجہ گمش تھے۔ میں نے سلسلے کو دراز کیا۔ ”2010 کے فٹنگ اسپیکٹرل کا تیسرا نشانہ پاکستان کے نوجوان تیز باؤلر محمد عامر بنے۔ محمد عامر جس کا کیریئر کے آغاز سے ہی دسم اکرم سے موازنہ کیا جاتا تھا۔ اپنی اسپنڈ لائن لیٹھ اور شاندار سوئیٹنگ باؤلنگ سے وہ کسی بھی بلے باز کو مشکل میں ڈال سکتے تھے۔ محمد عامر پرائیز اگست 2010 کو میچ فٹنگ کا الزام لگایا جس کی وجہ ان کی میچنگی گئی ناقابل یقین نوبال تھی۔ محمد عامر نے اپنا جرم تسلیم کر لیا اور قوم سے معافی مانگی۔ نومبر 2011 میں عامر کو جیل بھجوا دیا گیا اور ان پر بھی پانچ سال کی پابندی عاید کردی کی مگر کم عمری کی وجہ سے انہیں کافی رعایت دی گئی۔ 29 جولائی 2015 کو انہیں کرکٹ کھیلنے کی اجازت مل گئی۔ 2016 میں انہیں پاکستان کی قومی ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور اب محمد عامر ٹیسٹ ٹیم کا حصہ ہیں۔ تیرہ اپریل 1992 کو گوجران میں پیدا ہونے والے محمد عامر نے اپنا پہلا انٹرنیشنل میچ آئی سی سی ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ 2009 میں صرف سترہ سال کی عمر میں کھیلا۔ محمد عامر نے اس ٹورنامنٹ کے سارے میچوں میں

ساتھ نے تیس سال ٹیسٹ میچ کھیلے اور ستاسی وکٹیں حاصل کیں۔ ان کی بہترین باؤلنگ 2006 میں سلاؤتھم افریقہ کے خلاف دیکھنے کو ملی جب انہوں نے اپنی بہترین سوئنگ باؤلنگ سے مخالف ٹیم کے چھکے جھڑا دیے اور میزبان ٹیم کو صرف 84 رنز پہ ڈھیر کر دیا اور اٹھایانے تاریخ میں پہلی بار جنوبی افریقہ کو ان کے گھر میں شکست دی۔ سری ساتھ نے اس فتح میں پانچ وکٹیں حاصل کیں اور مرد میدان قرار پائے۔ کرکٹ کا یہ ستارہ بھی اسپاٹ فگسنگ کی وجہ سے ڈوب گیا۔

ایک ان پر ہی نہیں، انڈیا کا ایک اور کھلاڑی بھی اس جرم میں ملوث پایا گیا۔

”بھارت کی نمائندگی کرنے والے بیٹنگ آل رولڈر اے جے کمارشام بھی اسپاٹ فگسنگ کا شکار ہو چکے ہیں۔ 2000 میں اے جے کمارشام اسپاٹ فگسنگ کا الزام لگایا گیا۔ جرم ثابت ہونے پر ان پر تاحیات پابندی لگادی گئی۔ ستمبر 2014 میں دہلی ڈسٹرکٹ کورٹ نے ان سے پابندی ہٹائی اور بی سی آئی کی کوکم دیا کہ انہیں بورڈ کی سرگرمیوں میں شرکت کی اجازت دی جائے۔ 3 اپریل 1964 کو دہلی میں پیدا ہونے والے اے جے کمارشام نے اپنے کیریئر کا آغاز دو جنوری 1986 کو ویسٹ انڈیز کے خلاف کیا۔ اتیس ایک روزہ میچوں میں اے جے شرم نے بیس کی اوسط سے 424 رنز بنائے اور پندرہ وکٹیں حاصل کیں۔“

اس جرم میں صرف بڑی ٹیموں کے کھلاڑی ہی نہیں بگ لے دیش جیسی چھوٹی ٹیم کے کھلاڑی بھی ملوث پائے گئے۔ بگ لے دیش کے نوجوان بے باز محمد اشرف بھی اسپاٹ فگسنگ کا نشانہ بن کر آٹھ سال کی پابندی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اپنے خوبصورت اسٹروک بے لے کی وجہ سے مشہور نوجوان بیٹسمین محمد اشرف بگ لے دیش کی بیٹنگ لائن اپ کے مستقبل کی امید تھے۔ 2013 کی بگ لے دیش پریمیر لیگ کے دوران محمد اشرف پر میچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ 2014 میں بگ لے دیش کرکٹ بورڈ نے محمد اشرف پر آٹھ سال کی پابندی عاید کی۔ بعد میں یہ پابندی کم کر کے پانچ سال کر دی گئی۔ سات جولائی 1984 کو ڈوہاکا میں پیدا ہونے والے محمد اشرف نے اپنے کیریئر کا آغاز چھ ستمبر 2001 میں سری لنکا کے خلاف کیا۔ محمد اشرف نے آٹھ ٹیسٹ میچوں میں چوبیس کی اوسط سے رنز بنائے اور اکیس وکٹیں بھی حاصل کیں۔ اشرف بگ لے دیش کی طرف سے ون ڈے، ٹیسٹ اور ٹوئنٹی ٹو ٹی ٹی بی کی تیز ترین نصف سنچری اسکور کرنے والے بے باز ہیں۔ محمد اشرف بگ لے دیش کی طرف سے ایک روزہ کرکٹ اور ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے زیادہ رنز اسکور کرنے والے

دوسرے بے باز ہیں۔ اشرف 2007 سے 2009 تک تیرہ ٹیسٹ میچ، آئیس ون ڈے اور گیارہ ٹی ٹوئنٹی میچوں میں بگ لے دیش کی کپتانی بھی کر چکے ہیں۔ کرکٹ کا ایک اور بہترین کھلاڑی اسپاٹ فگسنگ کا نشانہ بن گیا۔ اسی طرح اسپاٹ فگسنگ کے جرم میں ملوث ہو کر عمر بھر کے لیے بین ہونے والے کھلاڑیوں میں نیوزی لینڈ کے اوپننگ بیٹسمین لوونسنٹ بھی شامل ہیں۔ لوونسنٹ نے 2011 میں ساؤتھی کھلاڑی نوید عارف کے ساتھ مل کر انگلش کلاؤنی کا میچ فکس کرنے کا اعتراف کیا۔ جس کے بعد 2014 میں انگلینڈ بورڈ نے ان پر تاحیات پابندی لگادی۔ 11 نومبر 1978 کو نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں پیدا ہونے والے لوونسنٹ نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز تیس نومبر 2001 کو آسٹریلیا کے خلاف کیا اور پہلے میچ میں ہی سنچری اسکور کی۔ ڈیبیو پہ سنچری اسکور کرنے والے یہ نیوزی لینڈ کے چھ کھلاڑی تھے۔ لوونسنٹ نے اپنے کیریئر میں 23 ٹیسٹ میچ کھیلے اور تین سنچریوں اور نو نصف سنچریوں کی مدد سے 1332 رنز اسکور کیے۔ لوونسنٹ نے 102 ایک روزہ میچ کھیل رکھے ہیں جس میں انہوں نے تین سنچریاں اور گیارہ نصف سنچریاں اسکور کیں۔ یہ نیوزی لینڈ کے واحد کھلاڑی ہیں جو اسپاٹ فگسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے۔

انہی کی طرح ویسٹ انڈیز کے مشہور بے باز مارلون سیوٹیلو بھی میچ فگسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہوئے تھے۔ 2007 میں ویسٹ انڈیز اور انڈیا سیریز کے دوران ان پر بیس کو معلومات دینے کا الزام لگایا گیا۔ 2008 میں آئی سی سی کی طرف سے ان پر دو سال کے لیے بین لگادیا گیا۔ سیوٹیلو پانچ فروری 1981 کو جیمیکا میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز 14 اکتوبر 2000 کو سری لنکا کے خلاف کیا۔ مارلون سیوٹیلو اب تک آکٹری ٹیسٹ اور ایک سو ستاسی ایک روزہ میچ کھیل چکے ہیں۔ مارلون سیوٹیلو کا شمار ویسٹ انڈیز کے بہترین بے بازوں میں ہوتا ہے۔ سیوٹیلو 2012 اور 2016 کے ٹوئنٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ جیتنے والی ویسٹ انڈیز ٹیم کا اہم حصہ تھے۔ انہوں نے ان دونوں ٹورنامنٹس کے فائنل میں مین آف دی میچ کا ایوارڈ حاصل کیا جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ورلڈ کپ 2015 میں کرس گیل اور مارلون سیوٹیلو نے تین سو بہتر رزنگی پانڈر شپ قائم کی جو کہ ایک روزہ کرکٹ کی تاریخ کی سب سے بڑی پانڈر شپ ہے۔ میچ فگسنگ کی وجہ سے پابندی کا شکار ہونے والے یہ ویسٹ انڈیز کے پہلے کھلاڑی ہیں۔



پرائی کوکھ

کاشف زبیر

اسے دنیا کی ہر سہولت میسر تھی، دولت کے ڈھیر پر وہ بیٹھا ہوا تھا لیکن جب اپنے حویلی نما گھر کا جائزہ لیتا تو دکھ سے دل بھر اٹھتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے ایک عجیب راستہ منتخب کیا تھا لیکن اسے حاصل کیا ہوا ہے؟

مغرب سے درآ کر ایک الگ انداز کا واقعہ

سیلی فے اور اس کا شو ہر مارینو نے اس کافی فارم میں کام کرتے تھے یہاں برازیل کی بہترین کافی اگتی تھی اور یہ فارم مسٹر بین جوئے کی ملکیت تھا۔ بین جوئے کا شمار برازیل کے چند دولت مند ترین افراد میں ہوتا تھا۔ یوں تو اس کے بے شمار کاروبار تھے جن میں بینکوں سے لے کر ائر لائن تک شامل تھیں لیکن وہ کافی کنگ کے نام سے مشہور تھا۔ بین جوئے نسلاً اطالوی تھا اور وہ دس سال پہلے برازیل آ کر آباد ہوا تھا۔ وہ یہاں مقبول بھی تھا کیونکہ اس

نے اپنی دولت سے برازیل میں بے شمار کاروبار شروع کیے تھے اور کئی ہزار افراد کو روزگار مہیا کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ قلائد کا موس میں بھی پیش پیش رہتا تھا اس نے عورتوں بچوں اور منشیات کے عادی افراد کی بھالی اور بہتری کے لیے کئی اداروں کو بھاری عطیات دیے تھے۔

پچاس سالہ بین نے دو سال پہلے ہی برازیل کی مہنگی ترین سپر ماڈل نوری سے شادی کی تھی۔ نوری کے حسن و جمال میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کے بے شمار پرستار تھے۔ لیکن ان میں کوئی بین جوئے جیسا دولت مند نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بین نے اسے پرپوز کیا تو اس نے اقرار کرنے میں زیادہ دیر نہیں کی تھی۔ نوری جانتی تھی کہ اس کی کامیابی کا دور بہت مختصر ہے اور چند سال بعد وہ سابقہ سپر ماڈل بن جائے گی۔ دوسرے وہ اس مہنگی زندگی سے اکتا چکی تھی۔ اس نے کامیابی، شہرت اور دولت سب حاصل کر لی تھی۔ اب وہ سکون سے ایسی پرورش زندگی گزارنا چاہتی تھی جس کے لیے اسے خود کوئی تنگ و دو نہ کرنی پڑے۔ بین جوئے اسے بے زندگی دے سکتا تھا۔ اس کے انتخاب کی ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا شخص نہیں تھا اس نے نوری کو پسند کیا تھا اور اس کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس نے نوری پر کام کرنے کی پابندی بھی نہیں لگائی تھی۔ یعنی وہ شادی کے بعد بھی ماڈلنگ کر سکتی تھی۔ گزشتہ دو سال سے ان کے درمیان بہت اچھی گزر رہی تھی۔ نوری کام کرتی تھی لیکن دورانیہ کم کر دیا تھا۔ خاص طور سے جب بین گھر آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ بھی گھر میں ہو۔ اس طرح اس نے کام بھی مخصوص کر لیا تھا اور اب ایسی ماڈلنگ کرنے سے گریز کرتی تھی جس میں اسے مکمل عریاں ہونا پڑے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے شوہر کی معاشرے میں عزت ہے اور نوری کی عریاں ماڈلنگ سے اسے شرمندگی ہو سکتی ہے۔ نوری نے بین سے صرف ایک شرط سنوائی تھی کہ بین اسے ماں بننے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اس نے بین سے صاف کہہ دیا ہے۔

”میں ماں نہیں بننا چاہتی ہوں۔“

”تمہیں بچے پسند نہیں ہیں؟“

”بچے تو پسند ہیں لیکن میں ماں بننے کی تکلیف نہیں برداشت کر سکتی۔“

نوری کا تعلق بہت غریب گھرانے سے تھا اور اس نے اپنے چار بہن بھائیوں کو گھر میں پیدا ہوتے دیکھا تھا اس کی ماں پر اس دوران میں جو گزر رہی تھی وہ ہمیشہ کے لیے

نوری کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ ماں بننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس معاملے میں وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ اس نے اس شرط کو باقاعدہ تحریر کروایا تھا۔ یہ ان کے شادی کے معاہدے میں شامل تھی لیکن اسے خفیہ رکھا گیا تھا۔

بین نے اس وقت تو نوری کی یہ شرط مان لی تھی لیکن اب اسے اولاد کی کمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ پچاس برس کا ہو چکا تھا اور اس کے پاس زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اگر اب اس کا بچہ ہوتا تو وہ کوئی تیس برس بعد جا کر اس قابل ہوتا کہ اس کا وسیع کاروبار اور دولت سنبھال سکے۔ دوسری طرف وہ جانتا تھا کہ نوری کسی صورت ماں بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی۔ جب بھی ان کے درمیان بچے کے موضوع پر بات ہوتی تو نوری اپنا عزم ضرور دہراتی تھی۔ ایک موقع پر جب بین نے بچے کو اپنی خواہش قرار دیا تو نوری نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں اس بات پر تم سے الگ ہونے کو ترجیح دوں گی مگر تم چاہو تو کسی اور سے شادی کر کے اپنی خواہش پوری کر سکتے ہو۔“

لیکن بین، نوری سے محبت کرتا تھا اور اسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے بات وہیں رہ جاتی تھی۔ وہ نوری سے اس موضوع پر بات نہیں کرتا تھا لیکن اس کے اندر بچے کی خواہش باقی تھی۔

سیلی اور ماریونو کا تعلق برازیل کے پڑوسی ملک بولیویا کے ایک پسماندہ سرحدی علاقے ٹریینیڈاڈ سے تھا یہ جگہ برازیل کی سرحد سے کوئی پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ ماریونو ایک مزدور تھا اور جب سیلی نے اس سے شادی کی تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے پاس نہ تو اپنا مکان ہے اور نہ اپنی زمین۔ کیا ان کے بچے بھی اسی طرح غربت اور محروم زندگی گزاریں گے۔ سیلی اور ماریونو کا تعلق بہت غریب گھرانوں سے تھا جہاں ایک وقت کھانا بننا تھا تو دوسرے وقت کھانا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی کو اس کے ماں باپ نے بڑی مشکل سے ہائی اسکول تک پڑھایا تھا اور اس کے بعد اسے صاف کہہ دیا کہ اگر اسے آگے پڑھنا ہے تو اپنے سارے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے۔ سیلی جانتی تھی اس کے ماں باپ خود غرض نہیں تھے لیکن وہ کیا کرتے ان کے پانچ بچے اور بھی تھے، ان کو پڑھانا اور پالنا تھا۔ سیلی سب سے بڑی تھی۔

مجبوراً صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے کام شروع کر دیا۔ ان کے علاقے میں کام محدود تھا۔ مردکان کن بن

ہاتے تھے اور عورتیں کھیتوں میں کام کرتی تھیں۔ سیلی بھی ایک کھیت میں کام کرنے لگی۔ جہاں جان تو زمینت کے بعد اسے اتنا ملا تھا کہ وہ بس اپنے اخراجات پورے کر سکتی تھی۔ آگے تعلیم حاصل کرنے کا خواب ادھر اور رہ گیا تھا کیونکہ اتنی آمدنی میں وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتی تھی اور اگر کالج میں داخلہ لیتے تو اتنا کام بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں زمین زیادہ تر جاگیرداروں کے قبضے میں تھی اور اکثر لوگ ان ہی کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ بولیو یا ویسے بھی ایک ہمساندہ ملک تھا اب بھی اس کی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس وقت تو غربت بہت زیادہ تھی۔

سیلی کی ماریو سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی کھیت میں کام کرنے والا مزدور تھا اس کی تعلیم معمولی سی تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ عام سانو جوان تھا اس کے مقابلے میں سیلی خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی، اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور جلد انہوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ ہسپانوی نسل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہاں کے لوگ عشق و محبت کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہسپانوی مشرقیت کے دلدادہ جو ہوتے، وفات ان کی سرشت میں ہوتی ہے اسی وجہ سے یورپ بھر میں انہیں محبت کی دنیا کے باسی کہا جاتا ہے۔ وہ لوگ ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور چاہے جانے کے متمنی ہوتے ہیں۔ پیار ان کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اسی لیے ان کی شادی کو دونوں خاندانوں نے سراہا تھا۔ ایک دوسرے کے ہو گئے۔

شادی کے بعد انہیں صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ زندگی کس قدر دشوار ہے خاص طور سے جب آدمی کے پاس بنیادی ضرورتوں کے لیے بھی رقم نہ ہو۔ بولیو یا میں خراب اقتصادی حالات کی وجہ سے پورے ملک کی ایک جیسی پوزیشن تھی اگر وہ کہیں اور چلے جاتے تب بھی ان کا معیار زندگی بہتر نہ ہوتا۔ ابھی ان کی ازدواجی زندگی کا آغاز تھا اور وہ جدوجہد کر سکتے تھے جب ان کے بچے ہو جاتے تو وہ جدوجہد کرنے کے قابل بھی نہیں رہتے اور پھر ان کو جیسے چمپے گزارا کرنا پڑتا جیسے ان کے ماں باپ کرتے آئے تھے۔ سیلی اس معاملے میں بہت حساس تھی اور وہ چاہتی تھی کہ مشکلات انہوں نے برداشت کی ہیں وہ ان کے بچوں کو نہ داشت کرنی پڑے۔ وہ باقاعدگی سے اخبار دیکھتی تھی کہ لاپرواہی کوئی روشنی کی کرن نظر آجائے۔ پھر اسے یہ کرن نظر آ گئی۔ ایک دن ماریو کام سے آیا تو سیلی بہت خوش

تھی۔ ماریو نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے تم بہت خوش نظر آ رہی ہو؟“

سیلی نے آج کا اخبار اس کے سامنے رکھ دیا اور ایک خبر پرائنگل رہی۔ اس کے مطابق برازیل میں بولیو یا کی سرحد کے پاس کافی کی وسیع پیمانے پر کاشت کی جارہی تھی اور کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے سستے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ اس لیے بولیو یا کے سرحدی علاقے سے لوگ برازیل جا رہے تھے اور وہاں ان کو ملازمتیں مل رہی تھیں۔ آمدنی تین سے چار گنا زیادہ تھی اس لیے لوگ برازیل جانے کو ترجیح دے رہے تھے اور کیونکہ برازیل کو بھی کارکنوں کی ضرورت تھی اس لیے وہ آسانی سے بولیو یا کے لوگوں کو ورک ویزا دے رہے تھے۔ ماریو نے خبر پڑھ کر سوالیہ نظروں سے سیلی کی طرف دیکھا تو اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”ہم بھی برازیل جاسکتے ہیں اور وہاں کام حاصل کر سکتے ہیں۔“

ماریو بچپنچا تھا۔ ”لیکن اپنا ملک چھوڑ کر....“ ”ہم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہے ہیں۔“ سیلی نے اس کی بات کاٹی۔ ”ہم وہاں جا کر رقم جمع کریں گے اور جب ہمارے پاس اتنی رقم ہو جائے گی کہ ہم اپنی زمین اور مکان خرید سکیں تو ہم واپس آجائیں گے۔“

ٹرینیڈاڈ میں زمین زرخیز اور سستی تھی لیکن لوگ اتنے غریب تھے اور آمدنی اتنی محدود تھی کہ وہ یہ سستی زمین بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ آمدنی محدود تھی تو مہنگائی بہت زیادہ تھی لوگ جو کماتے تھے وہ پورا نہیں پڑتا تھا بچت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سیلی اور ماریو یہاں دونوں کمارہے تھے لیکن شادی کے بعد ان کی بچت سو بولیوین ڈالرز تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ ماریو ہچکچارہا تھا لیکن سیلی نے اسے راضی کر لیا۔ ماریو کو خوف تھا کہ یہاں روزگار ویسے ہی مشکل سے ملتا ہے اور وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے اور ان کو برازیل میں بھی کام نہیں ملا تو ان کو واپس آ کر بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے برعکس سیلی یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھی۔ اس کا کہنا تھا خطرے کا سامنا کیے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا ہے وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو خطروں کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

بولیو یا کے شہریوں کو ویزا سرحد پر مل رہا تھا۔ برازیلی حکام صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ کام کے لیے آنے والے جوان اور مضبوط ہیں۔ وہ کسی کم عمر یا بوڑھے آدمی کو...

ویزم نہیں دے رہے تھے۔ سیلی اور ماریو ایک خستہ حال بس اور پھر کوئی چار میل کا پیدل سفر کر کے سرحدی چوکی تک پہنچے۔ جہاں ان کو آسانی سے ویزا مل گیا۔ یہ عارضی ویزا تھا ان کو مستقل ویزا اس وقت ملتا جب ان کو کہیں ملازمت مل جانی دوسری صورت میں ان کو ایک ہفتے کے اندر واپس آنا پڑتا اور وہ نہیں آتے تو برازیلیں پولیس ان کی تلاش شروع کر دیتی۔ سیلی نے سنا تھا کہ برازیل سے زیادہ موانع پورٹو ویل ہو میں تھے۔ یہ علاقہ خاص طور سے کافی کے باغات کے لیے مشہور ہو رہا تھا۔ وہ پورٹو ویل ہو کی طرف روانہ ہو گئے۔ بس کانکت خریدنے کے بعد ان کے پاس بس اتنی رقم بچی تھی کہ وہ اس سے دو دن گزارا کر سکتے تھے اور اس کے بعد فاقے شروع ہو جاتے۔ دو گھنٹے بعد وہ پورٹو ویل ہو میں تھے۔

سیلی نے بس سے اترتے ہی ایک ڈسٹ بن میں نظر آنے والا تازہ اخبار اٹھایا اور اس میں ملازمت کے اشتہار دیکھنے لگی۔ سرحد کے دونوں جانب اسپیشل زبان بولی اور لکھی جاتی ہے اس لیے زبان کا مسئلہ نہیں تھا۔ سیلی نے ایک بڑا اشتہار دیکھا۔ یہ جوئے فارمر کی طرف سے تھا اور یہاں کافی کے باغات میں کام کرنے کے لیے مزدور درکار تھے۔ کھانے اور رہائش کے ساتھ معقول تنخواہ بھی دی جارہی تھی۔ یہ ان کی سابق آمدنی سے تین گنا زیادہ تھی۔ سیلی نے خوش ہو کر ماریو سے کہا۔ ”اگر یہاں ملازمت مل گئی تو ہم تین چار سال میں بہت ساری رقم جمع کر سکتے ہیں۔“

”اگر ملازمت مل جائے تو۔“ ماریو نے جواب دیا وہ ابھی تک شک میں تھا کہ ان کو یہاں کام مل سکتا ہے حالانکہ اس کے ہزاروں ہم وطن یہاں کام کر رہے تھے۔ وہ جوئے فارمر پہنچے اس وقت وہ تین جوئے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ فارمر کے ایک نائب منیجر نے ان کا انٹرویو لیا اور ان کی عمر، صحت اور کھیتوں میں کام کرنے کا تجربہ جان کر ان کو فوراً ملازمت دے دی۔ جوئے فارمر کے باغات میلوں کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں کام کرنے والے افراد کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ ان مزدوروں کے لیے باغات کے درمیان میں ہی جا بہ جا چھوٹے چھوٹے ہٹ بنائے گئے تھے۔ سستے اور سادہ تعمیراتی میٹرل سے بنے ہوئے ان ہٹس میں سہولتیں موجود تھیں۔ ان کو بجلی اور پانی دیا گیا تھا لیکن وہ یہاں کچھ پکا کر نہیں کھا سکتے تھے۔ بچن کی سہولت نہیں تھی۔ ایک بڑا سائیس

تھا جہاں کارکنوں کو تین وقت کھانا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مشروبات بھی دستیاب تھے۔ رہائش اور کھانے کے عوض ان کی تنخواہوں سے معمولی سی رقم کافی جاتی۔ سیلی اور ماریو میاں بیوی تھے اس لیے ان کو ڈبل بیڈ والا ہٹ دیا گیا تھا۔ ہٹ ایک کمرے اور ساتھ میں چھوٹے سے بھڑوم پر مشتمل تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ، ایک الماری اور دو دروازے تھیں۔ یہ سیلی اور ماریو کے بولیویا کے اس گھر سے چھوٹا تھا جہاں وہ کرائے پر رہتے تھے لیکن یہاں ساری ضروری سہولتیں تھیں۔ سیلی اور ماریو خوش تھے۔ وہ جتنا سوچ کر آئے تھے ان کو اس سے زیادہ ہی مل گیا تھا۔ بس کام ذرا سخت تھا۔ صبح سات سے دوپہر دو بجے تک کام کرنا ہوتا تھا اس کے بعد وقفہ ملتا تھا۔ پھر پانچ سے سات بجے تک کام ہوتا تھا۔ رات نو بجے تک میس میں کھانا ملتا تھا اور ان کو صبح چھ بجے اٹھنا پڑتا تھا۔ سات بجے تک ناشتا کر کے وہ کام پر پہنچ جاتے تھے۔ ان کی درخواست پر ان کو ایک ہی جگہ لگایا گیا تھا۔

جوئے فارمر کی میلوں پہنچنے کی زمین کے وسط میں بین جوئے کا عالی شان محل نما مکان تھا۔ اگرچہ وہ کاروبار کے سلسلے میں زیادہ تر ریوڈی جیجر و میں رہتا تھا لیکن اس کی اصل رہائش گاہ یہی تھی۔ وہ جب یہاں آتا تو اپنے فارم کا دورہ ضرور کرتا اور اس کے ایک ایک حصے میں آتا تھا۔ سیلی اور ماریو اسے مینے میں ایک بار تو ضرور دیکھتے تھے۔ وہ اپنے کسی کاروبار کو اتنی اہمیت نہیں دیتا تھا جتنا جوئے فارمر کو۔ اس کی ذاتی دل چسپی کی وجہ سے فارمر کی انتظامیہ اور پھر وائزر بھی مستعد رہتی تھی اور کارکنوں پر عمل نظر رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سیلی اور ماریو کو کام کے اوقات میں سکون کے مواقع بہت کم ملتے تھے اور شام کو جب چھٹی ہوتی تو وہ تھک چکے ہوتے تھے۔

اس کے باوجود وہ خوش تھے۔ یہاں کوئی پریشان کرنے والی چیز نہیں تھی وہ محنت کرتے تھے تو ان کو اس کا پورا معاوضہ دیا جاتا تھا۔ پھر رہائش اور کھانا پینا بھی بہترین تھا اس لیے وہ کام میں پوری دل چسپی لیتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں ان کی صحت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ ایک سال بعد جب وہ دو ہفتے کی چھٹی پر واپس گئے تو ان کے گھر والے ان کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ انہوں نے ایک سال میں جو کمایا تھا اس سے انہوں نے اپنے گاؤں کے قریب ایک چھوٹی سی واوی میں کچھ زمین خرید لی۔ اس واوی میں ایک چشمہ بھی تھا اور وہاں کسان بہت اچھی فصل حاصل کرتے

تھے۔ یہ زمین تھوڑی تھی لیکن ان کو اُمید تھی وہ چند سال میں مزید زمین حاصل کر سکیں گے اور اس پر گھر بھی بنالیں گے۔
 بین جو اے عام طور سے مینے کی آخری تاریخوں میں گھر آتا تھا اور اس کے بعد یہاں ایک ہفتہ یا اس دن ٹھہرتا تھا۔ جب وہ آتا تو اس سے اگلے دن وہ جو اے فارمز کا دورہ شروع کرتا۔ اپنی واپسی تک وہ روزانہ صبح سے شام تک جو اے فارمز کے مختلف حصے دیکھتا تھا۔ اگر اس کی مصروفیت کی وجہ سے کوئی حصہ معائنے سے رہ جاتا تھا تو وہ اگلی بار اپنے معائنے کا آغاز اسی حصے سے کرتا تھا۔ اس نے جو اے فارمز میں دنیا کی بہترین کافی کاشت کرائی تھی اور یہ کافی ایک معاہدے کے کافی تیار کرنے والی بہترین کمپنیوں کو فراہم کی جاتی تھی بین اپنے فارمز میں کوئی کیسیائی کھاد یا جراثیم کش دوا استعمال نہیں کرتا تھا اس کے بجائے وہ حیاتیاتی کھاد اور کیڑے مکوڑے مارنے کے قدرتی دوا استعمال کرتا تھا جو اسے کسی قدر مہنگے پڑتے تھے لیکن اس کے نتیجے میں جو کافی پیدا ہوتی تھی اس کا معیار اور ذائقہ لا جواب ہوتا تھا۔ بین جو اے جتنا اس فارم پر خرچ کرتا تھا اس سے کہیں زیادہ کمایا تھا۔

لیکن اس بار بین جب گھر آیا تو خلاف معمول دوسرے دن اس نے فارم کا معائنہ نہیں کیا۔ نہ اس سے اگلے دن نکلا اور پھر وہ پورا ایک ہفتہ تک اپنے محل نما مکان سے نہیں نکلا تھا۔ فارمز انتظامیہ اور کارکن جبران تھے کیونکہ برسوں سے بین جو اے کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ تو اسے اگلے دن اپنے درمیان دیکھنے کے عادی تھے۔ جو لوگ بین سے براہ راست تعلق رکھتے تھے وہ بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیوں فارمز کے معائنے پر نہیں نکلا تھا۔ انہوں نے بین سے رابطے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پرسنل اسٹاف نے کسی ملاقات کے امکان کو رد کر دیا تھا اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی تھی۔

یہ بین کی آمد کا چمٹاؤ تھا۔ وہ اور نوری مکان کے لیرس میں موجود تھے جہاں سے دور تک پھلے باغات صاف نظر آتے تھے اور وہ اپنے ہی فارمز کی بئی کافی پی رہے تھے۔ بین جو اے کو کافی زیادہ پسند نہیں تھی لیکن اس کے لہال میں یہ کاروباری اخلاقیات کا تقاضہ تھا کہ وہ جو چیز اسروں کو بیچ رہا ہے اسے خود بھی استعمال کرے۔ دونوں ماں بیوی خاموش تھے۔ پھر نوری نے ہچکچا کر کہا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

بین نے کسی قدر سرد انداز میں اسے دیکھا۔ ”بہی مناسب ہوگا، ورنہ تم بتاؤ اس کے سوا اور کیا راستہ ہے؟“
 ”میرا مطلب ہے کیا اخلاقی اور قانونی لحاظ سے یہ درست ہوگا؟“

”شاید نہیں۔“ بین کا لہجہ مدغم ہو گیا تھا۔ ”لیکن دوسروں کو اس بارے میں پتا ہی نہیں چلے گا۔“
 ”کیسے پتا نہیں چلے گا جب کہ اس کام میں بہت سارے لوگ ملوث ہوں گے۔“ ڈاکٹرؤں کی پوری ٹیم رہے گی۔ نوری کی آواز تیز ہو گئی۔
 ”تم مجھ پر اعتماد رکھو۔“ بین نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ ممکن ہے۔“

”میں جانتی ہوں اور مجھے تم پر اعتماد ہے۔ لیکن اگر بات کھل گئی تو تم سوچ سکتے ہو ہم کس مشکل میں پڑ جائیں گے؟“

”کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“ بین نے کہا۔ ”میں سب سنیاں لوں گا۔“

اس گفتگو کے بعد وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے تھے۔ گزشتہ چار دن سے تین ڈاکٹرؤں کی ایک ٹیم جدید ترین آلات کی مدد سے ان کا جسمانی معائنہ کر رہی تھی۔ ان کے متعدد ٹیسٹ لیے گئے تھے اور آج ہی اس ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر روزانے بین کو بتایا تھا کہ وہ جو چاہتا تھا وہ عملی طور پر مشکل سمجھ لیکن ناممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹرؤں کی یہ ٹیم اپنے ملے اور آلات سمیت بہت خفیہ محل تک آئی تھی۔ وہ جس حصے میں مقیم تھی وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں تک کھانے پینے کا سامان بھی خود کار روبوٹک ٹرالیوں کی مدد سے جاتا تھا۔ ڈاکٹر روز کی طرف سے اوکے کا سگنل ملنے کے بعد ہی بین جو اے نے نوری سے بات کی تھی اگرچہ نوری کو پہلے بھی معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے لیکن اس وقت ان کے ٹیسٹ لیے جا رہے تھے۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بین جو اے جو چاہتا ہے وہ ممکن ہے۔ نوری اگرچہ اس خیال سے متفق نہیں تھی کیونکہ ایک تو اسے اخلاقی لحاظ سے درست نہیں سمجھ رہی تھی اور دوسرے اسے اولاد کی خواہش نہیں تھی جب کہ بین جو اے بہر صورت اپنا وارث چاہتا تھا اور اس کے لیے کسی حد تک جانے کے لیے تیار تھا سوائے اسے چھوڑنے کے۔ کیونکہ وہ نوری سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ نوری سے بات کر کے بین جو اے محل کے اس حصے میں آیا جہاں ڈاکٹر اپنے عملے اور سامان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ بین

جوائے ڈاکٹر روزا کے پاس آیا۔
”ہم تیار ہیں۔“

”گلد“ ڈاکٹر روزا مسکرایا۔ ”اب ایک ایسی عورت درکار ہے جو شادی شدہ ہو، کنواری نہ ہو اور ابھی ماں بھی نہ بنی ہو۔“

”اسے دیکھنا پڑے گا۔“ بین جوائے نے کہا۔ ”لیکن بندوبست ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے ہم کل سے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔“ ڈاکٹر روزا نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے ایک مہینے کے اندر ہمیں کامیابی مل جائے گی۔“

اگلے روز بین جوائے محل سے نکلا اور اس نے فارمزا معاہدہ شروع کر دیا۔ فارمزا کی انتظامیہ اور کارکنوں نے سکون کا سانس لیا تھا کہ بین جوائے ٹھیک تھا۔ وہ ٹھیک تھا تو ان کی روزی بھی سلامت تھی۔ اس علاقے میں بین جوائے ملازمین کو سب سے اچھی خواہیں اور سہولیات دیتا تھا۔ کسی ہنگامی صورت حال میں بھی ان کا خیال رکھتا تھا تو ایسے مالک کی سب کو فکر رہتی تھی۔ جب بین جوائے اس حصے میں داخل ہوا جہاں سیلی اور ماریونے کام کر رہے تھے۔ وہ دونوں ایک درخت کے آس پاس زمین صاف کر رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بین جوائے ٹھیک گیا تھا اور اس نے اس حصے کے سپروائزر کو اشارے سے پاس بلا یا وہ دوڑا آیا تھا۔

”جناب عالی۔“

”یہ دونوں کون ہیں؟“

”یہ میاں بیوی ہیں۔ سیلی نے اور ماریونے دونوں بولیوین ہیں۔ یہاں ایک سال سے زیادہ عرصے سے کام کر رہے ہیں دونوں غنتی اور اچھے کارکن ہیں۔“ سپروائزر نے مستعدی سے جواب دیا۔

بین جوائے نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ اس نے سپروائزر سے پوچھا۔ ”یہ کہاں مقیم ہیں؟“

”سیکٹر فائیو میں ان کو ایک ہٹ الاٹ کیا گیا ہے۔“ اس وقت سیلی اور ماریونے بین جوائے کو سامنے دیکھ کر منڈب کھڑے ہو گئے تھے۔ جب وہ سپروائزر سے بات کر رہا تھا تو سیلی نے محسوس کیا وہ ان کے بارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ کیونکہ گفتگو کے دوران بین کی نظر میں مشتعل ان پر مرکوز تھیں بلکہ یہ کہنا چاہے کہ سیلی پر مرکوز تھیں لیکن انہیں مردانہ نظریں نہیں کہا جاسکتا تھا۔ سیلی نے موسم کی مناسبت

سے جینز کی چھوٹی سی نیکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا صحت مند جسم اس لباس میں نمایاں ہو رہا تھا اس کے باوجود بین نے اسے مرد کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ سیلی کو ایسی نظروں کا خوب تجربہ تھا۔ بین کچھ دیر سپروائزر کے ساتھ بات کرتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے کچھ کارکنوں سے بات کی لیکن پھر سیلی اور ماریونے کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کام معمول کے مطابق ہونے لگا تو سیلی نے آہستہ سے ماریونے سے کہا۔

”مجھے لگ رہا ہے بین جوائے ہمارے بارے میں بات کر رہا تھا۔“

ماریونے نے بے یقینی سے کہا۔ ”اسے ہمارے بارے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پتا نہیں لیکن مجھے ایسا ہی لگا۔“ سیلی بولی۔
”تمہیں غلط بھی ہوئی ہو گی بین جوائے کو ہم جیسے معمولی کارکنوں کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ سیلی نے کہا اور کام میں لگ گئی۔ وہ ایک مہینہ پہلے ہی واپس آئے تھے اور ان کو چھٹیوں کے پندرہ دنوں کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ زمین خریدنے اور آنے جانے کے اخراجات کے بعد ان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا اس لیے وہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کے منتظر تھے۔ ان کو دو دن بعد آنے والی پہلی کو تنخواہ مل جاتی۔ سیلی کو کچھ نئے کپڑوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ زیادہ بے تابی سے تنخواہ والے دن کی منتظر تھی۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو سیلی بھی بات کر رہی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک گئے۔ رات کے اس وقت کوئی نہیں آتا تھا۔ یہاں ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا کچھ کارکنوں سے اچھے تعلقات تھے تو ان سے بھی میس میں ملاقات ہو جاتی تھی۔

”کون ہے؟“ ماریونے پوچھا۔

”سپروائزر آتے ہیں۔“ باہر سے آواز آئی۔ آتے ہیں ان کا سپروائزر تھا ماریونے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

”تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہے؟“

”اس وقت؟“ ماریونے بولا۔ ”کیا کوئی کام ہے؟“
”نہیں تمہیں جناب بین جوائے نے طلب کیا ہے۔“ ماریونے کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ”جناب بین

جوائے نے؟“

”تو اور کیا کہہ رہا ہوں۔“ آئز مین نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”خود اچلو وہ انتظار کرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔“

”ایک منٹ جناب میں اپنی بیوی کو کہتا ہوں۔“ ماریٹو کہہ کر اندر آیا اور اس نے سیلی کو بتانا چاہا لیکن وہ پہلے ہی سن چکی تھی۔ ماریٹو نے کہا۔ ”تیار ہو جاؤ۔“

دونوں میاں بیوی اس طلی پر پریشان ہو گئے تھے۔ ان کے دل میں خدشہ آیا تھا کہ شاید ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جس کی پاداش میں ان کی طلی ہو رہی ہے۔ آئز مین گاڑی میں آیا تھا راستے میں ماریٹو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جو ہمیں بلایا گیا ہے؟“

آئز مین ہنسا۔ ”یہ تو میں بھی نہیں جانتا لیکن جہاں تک کسی غلطی پر جواب طلی ہے تو یہ جناب بین جوائے کا کام نہیں ہے۔“

یہ بات سیلی اور ماریٹو بھی سمجھ رہے تھے اس کے باوجود وہ سب سے ہوئے تھے۔ اگر ان کو ملازمت سے نکال دیا جاتا تو اتنی اچھی ملازمت دوبارہ نہیں ملتی۔ کام تو مل جاتا لیکن اس میں نہ تو اتنی اچھی تنخواہ ہوتی اور نہ ان کو رہائش اور کھانے کی سہولت ملتی۔ آئز مین نے ان کو کل کے دروازے پر موجود ایک سوٹ پوش جوان آدمی کے سپرد کیا اور وہ ایک ویران اور خاموش راستے سے گزار کر کل کے اندر لے آیا اور کئی طویل راہداریوں سے گزر کر وہ ایک ہال نما جگہ پہنچے جہاں کئی افراد ڈاکٹروں والے لباس میں موجود تھے۔ وہاں ڈاکٹر روزا بھی تھا وہ ان کے پاس آیا۔ ”مسٹر اور مسز نے میرے ساتھ آؤ۔“

وہ ان کو ایک چھوٹے سے کیمین میں لے گیا۔ یہ ڈاکٹر روزا کا دفتر تھا۔ اس نے ان کو بٹھایا اور نرم لہجے میں سمجھانے لگا کہ ان کے کچھ ٹیسٹ ہوں گے اس کے بعد ان کو بین جوائے کی طرف سے ایک پیش کش ہوگی اور اگر انہوں نے یہ پیش کش قبول کر لی تو ان کے سارے ولدردور ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر روزا کی اس پیش کش میں تھی۔ لیکن بعض الفاظ پر وہ لڑکھڑا جاتا تھا۔ بہر حال سیلی اور ماریٹو اتنا سمجھ گئے تھے کہ بین جوائے ان سے کوئی کام لیتا چاہتا تھا اور اس کے بدلے ان کو بہت بڑی دولت مل جاتی۔ وہ دولت کے لیے تو یہاں آئے تھے اور ڈاکٹر روزا کے الفاظ پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ خوش ہو گئے۔ سیلی نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہمارے کس قسم کے ٹیسٹ ہوں گے۔“

”یہ تم کل دیکھ لو گے لیکن کیا یہ بات چینی ہے کہ تم ایسی امید سے نہیں ہوئیں؟“

”ایک بار بھی نہیں۔“ سیلی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ڈاکٹر روزا نے یہ سوال پہلے ہی کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے امید سے ہونے یا نہ ہونے سے ان لوگوں کو کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر روزا ان کو ہال میں لے کر آیا جہاں ایک شخص نے ان کو دو دو انجکشن دیئے اور پھر کچھ دوائیاں کھانے کو دیں اور پھر ان کو آرام کرنے کے لیے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ دوائیوں میں شاید کوئی نیند کی دوا بھی تھی کیونکہ ان کو لیٹنے ہی نیند آگئی تھی جب کہ اس سنسنی میں اتنی آسانی سے نیند نہیں آتی۔ جو اس وقت وہ محسوس کر رہے تھے۔ صبح ان کو بیدار کیا گیا تھا کیونکہ ان کے ٹیسٹ صبح سویرے نہار منہ ہونا تھا۔ ان کے خون کا نمونہ لیا گیا اور پھر ان کو کئی مینٹین کی مدد سے چپک کیا گیا۔ ڈاکٹر روزا سیلی کو الگ حصے میں لے گیا اور اس کو مخصوص معائنہ کیا۔ اس کام میں بھی اس نے مینٹین استعمال کی تھیں۔ یہ تمام ٹیسٹ اور چپک اپ کو کئی تین گھنٹے تک جاری رہے تھے۔ اس کے بعد ان کو بھرپور ناشائستہ کر دیا گیا۔ جس وقت وہ ناشائستہ کر رہے تھے۔ اس حصے کے ایک کمرے میں ڈاکٹر روزا بین جوائے اور نوری سے بات کر رہا تھا۔

”عورت مکمل طور پر فٹ ہے شی ازاے پاورفل دو ہیں لیکن اس کے شوہر کے ساتھ مسئلہ ہے۔ بلڈ پورٹ کے مطابق اس میں مخصوص ہارمون کی کمی ہے اور شاید اسی وجہ سے وہ اب تک ماں باپ نہیں بن سکے ہیں۔“

نوری کسی قدر بے چین تھی اس نے کہا۔ ”کیا یہ عورت مان جائے گی؟“

”یہ تو آپ پر ہے۔“ ڈاکٹر روزا نے محتاط انداز میں کہا۔ ”معلومات اسی وقت آگے بڑھیں گے جب وہ مان جائے گی۔“

بین جوائے بھی مضطرب تھا۔ اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میری طرف سے تم ان سے بات کرو؟“

”میں۔“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”میں کیسے بات کر سکتا ہوں جناب؟“

”کر سکتے ہو میری طرف سے تم ان کو کوئی بھی مالی پیش کش کر سکتے ہو اور ان کی وہ تمام شرائط بھی مجھے قبول ہوں گی جو میرے بس میں ہیں۔“

ڈاکٹر روزا ہچکچایا لیکن پھر مان گیا کیونکہ اگر یہ کام انجام پذیر ہوتا تو اسے بھی انعام میں بہت بڑی رقم ملتی جو اس کے معاوضے کے علاوہ ہوتی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”میں ان سے بات کرتا ہوں۔“

”صرف بات مت کرو بلکہ ان کو راضی کرو۔“ تین جوائے کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا تھا۔ ”تم جانتے ہو یہ تمہارے لیے بھی بہت ضروری ہے۔“

ڈاکٹر روزا اس کی بات کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ وہ ہال میں واپس آیا جہاں سیلی اور ماریونو کرسیوں پر پاس پاس بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی سیلی نے کہا۔ ”ڈاکٹر تم نے بتایا نہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”مصر.... مصر۔“ اس نے جواب دیا اور ان کو اپنے دفتر والے کیمین میں لے آیا یہاں ان کی بات کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ ان کو بٹھا کر ڈاکٹر روزا نے پہلے تمہید باندھی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ممکن ہے میں تم سے جو کام لینا چاہتا ہوں وہ تمہارے لیے پسندیدہ نہ ہو لیکن اس دنیا میں سب کچھ تو انسان کی پسند سے نہیں ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کے بدلے مل کیا رہا ہے؟“

”ڈاکٹر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ ماریونو بولا۔ ”ہم اب تک کچھ نہیں سمجھ سکے ہیں۔“

”میں سمجھا رہا ہوں لیکن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میں جو کہوں اس پر غور ضرور کرنا۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر روزا آہستہ آہستہ ان کو بتانے لگا کہ تین جوائے ان سے کیا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی حیرت بھرے انداز میں سن رہے تھے خاص طور سے سیلی کی تو آنکھیں ہی پھیل گئی تھیں کیونکہ اصل مطالبہ اسی سے تھا البتہ یہ ان دونوں میاں بیوی کی اجازت سے مشروط تھا۔ ان کا پہلا رد عمل نہایت مخالفانہ تھا۔ ماریونو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔“

”اگر تمہارا مطلب ہے کہ سائنسی لحاظ سے تو یہ بالکل....“

”سائنس گئی بھاڑ میں۔“ ماریونو برہمی سے بولا۔ ”یہ ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔“

”دیکھو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ صرف ایک سال کی بات ہے۔“

”صرف ایک سال۔“ سیلی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”صرف ایک سال جو ہماری باقی ساری زندگی کو برباد کر دے گا۔“ وہ گھڑی ہو گئی۔ ”چلو ماریونو یہاں سے۔“

”ایک منٹ....“ ڈاکٹر روزا نے جلدی سے کہا اور ان کو کسی نہ کسی طرح پھر سے بیٹھنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ ”ابھی اصل بات تو ہوئی نہیں ہے۔ کیا تم سوچ سکتے ہو اس کے عوض تم کیا حاصل کر سکتے ہو۔ تم جو رقم مانگو گے میں جوائے تم کو دے گا تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔“

”ہمیں نہیں چاہیے۔“ ماریونو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس میں سیلی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ کوئی اس کے پاس نہیں آئے گا۔ اس کی عزت محفوظ ہوگی۔“

”یہ عزت محفوظ ہوگی۔“ سیلی نے زہریلے انداز میں بولی۔ ”کسی عورت کی بے عزتی صرف اس طرح تو نہیں ہوتی ہے جس طرح عام طور سے سمجھا جاتا ہے تمہاری تجویز بھی بے عزتی کے برابر ہے۔“

”ہمیں دولت نہیں چاہیے۔“ ماریونو نے کہا۔ ”ہم جو کما رہے ہیں اس سے مطمئن ہیں۔“

”جناب بین جوائے سے کہا جائے کہ وہ سیلی اور کو تلاش کریں۔“ سیلی نے کہا اور پھر کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر روزا سمجھ گیا تھا کہ کوئی ترغیب ان کو راضی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ان کے لباس اور گفتگو سے جان گیا تھا کہ ان کا تعلق معاشرے کے نہایت غریب طبقے سے تھا اور اسی وجہ سے اسے اُمیدگمی کہ وہ مان جائیں گے لیکن انہوں نے اس کی پیش کش سننے کی ذمہ داری نہیں لی تھی۔ اب اس کے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ ایک آخری حربہ دمکی کا باقی رہ گیا تھا۔ اس نے سرد لہجہ بھاتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتے ہو اس انکار کی تمہیں کیا قیمت ادا کرنی پڑ سکتی ہے؟“

☆☆☆

سیلی بستر پر لیٹی سسکیاں لے رہی تھی اور ماریونو اس کے برابر میں سر ہانے سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سیلی کے دینے کے انداز میں سیلی کے شانے پر تھا۔ کچھ دیر بعد سیلی نے جھپکی آواز میں کہا۔ ”مجھے مت چھو میں اس قابل نہیں ہوں۔“

ماریونو نے سرد آہ بھری۔ ”ہم دونوں ہی اس قابل نہیں رہے ہیں بلکہ تصور تو میرا ہے۔“

سیلی اٹھ بیٹھی۔ ”میں اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔“

”تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں اس ذمہ داری کو نہیں نبھا سکا۔“

”یہ بھی تو میری ذمہ داری ہے ہوا ہے۔“ سیلی کے لہجے میں اصرار تھا۔ ”مجھے بچانے کے لیے تم نے اپنی غیرت کی قربانی

دی۔“

مارینو آہستہ سے بولا۔ ”شاید ہم دونوں ہی کمزور ہو گئے تھے۔ جان بچانے کے لیے ان کی بات مان لی۔“

اس بات کو ایک مہینہ گزر چکا تھا جب ان کو بین جوئے کے محل میں لے جایا گیا تھا اور آج ڈاکٹر روزانے تصدیق کر دی تھی کہ سلی انمید سے ہو گئی تھی۔ وہ بدستور محل میں مقیم تھے اور ان کو یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ مجبوراً اس کام پر تیار ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بین جوئے نے ڈاکٹر روزانے کے توسط سے ان کو پیغام بھیجا تھا کہ ان کو اتنا دیا جائے گا کہ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔ سلی اور مارینو نے اس بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ محض مجبور تھے۔ جب سلی ڈاکٹر روزانے کے تجربات سے گزر رہی تھی تو اس نے مارینو کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ اب سلی کے پاس نہیں جائے گا۔ اسے چند روز تک سلی سے بالکل الگ رکھا گیا تھا اور جب محل کی تصدیق ہو گئی تو اسے سلی کے ساتھ ایک کمرے میں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ اس پر بھی وارننگ برقرار تھی کہ وہ سلی کے پاس نہیں جائے گا۔ کمرے میں کیرے لگے تھے اور اگر وہ اس ہدایت کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش کرتا تو ان کو پتا چل جاتا اس صورت میں مارینو کو کسی اور جگہ منتقل کر دیا جاتا جہاں وہ قید ہوتا۔ آج وہ کتنے دن بعد ایک ساتھ تھے۔ سلی نے سرگوشی میں کہا۔

”میں اس بچے کو پیدا کرنا نہیں چاہتی۔“

مارینو نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”یہ ہماری خواہش نہیں ہے اور نہ ہمارا بچہ ہے لیکن ہم اس معاملے میں بے بس ہیں۔“

”میں اس بچے کو پیدا نہیں کرنا چاہتی۔“ سلی نے پھر کہا۔

”اس کی ایک ہی صورت ہے ہم مر جائیں۔“

لیکن سلی مرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے اور مارینو کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی اس لیے ان بچوں کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی جنہیں پیدا کرنے کا اس نے خواب دیکھا تھا اس کے اور مارینو کے بچے۔ یہ بچہ نہیں جو اس کے پیٹ میں تھا اور اسے ابھی سے اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے پیٹ میں کوئی عفریت گھس آیا ہو۔ اس نے اس کے اور مارینو کے بچوں کا حق غضب کر لیا ہو۔ ڈاکٹر روزانے مارینو کو بتایا تھا کہ اس میں مخصوص ہارمون کی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کی

ماہنامہ سوسائٹی



ماہ تمبر کے

شمارے کی دل

فریب کہانیاں

اولین صفحات

جیکا کے ساحلوں میں سیاحت کے شوقین اور حبرم کے متوالوں کا سنگین ملاپ۔ تجسس سے بھرپور ایڈ ونچر

انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک جیمین کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلائی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت..... عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سرورق کے رنگ

روبینہ رشید اور سید شکیل کاظمی کی سرورق پر سنسنی خیز کہانیاں

ان کے علاوہ

منظرِ امام، تنویرِ ریاض، سلیم انور، ارشد بیگ، جمال دوستی، تمکین رضا اور عکس فاطمہ کی طبع زاد ترجمہ کہانیاں

چنی تکتہ چنی

آپ کے تمبرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتنا کس

رہ سکتی۔ میں مر جاؤں گی۔“
 ”اب ہم باہر نکلنے لگے ہیں تو میں موقع دیکھتا ہوں۔ شاید کوئی راستہ سمجھ میں آجائے۔“
 سیلی نے مگر انوں کی طرف دیکھا۔ ”یہ ہم پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔“

”کیونکہ ہم نے اب تک رویہ بھی ایسا ہی رکھا ہے۔“
 ماریونے سوچ کر کہا۔ ”اگر ہمیں یہاں سے نجات حاصل کرنی ہے تو ہمیں اپنے رویے میں بھی تبدیلی لانی ہوگی۔“

اگرچہ یہ کام مشکل تھا کیونکہ سیلی اور ماریون دونوں ہی سادہ فطرت انسان تھے جن کو زیادہ اداکاری نہیں آتی تھی۔ پھر بھی انہوں نے خود پر جبر کر کے ایسا ظاہر کرنا شروع کر دیا جیسے وہ اب خوش ہیں اور ان کو اس تجربے پر پہلے جیسا اعتراض نہیں رہا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ انہیں ملنے والی رقم نے نرم کیا ہے ماریونے ڈاکٹر روزا سے پوچھا۔
 ”بین جوائے ہمیں کیا دے گا؟“

”جو تم چاہو۔“ ڈاکٹر روزا خوش ہو کر بولا کیونکہ اب تک وہ ان پر اور خود پر کرتا رہا تھا وہ ایک ڈاکٹر تھا جو انسانوں کی خدمت کرنے کا حلف اٹھا کر اس مقام تک آیا۔ یہ کام کرتے ہوئے اسے کوفت ہو رہی تھی اس لیے جب اس نے ماریون اور سیلی کے رویے میں تبدیلی دیکھی تو خوش ہو گیا تھا۔

”یہ ہمیں کس طرح ملے گا؟“
 ”بچے کی پیدائش کے فوراً بعد.... دنیا میں جہاں کہو اور جس کرکسی میں کھول جائے گا۔“
 چند دن بعد سیلی نے ڈاکٹر روزا سے کہا۔ ”کیا ہم اس محل کے علاوہ کہیں اور نہیں رہ سکتے۔“
 ”یہاں کیا مسئلہ ہے؟“

”یہاں مجھے ٹھن ہوتی ہے جبر کا احساس ہوتا ہے۔“
 ”میں بین جوائے سے بات کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ اس نے بین جوائے سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے کہا۔ ”اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“
 ”میرا خیال ہے اگر ایسا ہو جائے تو یہ میاں بیوی دینی دباؤ سے نکل جائیں گے اور بعد میں بھی آپ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

مستقبل کا خیال بین جوائے کو بھی پریشان کر رہا تھا بچے کی پیدائش کے بعد تو اسے ان دونوں کو چھوڑنا پڑے گا اور اس وقت نہ جانے ان کا کیا رد عمل ہو۔ اس لیے اس نے

اولاد پیدا ہونے کا امکان بہت کم تھا۔ لیکن ماریون اور سیلی کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ ان کے خیال میں ڈاکٹر روزا اپنے مفاد کی خاطر ان سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے ماریون سے کہا کہ وہ چاہے تو وہ اس کا علاج کر سکتا ہے۔ وہ اس چیز کا ماہر ہے لیکن ماریون نے انکار کر دیا تھا۔ انہیں ڈاکٹر روزا پر اعتماد نہیں تھا۔ حمل کی تصدیق ہو جانے کے بعد اس نے سیلی کو احتیاطیں بتائی تھیں،
 ”اب تم دونوں کو بچے کی پیدائش تک یہیں رہنا ہو گا۔“

”اس کٹھ ہوئے ہال اور کمرے میں؟“ سیلی نے کہا۔

”نہیں تم لوگ جاہو تو باہر کھلی فضا میں بھی جا سکتے ہو اور جاہو تو محل میں کسی اور جگہ بھی ٹھنل کیا جا سکتا ہے۔“
 انہوں نے کسی اور جگہ جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن باہر کھلی فضا میں کھونسنے والی پیش کش قبول کر لی تھی۔ یہاں کئی خجریات کے بعد ان کو پتا چل گیا تھا کہ وہ مستقل نہ صرف کیمروں کی زد میں رہتے ہیں بلکہ ان کی باتیں بھی سنی جاتی ہیں گویا وہ مکمل طور پر ان کی نظر اور سماعت میں تھے۔ باہر جانے کی صورت میں وہ ایک تو تازہ ہوا اور دھوپ حاصل کر سکتے تھے۔ دوسرے وہ آپس میں کھل کر بات کر سکتے تھے۔ ان کو باہر جانے کی اجازت مزید دو دن بعد ملی تھی جب ڈاکٹر روزا نے سیلی کے مزید ٹیسٹ مکمل کر لیے تھے۔ اس دوران میں اس کے لیے ایک عورت فروز آئی تھی جس کا کام دن بھر میں سیلی کو مختلف انکسرسائز اور حرکات کرانا تھا تا کہ وہ جسمانی طور پر فٹ رہے اور اس کے وجود میں پلنے والا بچہ بھی صحت مندر ہے۔ جس دن وہ باہر نکلے تو ان سے ساتھ دو نگران بھی تھے لیکن وہ ان سے دور رہے تھے۔ محل کا سبزہ زار ناقابل بیان حد تک خوب صورت تھا۔ مگر ان دونوں کے نزدیک اس جگہ کی حیثیت ایک خوب صورت قید خانے سے زیادہ نہیں تھی۔ اور قید خانہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو آدمی وہاں سے رہائی کے خواب دیکھتا ہے۔ سیلی نے بھی موقع ملتے ہی یہ بات کی تھی۔

”ماریون کیا ہم یہاں سے جانیں سکتے ہیں؟“
 ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں ہم کوشش کر سکتے ہیں۔“
 اس نے سوچ کر کہا۔ ”لیکن ناکام رہے تو یہ شاید ہمیں الگ الگ کر دیں۔“
 ”سیلی کانپ گئی تھی۔“ ”میں تم سے الگ نہیں

خو سیلی کا خیال رکھتا تھا۔ ان تین افراد کے علاوہ ایک بارچی تھا اور ایک دوسرے کاموں کے لیے مخصوص شخص تھا۔ سرہاؤس کے گیٹ پر دو مسلح گارڈز کی ڈیوٹی ہوتی تھی لیکن ان کا سرہاؤس سے تعلق نہیں تھا وہ باہر سے آتے تھے اور دوسرے گارڈز کے آنے پر ڈیوٹی ان کے حوالے کر کے چلے جاتے تھے ان کا کھانا پینا بھی باہر سے آتا۔

سرہاؤس سے نکلنے کے لیے صرف یہی ایک گیٹ تھا اس کے علاوہ چاروں طرف دیواریں بلند دیوار تھیں جس پر ڈیزائن والی خاردار باڑھ بھی لگی تھی۔ گویا تین جوانے نے یہاں بھی خیال رکھا تھا کہ سیلی اور ماریونہیں فرار نہ ہو جائیں۔ عقب میں تقریباً دیوار جیسی سیدھی ڈھلان تھی جس پر اترا خودکشی کے مترادف تھا۔ لیکن تین جوانے ایک بات بھول گیا تھا کہ انسان کو قید کیا جاسکتا ہے اس کی فطرت کو قید نہیں کیا جاسکتا ہے یہ فطرت ہے جو آگ کا دریا بھی پار کر جاتی ہے اور ناممکن کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

وقت گزرتا رہا جیسے مینے میں سیلی کا بیٹ نمایاں ہونے لگا تھا اور اسے چلنے پھرنے میں کسی قدر وقت ہوتی تھی اس کے باوجود وہ ہر شام کو سرہاؤس کے اوپری ٹیرس میں ضرور جاتی تھی کیونکہ ایک بار ڈاکٹر روزا نے اسے بتایا تھا کہ سامنے نظر آنے والی پہاڑیوں کے پاس اس کا ملک بولیویا تھا۔ یعنی وہ بولیویا کے سرحد کے پاس کہیں تھے۔ تب سے سیلی ہر روز اوپر ٹیرس پر آکر ان پہاڑوں کی طرف حسرت سے دیکھتی تھی۔ اسے لگتا جیسے وہ ایک بہت بڑے قید خانے میں آگئی ہو اور اس کی آزادی ان پہاڑوں کے پانچویں لیکن وہاں تک جانا ناممکن تھا۔ کم سے کم اس حالت میں شروع میں ان کو فرار کا خیال آتا تھا لیکن جب وقت گزرتا گیا اور بچے نے اس کے وجود میں اپنی جڑ مضبوط کر لی تو ان کے لیے فرار بھی ممکن نہیں رہا تھا اب اسے بچے کو جنم دینا ہی تھا۔ اس کے بعد ہی اسے چھکارا مل سکتا تھا۔ اس لیے فرار کا خیال رفتہ رفتہ ان کے ذہن سے محو ہوتا چلا گیا تھا۔

چھ مہینے بعد سیلی اکثر سوچ میں گم نظر آتی تھی۔ مارچ پوچھتا تو وہ ٹال جاتی تھی۔ کبھی کبھی راتوں میں مارچ کی سسکیاں سنائی دیتی تھیں جیسے اس کے دل پر کوئی بوجھ لیکن جیسے ہی مارچ حرکت کرتا یا اسے آواز دیتا تو وہ ہوا جاتی اور سوٹی بن جاتی تھی۔ ماریونہیں یہاں کیوں روٹی تھی۔ ایک رات ماریونہ کی آواز آئی۔ ماریونہیں تھی۔ ماریونہ نے اسے سرہاؤس میں لے لیا۔

اجازت دے دی۔ یہاں سے کچھ دور ایک بلند پہاڑی مقام پر اس کا ایک چھوٹا سا دھلا تھا۔ جب یہاں گری زیادہ ہوتی تھی تو وہ ٹوری کے ساتھ وہاں بھی چلا جاتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ان دونوں کو ڈاکٹر روزا اور اس کے عملے کے ساتھ وہاں منتقل کر دے گا۔ اس طرح سیلی اور ماریونہ بھی خوش ہو جائیں گے۔ ابھی تک اس کا ان سے سامنا نہیں ہوا تھا اس کے باوجود ایک ہی جگہ رہنے کا احساس دونوں طرف سے حاوی رہتا تھا۔ الگ جگہ چلے جانا دونوں کے حق میں بہتر تھا۔ ٹوری تو مستقل ریوڈی جنر وچل گئی تھی تین جوانے کا بھی زیادہ وقت جوئے فارمز سے دور گزرتا تھا۔ لیکن یہ بات سیلی اور ماریونہ کو نہیں معلوم ہوتی تھی۔

”ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ تین مہینے ہونے میں کتنا وقت ہے اور یہ میاں بیوی کوئی گریڈ تو نہیں کریں گے؟“

”ابھی ایک مہینہ باقی ہے۔“ ڈاکٹر روزا نے جواب دیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے انہوں نے صورت حال کو کافی طور پر قبول کرنا شروع کر دیا ہے۔ دولت کی کشش بھی ان کو مجبور کر رہی ہے میرا خیال ہے بچے کی پیدائش تک وہ بالکل راضی ہو جائیں گے اور جب آپ ان کو بہت بڑی رقم دیں گے تو ان کی رہی سہی تکلیف بھی ختم ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے تین مہینے مکمل ہونے پر ان کو ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے اس دوران میں تم وہاں بھی دیکھ بھال کے تمام انتظامات کر لو۔“

ایک مہینے کے دوران میں ڈاکٹر روزا نے تین جوانے کے سرہاؤس میں تمام انتظامات کر لیے تھے اس نے سیلی اور ماریونہ کو بھی بتا دیا تھا کہ ان کو ایک مہینے کے اندر ایک اور جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ ایک مہینے بعد ان کو سرہاؤس منتقل کر دیا گیا تھا یہ دو منزلہ لکڑی کا بنا ہوا سرہاؤس تھا۔ جو پہاڑی پر سب سے بلند جگہ تھا۔ یہاں موسم گرمیوں میں بھی خوشگوار ہوتا تھا اور رات کو کسی قدر سردی ہو جاتی تھی۔ سیلی اور ماریونہ کو ماسٹر بیڈ روم دیا گیا تھا۔ یہاں آکر سیلی اور ماریونہ کو کچ بچ آزادی کا احساس ہوا تھا۔ یہاں وہ ٹھکن نہیں تھی جو وہ فارمز والے محل میں محسوس کرتے تھے۔ یہاں ڈاکٹر روزا اور اس کے دو معاونین تھے باقی افراد کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ اتنے افراد میں صرف ڈاکٹر روزا ہی تین جوانے کے راز سے واقف تھا باقی افراد کو اس تجربے کے بارے میں کچھ۔۔۔ معلوم نہیں تھا۔ اب سیلی کو فریو تھراپسٹ کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ڈاکٹر روزا

اندر نہیں تھی پھر اسے اوپر تیرس کا خیال آیا۔ سلی وہاں موجود تھی۔ وہ ساکت کھڑی دور مغرب میں تاریک پہاڑوں کو گھور رہی تھی۔ ماریونے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
 ”سلی کیا بات ہے تم مجھ سے ہر بات کر سکتی ہو۔“
 سلی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم میری بات سنو اور مانو گے؟“

”ہاں کیونکہ تم میری بیوی ہو۔“ ماریونے ٹھوس انداز میں کہا۔

”میں یہ بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ کسی قیمت پر بھی نہیں دوں گی۔ کیا تم مجھے اور میرے بچے کو یہاں سے نکال کر لے جاسکتے ہو؟“

ماریونے ساکت ہو گیا پھر اس نے کہا۔ ”ہاں میں تمہیں لے جاسکتا ہوں یہاں سے۔“

☆☆☆

بین جوائے برازیل کے دارالحکومت برازیلیہ میں ایک سینما روم میں شرکت کرنے گیا ہوا تھا وہاں اسے اطلاع ملی تھی تو اس نے فوری طور پر اپنی مصروفیت منسوخ کی اور ذاتی جیٹ طیارے سے پورٹوویل ہو کی طرف روانہ ہو گیا۔ پانچ گھنٹے بعد وہ سر ہاؤس میں تھا جہاں ڈاکٹر روزا اور گیٹ گارڈز بدحواس موجود تھے۔ اس دوران میں بین جوائے کی ہدایت پر محل سے اس کے درجنوں آدمی یہاں پہنچ گئے تھے اور وہ پیدل، گاڑیوں اور ہیلی کاپٹرز کی مدد سے سلی اور ماریونے کو تلاش کر رہے تھے جو سر ہاؤس سے رات کسی وقت نکل گئے تھے۔ یہاں کیمرے اور بانگ نہیں تھے اس لیے ڈاکٹر روزا یا کسی کو بھی صبح سے پہلے معلوم نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر روزا اور خود بین جوائے مطمئن تھا کہ معاملات ان کی مرضی کے مطابق جا رہے ہیں اور وہ اپنے حفاظتی انتظامات سے بھی مطمئن تھا۔ اس کے باوجود جب ڈاکٹر روزا صبح سات بجے سلی کو جگانے آیا۔ وہ ناشتے سے پہلے اسے کچھ مخصوص ورڈشیں کراتا تھا تو وہ اور ماریونے اپنے گمرے میں نہیں تھے۔ اس نے فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود گارڈز کو چیک کیا لیکن وہ ڈیوٹی پر تھے اور انہوں نے انکار کیا کہ سلی اور ماریونے گیٹ سے نکل کر گئے ہیں۔ دیواریں پھلانگنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے بین جوائے کو کال کر کے اطلاع دی اور ایک گھنٹے میں محل سے اس کے آدمی آگئے تھے اور اب وہ باریک بینی سے سر ہاؤس کا جائزہ لے رہے تھے کہ سلی اور ماریونے کیسے نکلے۔ اس کے ساتھ پہاڑوں پر ان

کی تلاش شروع کر دی گئی تھی۔
 ”وہ کیسے نکلے؟“ بین جوائے نے ڈاکٹر روزا سے پوچھا۔

”اس بارے میں آپ کا سیکورٹی انچارج بتا سکے گا اس نے پتا کیا ہے۔“ ڈاکٹر روزا نے جواب دیا۔ بین جوائے نے سیکورٹی انچارج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے کہا۔

”وہ دونوں بیس منٹ میں موجود سیوریج کے پائپ کی مدد سے نکلے ہیں۔ پائپ چار سو فٹ نیچے نکلا ہے انہوں نے کہیں سے رسی حاصل کر لی تھی اور اس کی مدد سے نیچے اترے ہیں۔“

”ایک سات مہینے کی حاملہ عورت دو فٹ قطر کے پائپ سے نکل گئی وہ بھی چار سو فٹ نیچے۔“ بین جوائے کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آزادی کے لیے انسان سب کر سکتا ہے جناب۔“ ڈاکٹر روزا نے کہا نہ جانے کیوں اسے اندر سے اس بات کی خوشی ہو رہی تھی۔

”ڈاکٹر یہ تمہاری ذمہ داری تھی۔“ بین جوائے بولا۔

”نہیں جناب ان کی نگرانی اور سیکورٹی میری ذمہ داری نہیں تھی میری جو ذمہ داری تھی وہ میں نے پوری کی ہے۔“

بین جوائے اس دن وہیں رہا اور تلاش کے کام کی نگرانی کرتا رہا۔ اس نے پولیس کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ مقامی پولیس ایک طرح سے اس کی ذاتی ملازم تھی۔ انہوں نے بین جوائے کے آدمیوں کے ساتھ مل کر پہاڑوں کا ایک ایک حصہ چھان مارا تھا اور سرحد تک دیکھا تھا لیکن سلی اور ماریونے کا کہیں سراغ نہیں ملا تھا۔ دو دن بعد بین جوائے نے تسلیم کر لیا کہ وہ دونوں سرحد عبور کر کے بولیویا جا چکے تھے۔ بین جوائے کا اثر برازیل تک ہی نہیں تھا بلکہ اس کے رابطے بولیویا میں بھی تھے اس نے اپنے جاننے والوں سے رابطہ کر کے ان سے کہا کہ وہ بولیویا میں اس علاقے میں سلی اور ماریونے کو تلاش کریں جہاں وہ آ پائی رہتے آئے تھے۔

بین جوائے کے رابطہ کاروں نے سلی اور ماریونے کے علاقے میں دیکھا دونوں کے خاندانوں سے بھی تفتیش کی اور مقامی پولیس کی مدد بھی حاصل کی لیکن سلی اور ماریونے وہاں بھی نہیں آئے تھے۔ ایک مہینے بعد بین جوائے ناکام اور

نامراد واپس ریوڑی جینر ولوٹ گیا تھا جہاں نوری اس کی منتظر تھی اس نے بین جو اسے پہلا سوال پہنچے کے بارے میں کیا تھا۔

”وہ نہیں مل سکے۔“ بین جو اسے نے جھکے انداز میں کہا تو نوری نے اس کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

”ذیل شخص میں اسی وجہ سے اس کردہ تجربے کا حصہ بننے پر تیار ہوئی تھی کہ تمہاری خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور مجھے پکڑ جائے گا اور اب تم کہہ رہے ہو وہ بچے لے کر غائب ہیں۔“

بین جو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”بکو اس مت کرو.... تمہیں بچہ چاہیے ہی نہیں تھا یہ تو بس میری خواہش تھی اور میں نے اسے حاصل کرنا چاہا تھا۔“

”لیکن اب تم نے اسے گواہ کیا ہے۔“ نوری تلخ انداز میں بولی۔

”میں مایوس نہیں ہوں میں ان کو تلاش کروا رہا ہوں اور اگر وہ نہ ملے تو میں دوبارہ....“

اس بار نوری نے اسے چھڑ مارا تھا۔ ”تم میرے اندازے سے بھی زیادہ گھٹیا شخص نکلے۔ تمہیں اس بچے کی کوئی پروا نہیں ہے جو ہمارا ہے تمہیں صرف اپنے کاروبار کے لیے ایک وارث چاہیے۔“

”ہاں مجھے ایک وارث چاہیے۔“ بین جو اسے بولا۔ ”اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔“

”تب تم وارث حاصل کرتے رہو۔“ نوری بولی۔ ”لیکن اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی اور نہ ہی تم مجھے استعمال کر سکتے ہو۔“

”ایک منٹ نوری میری بات سنو....“ بین جو اسے نے اسے روکنا چاہا لیکن نوری اس کی بات سننے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ پھر وہ اس کے گھر اور زندگی سے بھی نکل گئی تھی۔ اس نے بین جو اسے سے کہا۔

”اگر تم چاہتے ہو کہ میری زبان بند رہے تو شرافت سے طعنے کی کا معاملہ ملے کر لو میں اب تم سے بات نہیں کرنا چاہتی میرا وکیل رابطہ کرے گا اور یاد رکھنا اگر بات کو رٹ تک گئی تو میری زبان بند نہیں رہے گی۔“

بین جو اسے لوگ رہا تھا کہ ایک ایک کر کے اس کا سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا وہ مجبور تھا اگر انکار کرتا تو نوری اس کا راز فاش کر دیتی۔ چھ مہینے کی تلاش کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ سیلی اور ماریو اس کی پہنچ سے دور نکل

گئے تھے اس نے بچے کی پیدائش کے متوقع دنوں میں بولیو یا کے تمام اسپتالوں کو چھٹی چیک کر لیا تھا کہ شاید سیلی کہیں داخل ہو لیکن اس کی یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی کسی ایسی جگہ چلے گئے تھے جو اس کی سوچ سے بھی باہر تھی۔ نوری نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ اپنا وارث حاصل کرنے کے چکر میں وہ اپنی بیوی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

نوری کے بعد اس نے ایک عام عورت سے شادی کی جسے بچہ پیدا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اس بار قدرت کی طرف سے اولاد اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر ڈاکٹر روزا کی خدمات حاصل کیں۔ اس نے بھی اپنی سی ہر ممکن کوشش کر لی۔ مارشادو بار امید سے ہوئی لیکن ہر بار بچہ ضائع ہو گیا۔ تیسری بار وہ ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد بین جو اسے نے ہار مان لی تھی۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ اولاد اس کے مقدر میں ہے اور جو اولاد اس کی تھی وہ اس کے مقدر میں نہیں ہے۔

وقت گزرتا رہا بین جو اسے دنیاوی لحاظ سے ترقی کر رہا تھا اس کی دولت دن بدن بڑھ رہی تھی۔ مگر اولاد اور وارث سے محرومی اس کی زندگی کا سب سے بڑا آزار بن گئی تھی۔ چند سال بعد مارشادو نے بھی اس سے طلاق لے لی تھی اور اس نے طلاق اس وجہ سے لی تھی کہ بین جو اسے بچہ نہیں دے سکا تھا جب کہ اسے بچے کی خواہش تھی۔ مارشادو نے دوسری شادی کی اور اس کے کئی بچے ہوئے تھے۔ اس سے الگ ہونے کے بعد بین جو اسے نے پھر شادی نہیں کی تھی۔ اس کی عمر بھی ساٹھ سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اور اب اس کی عمر ستر سے زیادہ ہو چکی تھی۔

سیلی اور ماریو کا خیال اس کے ذہن سے نکلا نہیں تھا اس نے ایک جاسوس ایجنسی کی خدمات مستقل بنیادوں پر حاصل کر رکھی تھی۔ وہ سیلی اور ماریو کو تلاش کر رہی تھی۔ ایجنسی کی جانب سے ہر مہینے ایک لفافہ آتا تھا اور اس میں صرف ناکا کی کی اطلاع ہوتی تھی۔ بین جو اسے لفافے کو برقی ڈسٹ بن میں ڈال کر جلا دیتا تھا۔ یہ اس کا راز تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ غلطی سے بھی فاش ہو جائے۔ ایجنسی کے مالک کارلوں بیانے کئی بار اس کیس سے دست بردار ہونے کا ارادہ کیا لیکن بین جو اسے نے ہر بار اسے روک دیا۔ ”تم اپنا کام کرتے رہو۔“

ایک مہینہ پہلے کارلوں لفافے کے بجائے نو اس

سے ملنے آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب اس کیس کا باب بند کر دیا جائے لیکن بین جو اے نے پھر انکار کر دیا۔ ”جب تک میں زندہ ہوں تم یہ کام جاری رکھو گے۔“

”ایک سوال ہے جناب۔“ کارلوس نے کہا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ لوگ بولیویا میں ہوں گے؟“

”ہاں تو اور کہاں جاسکتے ہیں؟“

”بعض اوقات جب انسان نے کسی سے چھپنا ہو تو وہ اس سے دور جانے کے بجائے پاس چھپنے کو بھی ترجیح دیتا ہے جب کہ چھپنا آسان ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”بولیویا ایک ہمسامہ اور چھوٹا ملک ہے اس کے مقابلے میں برازیل ایک بڑا اور ترقی یافتہ ملک ہے یہاں کسی کے چھپنے کے مواقع زیادہ ہیں بشرط کہ تلاش کرنے والے کا ذہن اس طرف نہ جائے۔“

بین جو اے نے تعجب سے کہا۔ ”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے۔“

”بعض اوقات دور کی سوچتا ہے اور پاس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔“ کارلوس جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ”ایک مہینے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔“

لیکن ایک مہینے کے بجائے اس کی طرف سے دو ہفتے بعد ہی اتفاقاً آگیا اور بین جو اے اس خلاف معمول لفافے کو دیکھ کر ہی جان گیا تھا کہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ لفافے میں ایک چھوٹا سا رقعہ تھا جس پر شاہی برازیل کے ایک چھوٹے سے قصبے کا پتا تھا۔ دو گھنٹے بعد ہی بین جو اے کا جیٹ طیارہ اسے لے کر شاہی برازیل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سیلی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں دھلے کپڑے سوکنے کے لیے ٹانگ رہی تھی۔ سڑک کے پار کھیل کے میدان میں کچھ لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک سنہری بالوں اور گوری رنگت والا نوجوان بھی تھا۔ وہ بڑی مہارت سے فٹ بال کو دونوں پیروں سے باری باری اچھال رہا تھا اور اسے زمین پر کرنے سے روک رہا تھا۔ جب تک سیلی کپڑے لٹکانی رہی نوجوان نے فٹ بال کو گرنے نہیں دیا تھا۔ وہ مسکراتی اور خالی ٹوکرا لے کر اندر جانے کے لیے مڑی تھی کہ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹی کار آ کر رکی۔ سیلی نے توجہ نہیں دی تھی لیکن جب اس سے

ایک سفید بالوں والا بوڑھا آدمی اترا تو وہ ساکت رہ گئی تھی۔ اس نے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی وہ بین جو اے تھا۔ وہ ہر روز ہی کہیں نہ کہیں اسے ٹی وی پر دیکھتے تھے۔ شروع میں وہ ان کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا جو راتوں میں آکر ان کو چکا دیتا تھا اس کے خوف سے وہ سالوں سے رہے تھے۔ مگر سے نکلنے ہوئے ڈرتے تھے کہ ان کو تلاش نہ کر لیا جائے۔ پھر رفتہ رفتہ خوف کم ہوتا گیا۔ ان کے پہلے بچے نے جنم لیا جو اصل میں ان کا نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی ان کا بچہ تھا دونوں نے اس سے اسی طرح ٹوٹ کر محبت کی تھی جیسے وہ اپنے بچے سے کرتے۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ اسی طرح پامل ہو جاتے تھے جیسے انسان اپنے بچے کے لیے ہوتا ہے۔

جب جوزینو تین سال کا ہوا تو سیلی پھر اُمید سے ہو گئی۔ وہ اور ماریونو خوشی سے پاگل ہو گئے تھے کیونکہ ڈاکٹر روزا کی بات ان کے ذہن میں تھی اور ان کو لگتا تھا کہ وہ کبھی ماں باپ نہیں بنیں گے۔ اس لیے اس کی پیش گوئی غلط ثابت ہونے پر وہ خوش تھے۔ اس بار بھی بیٹا ہوا تھا۔ وہ پہلے بچے کے برعکس ان پر گیا تھا۔ پھر دو بیٹیاں ہوئیں اور یہ تھی ان کی طرح سیاہ بال اور سونارا رنگ لیے ہوئے تھیں۔ مگر یہ تعجب کی بات نہیں تھی مگر میں ایک آدھ بچہ اپنے ماں باپ سے مختلف ہوتا ہے۔

جب وہ سرباؤس سے نکل کر یہاں آئے تو شروع میں ان کو بہت دشواری اور تنگ دتی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سیلی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی کام کر سکتی اور سارا بوجھ ماریونو پر تھا پھر وہ غیر قانونی تارکد وطن تھے ان کے پاس کاغذات بھی نہیں تھے۔ اس لیے ماریونو کو ملازمت ملنے میں بہت دشواری ہوئی تھی کبھی کام ملتا اور کبھی نہیں۔ ان کو اکثر فاقے بھی کرنا پڑتے تھے۔ پھر جوزینو کی پیدائش پر سیلی کو اسپتال لے جانا پڑا اور ان کا راز کھل گیا۔ بہر حال بچے کی وجہ سے ان کو برازیل کی شہریت بھی مل گئی اور ماریونو کو کام بھی ملنے لگا۔ اس کے بعد حالات بہتر ہوتے چلے گئے۔ ماریونو نے سخت محنت کر کے کچھ رقم جمع کر کے اپنی زمین لے لی اور اب وہ اس پر کام کرتا تھا۔ وہ بہت خوشحال تو نہیں تھے لیکن اب ایک مناسب زندگی بسر کر رہے تھے۔ بین جو اے کا بھوت بھی ذہن کے کہناں خانوں میں جا چھپا تھا اور اب اس کا خیال بھی آتا تھا تو وہ خوف محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن اتنے سالوں بعد بین جو اے کو سامنے دیکھ کر سیلی

چٹوڑے

چٹوڑے گردے، مٹانے اور جگر کو قوت بخشنے ہیں۔ موسم سرما میں ان کا کھانا پیشاب کی زیادتی کو روکتا ہے۔ چٹوڑہ موسم سرما کے اثرات کو کم کرتا ہے اور جسم کو حرارت عطا کرتا ہے۔ چٹوڑے کھانے سے پہلے نہ کھائیں، کیونکہ اس طرح بھوک ختم ہو جاتی ہے اور کھانا نہیں کھایا جاتا۔ اس لیے انہیں ہمیشہ کھانے کے بعد کھائیں۔

تل

تل موسم سرما کی سوغات ہے۔ اسے کھانے سے سردی اثر نہیں کرتی۔ موسم سرما میں کمزور اور بوڑھے افراد کو پیشاب بار بار آتا ہے۔ اس طرح بعض بچے بھی رات کو سوتے ہوئے بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تل کے لٹو کھانا بہت مفید ہے۔ روزانہ تل کا ایک چمچ کھالینا صحت کے لیے مفید ہے۔

پیدا کرنے کی تکلیف برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔
”تم بلا وجہ اپنی توانائی ضائع کر رہے ہو۔“ سیلی بولی۔
”مجھے ڈاکٹر روز پہلے ہی یہ سب بتا چکا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ جوڑینو میری اولاد ہے۔“
”ایک معمولی سا ٹیٹ ثابت کر دے گا کہ وہ میری اولاد ہے۔“ بین جوئے لڑکے کا سر خوش نظر آنے لگا تھا۔
”ہاں لیکن کیا تم اس بات کا اعلان کر سکتے ہو؟“ سیلی نے اسے چیلنج دیا۔
”کیا تم سب کو بتا سکتے ہو کہ تم نے اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا کیا تھا۔“

بین جوئے جب ہو گیا تھا لیکن پھر اس کے تاثرات دوبارہ سخت ہو گئے۔ ”ٹھیک ہے اس میں میری بدنامی ہوگی اور ممکن ہے مجھے مجرم بھی قرار دیا جائے لیکن اپنی اولاد کو حاصل کرنے کے لیے میں سب برداشت کرنے کو تیار ہوں۔“
”تم نے مجھے جانور کی طرح استعمال کیا۔“ سیلی جذباتی ہو گئی۔
”ایسا تو مجرم بھی نہیں کرتے ہیں۔“
”جو ہوا میں اس پر شرمندہ ہوں۔“ بین جوئے نے کہا۔
”تم جس طرح چاہو میں اس کی خلافی کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے سیلی کا معمولی سا گھر دیکھا پھر اس نے کپڑے اور ان کا ساڑ دیکھا۔ اسے ہچا چل گیا کہ سیلی کے اور بچے بھی تھے۔ ”جس طرح سے بھی تم چاہو۔“

کے اندر موجود خوف باہر آ گیا تھا۔ بین جوئے نے کار سے اترتے ہی اسے دیکھا اور اس کی نظریں اسے کچھ دیر سیلی پر جمی رہی تھیں۔ بیس سالوں نے اس پر زیادہ اثر نہیں چھوڑا تھا وہ پہلے کی طرح مضبوط اور خوب صورت جسم کی مالک تھی۔ اس کا چہرہ جوانی جیسا تازہ نہیں رہا تھا لیکن اس پر جھریاں بھی نمودار نہیں ہوئی تھیں۔

بین جوئے نے لکڑی سے بنی دیوار میں لکڑی کا بتا ہوا دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔ ”ہیلو... کیسی ہو تم سیلی؟“
”تو تم نے ہمیں تلاش کر لیا؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”ہاں اور اس کام میں صرف دو ہفتے لگے۔“
”میرا تو خیال ہے بیس سال گزر چکے ہیں۔“
”بیس سال تک میں تم دونوں کو غلط مقام پر تلاش کر رہا تھا یہ خیال تو صرف دو ہفتے پہلے آیا کہ تم دونوں برازیل میں بھی ہو سکتے ہو۔“
سیلی اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ ماریون کا کام پر گیا ہوا تھا اور بچے اسکول گئے تھے۔ اب سیلی کو وہی حالات اور بین جوئے کا سامنا کرنا تھا اس نے ابتدائی خوف پر قابو پایا تھا اور تن کر بین جوئے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ ”ٹھیک ہے تم نے ہمیں تلاش کر لیا ہے لیکن تم کیا چاہتے ہو؟“
”تم جانتی ہو میں کیا چاہتا ہوں۔“ بین جوئے بولا۔
”میں اپنا وہ بچہ لینے آیا ہوں جو تمہارے پیٹ میں تھا جب تم اور ماریون فرار ہوئے تھے۔“
”وہ بچہ تمہارا نہیں ہے اسے میں نے جنم دیا ہے وہ میرا بیٹا ہے۔“

”تم صرف ایک کیریئر تھیں اصل میں وہ میری اور نوری کی اولاد ہے۔“ بین جوئے نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

”اولاد اس کی ہوتی ہے جو اسے پیدا کرتا ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کس کی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے میں اس کی ماں ہوں۔“

”ایک بات سے شاید تم بے خبر ہو۔“ بین جوئے نے دھیمے انداز میں کہا۔ ”تمہارے جسم میں ایک مکمل جنین رکھا گیا تھا۔ تم سمجھ رہی ہو تا۔ وہ جنین میرے اور نوری کے تولیدی خلیوں سے تیار کیا گیا تھا اور یہ کام ڈاکٹر روزانے ٹیٹ ڈس میں انجام دیا تھا۔ پھر اسے تمہارے جسم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ایسا صرف اس وجہ سے کیا گیا کیونکہ نوری بچہ

”اگر تمہارا اشارہ دولت کی طرف ہے تو وہ تم پہلے بھی دے رہے تھے اور ہم نے پہلے بھی اسے منکر دیا تھا ورنہ فرار ہی نہ ہوتے۔“

”اس وقت تم صرف دو تھے لیکن اب تم ایک فیملی ہو اور تم کو اپنے بچوں کے لیے بہتر زندگی کی ضرورت ہوگی۔“

بین جوئے کا لہجہ غریب دینے والا تھا۔

”ہم اپنی بساط کے مطابق ان کو بہتر زندگی دے رہے ہیں۔ میرا شوہر اس کے لیے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتا ہے۔“

بین جوئے نے محسوس کیا کہ سیلی کی صورت نہیں مانے گی اور اس مسئلے کا کوئی ایسا حل نہیں نکلے گا جو دونوں فریقوں کے حق میں ہو۔ لیکن اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔

سنہری بالوں اور دھکتی سفید رنگت والا نو جوان اندر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ایک بہترین اور نئی فٹ بال اٹھا رکھی تھی اور اس کا لباس بھی بہترین تھا۔ اس نے اندر آکر سیلی کا گال چوما

اور بین جوئے کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون ہے ماں؟“ اس کی نظروں میں انجینیتھی اس نے فی پر بین جوئے کو دیکھا

لیکن یہ اس کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہ مشہور زمانہ بین جوئے ان کے گھر آسکتا ہے۔ بین جوئے کو لگا جیسے

اس کے سامنے اس کی جوانی کی تصویر سامنے آگئی ہو۔ وہ یقیناً اس کا اور فوری کا بیٹا جوڑیو تھا۔ لیکن اس سے پہلے وہ

جوڑیو سے تعارف کرنا سیلی نے اس کا ہاتھ چوما اور بولی۔

”ایک پرانا واقف کار ہے۔ تم اندر جا کر نہالو آج میں نے تمہارا پسندیدہ اسٹوڈیو بنایا ہے۔“

”دنیا کی سب سے گریٹ ماں۔“ جوڑیو خوش ہو گیا تھا اس نے پھر سیلی کو پیار کیا اور فٹ بال اچھالتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔

”یہ... میرا...“

”تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ سیلی بھرتن کر کھڑی ہوگئی۔ ”جوڑیو... صرف میرا بیٹا ہے اگر تم نے اسے

حاصل کرنے کی کوشش کی تو یقین کرو ہم آخر تک لڑیں گے اور عدالت میں جائیں گے۔ مجھے یقین ہے دنیا کی کوئی

اولاد ایک ماں سے اس کا وہ بچہ نہیں جھین سکتی جسے اس نے جنم دیا ہو۔ میں تمہارے سارے کر توت دنیا والوں کے سامنے لے آؤں گی۔“

بین جوئے سیلی کی باتیں سن رہا تھا اور اس کا چہرہ ہتا رہا تھا کہ اس پر زیادہ اثر نہیں ہوا ہے اور وہ بہر صورت اپنی

سی کر کے رہے گا۔ یک دم سیلی کا حوصلہ ٹوٹنے لگا تھا اسے

معلوم تھا بین جوئے طاقت ور آدمی تھا اس نے پہلے بھی انہیں مجبور کیا تھا اور اب کر سکتا تھا۔ وہ ان سے جوڑیو کو جھین کر لے جاسکتا تھا۔ اس کا سر جھک گیا تھا۔ ”جوڑیو بہت

اچھا فٹ بالر ہے۔ ابھی اس نے مقامی لیگ سے معاہدہ کیا ہے اس کا کھیل دیکھنے والے کہتے ہیں کہ آنے والے دنوں

میں برازیل کی ٹیم میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ وہ اچھا طالب علم ہے وہ ہم سے بہت محبت کرتا ہے۔ یہ گھر اور خاندان اس

کا فخر ہے۔“ سیلی نے کہتے ہوئے سر اٹھایا۔ ”کیا تم صرف اس لیے اس سے اس کا فخر اور اس کا سب کچھ جھین لو گے کہ

تمہیں اپنے کاروبار کے لیے ایک چیف ایگزیکٹو درکار ہے۔ شاید تمہیں چیف ایگزیکٹو مل جائے لیکن جوڑیو سے

اس کا سب کچھ جھین جائے گا۔ ٹھیک ہے میں مانتی ہوں، وہ تمہاری اولاد ہے لیکن کیا تم صرف اس لیے اسے تباہ کر دو گے کہ وہ تمہاری اولاد ہے؟“

بین جوئے کا چہرہ کسی پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔ مگر کچھ دیر گزرنے کے بعد اس پتھر میں دراڑیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ پتھر کے نیچے سے نری نمودار ہو رہی تھی۔ بینا

جوئے نے ایک گہری اور ٹھکست خوردہ سانس لی۔

”سیلی تم ٹھیک کہہ رہی ہو جوڑیو کو صرف اس لیے تباہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ میری اولاد ہے۔ لیکن میری تم سے ایک

الٹی ہے۔ کیا میں بھی اسے دیکھنے آسکتا ہوں۔ تم لوگوں سے میرا تعلق بھی تو ہے۔ بس دس پندرہ منٹ کے لیے؟“

سیلی نے ٹی ٹی میں سر ہلایا۔ ”بہتر ہو گا تم اس باب کو یہیں بند کر جاؤ کیونکہ تم بار بار آؤ گے تو اس سے کوئی خرابی ہو سکتی ہے۔“

بین جوئے نے ایک اور گہری سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ میری دولت کا وارث ہوگا۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔“ سیلی نے بات ختم کر دی اور بین جوئے کے پاس وہاں سے رخصت ہونے کے سوا اور

کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا اگر کدے جانے کے بعد جوڑیو اندر سے نکل آیا اس نے نہا کر لباس بدل لیا تھا۔

”ماں وہ بوڑھا کیوں آیا تھا؟“

”وہ کسی کا پتا پوچھتا آیا تھا لیکن اس کا بتایا ہوا شخص یہاں نہیں رہتا ہے وہ غلطی سے آیا تھا اور اب بھی نہیں آئے گا۔“ سیلی نے یقین سے کہا اور اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

دن کے نوبت تھے، جیسن اسٹیٹ یونیورسٹی نیویارک
میں داخل ہوا اور اپنی کلاس میں پیکچرار کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ
یونانی تاریخ کا مضمون پڑھایا کرتا تھا۔ اس کی عمر اکیس برس تھی
اور قد چھ فٹ دو انچ۔ وہ اپنے طالب علموں میں مقبول تھا۔
34 طالب علموں کی اس کلاس میں دروازے توڑتے مگر
کھڑکیاں نہیں تھیں۔ اسے دیکھ کر طلبا خاموش ہو گئے۔ جیسن
نے براہر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انیس سالہ نام الیگزینڈر کو دیکھ
کر سر کو خیف سی جیسن دی، جو سیکنڈری اسکول میں انگریزی کا

ہلاکت خیز

شکیل صدیقی

ترقی یافتہ ممالک میں دہشت گردی کی وباء اس طرح پھیل رہی ہے
کہ ہر کوئی حیران و پریشان ہے۔ یہ دہشت گردی دولت کے حصول
کی خاطر نہیں ہوتی ہے بلکہ نفسیاتی دباؤ، قتل و خونریزی پر
اکساتا ہے۔ زیر نظر خونی واقعات اب وہاں عام ہیں۔

ایک خونی واقعے کی روداد جو امریکا میں عام ہے



استاد بننا چاہتا تھا۔ جب کہ سامنے کی قطار میں چھبیس سالہ مانک کوز بیٹھا جو تاریخ کا پروفیسر بننا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے فونڈز رکھا پھر تھا۔ وہ اپنے بچپن کی ابتدا کرنا چاہتا تھا کہ اس نے دروازے پر کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا تم اس کلاس کے طالب علم ہو؟“

وہ ہماری جسم کا تھا اور اس کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ وہ برساتی جیکٹ پہنے تھا اور اس کے چہرے سے سختی جھلکتی تھی۔ اس نے اپنے شانے سے لٹکنے والے بیک سے ایک بندوق نکال لی۔ ”آج کاسب سے اہم اعلان یہ ہے کہ تم سب لوگ یرغمالی ہو۔“

ٹام جو انگریزی کا استاد بننے والا تھا، اس صورت حال سے خوفزدہ ہو گیا اور اس کی گدی کی ایک رگ پھڑکنے لگی۔ اسے ہرن کا شکار کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ جانتا تھا کہ انجینی کے اعشاریہ 270 کی ریمیننگ سی آئیو میک جس سے پانچ گولیاں فائر کی ہیں۔ اگر کسی شخص کے قریب جا کر کیا جاتا تو اس کے گلوے اڑ سکتے تھے۔

”میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھے رہو۔ کوئی حرکت نہ کرے۔“ اس نے راقفل لہراتے ہوئے کہا۔ اس نے طائرانہ نگاہ سے ہال کا جائزہ لیا پھر دائیں جانب پڑی ہوئی میز کی طرف بڑھ گیا اور اس نے اپنی برساتی جیکٹ اتار دی۔ نیچے ایک اور جیکٹ تھی۔ سیاہ رنگ کی چمکدار چمکت جس سے میچنگ کرتی ہوئی چٹون اس نے پہنی رکھی تھی۔

”چلو اٹھو۔“ وہ چنچا۔

سارے طالب علم اپنی جگہوں سے اٹھے اور دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ بندوق بردار نے پروفیسر کی طرف مڑ کر کہا۔ ”اب تم میڈیا سے رابطہ قائم کرو اور ہو سکے تو کانگریس اور جناب صدر کو بھی اطلاع دو۔“

فونڈز راہی جگہ سے اٹھا اور حیرت فدی سے لمحہ آفس میں چلا گیا۔ پھر اس نے یونیورسٹی پولیس کو فون کیا اور انہیں بندوق بردار کے بارے میں بتایا۔

☆☆☆

بندوق بردار اب دائیں جانب کی دیوار سے ٹیک لگائے طالب علموں سے 35 فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنی بندوق میز کے سہارے سے کھڑکی کی پھر اس نے جسے بے ڈیبا کال کر ایک سگریٹ سلگائی۔ اس نے پہلا کش کھینچ کر لایا ابالی انداز سے کہا۔ ”میں ایک غلط تجربے کی پیدائش

کی پیداوار ہوں۔“ اس نے اپنی بندوق اٹھالی اور موڈ میں بولا۔ ”مگر میں اس کے بارے میں کسی اور کو بتانا نہیں چاہتا۔“ مانک کوز نے سوچا یہ شخص غامبیا دیوانہ ہے۔

وقت گزر رہا تھا اور بندوق بردار خالی نشستوں کے درمیان ٹپل رہا تھا۔ راقفل اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایک ایسی جوتا ٹون کا طالب علم تھا اسے بندوق بردار کی جیب میں پڑی ہوئی گولیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ”کیا تم اس دیوانے پر چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ اس نے اپنے قریب کھڑے ساتھی سے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ چاہتا کیا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔

”ان دروازوں کو کھولو۔“ بندوق بردار نے بندوق کی نال سے اشارہ کیا۔ وہ دروازہ ایک سرنگ سے جا کر مل جاتا تھا۔

وہ دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور اسے کھلا دیکھ کر کوئی بھی اندر آ سکتا تھا اور خوریزی ہو سکتی تھی۔ ”اے ٹھہرو۔ اسے نہ کھولو۔“ مانک کوز نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

بندوق بردار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ایک ہی عمر کے تھے۔ بندوق بردار چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے سر کو آٹاشی بینش دی جیسے اس کی بات سمجھ گیا ہو۔ پھر اس نے کہا کہ وہ کمرے کے ابتدائی حصے کی طرف جائیں جہاں بارہ فٹ کی ایک پڑھوٹھن اسکرین لگی تھی۔

مانک نے محسوس کیا کہ آٹاشی کا رویہ کبھی بھار دوستانہ ہو جاتا ہے۔ اگر میں اس سے شناسائی پیدا کروں تو کام بن سکتا ہے۔ برہمی میں جو اس کی ناک سختی سے کھڑی ہے ممکن ہے کہ میں اسے موڈنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

اس نے جائزہ لیا تو پتا چلا کہ وہ اس کے قریب بیٹھا ہے۔ اس نے ملائمت اور رسانیت سے کہا۔ ”ہیلو فونڈ! ایک سگریٹ مل جائے گی؟“

ابھی کی آنکھیں سکر گئیں۔ پھر اس نے مانک سے کہا۔ ”ہاں۔“ اس نے ڈیبا سے ایک سگریٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”لیکن کسی اور کو نہیں ملے گی۔“

مانک نے دیکھا کہ ان کے درمیان صرف چھ فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس نے سگریٹ اچھال دی تو مانک نے اسے پیچ کر لیا۔ ”ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“

”جب میں نوعمر تھا تو انہوں نے میرا دماغ کھول کر اس میں ایک کمپیوٹر چپ رکھ دی تھی۔ تاکہ میں جو کچھ سوچوں اس

سے وہ باخبر ہو جائیں۔ وہ مجھے اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور مجھ پر مکمل کنٹرول چاہتے ہیں۔“

مانک نے سوچا کہیں وہ پاگل تو نہیں ہے؟

پروجنٹن اسکرین کے پیچھے سے اچانک کسی نے اس اجنبی کو مخاطب کیا۔ ”ہیلو! کیا تم میری آواز سن سکتے ہو؟“

طالب علموں کے چہروں پر قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ اجنبی کو دہاں آئے ہوئے پچاس منٹ ہو چکے تھے۔ آواز پروجنٹن اسکرین کے پیچھے سے آ رہی تھی، جب کہ اسکرین دھندلے شیشے کا تھا۔ چنانچہ دوسری طرف کون تھا اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔

طلبہ نے اس کے سامنے ایک مانک رکھ دیا تاکہ وہ بات کر سکے۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ پوچھا گیا۔

”میری کہ یونیورسٹی کے صدر، گورنر، سپریم کورٹ کے جج

اور صدر امریکا کو یہاں بلایا جائے۔“

”غصہ ہو دیکھتا ہوں کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“ جواب دیا گیا۔ ”میرا نام کیوں ہے اور تمہارا؟“

”اپنے ذرائع سے میرا نام معلوم کرو۔“ اس نے غرا کر

کہا۔ پھر مانک بھینک کر دوبارہ رائفل اٹھالی پھر اس کی انگلی

ٹریگر پر جتنی سے جتنی۔ اس نے نال کا رخ چھت کی طرف کر

کے طلبہ سے پوچھا۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں فائر کروں؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ ہال میں بہت سی خوفزدہ آوازیں

ابھریں۔

مانک کونز نے ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے

کہا۔ ”چھت میں لوہا اور کنکریٹ ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ

تمہاری چٹائی ہوئی گولی چھت توڑ کر دوسری طرف نکل

جائے۔ اگر وہ پلٹ گئی تو تمہارے دماغ میں بھی سوراخ کر سکتی

ہے۔“

”تم درست کہتے ہو۔“ وہ بولا۔ پھر اس نے رائفل کی

نال کا رخ پروجنٹن اسکرین کی طرف کر کے فائر کر دیا۔ ایک

دھماکا ہوا اور طلبہ کی چیخیں گونجیں۔ پھر پروجنٹن اسکرین سے

لمبا کرنے لگا۔

اس اسکرین کے پیچھے ایک کراہتا جہاں پولیس کے دو

افسران کیوں اور نیمز ہو رہے بیٹھے تھے۔ انہوں نے فائر کا

دھماکا سنا پھر اسکرین میں ایک سوراخ ہوتے دیکھا۔ وہ گولی کا

سوراخ تھا۔ انہوں نے جلدی سے خود کو آڑ میں کر لیا۔

”یہ بڑی رائفل کا دھماکا ہے۔ گولی جسم میں داخل

امریکن ہرٹ ایسوسی ایشن کی رپورٹ میں ڈاکٹر فریک ایک نے ناریل کے تیل کو کھانوں میں استعمال کرنے کے نقصانات نہیں بتائے، البتہ اسے خطرناک چربی کا تیل قرار دیا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ناریل کے تیل میں جانوروں کے گوشت میں موجود چربی، مکھن اور دیگر چربی والی اشیاء کے مقابلے زیادہ چربی ہے، مگر لوگ اسے صحت کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں امریکا کی 7 کلینکس کی جانب سے ناریل کے تیل سمیت دیگر چربی والے تیلوں پر کی جانے والی تحقیق کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کونوٹ آئل میں موجود چربی کی خراب مقدار (ایل ڈی ایل) دل کی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

☆☆☆

رائفل کے کارٹوس کا کھوکھا اس نے جیب سے نکال کر

طلبہ کے سامنے پھینک دیا اور سرکار بولا۔ ”میرے پاس ایسے

بہت سے کارٹوس ہیں۔“ اس نے جیب سے کارٹوس نکال

کر میز پر رکھ دیے پھر انہیں گنتے لگا۔ اس کے بعد اس نے کمر

میں لگا ہوا خنجر نکالا اور اس کی دھار پر انگلی پھیرتا ہوا بولا۔ ”اس

کی دھار بہت تیز ہے۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد خنجر کو دوبارہ

اس کے غلاف میں رکھ لیا۔ اس کے بعد ہال میں ٹپٹنے

لگا۔ جب وہ رائفل سے دس فٹ دور چلا گیا تو ایسٹنی نے سوچا

کہ اس سے پہلے کہ وہ مڑ کر اس طرف آئے چھلانگ لگا کر

رائفل تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات اس نے سرگرمی میں اپنے

ساتھی سے بھی کہہ دی۔ اس نے سرکواشیانی جنٹن دی تو ایسٹنی

نے اپنی ٹانگوں کی پوزیشن تبدیل کر لی اور سرگرمی میں

بولا۔ ”مگر یہ نہیں معلوم ہے کہ اس کی جیب میں کوئی ریوا لور تو

نہیں ہے، جس سے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دے۔“

اجنبی نے جیسے اندازہ نہ لگایا۔ اس نے پلٹ کر اپنی

رائفل اٹھالی اور نال کا رخ ایسٹنی کی طرف کر کے

بولا۔ ”سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ اگر مجھ پر چھلانگ لگانے کا

ارادہ ہے تو اس ارادے کو جیب ہی میں رکھو۔ اس لیے کہ میں فائر کرنے میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔ خبردار ہیرو بننے کی کوشش نہ کرتا۔“

اسٹینسی کو گھبراہٹ میں پسینا آنے لگا۔ اسے اپنے والدین اور بھائی یاد آنے لگے۔ اسے رات کو دادی کے ساتھ ڈنبر کرنا تھا، جواب ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔

رائفل بردار اسپکسن کی طرف مڑا جو کلاس میں واحد ٹیکر تھا۔ وہ چھ فٹ تین انچ کا تھا اور اس کا وزن 260 پاؤنڈ تھا۔ وہ قطبال ٹیم کا کپٹن تھا۔ اسٹی نے کہا: ”دو تہا رہا نمبر دوسرا ہوگا۔“

ان دونوں کا ساتھ بیٹھنا اسے پسند نہیں آیا۔ اس نے اسٹینسی سے کہا: ”تم ہال کی دوسری طرف جاؤ اور ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا، میرا غصہ بہت خراب ہے۔“

اس نے مگر وفون اٹھا کر کہا: ”ہاں، تو تم لوگ اب کیا کر رہے ہو؟“

”دوبارہ فائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے میڈیا کے لوگوں کو بلا لیا ہے۔“ کیون نے کہا۔

”میرے ساتھ تفیاتی کھیل نہ کھیلو۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرو۔ ورنہ میں طلبہ کو گولیاں مارنا شروع کر دوں گا۔“ اس نے گھبراہٹ لے لی کہ تو دو لڑکیاں روئے لگیں۔

”چیخو چلاؤ نہیں۔ میں تم لوگوں کو گولی نہیں ماروں گا۔“ اس نے کہا۔ ”دروازہ کھول دو اور انہیں جانے دو ان کے ساتھ کوئی اور دروازے کی طرف نہیں بڑھے گا ورنہ میں اس کی پیٹھ پر گولی مار کر اسے جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

مانک کو زور اسٹینسی نے دروازہ کھولا تو دوسری طرف سے سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ کپکپا کر رہ گئے۔ دونوں لڑکیاں اس سرنگ سے باہر چلی گئیں۔ مانک نے دیکھا کہ وہ جہاں کھڑا تھا، آزادی وہاں سے صرف چندہ فٹ کے فاصلے پر تھی، لیکن اس کوشش میں کسی اور کی بھی جان جاسکتی تھی۔ وہ جتونی، جنون میں دوسرے طلبہ کو نشانہ بنادیتا تو اس کی ذمے داری مانک پر ہی عائد ہوتی۔ چنانچہ اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر اسٹینسی بھی اپنی جگہ پر چلا گیا۔

اسٹی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند چھوٹی سنگریاں نکالیں اور طلبہ کو دکھانے لگا۔ ”میں دیوانہ نہیں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”انہیں رکھنے کی بھی ایک وجہ ہے۔“

”یہ سنگریاں تمہیں کہاں سے ملیں؟“ مانک کو زور نے پوچھا۔

”یہ میری سچی دہائی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ جب آپ مٹی میں ان سنگریوں کو دبا کر مسلیں گے تو سکون محسوس کریں گے۔“

پھر اس نے مگر وفون اٹھا کر کہا: ”میرے لیے ایک ٹیلی وژن سیٹ لاؤ، پورٹبل ٹوائلٹ، غذا اور سگریٹ وغیرہ بھی۔“

”اس کے بعد کیا تم طلبہ کو جانے دو گے؟“ دوسری طرف سے ہورن نے پوچھا۔

”فضول باتیں نہ کرو۔“ وہ دھاڑا۔ ”ٹیلی وژن لا کر رکھو۔“ اس نے طلبہ کی طرف مڑ کر کہا۔ ”تم سب ہال کے وسط میں آ جاؤ۔“

جب سب بیٹھ گئے تو ٹام الیکزینڈر سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اسٹی پر جھپٹ پڑا۔ اسٹی ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ اس کی بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹی جارہی تھی۔ پھر وہ گھوما اور زینیک طرف دھاڑا۔ الیکزینڈر نے اس کی کمر تھام لی اور اسے اپنی طرف گھما دیا۔ اچانک الیکزینڈر نمودار ہوا۔ وہ دونوں مل کر اسے کھینٹتے ہوئے آخری زینے تک لے گئے۔

اسٹی کو موقع مل گیا۔ اس نے نہ بچ کر نکال لیا۔ الیکزینڈر اور مانک کو زور نے اسے دروازے سے ٹکرا دیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس دوران میں تین مضبوط جسم کے لڑکوں نے اسٹی پر ہتھ بول دیا۔ وہ فرش پر گر پڑا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

ان میں سے ایک نے پرجوش ہال کا دروازہ کھولا تو آٹھ مسلح پولیس والے دوسری طرف سے آ گئے۔ انہوں نے اسٹی کو چھڑی لگا دی۔

اسٹینسی اور دوسرے لڑکے جو دھماچو کڑی میں زخمی ہو گئے تھے انہیں میڈیکل سینٹر لے جا کر طبی امداد دی گئی۔ وہ سب ایک دوسرے کے شکر گزار تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کی جانیں بچالیں۔

☆☆☆

ستائیس سالہ رالف ٹوروی امریکی تھا اور شکاگو میں رہتا تھا۔ زیادہ پڑھنے لکھنے کی بنا پر وہ چنی مریض ہو گیا تھا اور وار داتیں کرنے لگا تھا۔ ہر وقت غلامی سے آزاد ہونے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ جس کیپٹن پرچپ کا وہ تذکرہ کرتا رہتا تھا وہ اس کے دماغ میں کہیں بھی نہیں ملے۔ معلوم نہیں کیوں اس کے دماغ میں یہ وہم پرورش پارہا تھا اور کب سے؟ اسے اپنی جیل میں بند کر دیا گیا۔ جلد ہی اس پر مقدمہ چلنے والا تھا۔



فلم نگری

لیڈی کلر

انور فرہاں

پاکستانی فلم نگری میں ایک سے ایک اداکار آئے، فن کا جوہر دکھایا، کامیابی کے جھنڈے گاڑے لیکن وہ شہرت وہ پسندیدگی جو اس اداکار کے حصے میں آئی کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ اس کا کمال یہ تھا کہ پردے سمیں پر آتے ہی لڑکیوں کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی۔ انتقال کے بعد بھی اس کے شائقین اسے پوجنے کی حد تک پیار کرتے ہیں۔

اس نامور اداکار کی سرگزشت جس کا نام کامیابی کی ضمانت تھا

جانے کے بعد بھی نہیں مرتے۔ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنے بے شمار چاہنے والوں اور پرستاروں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک وحید مراد بھی تھے۔ پاکستانی ٹیلیوژنکار 23 نومبر 1983ء کو اپنے چاہنے والوں

اللہ کے بے شمار بندے ایسے ہیں جو جیتے جی بھی زندہ رہنے کے حقدار نہیں کہلا سکتے جب کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس دار فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی، عالم جاودانی پہنچ جانے کے بعد بھی منوں مٹی کے نیچے دفن ہو

مراد کو خصوصی طور پر ٹریبونٹ پیش کرنے کے لیے خاص پروگرام نشر کرنا شروع کر دیے۔ اس حوالے سے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وحید مراد کل بھی زندہ تھا۔ آج بھی زندہ ہے۔ اور کل بھی زندہ رہے گا۔

وحید مراد نے جب نیا نیا فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا اس وقت سنسٹوٹل کمار، سدھیر، ورین، کمال، حبیب، یوسف خان اور اعجاز درانی وغیرہ بڑے اور سپر ہیرو کے طور پر موجود تھے۔ یہ تمام اداکار اپنی شخصیت اور اداکاری میں لا جواب تھے۔ سب کا اپنا انداز تھا اپنا اپنا فن تھا۔ ان سب میں کمی صرف یہ تھی کہ وہ نوجوان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اس دور میں وحید مراد ان کے ساتھ چھوٹے موٹے کردار کیا کرتے تھے۔ فلم ”اولاد“ میں وحید مراد نے حبیب کے ساتھ پر فرام کیا۔ فلم ”دائن“ میں سنسٹوٹل کمار کے ساتھ اداکاری کی۔ ”عید مبارک“ میں ایک بار پھر حبیب کے ساتھ جڑوی کردار ادا کیا۔ یہ ساری بڑی اور کامیاب فلمیں تھیں مگر ان میں وحید مراد کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی۔ عوام میں کل کران کی پہچان نہیں ہوئی۔ ٹھوڑی توجہ انہوں نے ”دائن“ میں حاصل کی جب نیلو کے ساتھ انہوں نے مغربی تہذیب اپنانے والے کردار میں ایک ڈانس آسٹم کلب کے ماحول میں پچھراڑ کرایا۔ پہلی بار لوگوں کو ان کا انداز ذرا مت کراد مختلف لگا۔

ایک اداکار جو کچھ خود چاہتا ہے کہ ایسا کردار ہو تو وہ اس میں اپنی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر طور پر اجاگر کر سکتا ہے مگر دوسروں کی فلموں میں ایسے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے انہیں خود اپنی فلمیں بنانی پڑتی ہیں۔ وحید مراد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ان کا ذاتی پروڈکشن ہاؤس تھا جس کے بیزنس تے وہ دو فلمیں بنا چکے تھے مگر ان میں وہ بطور اداکار شامل نہیں تھے۔ اب جب انہیں اپنی اداکاری کو اپنی خواہش کے مطابق نکھارنے اور سنوارنے کا خیال آیا تو انہوں نے پہلے ”ہیرا اور پتھر“ اور پھر ”ارمان“ جیسی فلمیں پروڈیوس کیں۔ جن میں خود ہیرو کا رول پلے کیے۔ ”ہیرا اور پتھر“ میں وہ پہلی بار مکمل ہیرو کے طور پر منظر عام پر آئے اور اس حیثیت سے انہیں فلم دیکھنے والوں نے پسند کیا۔ ان کے لیے اتنی پذیرائی ہی کافی تھی۔ اس کے بعد اپنی اگلی فلم ”ارمان“ میں اپنے سارے ارمان پورے کر لیے۔ ”ارمان“ میں وہ ایک ایسے نوجوان کے رول میں آئے جو شرارتی بھی ہے، عاشق بھی اور جدائی میں تڑپنے والا بھی ہے۔ ایسے نوجوان کا کردار اپنی ساری فنی خوبیوں کے

کے درمیان سے اٹھ کر افق کے اس پار چلے گئے مگر آج بھی اسے دنوں کے بعد بھی وہ ہمارے درمیان ہی موجود ہیں۔ اپنے سینکڑوں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں پیار کرنے والوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر زندہ ہیں۔

کروڑوں دلوں پر راج کرنے والے یہ خوب صورت اور من معنی صورت کے فنکار دلیپ کمار کے بعد وہ واحد اداکار تھے جن کا ہیرا اسٹائل ضرب اعلیٰ بنا۔ حتیٰ کہ اس زمانے کی اکثر لڑکیاں تک وحید مراد کے اسٹائل کے پال بنایا کرتی تھیں۔ یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کی پاپولرٹی خواتین کے حلقوں میں حدود درجہ زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ”شہنشاہ رومانس“ اور ”یڈی کلر“ جیسے القاب سے بھی یاد کیا گیا۔ ان کے چاہنے والوں نے انہیں چاکلیٹی ہیرو کا بھی خطاب دیا اور لاکھوں دلوں کی دھڑکن بھی کہا۔ بے مثل، منفرد، لا جواب اور باکمال وحید مراد کہہ کر بھی انہیں یاد کرتے ہیں۔ نعمات کی پچھراڑیشن کے حوالے سے بھی وہ برصغیر کے لاثانی ہیرو تھے اس لیے انہیں ماسٹر آف سوگ پچھراڑیشن کا خطاب بھی دیا گیا۔

سلور اسکرین پر جلوہ گر ہونے والے فنکاروں کو ہر دور میں اور ہر جگہ فلم بینوں کا بڑا طبقہ چاہتا ہے، پیار کرتا ہے، یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں مگر ان کے جیسے ہی اس پیار کا بزنس بندھا رہتا ہے بلکہ اکثر تو اس وقت تک عوامی مقبولیت کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ جب تک وہ خود مقبول ہوتے ہیں۔ اور وہ اسکرین سے آؤٹ ہوئے، اُدھر چاہنے والوں کے دلوں میں بھی ان کی چاہت کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔ نئی اور انوکھی بات یہ ہے کہ دنیا سے گزرنے کے برسہا برس بعد بھی چاہنے والوں کی چاہت کم نہ ہو۔ پیار کرنے والے بھلا نہ سکیں۔ یہ حیران کن بات ہے۔ وحید مراد کو ہم سے پچھڑے 34 سال بیت چکے ہیں مگر وحید مراد آج بھی اپنے بے شمار چاہنے والوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر دھڑک رہے ہیں۔ اس دور میں بھی جب عام لوگ اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ کو بھی ان کے گزرنے کے سال دو سال بعد یاد نہیں رکھتے۔ وحید مراد کے پرستاروں کی اس والہانہ محبت کو دیکھتے ہوئے دوسرے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ خصوصی طور پر میڈیا نے ان کی اس عقیدت بھری محبت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے وحید مراد کی برسی پر خاص اہتمام کرنا شروع کر دیا۔ شوبز کے اخباروں اور پرچوں نے خصوصی ایڈیشن شائع کرنا شروع کر دیئے اور ٹی وی چینلوں نے وحید

ساتھ ادا کر کے انہوں نے فلم بینوں کو چونکا دیا۔ لوگوں نے بار بار ”ارمان“ دیکھی اور وحید مراد کی محبت میں گرفتار ہوتے چلے گئے۔ یہ ایسی فلم تھی جس کے ذریعے رب العزت نے انہیں ایسی شہرت بخشی جو انہیں تمام ہیروز سے الگ ثابت کر گئی۔ ان کی اپنی الگ پہچان بنا گئی۔ ”ارمان“ وحید مراد کی نئی زندگی کی ایک خوشگوار ٹریننگ پوائنٹ تھی۔ ایک ایسی فلم جس نے ان کو شہرت اور مقبولیت کے فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا۔

یہ درست ہے کہ اس فلم کے ذریعے وحید مراد کو جو عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس میں خود وحید مراد کا کلیدی کردار تھا۔ ان کی فنی صلاحیتوں کا بڑا عمل دخل تھا مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک پوری ٹیم تھی جس نے وحید مراد کی صلاحیتوں کو اجمار نے اور نگہار نے میں زبردست کردار ادا کیا۔ ان میں پرویز ملک کا خصوصی کردار تھا۔ ملک صاحب امریکا سے فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے تازہ بہ تازہ پاکستان واپس آئے تھے۔ وحید مراد کے دیرینہ دوست تھے۔ جب کہ وحید مراد نے ”ہیرا اور پتھر“ شروع کی تو اقبال رضوی اسے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ جب وحید مراد نے پرویز ملک کو اس کی ڈائریکشن کے لیے کہا تو وہ بولے۔ ”اب تک اس فلم کو کون ڈائریکٹ کر رہا تھا؟“

”اقبال رضوی۔“

”کیا وہ برا نہیں مانیں گے اگر میں نے.....“

”ارے نہیں یا! میں انہیں رضا مند کر لوں گا۔ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔“ اور جب ملک کو اطمینان ہو گیا کہ اقبال رضوی نے بخوشی انہیں ”ہیرا اور پتھر“ کی ہدایات کی اجازت دے دی ہے تو انہوں نے ”ہیرا اور پتھر“ سے اپنی ہدایت کاری کی ابتدا کی۔ سب سے پہلے فلم کے اسکرپٹ کو انور پڑھا اور جہاں جہاں انہیں ترمیم و اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی ترمیم و اضافہ کیا۔ پھر شوٹ کیے ہوئے حصے میں بھی جس کو مناسب سمجھا اسے رکھا باقی کو ریجیکٹ کر دیا۔ اسکرین پلے میں بھی اپنی مرضی سے تبدیلی کی۔ اس کے بعد اپنے انداز میں فلم مکمل کی۔ ”ہیرا اور پتھر“ پسند کی مگر پرویز ملک اس سے مکمل طور پر مطمئن نہیں تھے لیکن وحید مراد نے اب اگلی فلم شروع کی تو ملک صاحب نے اپنی بھرپور صلاحیتوں اور امریکا سے حاصل کی ہوئی تعلیم و تربیت کا مظاہرہ کیا۔ ”ارمان“ مکمل ہو کر سلور اسکرین کی زینت بنی تو

زندگی نامہ

نام: وحید مراد (خاندانی بھی اور فلمی بھی)

پیدائش: بروز بدھ 12 اکتوبر 1938ء

مقام پیدائش: کراچی

والد: غلام مراد

والدہ: شریں مراد

تعلیم: انگریزی ادب میں ایم اے

شادی: بروز جمعرات 17 ستمبر 1964ء کو سلسلی

ہنت ابراہیم سے طارق روڈ کراچی میں شادی ہوئی۔ سلسلی مراد 31 مارچ 1941ء کو بھارت کے شہر سورت میں پیدا ہوئی تھیں۔ اولاد: ایک بیٹی عالیہ مراد، ایک بیٹا عادل مراد۔ عالیہ 23 دسمبر 1969ء کو فلم ”عندلیب“ کی شاندار گولڈن جوبلی کے موقع پر پیدا ہوئیں جب کہ عادل مراد 13 نومبر 1976ء کو ڈائمنڈ جوبلی فلم ”شبانہ“ کی ریلیز کے موقع پر پیدا ہوئے۔

فلمی کیریئر: فلم ساز، اداکار، ہدایت کار، مصنف اور گلوکار۔ فلم ساز کے طور پر گیارہ فلمیں پروڈیوس کیں۔ اداکار کے طور پر 125 فلموں میں اداکاری کی۔ ان میں 115 اردو، 9 پنجابی اور ایک پشتو فلم تھیں۔ بطور ہدایت کار اور گلوکاران کی ذاتی فلم اشارہ بھی۔ بطور مصنف ان کی تین فلمیں ارمان، احسان اور اشارہ ہیں۔

اعزازات: 44 فلموں نے سلور جوبلی، 28 فلموں نے گولڈن جوبلی، 4 فلموں نے پلاٹینم جوبلی اور ایک فلم نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔

ایوارڈز: مختلف اداروں کی جانب سے 32 ایوارڈز حاصل کیے۔ 2011ء میں بعد از مرگ حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز دیا گیا۔

فلمیں: پہلی فلم بطور اداکار فلم ساز درپن اور ہدایت کار اٹلانڈک فلم ”سحسی“ جس میں وہ ایک مل مزدور کے مختصر کردار میں نمودار ہوئے۔ بطور مکمل ہیروز، پہلی فلم ”ہیرا اور پتھر“ آخری فلم ”زلزلہ“ جوان کی موت کے بعد ریلیز ہوئی۔ بطور فلم ساز پہلی فلم ”انسان بدلتا ہے“ آخری فلم ”ہیرا“ جوان کے انتقال کے بعد نمائش پزیر ہوئی۔

انتقال: 23 نومبر 1983ء بروز بدھ 10 بجے کراچی میں انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر 45 برس تھی۔

مدفن: بروز جمعرات صبح ساڑھے دس بجے لاہور میں ہوئی۔

اس نے دھوم مچادی۔

اس کی یہ عوامی مقبولیت دیکھ کر قلم ساز اسے ایسی ۶ فلموں میں کاسٹ کرتے تھے جو اس کے پرستاروں کو اچھ لگیں، پسند آئیں اور ایسی فلمیں عام طور پر لو اسٹوری ہو ا تھیں۔

وحید مراد کو رومانوی کرداروں کی ادائیگی میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے وہ روینچک فلموں کی اہم ضرورت سمجھ جاتے تھے۔ رومانوی کرداروں کی ادائیگی کی طرح رومانو ا غیتوں کی پچھراڑیشن میں بھی ان کا کوئی جانی نہیں تھا۔ ان کا اس خوبی کی وجہ سے ہی انہیں ماسٹر آف سوئگ پچھراڑیشن کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

وحید مراد نے اپنی فلمی زندگی میں 292 نغمات فلمبند کرواتے جن میں بڑی تعداد روینچک گیتوں کی تھی۔

کچھ اداکار اپنی پہلی ہی فلم میں ہٹ ہو جاتے ہیں جیسے ندیم۔ مگر وحید مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ انہیں منزل مقصود کے حصول کے لیے بہت پاب زبیلے پڑے اگرچہ وہ ایک معروف فلم تقسیم کار شاعر مراد کے فرزند ارجمند تھے اس کے باوجود وحید مراد کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے زینہ زینہ قدم بڑھانا پڑا۔

وحید مراد وہایت کارالحمد کی فلم ”ساحی“ میں پہلی بار اداکار درپن کے ہمراہ جلوہ گر ہوئے۔ یہ فلم 1959ء میں ریلیز ہوئی۔ یہ ایک مختصر سا جودی سا کردار تھا۔ وہایت کا ایس سلیمان کی دوسری فلم ”باچی“ بھی وحید مراد کی دوسری فلم تھی جو 1963ء میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں وحید مراد او محمد علی مہمان اداکار کی حیثیت سے شامل تھے۔ یہ ایک تقریبہ کاسین تھا جس میں ایک مقبول گیت فلمبند کیا گیا تھا جس کے بول تھے

جن لاکو توری لگن

یہ گیت اداکارہ راقصہ پنا پر عکس بند کیا گیا تھا۔ گا۔ کی اس تقریب میں حاضرین کی صف میں وحید مراد بھی شامل تھے۔

اسی طرح 1966ء میں ریلیز ہونے والی فلم ”میں و نہیں“ میں بھی وحید مراد او محمد علی مہمان اداکار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے تھے۔ یہ بھی ایک تقریب کا منظر تھا۔

ہاں 1962ء میں قلم ساز وہایت کار ایس ایم یوسف کی معاشرتی، سماجی، مگر ہیرو اور نغماتی فلم ”اولاد“ میں وحید مراد کو ایک مختصر کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ اس فلم میں انہوں نے حبیب اور نیر سلطانہ کے صاحبزادے کا کردار ادا کیا تھا اور

اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس قلم سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چڑھے لکھے اور تربیت یافتہ قلم نگار اور غیر تربیت یافتہ اور نا امل قلم بنانے والوں میں یہ فرق ہوتا ہے۔

اس قلم کے دوسرے نمایاں تخلیق کاروں میں مسرور انور اور سمیل رعنا تھے۔ موسیقی کا فلموں کی کامیابی میں بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ اچھی موسیقی اچھے گانے ہوں تو کمزور کہانی کی فلمیں بھی پسند کر لی جاتی ہیں۔ ”ارمان“ کی کہانی، ہدایت کاری، اداکاری تو سپر کلاس کی تھیں۔ اس پر سمیل رعنا کی دلوں میں اثر جانے والی موسیقی کی دھنیں اور مسرور انور کے مدحمرے گیتوں نے سونے پر سہاگا کا کام کیا جب کہ اچھے رشدی کی جادوئی آواز نے بھی ایسی جادوگری دکھائی کہ قلم کی قدردانیت میں کمی گنا اضافہ ہو گیا۔ اگر ارمان کو لوگوں نے بار بار دیکھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پوری ٹیم کی فنی کارکردگی عروج پر ہے۔ اس قلم کی سپر ڈپر کامیابی نے وحید مراد کی پسندیدگی، مقبولیت اور شہرت کو باہم عروج پر پہنچا دیا۔ اس قلم کی نمائش کو اتنے دن ہو گئے مگر آج بھی اس کی ترد تازی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔

وحید مراد بلاشبہ ایک ذہین اور اداکارانہ صلاحیتوں سے مالا مال فنکار تھے۔ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے والے سامنے آئے تو منہ بند کلیوں کی طرح ان کی فنی صلاحیتیں کھلی چلی نکلیں۔ ان کی فلمیں دیکھنے والے ان کے گرویدہ اور شیدائی ہوتے چلے گئے۔

ہر دور میں فنکاروں کے چاہنے والے موجود ہوتے ہیں۔ آج بھی شان، جاوید شیخ، عجب گل اور شاہد خان کو ان کے پرستاروں کا طبقہ انہیں چاہتا ہے ان سے پیار کرتا ہے مگر جس تناسب سے وحید مراد کو اس کے چاہنے والوں نے چاہا، پیار کیا اس تناسب سے کسی اداکار کو بھی چاہا نہیں گیا۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ جواب تک نہیں ٹوٹا اور شاید آنے والے دنوں میں بھی نہیں ٹوٹے گا۔

رومانی ہیرو کے طور پر سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے وحید مراد کی پسندیدگی کا ایک روپ یہ بھی ہے کہ جو نوجوان لڑکوں اور کالج کی طالبات ہی اس کی گرویدہ نہیں تھیں بلکہ پردہ دار مگر ہیرو خواتین بھی سب سے چھپ کے اس کے نام کی مالا جاکر کرتی تھیں۔ شہر کے سنیواؤں میں اس کی فلمیں لگتیں تو انہیں دیکھنے ضرور جاتیں واپس آکر اس کی ایک ایک ادا کو یاد کر کے سوسو جان سے اس پر فدا ہوتیں۔

اس فلم کو ان کی اولین فلم کہا جاتا ہے۔

ہدایت کار قدیر مگوری نے انہیں اپنی گھریلو اور نفسانی فلم ”دامن“ میں پہلی بار نیلو کے ساتھ رومانی عنصر بنا کر پیش کیا تھا مگر سنٹوش کمار اور مینیہ خانم اس فلم کے ہیرو ہیروئن تھے۔ وحید مراد اور نیلو کے جڑی رومانوی کردار تھے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض تو ایک شرا کے طور پر فلمی میدان میں قدم رکھتے ہیں جن کی بہترین مثال سلطان راہی اور نگہلا کی ہے۔ وحید مراد کے ساتھ یہ نوبت تو انہیں آئی مگر چھوٹے موٹے کرداروں کے بعد جب انہیں قدرے بڑے کرداروں کے ملنے لگے تو وہ بھی ثانوی ہوتے تھے۔ بڑے فنکاروں کے ساتھ بغل بچ کے طور پر پیش کیے جاتے تھے۔ وحید مراد بڑے لکھے اور ہاشور ادا کرتے تھے ان کے لیے یہ صورت حال لوہ لکھ رہی تھی۔ کبھی جب وہ اکیلے بیٹھے ہوتے تو خود ہی خیال آرائی کرتے۔ ”اس طرح تو میں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے پہنچے پوڑھا ہوا جاؤں گا۔“

ان کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ انہیں اس کے سدباب کے لیے انہیں اپنی طبیعت کے مطابق کرداروں پر پر فارم کرنے ہی میں اپنی بہتری نظر آئی۔

”کیوں نہ میں اپنے لیے اپنی فلم بنائوں؟“ انہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ چند ہفتے اس پر غلطے دل و دماغ سے غور و فکر کیا اور پھر ”نہیر اور پتھر“ بنا کر اس میں فرسٹ رومانی عنصر کے طور پر کام کیا اور تماشاخیوں نے انہیں سولو ہیرو کے طور پر دیکھ کر اپنی عمر پور پسندیدگی کا اظہار کیا۔

لوگوں میں جہاں بہت سی اچھائیاں اور خوبیاں ہوتی ہیں وہاں ان میں کچھ خرابی اور برائی بھی ہوتی ہے۔ انسان ہونے کے ناتے وحید مراد بھی اس انسانی جبلت سے پاک نہیں تھے جہاں ان میں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں کچھ خامیاں بھی تھیں۔ ان میں سے ایک خرابی یہ تھی کہ وہ بڑے ہڈبانی تھے۔ فوراً روٹھ جاتے تھے۔ ناراض ہو جاتے تھے اور اپنے بہترین ساتھیوں اور دوستوں سے بھی بدظن ہو جاتے تھے۔ ان کے بہت قریبی اور بہت اچھے دوست ہدایت کار پرویز ملک کی زبانی ان کی خوبیاں اور خامیوں کا اندازہ آپ لکھی لگا سکتے ہیں۔ پرویز ملک کہتے ہیں۔ ”وحید مراد میرے ”من تھے۔ انہوں نے مجھے بطور ہدایت کار متعارف کرایا۔ وہ ایک مصلح رومانوی ایکٹر تھا مگر اس کی ذاتی زندگی میں کافی اگلی کی بھی جس کی وجہ سے وہ سفارش پسند نہیں کرتے تھے۔“ اگر می دونوں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے

وحید مراد کے بچے

عالیہ مراد کی شادی 12 فروری 1987ء کو سید سجاد حسین شاہ سے ہوئی جن سے ان کے دو بچے سید مقبول شاہ اور مجمل ہیں۔

عادل مراد کی شادی مریم رحیم سے 27 دسمبر 2005ء کو ہوئی ان کا بیٹا عیان عادل 16 نومبر 2006ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔

عادل مراد بحیثیت اداکار

وحید مراد کے صاحبزادے عادل مراد جو وحید مراد کے انتقال کے وقت سات سال کے تھے۔ اب ماشاء اللہ اپنے بڑے ہو گئے ہیں کہ اب بچوں کے باپ ہیں اور اب اپنے والد وحید مراد کے پیشے پر فارمگ آرٹ سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان کی پہلی فلم ”محسن آئے نہ“ 11 اگست 2017ء کو ریلیز ہوئی ہے (شاید یہ سہریں بڑے وقت آپ عادل مراد کی یہ فلم دیکھ چکے ہوں) ”محسن آئے نہ“ سید نور کی فلم ہے۔ ان کی اس سے پہلے 55 فلمیں ریلیز ہو چکی ہیں۔ عادل مراد جو لی وی انڈسٹری سے بطور پروڈیوسر ڈائریکٹر وابستہ تھے اور متحدہ ڈراما سیریز اور سوپ کرتے رہے تھے۔ ایک دن سید نور کی طرف سے انہیں ان کی فلم میں کام کرنے کی دعوت ملی جسے غور و فکر کے بعد عادل نے قبول کر لی۔ اگرچہ یہ ایک ٹینجی شو کردار تھا۔ ایک وڈیرے کے بگڑے ہوئے بیٹے کا کردار تھا جو پو کے سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتا ہے اور دولت کے نشے میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔ اس مثالی کردار کو قبول کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے عادل مراد کہتا ہے۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ وحید مراد کو ”شیٹے کے گھر“ میں ان چاہنے والوں نے قبول نہیں کیا تھا اگر یہ سوچ کر میں وحید مراد بننے کی کوشش کرتا رہوں گا تو یہ میرے اور وحید مراد کے چاہنے والوں کے لیے اچھی بات نہیں ہوگی کیونکہ وحید مراد دنیا میں ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ یہ عوام کا کام ہے کہ میرا کام دیکھ کر فیصلہ کریں کہ میں بحیثیت اداکار کتنا کامیاب رہا ہوں۔“

کہا۔ ”پرویز! میں نے تمہاری باتوں پر کبھی عمل نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے آج یہ وقت کافی برا لگ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔ جب میں ندیم کے ساتھ فلموں میں مصروف تھا اس کے باوجود میں تمہیں ایک دوست اور بھائی سمجھتے ہوئے مشورے دیتا رہتا تھا۔ کیونکہ تم پاکستان کے ایک عظیم ہیرو ہو۔ آج میں جو کچھ ہوں صرف اور صرف تمہاری وجہ سے ہوں۔“

پرویز ملک کہتے ہیں۔ ”اور یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ میں نے وحید مراد سے جو کچھ کہا وہ حرف بہ حرف درست ہے مگر میرے لیے یہ بات بڑی تکلیف دہ ہے کہ میں نے وحید مراد کے ساتھ بے وفائی کی۔ یہ سراسر جھوٹ اور منہ پیرو بیگنہ ہے۔ میں نے ہم دونوں، قربانی، لچل، انتخاب، پہچان، مہربانی پروڈیوسر کی خواہش اور تقسیم کاروں کی ڈیمانڈ کے مطابق بنائی تھی۔“

پرویز ملک اس حوالے سے مزید کہتے ہیں۔ ”وحید مراد اور ہمارے چند افسین نے ہمیشہ ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر میں آج بھی وحید مراد کو ایک بہت بڑا اداکار مانتا ہوں۔ وحید مراد کا مقابلہ ہم بھارت کے بڑے بڑے ہیروؤں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ گانوں کی پچر انٹرین میں بھی وحید مراد کو کمال مہارت تھی۔ آج یہ بات میں فخر کے ساتھ کہوں گا کہ میری فلموں میں وحید مراد نے جو پر فارم کیا تھا ان فلموں میں گانوں کی پچر انٹرین میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اس کا سارا کریڈٹ وحید مراد کو جاتا ہے۔“

وحید مراد کی کامیابی و ناکامی سے قطع نظر میں یہ بات کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ وہ دنیائے فلم کے واحد ہیرو ہیں جو دو دہائی گزارنے کے بعد بھی اپنے پرستاروں کے درمیان موجود ہیں۔

پرویز ملک کے اس اظہارِ رائے سے آپ بخوبی اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ وحید مراد اپنے اتنے اچھے دوست کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایک ایسا وقت آیا تھا جب وحید مراد کی کچھ فلمیں تابز توڑنا کام ہو گئی تھیں۔ ہمارے ہاں ایک بری روایت ہے کہ اگر کسی اداکار یا اداکارہ کی کچھ فلمیں باکس آفس پر ناکام ثابت ہوں تو وہ ان کی نگاہوں سے ایک دم گر جاتا ہے۔ اسے ناکام ہیرو دیا بہرہ نہیں سمجھا لیا جاتا ہے۔ اگرچہ فلم ایک نیم ورک ہے۔ متحدہ دو گلوں کی کارکردگی سے فلم ٹیم اور کامیاب یا ناکام ہوتی ہے مگر ناکامی کی صورت میں سارا ملہا ہیرو یا

ہیروئن پر گرتا ہے۔ وحید مراد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ فلم میرا نے ناکام فلموں کا ذمہ دار وحید مراد کو ٹھہرا کر انہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور ان کی جگہ ندیم اور دوسرے ہیروؤں کا ستارہ کرنا شروع کر دیا۔ وحید مراد پڑھ لکھے تھے۔ باشعور انسان تھے۔ انہیں تو یہ نہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ان کی بجائے ندیم کو فلموں میں کاسٹ کرنے کے ذمہ دار پرویز ملک ہیں۔ پرویز ملک تو بس اسی بات کے گناہ گار تھے کہ پروڈیوسرز نے جس ہیرو کا انتخاب کیا اسی کو لے کر فلم بنائی۔

وحید مراد کی منہ پیو سوچ نے انہیں ڈپریشن کا شکار کر دیا۔ اگرچہ اس حوالے سے ندیم صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اگر صورت حال کا مقابلہ خود وحید مراد کو کرنا چاہیے تھا جس طرز انہوں نے اپنی ذاتی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو منوایا تھا اس طرح اس موقع پر بھی اپنی فلموں کے ذریعے فلم سازوں کے اس نظریہ کو مسترد کرنا چاہیے تھا۔ ان کا ذاتی پروڈکشن ہاؤس تھا۔ ان کے پاس سرمایہ بھی تھا۔ وہ یہ کام بخوبی کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔“

وحید مراد کے بارے میں ان کے دور کے ایک اداکار ہدایت کار شوکت ہاشمی نے بھی اپنے محسوسات اور تاثرات اظہار کیا ہے۔ نئی نسل کو شاید شوکت ہاشمی کے بارے میں زیادہ علم نہ ہو۔ اس لیے ان کے بارے میں مختصر عرض ہے کہ وہ ایک پرانے ہدایت کار اور مصنف تھے۔ بہترین فلمی افسر کی بہت بہت فلمیں بنائی تھیں جن کی زندگی جاری رہی۔ انہوں نے اس دور میں ایک عشق بھی کیا۔ اس میں ناکام ہو گئے اور پھر اس عشق کو شہرت ان کے لکھے ناول ”نیا جوگ“ سے حاصل ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے کچھ فلمیں بنائیں۔ آخری عمر بحیثیت صحافی گزاری۔

پاکستان میں انہوں نے ”ڈاکٹر“ کے نام سے جو فلم بنائی تھی اس میں انہوں نے وحید مراد کو بطور ہیرو پیش کیا تھا۔ یہ وحید مراد کی چوتھی فلم تھی۔ اس کے بعد بھی وحید مراد کو لے کر کچھ فلمیں بنائیں۔ شوکت ہاشمی فلم میرے علاوہ ادیب اور صحافی بھی تھے اس لیے ان کی سوچ، فکر اور ڈٹن قابلِ غور و فکر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

”وحید مراد، سنتوش، درپن اور سدھیر سے زیادہ فریش اور ٹیلنٹڈ تھا۔ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اسے کرداروں کی روح میں اتر کر پر فارم کرتا تھا۔ وقت م اسٹوڈیو آتا، جلدی سے میک اپ کر کے سیٹ پر پہنچ جاتا۔ سین پڑھتا، مکالمے یاد کرتا، کوئی اچھا شخص ہوتا تو ہدایت کا

گیتوں کی پیکر انزیشن

وحید مراد گانوں کی پیکر انزیشن میں اپنی مثال آپ تھے۔ اس لیے ان پر ہر فلم میں زیادہ سے زیادہ گیت فلمبند کرائے جاتے تھے مگر آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان کے کریڈٹ میں کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں ان پر کوئی گیت نکل بند نہیں کرایا گیا۔ ایسی فلموں میں اولاد، دامن، میرے اپنے، آہٹ، پردہ، نہیں۔ انوکھا راج اور جوگی قابل ذکر ہیں جب کہ کچھ ایسی فلمیں بھی ہیں جن میں صرف ایک گانا پیکر انز کرایا گیا۔ ان فلموں میں ممتا، بھو بیگم، ماں باپ، انسانیت، چاند سورج، بہار و پھول برساؤ، وقت، خریدار، جیو اور جینے، دو، گونج، انٹی شہنائی، آدمی، شیشے کا گھر، نذرانہ، وعدے کی زنجیر، یہاں سے وہاں تک، چھوٹے نواب، بندن، پیاری، گن مین، کرن اور کل، دو بی بی، مانگ میری بھر دو، بہرہ اور زلزلہ شامل ہیں۔

وحید مراد کی ذاتی فلمیں

وحید مراد نے بطور فلم ساز گیارہ فلمیں پروڈیوس کیں۔ جو یہ ہیں۔ انسان بدلتا ہے، جب سے دیکھا ہے تمہیں، بہرہ اور پتھر، ارمان، احسان، سمندر، اشارہ، نصیب اپنا اپنا، مستانہ ہاسی (پنجابی) جال اور بہرہ۔

چاکلیٹی بہرہ۔ لیڈی کلر

وحید مراد کو اس کی زندگی میں بھی اور آج بھی چاکلیٹی بہرہ اور لیڈی کلر جیسے القابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ وحید مراد کے حسب حال نام دینے والا کون شخص تھا؟ یہ دہی پریم مگری تھے جو معروف صحافی، مصنف اور نغمہ نگار تھے۔ جن کا ایک پرہٹ گیت آپ نے بھی سنا ہوگا۔ ”دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں“ فلم ”جاگ اٹھا انسان“ کا گیت ہے۔

وحید کے ہدایت کار، اداکارائیں، موسیقار اور گلوکار وحید مراد نے 53 ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ ان کے ساتھ 27 اداکارائیں ان کی بہرہ وئیں بنیں۔ ان پر 292 نغمات عکسبند ہوئے جنہیں 22 گلوکاروں نے گایا۔ 23 موسیقاروں نے ان گیتوں کی دھنیں کمپوز کیں۔

کو بڑے ادب سے بتاتا۔ شوٹنگ کے دوران محنت سے کام کرتا۔ ان ڈور آؤٹ ڈور، گرمی سردی جہاں بھی شوٹنگ ہوتی وہ خوشی خوشی کام کرتا۔ بس کچھ اور خوش اخلاق تھا۔ فلمی حلقوں میں روز بروز پاپولر ہوتا گیا اور دوسرے ہیروز کو پیچھے چھوڑتا ہوا، بہت آگے بڑھ گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کا نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے لاکھوں روپے کمائے اور بڑی عزت اور مقبولیت حاصل کی۔ یہ تو وحید مراد کی وہ خوبیاں تھیں جنہیں شوکت ہاشمی نے محسوس کیا۔ اب ان کی زبانی وحید مراد کی ایک اور خوبی کے بارے میں بھی اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے۔ شاید کسی اور نے اس جانب نشاندہی نہیں کی۔ وحید مراد کو اس بات کی قدرت بھی حاصل تھی کہ وہ آنے والے دنوں کے بارے میں کچھ فلموں اور فلمی لوگوں کے متعلق پیش گوئیاں بھی کرتے تھے جو حقیقت ثابت ہوتی تھیں۔

شوکت ہاشمی کہتے ہیں۔ ”میری فلم ”ڈاکٹر“ جس کے وہ بہرہ دتے۔ اس کی تکمیل کے دوران انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا تھا۔ ”آپ جتنے بھی جن کر لیجیے۔ میری یہ فلم کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی۔ پڑھے لکھے ناظرین اور ناقدین بمصرین کی تعریف و توصیف کے باوجود ”ڈاکٹر“ بارہ ہفتوں سے زیادہ چل سکی۔ میں نے بعد میں اس سے پوچھا۔ ”تم نے فلم کی تکمیل اور اس کی نمائش سے پہلے کیسے یہ کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کامیاب نہیں ہوگی؟“

میں نے وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ ”اس کی وجہ بہرہ وئیں ہے۔ اس فلم میں تمام اداکار اور ٹیکنیشنرز پلس ہیں صرف ایک مائیس ہے اور یہ مائیس تمام ہی پلس پر بھاری ہے یعنی اس فلم کی بہرہ وئیں۔“

میں نے اسے بتایا۔ ”اس فلم کی بہرہ وئیں ہی اس فلم کی پروڈیوسر ہے اور اس کا فلم بنانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ بطور بہرہ وئیں کسی طرح اٹھائیں ہو جائے۔“

وحید کلکلا کر ہنسا اور کہنے لگا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ میں اسے بخوبی جانتا ہوں۔ وہ کبھی بہرہ وئیں نہیں بن سکتی۔ وہ اور اتنے ہے۔ بد صورت ہے۔ بھدی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس میں اداکاری کا کوئی اسرار نہیں ہے۔ بہر حال میں صرف آپ کی خاطر اس فلم میں کام کر لوں گا۔ مہرا کیا ہے، میرے پاس دس فلمیں ہیں میرا کچھ نہیں بگڑے گا

مگر اس فلم میں آپ کا کیریئر ختم ہو جائے گا۔ آپ سوچ لیجیے۔“

وحید مراد نے سچ کہا تھا۔ فلم ابھی نصف کے لگ بھگ مکمل ہوئی تھی کہ یہ آثار نظر آنے لگے کہ آگے خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ ہیروئن صاحبہ کے شوہر نامدار کی ہر بات، ہر معاملے پر مدخلت سے مجھے فلم مکمل کرنا نامکن نظر آنے لگا۔ وہ چاہتے تھے کہ فلم کا کوئی منظر کوئی سین ایسا نہ ہو جس میں ہیروئن نظر نہ آئے۔ فلم کی کہانی میرے ایک دوست نے لکھی تھی اور کہانی کے تقاضے کے مطابق جہاں جہاں ہیروئن کی انٹری ضروری تھی وہاں وہاں اس کا کردار تھا۔ ہیروئن کے شوہر (فلم کے فلساز) کا کہنا تھا کہ آپ کہانی میں ایسی تبدیلی کریں کہ ہیروئن ہر سین میں موجود ہو۔ ایسا کرنا میرے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ ہیروئن صاحبہ کا اردو تلفظ بھی بہت ناقص تھا۔ میں بار بار ٹوٹا اور سچ ادا کیگی کے لیے کہتا تو ہیروئن سے زیادہ ان کے شوہر کو ناگوار گزرتا۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ میں ہیروئن کو لٹ ڈاؤن کر رہا ہوں۔ یونٹ میں بڑا اٹھچاؤ پیدا ہو گیا۔ دو گروپ بن گئے۔ ایک گروپ میرا حامی تھا دوسرا گروپ ہیروئن اور ان کے شوہر کی ہر ناجائز بات کو بھی درست تصور کرتا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر میرے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں اس فلم سے علیحدگی اختیار کر لوں۔

میری علیحدگی کے بعد میرے ایک تالاق شاکر گردنے جو پروڈیوسر کا خوشامد تھا، فلم کو مکمل کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی اور ہیروئن اور ان کے شوہر کی خواہش کے مطابق اسکرپٹ میں تبدیلی کر کے فلم مکمل کر لی۔ ”بندھن“ ریلیز ہوئی تو اس سے عوامی رشتے کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ایسی فلم کا جو حشر ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ پہلے ہی ہفتے میں اس کا دھڑن تختہ ہو گیا۔

”بندھن“ کی نمائش کے دوسرے دن ایور نیو اسٹوڈیو میں میری وحید مراد سے ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ان دنوں میں روزنامہ ”شرق“ میں سینئر سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کر رہا تھا۔ وحید مراد میرے قریب آیا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد بولا۔ ”آپ نے بہت اچھا کیا جو ملازمت کر لی۔ اب آپ کا فلمی کیریئر ختم ہو چکا ہے۔ دل لگا کر اخبار میں کام کیجیے یہ پیشہ فلم ڈائریکشن سے زیادہ ریسپکٹ ایبل ہے۔“

اگرچہ آدمی فلم (بندھن) چھوڑ کر میں آ گیا تھا مگر اس

کے پروڈیوسر نے انتقامِ قلم کے ٹائٹل اور پبلٹی وغیرہ میں میرا نام بطور ہدایت کار تحریر کیا تھا۔ حالانکہ اس فلم میں سوائے چھ آؤٹ ڈور اور ان ڈور گانوں کی کچھ انٹرین کے میرا کوئی کنٹری بیوشن نہیں تھا۔ پروڈیوسر کی اس انتقامی کارروائی سے میرے فلمی کیریئر کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ میں نے اس صورت حال سے پہلے ہی اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بدل دیا۔ میں نے بہت مناسب وقت میں صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کل بھی زندہ تھا آج بھی زندہ ہے۔ اس کے بہت سے پرستار ایسے نوجوان ہیں جنہوں نے اسے اس کی زندگی میں نہیں دیکھا ایسے چاہنے والے اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بھی بہت سی باتیں نہیں جانتے۔ نئی نسل کے ایسے پرستاروں کی معلومات میں اضافے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پرستار کی ابتدائی زندگی کے متعلق بھی بتایا جائے۔

وحید مراد کے والد محترم ثار مراد کا تعلق سیالکوٹ شہر سے تھا۔ ثار مراد بعد ازاں کراچی آ گئے جس کے بعد انہوں نے پاکستان فلمز کے نام سے فلموں کی تقسیم کاری کا ادارہ قائم کیا اور اس ڈسٹری بیوشن دفتر سے متعدد فلمیں ریلیز ہوئیں۔ وحید مراد کا بطور طالب علم پہلا اسکول میری کلاسکو سینڈری اسکول تھا۔ اسی اسکول سے انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا اس کے بعد ایم ایس کالج سے ایف ایس سی اور آرس کالج سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے انٹلنس لٹریچر میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ میٹرک سے ماسٹر کی ڈگری تک ان کا تعلیمی کیریئر شائع رہا۔

دورانِ تعلیم وہ فراغت کے اوقات میں اپنے والد ثار مراد کے دفتر میں بھی وقت گزارتے تھے۔ جہاں فلمی دنیا کے مختلف شعبوں کی مختلف شخصیات کی آمد بھی رہتی تھی۔ اس طرح انہیں فلموں اور قلم والوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ انہی دنوں انہوں نے دو فلمیں بھی پروڈیوس کیں۔ ان کی پہلی ذاتی قلم کا نام ”انسان بدلتا ہے“ جب کہ دوسری فلم ”جب سے دیکھا ہے تمہیں“ تھی۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ان کے دوست پرویز ملک فلم سازی کی تعلیم وہ تربیت حاصل کرنے امریکا جا رہے تھے تو وحید مراد نے بھی ان کے ساتھ ہی امریکا جانے اور فلم ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر جب انہوں

نے اس بات کی خواہش اپنے باپا سے کی تو انہوں نے انہیں امریکا جانے نہیں دیا۔ وجہ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں تھی کہ وہ اپنے ماں باپ کی واحد اولاد تھے اور ان کے باپا بھائی مرادان سے بہت محبت کرتے تھے۔ چند برسوں کے لیے بھی وہ ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو سمجھایا۔ ”تمہیں فلم سازی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”کیوں؟ کیوں ضرورت نہیں؟ میرا بھی ارادہ اسی لائن کو پیش بنانے کا ہے۔“

”اسی لیے تو تمہیں ضرورت نہیں۔“ ثار مراد بولے۔

”تم فلم سازی کی حیثیت سے فلمیں پروڈیوس کرو۔ اپنا پروڈکشن ہاؤس بنالو۔ سرمایہ کاری کے لیے تمہیں کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاپا کے پاس جو روپیہ پیسا ہے وہ سب تمہارا ہی ہے۔“

نو جوان وحید مراد نے چند لمحے سوچا۔ پھر کہا۔ ”ہاں آئیڈیا تو اچھا ہے۔“

”آئیڈیا اچھا نہیں بہت اچھا ہے۔ یہیں کراچی میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اس دوران یا اس کے بعد فلم سازی شروع کرو۔ مجھے تو کچھ فلم والے کہتے ہیں تمہارا بیٹا بالکل ہیرو ٹائپ ہے۔ اسے فلموں کا ہیرو بنانا۔“

وحید مراد ہنسنے لگے۔ ”ارے نہیں پاپا! میں کیا اداکاری کروں گا۔“

ثار مراد نے بیٹے کی محبت میں اسے امریکا جانے نہیں دیا مگر اس کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے اسے فلم پروڈکشن میں لگا دیا۔ اپنی ابتدائی ذاتی فلموں میں وحید مراد نے اداکاری نہیں کی مگر ثار مراد کے دوستوں نے ان کے بیٹے کو اداکار بنادیا۔ ہدایت کار ایس ایم یوسف نے وحید مراد کو اپنی فلم ”اولاد“ میں ایک نمایاں کردار میں پیش کر دیا۔ یہ ہیرو کا کردار نہیں تھا اس کے باوجود اہم رول تھا۔ جس میں وحید مراد نے توقعات سے بڑھ کر اچھی اداکاری کر کے سب کو حیران کر دیا۔ یہ فلم 1962ء میں ریلیز ہوئی اور گولڈن جوبلی کے اعزاز سے ہمکنار ہوئی۔ اس کے بعد سنش کمار اور صبیحہ خانم نے اپنی ذاتی فلم ”دامن“ میں سینیٹر فلمی حیز کے طور پر لکھو کے ساتھ پیش کیا۔ اس فلم میں بھی وحید مراد کی اداکاری کو فلم بینوں کی بڑی تعداد نے پذیرائی کی سند عطا کی اور وحید مراد بطور اداکار فلم والوں کی نگاہوں میں آ گئے۔

اس کے بعد وحید مراد کو ان کے بہی خواہوں نے یہ

مشورہ دیا کہ اب تم مکمل ہیرو کے روپ میں خود کو پیش کرو۔ ان لوگوں میں ان کے والد محترم ثار مراد بھی شامل تھے۔ وحید مراد خود بھی چاہتے تھے کہ وہ ثانوی کرداروں کے حصار سے نکلیں اور مرکزی رومانوی کرداروں میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں۔ اس وقت تک پروڈیوسر ملک امریکا سے واپس آچکے تھے۔ وحید مراد نے پڑھے لکھے اور روشن خیال ہونے کی وجہ سے اپنے فنی سفر کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے اپنی ایک ٹیم بنائی۔ اس میں ہدایت کار پرویز ملک، موسیقار سہیل رعنا اور مصنف و نغمہ نگار مسرور انور کے اہم کردار تھے۔ اس اشتراک کے نتیجے میں وحید مراد کی ”ارمان“ جیسی ہلاک بسفر فلم وجود میں آئی جس نے نہ صرف باکس آفس پر پلانٹینم جوبلی (75 ہفتے) کا رچم لہرایا بلکہ وحید مراد کو فلم انڈسٹری کا کامیاب ترین ہیرو متوالیا۔ ”ارمان“ 18 مارچ 1966ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس ٹیم کی فلم ”احسان“ اور کچھ اور فلموں نے بھی کامیابی کا سلسلہ جاری رکھا۔

”ارمان“ کی نمائش سے پہلے یعنی 17 ستمبر 1964ء میں ثار مراد نے بڑے ارمانوں کے ساتھ بیٹے کے سر پر سپرہاسنایا۔ ان کی دہن سلی ٹھیں جو ایک بڑے اور نامور صنعت کار کی صاحبزادی ہیں۔

وحید مراد کے فلمی کیریئر پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بطور فلم ساز اپنے ادارے فلم آرٹس کے بیزنس نے انہوں نے گیارہ فلمیں بنائیں۔ جن میں پنجابی فلم ”مستانہ ماہی“ اور آخری فلم ”ہیرو“ بھی شامل ہیں۔ بطور مصنف وحید مراد کی چار فلمیں ہیں۔ ارمان، احسان، اشارہ اور ہیرو جوان کی وفات کے بعد ریلیز ہوئی۔ بطور ہدایت کار ان کے فلمی کیریئر میں صرف ایک فلم ہے اور یہ فلم بھی اشارہ۔ اس فلم کی ہیروئن شبنم تھیں۔

انہوں نے بطور ہیرو مختلف ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا۔ وحید مراد کی پہلی جوڑی زینا کے ساتھ تھی۔ زینا کے ساتھ انہوں نے 9 فلموں میں کام کیا۔ جب کہ رانی کے ساتھ 18 فلموں میں اور شبنم کے ساتھ 16 فلموں میں کام کیا۔ نیلو، نغمہ، روزنہ، روجی بانو، بہار، پامہ شریف، سنگیتا، کویتا، ممتاز، نجمہ، انجمن، وردانہ رحمن، شائستہ قیصر، نش، فہیم آراء اور چتراسنہا (بنگالی اداکارہ) کے ساتھ بھی وہ بطور ہیرو جلوہ گر ہوئے۔

کبھی کبھی کچھ فلم ساز ہدایت کار کچھ تجربے بھی کرتے ہیں جو کبھی کامیاب اور کبھی ناکام ہو جاتے ہیں۔ جیسے اسلم

پرویز جب ہیرو کی حیثیت سے ناکام ہونے لگا اور یکے بعد دیگرے اس کی بہت سی فلمیں فلاپ ہونے لگیں تو اس نے از خود فلموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کئی برسوں کے بعد ہدایت کار حسن طارق نے اسے اپنی ایک فلم میں بطور ولن کاسٹ کیا۔ غالباً یہ فلم ”شکستہ“ تھی۔ فلم ریلیز ہوئی تو فلم کے ساتھ اسلم پرویز بھی بطور ولن ہٹ ہو گیا۔ اسی طرح اپنے وقت کے بہت بڑے ہدایت کار نذر اللہ اسلام نے بھی اپنی ایک فلم ”شیشے کا گھر“ میں ایک تجربہ کیا تھا۔ وحید مراد کو ولن کے روپ میں پیش کیا تھا۔ اس فلم کا ہیرو شاہد قمران کا یہ تجربہ بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ وحید مراد کے پرستاروں نے وحید مراد کو ولن کے روپ میں قبول نہیں کیا۔ انہوں نے یہ فلم بیکسر مسترد کر دی۔ اس طرح نذر اللہ اسلام جو کامیاب فلموں کے ہدایت کار تسلیم کیے جاتے تھے ان کی یہ فلم ناکام ترین فلم ثابت ہوئی۔ ”شیشے کا گھر“ 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی جو مافی کر دار میں وحید مراد کی پہلی اور آخری فلم تھی۔

وحید مراد کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہوا کہ ان کی فلم ”رشتہ ہے پیار کا“ کی فلم بندی پہلی بار کسی یورپی ملک میں کی گئی۔ وہ فلمی دنیا کے کرکٹ کلب کے بھی اچھے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے اس کلب کے کھلاڑی کی حیثیت سے 29 میچ کھیلے۔ ریڈیو پاکستان سے ان کے 43 انٹرویوز نشر ہوئے۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں وہ پانچ بار جلوہ گر ہوئے۔ طارق عزیز کے ”نیلام گھر“ میں دو بار اور پروگرام ”گیت مالا“ میں بھی دو بار۔ اور ایک بار ”سلور جوبلی“ پروگرام میں۔ وحید مراد کے اساتذہ انہیں ان کے کارخانہ پاکستان میں ہی نہیں ہالی ووڈ میں بھی ان کی تعالیٰ کرتے ہوئے کچھ اداکار نظر آتے تھے۔

وحید مراد جس نے 20 سال تک اپنے چاہنے والوں کے دلوں پر راج کیا۔ ان کا فلمی کیریئر اکیس برسوں پر محیط ہے۔ جن میں بیس سال تک فلم انڈسٹری میں اپنا سکہ رائج رکھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہی نہیں اس جہان فانی سے گزر جانے کے بعد بھی لاکھوں دلوں میں دھڑکن بن کر زندہ رہنا اور وہ بھی سال دو سال تک نہیں 34 سال گزرنے کے بعد بھی دلوں پر راج کرنا وحید مراد کا ہی اعزاز ہے۔ اس مرتبے پر ابھی تک کوئی دوسرا فنکار نہیں پہنچا۔ ناقدین اور مبصرین اسے ”مجسم فن“ اور ”مکتبہ فن“ کے القاب سے بھی یاد کرتے ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ ہماری فلم انڈسٹری اور اس کے کرتا دھرتاؤں نے اس کی اور اس کے فن کی قدر نہیں

کی۔ اس کی فلموں کی کامیابی اور ناکامی کو ترازو میں تول کر اس کی بے قدری کی۔ جب تک اس کی فلمیں ان کے بینک بیلنس میں اضافہ کرتی رہیں، اس وقت تک اسے سر آٹھوں پر بٹھایا۔ جب اس کی کچھ فلمیں کامیابی کے معیار پر پوری نہ اتریں تو اسے نظر انداز کر دیا۔ اگرچہ ان فلموں کی ناکامی میں ان کا اپنا حصہ بھی تھا۔

بہر حال وہ عظیم تھا اور ہمیشہ فی عظمت کے میناروں میں اس کا نام اور کام روشن رہے گا۔ اس کی بہت سی باتیں ہیں جو گزشتہ 33 برسوں سے لکھی جارہی ہیں پڑھی جارہی ہیں لیکن اب تک ختم نہیں ہوئی ہیں۔

ہم بھی آپ کے لیے اپنے قارئین کے لیے اس کی مزید باتیں کرتے ہیں جواب تک نہیں کر سکتے۔

یہ نالیف روز گار فنکار 12 اکتوبر 1938ء کو بروز بدھ کراچی میں پیدا ہوا۔ اس کا نام وحید مراد رکھا گیا۔ کیونکہ اس کے والد محترم کا نام ٹارمراد تھا۔ اس لیے اس کے نام وحید کے ساتھ مراد بھی جوڑا گیا۔

وحید مراد، ٹارمراد کی واحد اولاد تھے۔ اس لیے بڑے چاؤ اور لاڈ پیار سے ان کی پرورش ہوئی۔ ماں باپ کے حد سے زیادہ لاڈ پیار کے باوجود وہ بگڑے نہیں۔ ان کے بڑوں نے انہیں اچھی تعلیم اور اچھی تربیت دی۔ وہ جوتے پہن کر ہونہار بروا کے چھنے چھنے بات تو کچھ ایسی ہی بات وحید مراد کے ساتھ تھی۔ وہ بچپن اور لڑکپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم تک ان کا تعلیمی کیریئر بہت شاندار رہا۔ انہوں نے میٹرک میری کلاس اسکول سے 1952ء میں پاکستان ایس ایم سائنس کالج سے بی اے کیا اور 1968ء میں کراچی یونیورسٹی سے انگلش ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے ایم اے کی ڈگری سلیٹیک سے شادی کے بعد حاصل کی۔

یہ بات سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہے کہ وحید مراد طالب علمی کے زمانے سے ہی فلموں کے دھندے سے وابستہ ہو گئے تھے۔ دو فلمیں بنائی تھیں مگر اس عمری میں آکر بھی بچکے نہیں۔ ان کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پھر فلموں میں اداکاری بھی کرنے لگے مگر عام فلمی اداکاروں کی طرح بے راہ روی کے راستے پر گامزن نہیں ہوئے۔ اس کی خاص وجہ ان کے والدین کی اچھی تربیت تھی۔ بیٹے کے سلسلے میں اچھی منصوبہ بندی تھی۔ انہوں نے مناسب موقع دیکھتے ہی بیٹے کی شادی کر دی۔ جس سال تمیز کے میمنے میں بیٹے کی شادی کی

سمندر

کبھی کبھی قلم ساز و ہدایت کار اپنی عام روش اور شیڈول سے ہٹ کر کچھ تجربہ کرتے ہیں جس میں کبھی کامیاب اور کبھی ناکام ہوتے ہیں۔ وحید مراد نے بھی اپنی ایک قلم "سمندر" میں اپنے شیڈول سے ہٹ کر کچھ فیصلے کیے۔ جیسے اس قلم کے لیے پرویز ملک کی جگہ رفیق رضوی کو بطور ہدایت کار لیا۔ سہیل رعنا کی بجائے دیو بھٹے چار یہ کوسائن کیا اور مسرور انور کی جگہ صہبا اختر کو بطور شاعر آزما یا۔ جنم کو اس قلم میں پہلی بار مغربی پاکستان کی قلم میں بطور ہیروئن پیش کیا گیا۔ یہ قلم 10 مارچ 1968ء کو عید الاضحیٰ کے موقع پر ریلیز ہوئی۔ اس نے 37 ہفتے چل کر محض سطور جوہلی حاصل کی۔ اس قلم کے گیتوں نے کامیابی حاصل کی جن میں "تیرا میرا ساتھی ہے لہراتا سمندر" آج بھی مقبول ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تجربہ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔

وحید مراد روڈ

کراچی شہر کو اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ اس کی ایک سڑک وحید مراد روڈ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ سابق مارشین روڈ تھا جو قیام پاکستان سے قبل برٹش افسر کے نام سے منسوب ہے۔ 1989ء میں اسی مارشین روڈ کو وحید مراد کا نام دے دیا گیا۔ وحید مراد روڈ ریونیو سیمیا کی طرف سے شروع ہوتا ہے اور گارڈن روڈ سے نکل کر گوڈین سیمیا کی سائٹ پر آ جاتا ہے اور یہاں سے انیم اے جناح روڈ سے جا ملتا ہے۔ انیم اے جناح روڈ سے آنے والے کئی راستے وحید مراد روڈ کو انیم اے جناح روڈ سے ملاتے ہیں۔ وحید مراد روڈ پر یوٹی سیمیا تھا۔ اس کے برابر سے جو راستہ جاتا ہے کچھ ہی فاصلے پر سپدھے ہاتھ پر کوہ نور سیمیا تھا۔ اس کے بالکل سامنے جوہی سیمیا تھا۔ وحید مراد روڈ پر، گوڈین سیمیا، افشاں سیمیا اور نشین سیمیا ہوا کرتے تھے۔ ان چھ سیمیاؤں میں اب صرف دو سیمیا گھر باقی رہ گئے ہیں۔ وحید مراد کے نام سے سڑک متعین کرنے کا مطالبہ وحید مراد کے پرستاروں کا تھا۔ کوئی چھ سال بعد اس پر عمل درآمد ہوا۔ اس سلسلے میں الیاس رشیدی مرحوم نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ پاکستان میں پہلا واقعہ تھا کہ کسی اداکار کے نام پر شہر کی کوئی سڑک منسوب کی گئی۔

ای سال دسمبر کے مہینے میں "ہیرا اور پتھر" ریلیز ہوئی۔ جو اچھڑ مراد کی چوتھی یا پانچویں فلم تھی۔ شمار مراد صاحب نے بیٹے کے فلمی کیریئر کے بارے میں بھی نہیں سوچا کہ اس طرح اس کی عوامی مقبولیت اثر انداز ہوگی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بیٹے کو اخلاقی طور پر حجابات قدم رکھنے کے لیے ایسا کیا۔ یہ کسی اداکار کے لیے بوارنگی اقدام ہوتا ہے مگر اللہ نے ان کے نیک اقدام کا انہیں زبردست انعام دیا۔ "ارمان" 18 مارچ 1966ء میں نمائش پذیر ہوئی۔

ندیم جو اپنی پہلی فلم ہی سے ہٹ ہو گئے تھے۔ وہ بھی "پھوہری" کی کامیابی کے بعد اپنی شادی پر رضامند نہیں تھے مگر انہیں ان کے سرکاریوں کے مجبور کرنے پر شادی کرنی پڑی مگر وہ بہت خائف تھے کہ کہیں ان کی شادی کی خبر ان کی مقبولیت کو متاثر نہ کر لے مگر وحید مراد کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ وہ خوفزدہ تھے نہ ان کے والدین۔ شادی کے بعد وہ فلموں میں پہلے کی طرح کام بھی کرتے رہے اور ان کی عوامی مقبولیت میں روز بروز اضافہ بھی ہوتا رہا۔ "ہیرا اور پتھر" نے گولڈن جوہلی کامیابی حاصل کی اور "ارمان" نے پلاٹینم جوہلی کی۔

شادی کے بعد ان کے بچے بھی ہوئے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام انہوں نے عالیہ مراد رکھا اور بیٹے کا نام عادل مراد۔ دونوں کا نام عین (ر) سے شروع ہوتا ہے دونوں دادا دادی کے بھی لاڈ لے تھے۔

وحید مراد کے بارے میں کچھ لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ انہیں بچپن سے اداکاری کا شوق تھا مگر یہ حقیقت نہیں۔ انہیں لہروں میں کام کرنے کا فلمی کوئی شوق نہیں تھا اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی دونوں ذاتی فلموں "انسان بدلتا ہے" اور "جب سے دیکھا ہے جہیں" میں اداکاری ضرور کرتے مگر انہوں نے ان میں کوئی ثانوی کردار بھی ادا نہیں کیا۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ کچھ فلم والوں نے انہیں زبردستی اداکاری کرنے پر مجبور کیا۔ ان کی ساری دلچسپی تو صرف فلم سازی سے تھی۔ ان کے اداکار بننے میں ان کے علاوہ گھر کے کسی فرد کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ خود کرکٹر بننا چاہتے تھے ان کی والدہ کی خواہش کچھ اور تھی کہ ان کے والد شمار مراد انہیں سی ایس ایف جی آفیسر بنانا چاہتے تھے مگر ہوا وہی جو منظور خدا تھا۔ ان سمیت گھر کے تمام افراد کے نہ چاہنے کے باوجود وحید مراد اداکار بن گئے۔ فلموں کے ہیرو بن گئے اور ایسے بنے کہ آخری دم تک ہیرو ہی رہے۔

اداکاری میں وہ کیسے آئے یہ کہانی بھی عجب ہے۔ ایک دن ثار مراد صاحب نے درپن سے کہا۔ ”میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو سیر دینے کا ارادہ ہے۔“ درپن نے وحید مرادی طرف اشارہ کر کے کہا، جو اس وقت ان کے قریب ہی تھے۔ ”اب آپ کو کسی بھی ہیرہ کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ ہیرہ تو آپ کے اپنے ہی گھر میں موجود ہے۔“

درپن کی رائے سن کر ثار مراد صاحب کو فلم بنانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ کیونکہ درپن نے اپنی ذاتی فلم ”ساستی“ میں وحید مراد کو کاسٹ کر لیا۔ وحید مرادی یہ پہلی فلم جمعہ 23 اکتوبر 1959ء کو ریلیز ہوئی۔ الحامد اس فلم کے ہدایت کار، جے اے چشتی موسیقار اور درپن فلم ساز تھے۔ اس فلم کی کہانی اقبال رضوی نے تحریر کی تھی۔ مکالمے بھی انہی کے تھے جب کہ گیت طفیل ہوشیار پوری نے لکھے تھے۔ عکاسی کے فرائض نسیم حسین نے انجام دیے تھے۔ درپن، مجید خانم، سنو ش کمار، نذر اور طاش نے اہم کردار ادا کیے تھے۔ وحید مراد کو ایک اہم کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ ”ساستی“ سے شروع ہونے والا وحید مراد کا یہ فلمی سفر 125 فلموں پر محیط ہے۔ ”زولہ“ اس ”ساستی“ کی آخری مودی ثابت ہوئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ اچھائی خود خوشبو کی طرح پھیلتی ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ وحید مرادی ”ساستی“ میں مختصر مگر با اثر اداکاری نے یہ اثر دکھایا کہ دوسرے فلم میکرز بھی اس نئے نويے اداکاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہدایت کار ایس ایم سیف صاحب نے اپنی فلم ”اولاد“ میں بھی اس نئے اداکار کو ایک چھوٹا سا کردار دیا۔ اس فلم میں وہ نیر سلطانہ اور درپن کے بیٹے کے رول میں نمودار ہوئے تھے۔ اس مختصر کردار میں بھی وحید مراد فلم دیکھنے والوں کو اچھے لگے۔ ان کی اداکاری پسند آئی۔

وحید مراد کی اداکاری اور عوام کی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے سنو ش کمار نے اپنی ذاتی فلم ”دامن“ میں اس ابھرتے ہوئے اداکار کو زیادہ بہتر کردار میں پیش کیا۔ بطور سائیڈ ہیرو کے اس سے کام لیا۔ اس فلم میں ان کی سائیڈ ہیروئن نیلومیں۔ وحید مراد کو اس فلم میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا زیادہ بہتر موقع ملا۔ فلم بیٹوں نے اس نئے جوڑے کو نہ صرف پسند کیا بلکہ فلم میکرز کو بھی اس نئے اداکار میں پوشیدہ فنی خوبیوں کا اندازہ ہوا۔

”ارے بھئی! یہ لڑکا تو غضب کی اداکاری کرتا ہے یہ جلد ہی ہماری فلموں کی ضرورت بن جائے گا۔“ وہ جو کہتے ہیں جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ تو کچھ ایسی ہی بات اس نے اداکاری کی تھی۔ اس کی اداکاری پسند کرنے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ فلم بنانے والے تمام شاہنشاہوں کا رجحان دیکھتے ہیں۔ عوامی پسندیدگی کو پیش نظر رکھ کر فلموں کی کاسٹ ترتیب دیتے ہیں۔ فلم میکرز بڑی سنجیدگی سے اس نئے اداکار کے بارے میں منصوبہ بندی کرتے گئے۔

وحید مراد کے والد ثار مراد ایک جہاندیدہ فلم تقسیم کار تھے۔ فلم والوں سے ان کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے۔ انہوں نے فلم سازوں کے اس ارادے کو بھانپ لیا کہ فلم میکرز ان کے ابھرتے ہوئے اداکار بیٹے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انہوں نے سوچا یہ فائدہ وہ اور ان کا بیٹا خود کیوں نہ اٹھائیں۔ انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ”دیو! تم خود فلم بناؤ اور اس میں مکمل ہیرو کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم خود اپنی فنی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔“

وحید مراد اپنے باپ سے بے پناہ پیار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں اپنا بہترین بھی خواہ اور رہنما بھی سمجھتے تھے۔ ”ٹھیک ہے بابا! میں ایسی فلم بناتا ہوں۔“ اور انہوں نے ”ہیر اور پتھر“ کے پروڈیٹ پر کام شروع کر دیا۔ وحید مراد نے اس وقت کے کراچی فلم انڈسٹری کے معروف مصنف اور ہدایت کار اقبال رضوی سے ایک بالی وڈی فلم کی روایتوں کی کہانی لکھنے کو کہا۔

وہ جب کہانی لکھ کر لائے تو اس کی پسندیدگی کے بعد بولے۔ ”رضوی صاحب! آپ اس کے مکالمے بھی لکھیں گے۔“

جب وہ مکالمے لکھ چکے تو فلم ساز وحید مراد نے کہا۔ ”اس فلم کو ڈائریکٹ بھی آپ ہی کریں گے۔“ ”جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

اور پھر دونوں نے مل کر کہانی کی ضرورت کے مطابق آرٹسٹوں کا انتخاب کیا اور موسیقی کے لیے سہیل رحمان اور نغمات کے لیے مسرور انور اور موج لکھنوی کو منتخب کیا۔ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو شو بنگ شروع کر دی گئی۔ اس دوران کرنا خدا کا یہ ہوا کہ وحید مراد کے دیرینہ دوست پرویز ملک امریکا سے فلم ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت حاصل کر کے واپس

وہاں وحید مراد بطور ہیر و شہرت اور مقبولیت کے آسمان پر چاند سورج بن کر جگمگانے لگے۔ اس وقت ٹاپ کے جو ہیروز تھے۔ ان کو اس نے ابھرتے ہوئے ہیر وے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی چمک دیک سے ان کی شہرت اور مقبولیت کو کبھن نہ لگ جائے۔

دوسرے ہیروز کا ایسا سوچنا غلط نہیں تھا۔ فن اداکاری سے جس کو بھی آگاہی حاصل تھی اس نے اربان میں وحید مراد کی اداکاری دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ اس اداکار نے اداکاری کو حد کمال تک پہنچا دیا ہے۔ گویا وحید مراد نے اداکاری کا جدید اسلوب رائج کیا۔ ان میں بے جان الفاظ میں جادو بھرنے کی زبردست صلاحیت تھی۔ گیتوں کو اپنی شوخ اور چٹکل اداکاری سے تماشاخیوں کو فریفتہ کرنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری میں ہو کا ایک تازہ جھوٹکا بن کر نمودار ہوئے اور فلموں کو طعنے پڑ کر دیا۔ پاکستان میں بننے والی رومانوی فلموں کو ایک نیا اور خوشگوار موڑ دیا۔ اس نے فلم کے گانوں سے محبت کے جذبات کا ایک طوفان اٹھادیا۔ اس کی ان خدا داد خوبیوں کی وجہ سے وہ فلم انڈسٹری کے لیے ایک گویا تابیاب قرار دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی فنی جگمگاہٹ سے دوسرے فلمی ستاروں کو مانہ کر دیا۔

اس کے والد محترم نے اسے یاد دلایا۔ ”جہیں یاد ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا، اس سے پہلے کہ دوسرے تمہاری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ تم خود اپنی پسند کی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو فائدہ پہنچاؤ۔“

”جی ہاں مجھے یاد ہے وہ ڈر اڈا۔ میں بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ آپ جتنے اچھے ہیں آپ کی باتیں، آپ کے مشورے بھی اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو میں نے آپ کے کہے پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کا فائدہ پہنچایا۔ میرا تو ایمان ہے کہ جو لوگ اپنے ماں باپ کا کہا مانتے ہیں ان کے کہے پر عمل کرتے ہیں، اللہ انہیں ہمیشہ کامیاب و کامران کرتا ہے۔“

ایک محتاط جائزے کے مطابق وحید مراد کی تقریباً 125 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جن میں کچھ ناکام فلمیں بھی شامل ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مزید فلموں میں بھی اداکاری کی تھی مگر مختلف وجوہات کی بناء پر وہ ریلیز نہ ہو سکیں۔ جن میں بہت سی فلمیں مکمل ہو چکی تھیں اور کچھ غیر مکمل تھیں۔ یہ سب اگر مکمل ہو کر اسکرین کی زینت بنتیں تو وحید مراد کے کریڈٹ میں نہ صرف مزید کامیاب فلموں کا اضافہ ہوتا بلکہ ان کی

ادمان آگئے۔ کئی برسوں کے بعد دونوں بچھڑے ہوئے دوست ملے تو بہت خوش ہوئے اور وحید مراد نے اسی وقت ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ فلم ”ہیرا اور پتھر“ اب پروڈیو ملک ہی ڈائریکٹ کرے گا۔ اقبال رضوی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ فلم بن گئی اور کامیاب ٹھہری۔

”ہیرا اور پتھر“ کی کامیابی سے جہاں وحید مراد مکمل ہیر وے طور پر کامیاب ثابت ہوئے۔ وہاں پروڈیو ملک کو بھی بطور ہدایت کار شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

”ہیرا اور پتھر“ کے بعد وحید مراد نے پروڈیو ملک سے کہا۔ ”اب میری اگلی فلم تم شروع سے آخر تک اپنی پسند اور اپنے تجربے اور تعلیم و تربیت کی روشنی میں بناؤ۔“ ”ہیرا اور پتھر“ میں تو صرف تمہاری ڈائریکشن تھی۔ اس فلم میں سب کچھ تمہاری مرضی کا ہو۔“

”جو حکم سرکار کا۔“ پروڈیو ملک نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”جیسا آپ چاہیں گے، وہی ایسا ہوگا۔“

”ارمان“ ان دونوں کی دوسری فنی کاوش تھی۔ جس کے لیے پروڈیو ملک نے اس کے ہر شعبہ کو اپنی پسند اور معیار کے مطابق ترتیب دیا۔ جو کچھ فلم سازی کے بارے میں امریکا سے سیکھ کر آئے تھے اس کی روشنی میں اس فلم کو بنایا، سنوارا اور ایک اچھی فلم بنانے میں اپنی ساری فنی صلاحیتوں سے کام لیا۔

اللہ رب العزت اس کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتا ہے۔ پروڈیو ملک کی محنت، لگن، جدوجہد اور فنی صلاحیتوں کا اظہار، ایک شاندار اور یادگار فلم کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ ”ارمان“ ہر پہلو سے ایک بہترین فلم ثابت ہوئی۔ اس دور میں ہی نہیں ہر دور میں اپنی مثال آپ ہے۔ آج بھی اسی طرح تروتازہ ہے جس طرح اپنی پہلی نمائش کے زمانے میں تھی۔

”ارمان“ کی کہانی اس کے مکالمے، موسیقی، اس کے گیت، اداکاری اور فلم کی ہدایت کاری، معیار کے لحاظ سے اعلیٰ ترین تسلیم کی گئی۔ تماشاخیوں نے اسے اپنی ہر پسندیدگی سے پلایم جوئی کا اعزاز عطا کیا۔ ناقدین اور مبصرین نے اسے کامیاب فلموں کے سرکار جمو قرار دیا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس کے معیار میں، اس کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ کوئی فرق ظاہر نہیں ہوا ہے۔

”ارمان“ کی سپرڈ پر کامیابی سے جہاں پروڈیو ملک فلم انڈسٹری کے صفِ اول کے ہدایت کار تسلیم کر لیے گئے۔

فلموں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی۔

جو فلمیں ریلیز نہ ہوں ان کے بارے میں معلومات جمع کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن میں نے ”ویدو“ کے پرستاروں کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ مشکل مرحلہ بھی طے کیا ہے۔

آئیے! ان بد نصیب فلموں کے بارے میں آگامی حاصل کیجیے جن کو ریلیز ہو کر وحید مراد کے کریڈٹ میں اضافے کا موقع نہ مل سکا۔

مکمل فلموں کے علاوہ کچھ فلمیں ایسی بھی ہیں جو ساٹھ ستر فیصد تک بنی ہوئی ہیں۔ ان کی مکمل ہو جانے والی فلموں میں پہلی فلم کا نام ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ ہے۔ اس فلم کے فلم ساز صافضی اور ہدایت کار اقبال یوسف تھے۔ موسیقی کی دھنیں ناشاد نے ترتیب دی تھیں۔ تسلیم فاضلی اس کے نغمہ نگار تھے۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، شمیم آراء، صوفیہ بانو اور حنیف شامل تھے۔ وحید مراد نے اس فلم میں ڈبل رول ادا کیا تھا۔ ایک رول میں ان کی ہیروئن شمیم آراء تھیں۔ دوسرے میں صوفیہ بانو! اگر یہ فلم ریلیز ہو جاتی تو وحید مراد کی ہیروئنوں میں صوفیہ بانو کا بھی اضافہ ہو جاتا۔ یہ ریلیز فلم تھی۔ وحید مراد اس فلم سے بہت پر امید تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اس فلم میں، میں نے اپنی زندگی کا یادگار ڈبل رول ادا کیا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وحیدی آرٹ پروڈکشن کی جانب سے اس فلم کا ایک خصوصی پریس شو کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو میں ایک بار منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں اس فلم کے ہدایت کار اقبال یوسف نے اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت کی تھی۔ دیگر شرکاء میں وحید مراد مرحوم کی اہلیہ محترمہ سلٹی مراد، فلم ساز بشیر دانا والا، اسد قریشی، اداکار گلاب چانڈیو، محمود سلطان، بابر سلطان، ایس ایم بروہی اور آل پاکستان وحیدی کلب کے ممبروں نے شرکت کی تھی۔ یہ فلم ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ مار دھڑا سے بھرپور عام فلموں سے قطعی مختلف ہے۔ خوب صورت گیتوں سے مزین ایک رومانوی فلم ہے۔ جس میں وحید مراد کے ساتھ تمام اداکاروں نے بہترین اداکاری کی ہے۔ اس فلم کو دیکھنے والوں کی اجتماعی رائے یہ ہے کہ مرحوم وحید مراد کی یادگار فلموں میں اس کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس فلم کے تمام گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند گیت یہ ہیں۔

ملاوہ نظر مہرباں ہو گئی ہے۔ میرے دل کی زباں ہو گئی ہے (آواز ملکہ ترنم نور جہاں)

☆ میرا یار بڑا اثر میلا ہے (آواز احمد رشدی)

☆ تجھے چاہوں تجھے دیکھوں (آواز احمد رشدی)

”میرے چہون ساٹھی“ مرحوم وحید مراد کی دوسری مکمل فلم ہے جو آج تک ریلیز نہ ہو سکی۔ اس فلم کی پروڈیوسر نامہ اداکارہ دیبا تیکر ہیں۔ دیبا نے جب یہ فلم شروع کی تھی۔ تب اس کا نام ”مجھے تم سے پیار ہے“ رکھا تھا۔ بعد ازاں اس کا نام بدل دیا گیا اور اس کا نام ”میرے چہون ساٹھی“ رکھ دیا گیا۔ اس کے ہدایت کار محمد جاوید فاضل تھے۔ بطور ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ دیبا نے وحید مراد کے ساتھ مرکز رومانوی کردار ادا کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں محمد علی، عشرت چوہدری، لہری، زرقا، طاش اور طارق عزیز قابل ذکر ہیں۔ وحید مراد نے اس فلم میں ایک کروڑ پتی باپ کے بیٹے کا کردار بڑے احسن طریقے پر کیا تھا۔ وہ لو میرج کا قائل تھا۔ یعنی محبت کرنے کے بعد کی شادی کا قائل تھا۔ دیبا نے ایک سیٹ میڈ خاتون کا کردار بڑے اچھے طریقے سے نبھایا تھا۔ اس فلم کی کہانی علی سفیان آفاقی نے لکھی تھی جب کہ اس گھریلو اور نغماتی فلم کی موسیقی ناشاد نے ترتیب دی تھی۔ ”میرے چہون ساٹھی“ کے جو نغمات مقبول ہوئے ان میں یہ گیت بھی تھے۔

☆ چلی ایسی ہوا مستانی کہ دوپٹا بے ایمان ہو گیا (گلوکارہ مالا)

☆ ذرا ہم سے روٹھو جی۔ تم کو ماننے کو جی چاہتا ہے (گلوکار احمد رشدی)

☆ جارے جارے کارے بدرا جا (گلوکارہ نور جہاں)

☆ چاند کی نگری تاروں کا آئنا (آصف جاوید، صبیحہ خانم)

ادا کارہ فلم ساز دیبا تیکر نے یہ فلم 1971ء میں بنانا شروع کی تھی۔ یہ فلم ہر لحاظ سے ایک منفرد نغماتی اور سوشل فلم ہے۔ اس فلم کو ریلیز کرنے کا ذکر دیبا تیکر نے وحید مراد کے مداحوں سے کیا تھا مگر باوجود کوشش کے یہ فلم ریلیز نہ ہو سکی۔ جس کا دکھ وحید مراد کے پرستاروں کو ہمیشہ رہے گا۔

ایورینو پیکرز پاکستان ایک بہت بڑا فلم ساز ادارہ ہے۔ اس ادارے کی بنی ایک مکمل گھریلو رومانوی فلم ”دیا جا ساری رات“ سالوں سے مکمل ہونے کے باوجود آج تک نمائش کے لیے پیش نہ ہو سکی۔ اتنے بڑے ادارے کی ایک مکمل فلم یوں التوا کا شکار ہو جانے بڑے دکھ کی بات ہے۔ اس ادارے کے سربراہ سجاد گل اگر چاہیں تو یہ فلم ریلیز کر سکتا

ہیں کیونکہ ان کے پاس اتنے وسائل ہیں اور یہ ان کی ذاتی فلم ہے۔

”دیباچے ساری رات“ کے فلم ساز سجاد گل کے والد محترم آغا جی اسے گل اور ہدایت کار ایس ایم یوسف تھے۔ ہمیں آرام اسے ان فلم میں وحید مراد کے ساتھ مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ التوا کے شکار اس مودی کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین ہیں جب کہ اس کے تمام تر نغمات نامور شاعر قتیل شفائی کے تحریر کردہ ہیں۔

کسی زمانے میں ریڈیو پاکستان سے مہناز بیگم کی آواز میں گایا ہوا ایک نغمہ شہر ہو کر بہت مقبول ہوا تھا۔ شاید آپ نے بھی سنا ہو۔

اس مطلبی دنیا کو کوئی پیار سکھا دے

ہاں پیار سکھا دے

یہ خوب صورت گیت بھی وحید مراد کی ایک مکمل فلم ”نغمات کی رات“ کا ہے اس کے فلم ساز، مصنف اور ہدایت کار نامور شاعر شیون رضوی تھے۔ شاعر بڑی اس فلم کے موسیقار تھے۔ اس کے گانے اس کی ریلیز سے پہلے بہت مقبول ہو گئے تھے۔ اس فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، بارہ شریف، شاہد، صاعقہ اور طاہش شامل تھے۔ شیون رضوی کو اپنی اس فلم سے کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس فلم کو ریلیز کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اچانک ان کی موت واقع ہوئی یوں یہ فلم سلور اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔

”پہلی نظر“ بھی وحید مراد کی ایک مکمل فلم تھی۔ جو بوجہ ریلیز نہ ہو سکی۔ اس کے فلم ساز ظہور قریشی تھے۔ ہدایت کاری کے فرائض الحامد نے انجام دیے تھے۔ کہانی شور لکھنوی کی تھی جب کہ اسکرین پلے اور مکالمے اقبال رضوی نے لکھے تھے۔ تاج پگڈڑ کے بیڑے تلے بننے والی اس فلم میں وحید مراد، زیبا، آزاد، نرالا، شاہینہ، ترنم اور حنیف نے نمایاں کردار ادا کیے تھے مگر افسوس کہ یہ مکمل فلم بھی نمائش پذیر نہ ہو سکی۔

وحید مراد کی مکمل فلموں میں ایک پنجابی فلم ”شہری بابو“ بھی ہے۔ ایک فلم اسی نام سے بہت پہلے پاکستانی فلموں کے ابتدائی دور میں سورن لٹا کی تھی جو اس دور کی کامیاب فلم تھی۔ ”شہری بابو“ جس میں وحید مراد نے ٹائٹل رول کیا تھا لیکن فلم تھی۔ ایکشن اور رومان کا شاہکار تھی۔ اس کے فلم ساز مہاں جاوید قمر اور ہدایت کار افتخار خان تھے۔ یہ وہی افتخار خان ہیں جو اس سے پہلے وحید مراد کی ذاتی پنجابی فلم ”مستانہ ادا“ کی بھی ہدایات دے چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جال،

لورز کلب اور لورز

☆ پرنس وحید مراد فیئر کلب۔ ہیڈ آفس کلفٹن کراچی۔ ☆ آل پاکستان سینٹر وحیدی کلب۔ لاٹھی، کورنگی کراچی۔ ☆ آل پاکستان وحید مراد لورز کلب، لاہور۔ ☆ آل پاکستان وحید مراد کنٹک آف لیجنڈز، لاہور۔ ☆ شہنشاہ رومانس وحیدی کلب، کورنگی کراچی۔ ☆ ایور گرین وحید مراد گرینڈ فیئر لائٹس، سیالکوٹ، لاہور، کراچی۔ ☆ ایور گرین وحید مراد فین کلب، کراچی۔ ☆ آل پاکستان وحیدی کلب، سیالکوٹ۔ ☆ آل پاکستان وحیدی کلب، حیدرآباد۔ ☆ پاکستان لائف ٹائم کمپانی فیڈریشن۔

ان لورز کلبوں کو قائم کرنے والے اور ان کے تحت وحید مراد کی عقلمند اور بڑائی کا پرچم بلند کرنے والے محض ٹین ایجرز اور نوجوان لڑکے نہیں، بڑی عمر کے اور پختہ کار لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کلبوں کے عہدے داران اور ممبران وحید مراد کے ہارے میں نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھ کر اخبارات و جرائد میں شائع کرواتے ہیں بلکہ وحید مراد کی برسی پر فلمی اخباروں سے وحید مراد پر خصوصی ایڈیٹیشن نکلاتے ہیں۔ اس موقع پر وہ ایسے اخباروں کو اپنے کلبوں کی جانب سے بڑے بڑے اشتہارات چھپواتے ہیں اور ان خصوصی اشاعتوں کو زیادہ قیمتوں کے باوجود ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں۔ ایسے خصوصی شماروں کے لیے ان کلبوں کی جانب سے بھرپور مواد بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

بدر منیر کی عقیدت

پشتو فلموں کے لیجنڈ ہیرو بدر منیر اپنے ابتدائی دور میں کچھ عرصہ تک وحید مراد کے ذاتی ملازم رہے۔ انہوں نے (وحید مراد نے) بدر منیر کی اداکاری کی طرف دلچسپی دیکھتے ہوئے ان کے لیے پشتو فلم میں کام کرانے کی سفارش کی۔ لہذا انہیں (بدر منیر کو) پشتو فلم ”یوسف خان شیر بانو“ میں ہیرو کے طور پر منتخب کر لیا گیا۔ بدر منیر پشتو اور دو پنجابی فلموں میں کام کرنے لگے۔ پشتو فلموں کے سپر اسٹار بن گئے مگر وحید مراد کی عزت احترام میں کمی نہیں آنے دی۔ تمام عہدہ وحید مراد کو ”آقا“ کہہ کر پکارتے رہے۔

سپوتی، میرا مائی، پرواہ نہیں اور راجا کی آئے گی بارات بھی ان کی کامیاب فلمیں ہیں۔ اس فلم کی کہانی تو ہر کاظمی نے لکھی تھی۔ نعمات خواجہ پرویز کے تھے۔ موسیقی وجاہت عطرے نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم میں وحید مراد کے ساتھی فنکاروں میں ننہو، اعجاز، نیر سلطانہ، اقبال حسن، ساون اور سلطان راہی تھے۔ اداکارہ رانی وحید مراد کی ہیروئن تھیں۔ وحید مراد کو اپنی اس فلم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ”مستانہ مائی“ کی طرح ان کی یہ پنجابی فلم بھی کامیابی کے شاندار ریکارڈ قائم کرے گی۔ افتخار خان کی بھرپور ڈائریکشن سے بھی وہ بہت پر امید تھے مگر افسوس کہ پوری فلم ہر طرح سے مکمل ہونے کے باوجود نمائش پذیر نہ ہو سکی۔

”پیاسا سندھ“ جیسے خوب صورت نام کی فلم وحید مراد کی ایسی فلم ہے جس کی نمائش کی پیاس اب تک نہیں بجھ سکی ہے۔ اگرچہ یہ فلم مکمل ہو گئی تھی۔ یہ فلم ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم تھی۔ اس کے فلم ساز امان مرزا اور نذیر احمد تھے۔ اس کی کہانی بشیر نیاز نے لکھی تھی۔ موسیقی ایم اشرف نے ترتیب دی تھی۔ وحید مراد، محمد علی، بابہ شریف، نیر سلطانہ، حبیب، خالد سلیم موٹا، سانی، ملک انوکھا نے اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے مگر صد افسوس کہ اتنی بڑی کاسٹ اور کریڈٹ کی فلم اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔

اب کچھ ان فلموں کا ذکر جو مختلف حالات اور واقعات کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکیں۔ ان میں ایک فلم ”انجانے راستے“ تھی۔ اس کے ہدایت کار رفیق رضوی (بابو) تھے۔ آئی ایچ جعفری فلم ساز تھے۔ ”انجانے راستے“ کی کہانی صحافی اور مصنف آغا نذیر کاوش نے تحریر کی تھی۔ دیوبند چارہ اس کے موسیقار اور سرور انور نغمہ نگار تھے۔ ستر فیصد بنی ہوئی اس فلم میں وحید مراد کی ہیروئن شبنم تھیں۔ نازیگم، سنوٹش رسل، آزاد، آغا طاہش اور محمد علی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔

اداکار فلم ساز قوی خان نے وحید مراد کو کیلوٹر ہیرو ولے کر دو فلمیں بنائی تھیں۔ ان میں ایک فلم ”آنکھوں کے تارے“ اور دوسری ”حتا“ تھی۔

”آنکھوں کے تارے“ کی کہانی اطہر شاہ خان نے تحریر کی تھی۔ اس کی موسیقی کمال احمد نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں وحید مراد، نشو، دیبا، صاعقہ، لہری، عثمان بیڑا، قوی خان اور طاہش شامل تھے۔ یہ فلم 1976ء میں زیر تکمیل تھی۔ ساٹھ فیصد تک بننے کے بعد فنانس کی کمی کے باعث التواء کا شکار ہو گئی اور آگے نہ بڑھ سکی۔

قوی خان کی دوسری فلم ”حتا“ بھی تھفل کا شکار ہو کر مکمل نہ ہو سکی۔ ”حتا“ کے ہدایت کار اقبال اختر تھے۔ موسیقی کمال احمد کی تھی۔ کہانی بی ایچ بخاری نے تحریر کی تھی۔ اے حید اس کے عکاس تھے۔ وحید مراد، بابہ شریف، نوین تاجک، شاہد، نیر سلطانہ اور قوی خان اس فلم کے نمایاں فنکاروں میں شامل تھے۔ نوین تاجک وحید مراد کی ہیروئن تھیں۔ اس فلم کو بھی مکمل ہونے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔

یاد رہے کہ قوی خان نے بطور فلم ساز کوئی درجن بھر فلمیں بنائیں مگر وہ جتنے اچھے بڑے اور اعلیٰ معیار کے اداکار ہیں۔ ان کی پروڈیوس کی ہوئی فلمیں باکس آفس پر اس کے برعکس ثابت ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ فلم کا سبجیکٹ تو بہت اچھا تلاش کر کے اس پر کہانی لکھواتے تھے مگر فلم کی کامیابی کے لیے جو گیمبر یا معاملہ ڈانا ضروری ہوتا ہے۔ اس سے گریز کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان کی چند ایک ہی فلمیں باکس آفس کے معیار پر پوری اتریں جن میں ”جوری جوری“ اور ایک آدھ فلمیں تھیں۔ اپنی فلموں کی مسلسل ناکامی کے بعد انہوں نے فلم سازی سے توبہ کر لی۔

وحید مراد کی نامکمل فلموں میں ایک فلم ”علی منزل“ بھی تھی۔ جسے رفیق رضوی (بابو) ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ آغا نذیر کاوش اس کی کہانی کارناٹاد موسیقار اور تسلیم فاضلی نغمہ نگار تھے جب کہ اس فلم کی عکاسی رفیق رضوی کے صاحبزادے سعید رضوی سرانجام دے رہے تھے۔ 80 فیصد سے زائد فلم بنائی جا چکی تھی کہ اس کے فلم ساز نے اس کا نام تبدیل کر کے ”اپنی منزل اپنی راہیں“ کر دی۔ جانے اس نام کی تبدیلی کا اثر کیا کوئی اور وجہ کہ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ نہ راہیں، ہموار ہیں نہ منزل تک۔ فلم اچانک روک دی گئی۔ اس نامکمل رہ جانے والی فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، شائستہ قیصر، نشو، منور سعید، شاہ لواز، عرش منیر اور سانی شامل تھے۔ تبدیل شدہ نام ”اپنی منزل اپنی راہیں“ کے نام سے اس کے گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول ہوئے۔ جن میں سے چند گیت درج ذیل ہیں۔

☆ پیار دنیا سے بے نیاز ہوا (آواز۔ نور جہاں)

☆ اپنے ہوئے پرانے (آواز۔ نور جہاں)

☆ سلام آیا بہاروں کا (آواز۔ مالا)

فلم ساز محمد امین اور ہدایت کار رفیق اختر کی فلم ”ویدار“

بھی وحید مراد کی ریلیز نہ ہونے والی فلموں میں ایک تھی۔ اس فلم کی کہانی ذکی، بی اے نے تحریر کی تھی۔ موسیقی ایم اشرف کی

تھی جب کہ دو نامور شاعروں سرور انور اور فیاض ہاشمی نے اس کے گیت لکھے تھے۔ عکاسی مسعود الرحمان کی تھی۔ یہ فلم کافی حد تک بن چکی تھی۔ بلکہ اس کی پہلی ٹی بھی زور و شور سے جاری تھی کہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر ”دیدار“ مکمل نہ کی جاسکی۔ کہتے ہیں کہ بس تھوڑا سا ہی اس کا کام باقی رہ گیا تھا۔ اس فلم میں وحید مرادی ہیروئن شیم آراء تھیں جب کہ دیگر کاسٹ میں دیبا، لہری، نبیلہ اور جمیل نکل شامل تھے۔

وحید مرادی کی ایک نامکمل فلم ”من کی آس“ بھی تھی۔ جس کی تکمیل اور نمائش کی آس پوری نہ ہو سکی۔ اس کے فلم ساز سعید ملک اور ہدایت کار مشتاق رضوی تھے۔ کہانی اور مکالمے نذر ابراہیم اور راقب نوشانی نے تحریر کیے تھے۔ موسیقی رفیق علی اور کمال احمد کی تھی۔ نقد نگار سعید گیلانی اور تسلیم فاضلی تھے۔ ”من کی آس“ کے کئی گانے ریڈیو پاکستان سے نشر ہو کر مقبول بھی ہوئے۔ اس دور میں جب فلمیں بن رہی ہوتی تھیں تو ان کی تشہیر کے لیے فلم ساز اپنی فلموں کے گانے ریڈیو پر نشر کرنے کے لیے فراہم کر دیا کرتے تھے۔ ”من کی آس“ کے ایسے ہی چند گیت تھے۔

☆ من کی آس ہوئی نہ پوری۔ پیار کا سپنا ٹوٹ گیا (آواز نور جہاں)

☆ تمہی فضاؤں میں تو ہے صنم۔ اللہ قسم (آواز۔ غلام عباس، شازبہ)

اس فلم کی کاسٹ میں وحید مراد، نجمہ، غلام محی الدین، صبیحہ خانم، طالش، حنیف اور اسلم پرویز شامل تھے۔

”زیو“ بھی وحید مرادی کی ایک نامکمل فلم تھی۔ اس کے فلم ساز نصیر ملک اور ہدایت کار مسعود پرویز تھے۔ روچی بانو، وحید مرادی ہیروئن تھیں۔ جب کہ اس فلم کا دوسرا دو مان ہیرو ہارہ شریف اور تو قی خان کا تھا۔ صبیحہ خانم، سنو ش کمار اور اسلم پرویز اس فلم کے دیگر اہم کردار ادا کرنے والوں میں تھے۔ یہ ایک سوشل فلم تھی۔ مکمل ہو جاتی تو قی امکان تھا کہ کامیاب بھی ہوتی۔

متذکرہ بالا فلموں کے علاوہ وحید مرادی اور بھی فلمیں ہیں جو 30 فیصد، 40 فیصد اور 45 فیصد تک بنی ہوئی ہیں جب کہ چند فلمیں ایسی بھی ہیں جن کا تھوڑا سا ہی کام باقی رہ گیا تھا۔ ان کی مزید نامکمل فلموں میں، میں نے کیا جرم کیا؟ امم، اب کیا ہوگا، بات اک رات کی (جس میں ریشماں ان کی ہیروئن تھیں) ”دن ایک رات کی“ (جس میں شیم آراء ان کی ہیروئن تھیں) ہدایت کار پرویز اختر کی فلمیں برسات،

تیرا نام ہے محبت، پیغام اور وحید مرادی کی ذاتی فلم ”مقدّر“ قابل ذکر ہیں۔ وحید مراد یہ فلم ادا کار شاہد کے اشتراک سے بنا رہے تھے جو 40 فیصد تک مکمل ہو چکی تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار حسن طارق تھے۔ ہارہ شریف اس فلم میں وحید مرادی کی ہیروئن تھیں کہتے ہیں کہ یہ فلم شاہد کی بے پروائی کی وجہ سے مکمل نہ ہو سکی۔

وحید مرادی کی نامکمل فلموں میں گھر کی عزت، عقیدت اور وفا بھی ہیں جو تکمیل کے دوران مختلف وجوہ کی بنا پر رک گئیں اور دوبارہ شروع نہ کی جاسکیں۔

وحید مراد کے پرستاروں کی خواہش ہے کہ وحید مرادی جو فلمیں مکمل ہیں اور کسی نہ کسی وجہ سے نمائش کے مرحلے تک نہیں پہنچ سکی ہیں انہیں اسکرین کی زینت بنایا جائے اس سلسلے میں وہ درخواست گزار ہیں کہ ان فلموں کے مالکان یا ان کے وارث اس سلسلے میں اپنے وسائل بروئے کار لا کر ان کی نمائش ممکن بنائیں۔ پرستاروں کا کہنا ہے کہ ان فلموں کی کامیابی یقینی سمجھی جائے اگر وحید مرادی کی بیشتر پرانی فلمیں پار بار دکھائی ہوئی فلمیں اب چلتی ہیں اور اچھا خاصا برس کر رہی ہیں تو یہ نئی فلمیں بھی اللہ نے چاہا تو باکس آفس پر کامیاب ہوں گی۔

مکمل فلموں میں اقبال یوسف کی فلم ”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ دیا نیلم کی ”میرے جیون ساتھی“ فلم ساز آغا جی اے گل اور ہدایت کار ایس ایم یوسف کی ”دیا جیلے ساری رات“ اور نامور ہدایت کار افتخار خان کی ڈائریکشن میں بنی رنگین پنجابی فلم ”شہری بابو“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

”ہم بھی تو بڑے ہیں راہوں میں“ اور رنگین پنجابی فلم ”شہری بابو“ کے پروڈیوسروں یا ان کے وارثوں کو بھی چاہیے کہ ان فلموں کی نمائش میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کر کے انہیں ریلیز کریں تاکہ وہ سرمایہ جو ان فلموں کی وجہ سے منجمد ہو گیا ہے، اسے منافع کے ساتھ حاصل کریں۔

آج حسن طارق زندہ ہوتے تو شاید وہ ریاض شاہد (عابدہ ریاض) کی فلم ”بہشت“ اور ایم صادق مرحوم کی رکی ہوئی فلم ”بہار پھول برساؤ“ کی طرح وحید مرادی ان فلموں کو بھی مکمل کرا کے ریلیز کرتے۔

اگر متذکرہ بالا فلمیں ریلیز ہو جائیں تو وحید مراد کے کریڈٹ میں کچھ اچھی اور کچھ بہت اچھی فلموں کا اضافہ ہو جاتا مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ بہر حال ان کی کم و بیش

واضح ثبوت نہیں کہ انہیں ہم سے پچھڑے 33 سال ہو گئے ہیں پھر بھی ان کے لاکھوں چاہنے والے انہیں اب تک بھلا نہیں پائے ہیں۔ ان گنت لوگوں کے دلوں میں وہ آج بھی دھڑکن بن کر دھڑکتے ہیں۔

بات وحید مراد کی پسندیدگی اور چاہے جانے کی چل نکلی ہے تو اس سلسلے میں کچھ وچپ و غیر معمولی واقعات و حالات بیان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ باتیں اس دور کی ہیں۔ جب آتش جوان تھا۔ ہمارا خوہر و ہیر و شہرت اور مقبولیت کے آسان پر چمگوار تھا۔

1971ء کی بات ہے ماسکو (روس) میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا انعقاد ہوا تو اس فلمی میلے میں پاکستان سے وحید مراد، محمد علی، زیبا وغیرہ نے شرکت کی۔ پاکستانی فلمی صنعت کی نمائندگی کرنے والے اس وفد کی جہاں بڑی آؤ بھگت کی گئی وہاں ایک روسی اداکارہ آئری حلیف نے وحید مراد کو دیکھا تو اس کا حال یہ تھا کہ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کچھ چلا میں۔ پہلی نظر میں ہی وہ ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ فلمی میلے میں وحید مراد کی فلم ”ارمان“ دکھائی گئی تو اس سے متاثر ہو کر کئی روسی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے وحید مراد کو اپنی فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی جب کہ دوسری طرف روسی اداکارہ آئری حلیف وحید مراد کے محلے پڑ گئی۔

”مگر میڈم! میں آپ کو اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔“
 ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“
 ”میں شادی شدہ ہوں۔ میری بیوی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی میں نے گھر بھی جانا ہے۔“

مگر اس نادان خاتون پر وحید مراد کے کلام نرم و نازک کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ وہ وحید کے ساتھ پاکستان آنے پر ہلند ہو گئی۔ بڑی مشکلوں سے وحید مراد نے اس سے جان چھڑائی اور روسی فلم سازوں سے بھی معذرت کی کہ میرے لیے پاکستانی فلمیں ہی کافی ہیں۔ وفد کے دیگر ممبران نے جن میں کچھ سرکاری عہدے دار بھی تھے۔ انہوں نے پاکستان واپس آنے کے بعد بتایا۔ ”وحید مراد صاحب یہاں اپنے ملک میں ہی خواتین کی دیوانگی کا سبب بنیں بنے ہیں۔ بیرون ملک بھی انہیں دیکھنے والی لڑکیاں اور خواتین دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کی گرویدہ ہو جاتی ہیں۔“

لڑکیوں کی دیوانگی کا ایک واقعہ 1974ء میں بھی منظر عام پر آیا۔ پنجاب یونیورسٹی کیمپس کی پندرہویں خوہر

جو 125 فلمیں نمائش پذیر ہوئی ہیں ان میں بھی ان کا اداکارانہ فن عروج پر نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ان کی کچھ فلمیں ناکام بھی ہوئیں لیکن ان کا فن ان فلموں کی ناکامیوں سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہوا۔ وہ ہر فلم میں فن کا ایک ایسا گل کھلا گئے جس کی خوشبو آج تک لوگوں کی سانسوں اور ذہنوں میں اسی طرح بسی ہوئی ہے جسے کوئی فراموش کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ فن کی اصل معراج یہی ہے کہ وہ ہمیشہ قائم و دائم رہے۔

فن کو جلا بیٹھنے والا وحید مراد اپنی ذات کی جنگ میں پہلے ہی شکست کھا گیا ہو لیکن فن کے ہاتھوں کبھی مغلوب نہیں ہوا۔ 1982ء تک ہر سال اس کی فلمیں اسی اوسط سے ریلیز ہوتی رہیں جو ان کے ابتدائی سالوں سے چلتا آ رہا تھا۔ یہ شخص غلط اور بے بنیاد پروپیگنڈہ تھا کہ وحید مراد اپنے فنی کیریئر کے آخری چند برسوں میں فن کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ اگر ہم ان کے آخری پانچ سالوں کا جائزہ لیں تو یہاں طے چلا کہ مفاد پرستوں نے ان کے خلاف اتنی گھناؤنی سازش کی تاکہ یہ عظیم فنکار فن کے ہاتھوں اپنی شکست تسلیم کر کے اپنی موت آپ مر جائے۔

1979ء میں وحید مراد کی 7 فلمیں ریلیز ہوئیں جب کہ محمد علی کی 11 اور ندیم کی صرف 2 فلمیں نمائش پذیر ہوئیں۔ 1980ء میں جو ہماری فلمی صنعت کا بھرائی سال تھا۔ وحید مراد نے 5 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے ان کے برعکس ندیم کی 7 اور محمد علی کی صرف 2 فلمیں ریلیز ہو سکیں۔ 1981ء میں وحید مراد کی 9 فلمیں منظر عام پر آئیں۔ محمد علی کی گیارہ فلمیں جب کہ ندیم کی صرف تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ 1982ء میں وحید مراد کی سب سے کم یعنی صرف تین فلمیں نمائش پذیر ہوئیں جب کہ محمد علی کی چھ اور ندیم کی آٹھ فلمیں اسکرین کی زینت بنیں۔

اس تخمینے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فلموں کی کمی بیشی کا شکار صرف وحید مراد ہی نہیں رہے۔ ہر بڑے فنکار کو اس نازک مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ پھر کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ اپنے آخری برسوں میں وحید مراد فلموں کے حوالے سے کمپری کا شکار ہو گئے تھے۔

ان کی ذات بات کو ان کے فن سے منسوب کرنے والے نہ صرف ان کے فن کی بے قدری کر رہے ہیں بلکہ انھوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ وہ بھلائیوں کے ہاتھوں کیسے شکست کھا سکتا ہے؟ کیا یہ امر وحید مراد کے فن کی عظمت کا

شہنشاہ رومانس، ڈاکو کے روپ میں

وحید مراد برصغیر کے واحد ہیرو ہیں جنہوں نے ایک ہی سال میں مسلسل تین فلموں میں ڈبل رول کیے ہیں۔ جن میں ایشین، ناگ منی، دولت اور دنیا شامل ہیں۔ دولت اور دنیا میں وحید نے پہلی بار ڈاکو کا رول کیا۔ بل ازیں وہ خالصتاً رومانس کے شہزادے کے طور پر فلموں میں نظر آتے تھے۔ اس مختلف کردار میں بھی وحید نے ناظرین کو متاثر کیا۔ اس کردار میں وہ پینٹ اور شرٹ میں ملبوس نظر آئے جب کہ ہماری فلموں کے ڈاکو لانا کرتے یا شلواریں میں دکھائے جاتے تھے۔ اس فلم میں ان کا ایک رول ڈاکو کا تھا تو دوسرا معصوم کا۔ ڈاکو کے کردار میں انہوں نے لازوال کردار نگاری کی اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہر رنگ میں اپنی اداکاری کا جو ہر دکھا سکتے ہیں۔ اس فلم کی سپر ہٹ کامیابی کو صرف اور صرف وحید مراد کی پرفارمنس قرار دیا گیا کیونکہ اس فلم کے ہدایت کار خلیفہ سعید احمد کی اردو فلموں میں کوئی ویلیو نہیں تھی جب کہ اس کی دونوں ہیروئیں عالیہ اور روزینہ دوسرے درجہ کی اداکارائیں تھیں۔

چاہت کا ایک انداز

وحید مراد کے چاہنے والوں میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ وحید مراد کے انتقال کے بعد بشاد سے روہینہ خان نامی ایک خاتون ایک بڑی سی گاڑی میں اپنے چار گارڈز کے ہمراہ ہر جمعرات کو ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کرتے ہوئے گلبرگ III وحید مراد کی قبر پر حاضری دینے آتی ہے پھولوں کی چادر چڑھاتی ہے فاتحہ پڑھتی ہے اور دلہنیں پشاور لوٹ جاتی ہے۔

مشاہیر شعراء کا کلام اور وحید کی فلمیں

وحید مراد کی فلموں کو ایک اعزاز یہ بھی حاصل رہا ہے کہ اردو ادب کے نامور شاعروں کا کلام ان میں شامل کیا گیا۔ جن میں اختر شیرانی (فلم جان آرزو)، احسان دانش (تم ہی ہو محبوب میرے)، شان الحق حقی (پھر چاند نکلے گا)، فیض احمد فیض (چاند سورج)، داغ دہلوی (جاگ اٹھا انسان، گونج اٹھی شہنائی)، آغا شہر کا شعری (کنیز)، معین احسن جتوئی (چاند سورج) قابل ذکر ہیں۔

لڑکیاں وحید مراد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کلاس روم سے غائب رہنے لگیں۔ جب پرنسپل صاحب کے علم میں یہ بات آئی تو انہوں نے اس کا سخت نوٹس لیتے ہوئے ان لڑکیوں کو یونیورسٹی سے نکال دیا۔ یہ پرنسپل صاحب جن کا نام رؤف قریشی تھا صحافت سے بھی انہیں شوق تھا۔ انہی دنوں انہوں نے ”اخبار جہاں“ کراچی کے لیے وحید مراد سے انٹرویو کرتے ہوئے کہا۔ ”وحید صاحب! آپ جانتے ہیں کہ آپ کی مقبولیت کا جادو آج کی لڑکیوں کا مستقبل تباہ کر رہا ہے۔“

وحید مراد کے استفسار پر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ان لڑکیوں کی حرکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس جرم میں وہ یونیورسٹی سے نکال دی گئی ہیں۔

اس پر وحید مراد نے جواب دیا۔ ”جن میری بہنوں نے ایسا کیا بہت برا کیا۔ یہ حرکت اچھی نہیں۔ کلاس روم سے غائب ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ میں آپ کے توسط سے ایسی لڑکیوں تک اپنا یہ پیغام پہنچانا چاہتا ہوں کہ خدا را آئندہ کوئی لڑکی ایسے جرم کی مرتکب ہو کر اپنی تعلیم کو نقصان نہ پہنچائے۔ ان کے ایسے عمل سے ان کے خاندان کی بدنامی اور ان کے مستقبل پر داغ لگ جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کی اس دیوانگی نے مجھے ایک فلمی ہیرو کے طور پر نہیں ایک برے اور ناکردہ لکناہ کا مجرم بنا دیا ہے۔“

اس کے بعد انہوں نے رؤف قریشی صاحب سے کہا۔ ”میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ ان نادان لڑکیوں کو معاف کر کے یونیورسٹی میں انہیں پھر سے داخلہ دلوا دیں۔“

”میں آپ کی باتوں اور آپ کے اخلاق و آداب سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔“ قریشی صاحب بولے۔ ”اور اب مجھ پر یہ راز عیاں ہوا کہ آپ کی پرسنالٹی ہی کچھ ایسی ہے کہ جو آپ کو دیکھ لے وہ آپ کا بن جائے۔“ نامور مصنف، ڈائریکٹر اور صحافی علی سفیان آفاقی نے ایک بار وحید مراد کی باتیں کرتے ہوئے لکھا تھا۔

1969ء کی بات ہے۔ میں ناظم آباد کراچی میں اپنے عزیزوں کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کی فیملی بالخصوص خواتین شام کو تیار ہو کر اپنے شوہروں کے ساتھ باہر چلی جاتی تھیں۔ ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ایک عزیز سے پوچھ بیٹھا۔ ”آپ لوگ اکثر شام کو باہر کیوں چلے جاتے ہیں۔ کیا کسی خاص کام کے لیے جاتے ہیں یا یہ صرف تفریح کے

لیے؟“

وہ صاحب بولے۔ ”آفاقی صاحب! آپ سے کیا پردہ، ہم لوگ شام کو وحید مراد کی فلم ”عندلیب“ دیکھنے چلے جاتے ہیں۔“

”اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ لوگ واقعی وحید مراد کو دیوانہ وار چاہتے ہیں۔“ آفاقی صاحب کا کہنا ہے۔ ”وحید مراد جیسا کہ بزرگ پاکستان بھر میں کسی اور فلمی ہیرو کو نہ مل سکا۔“ کوئی کسی کو خواہ مخواہ نہیں چاہتا۔ کوئی خاص بات ہوتی ہے جب ہی اس کے خوالے سے وہ چاہا جاتا ہے۔ وحید مراد کی پاپولٹیری کا ایک واقعہ یہ بھی ہے۔

22 فروری 1974ء میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں پاکستان میں اسلامی سربراہی کافرنس ہوئی تھی جس میں یاسر عرفات، شاہ فیصل، کرنل قذافی، عیدی امین، سلطان قابوس، انور سادات، شیخ مجیب الرحمن اور شاہ ایران جیسے اسلامی ممالک کے سربراہوں نے شرکت کی تھی۔ لاہور کے اسپتلی ہال میں جب اسلامی سربراہان کو عشائیہ دیا گیا تھا تو ہماری فلم انڈسٹری کی کئی معروف شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن میں وحید مراد، محمد علی، ندیم، زیبا، نور جہاں، مہدی حسن، آغا جی اے گل، حسن طارق، سیف الدین سیف، سنسٹوکار، مصیہ خانم، رانی اور شبنم قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر سیف الدین سیف، محمد علی اور وحید مراد نے تقریریں بھی کیں۔ اس موقع پر وحید مراد نے انگلش اور عربی زبان میں تقریر کی تو حاضرین ششدر رہ گئے۔ وحید مراد انگریزی کی طرح عربی بھی بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ ان کے بہت سے قریبی ساتھیوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ وحید مراد عربی زبان سے بھی اس قدر آشنائیں کہ روانی سے عربی میں بھی تقریر کر سکتے ہیں۔ اگلے روز بہت سے اخباروں اور جریڈوں میں خبر کی صورت میں وحید مراد کی اس خاص خوبی کا ذکر کیا گیا تھا۔

وحید مراد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں انگریزی اور عربی کے علاوہ بھی کئی غیر ملکی زبانیں آتی تھیں۔ انہوں نے اپنی طالب علمی کے دور اور اس کے بعد بھی فرصت کے اوقات میں کئی غیر ملکی زبانیں سیکھی تھیں۔

وحید مراد کی عوامی مقبولیت کا ایک اور واقعہ بھی آپ سے شیئر کروں گا۔ مئی 1975ء کو فلم کے کچھ سنجیدہ اور پڑھے لکھے لوگوں نے فلموں میں تیزی سے بڑھتی ہوئی عریانی اور فحاشی کے خلاف احتجاجی ریلی نکالی تھی۔ یہ وہ دور

تھا جب ہماری فلمی صنعت میں کچھ نااہل اور نان کرسٹل لوگ قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے فلموں کو عریانی اور فحاشی کے زور پر چلانا شروع کر دیا تھا۔ سرکاری طور پر بھی شاید ان دنوں ان پر ہولا ہاتھ رکھا جا رہا تھا۔ اس لیے سینما گھروں میں بھی پاکستانی فلموں سے پہلے بعد میں یا درمیان میں غیر ملکی بلیو فلموں کے ٹوٹے دکھائے جاتے تھے۔ یہ احتجاجی ریلی اسی کے خلاف نکالی گئی تھی۔ اس ریلی میں فلم انڈسٹری کے نامور فلمی لوگ شامل تھے۔ یہ سارے فلمی لوگ مختلف ٹرکوں پر سوار ہو کر لاہور کے اسپتلی ہال سے لکشی چوک تک چکر لگا کر اور فحاشی اور عریانی کو روکنے کے نعرے لگا رہے تھے۔ اس موقع پر دیکھنے والی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ دیگر ٹرکوں کے مقابلے میں اس ٹرک پر لاہوریوں کی خصوصی توجہ مرکوز تھی جس پر وحید مراد سوار تھے۔ اس پر عوام کی جانب سے گل پاشی کی جارہی تھی اور وحید مراد زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اس موقع پر خواہ مخواہ حضرات کی جانب سے یہ مطالبہ بھی کیا جا رہا تھا۔

”وحید مراد! ہمیں انہادیدار کراؤ۔“ مجبور ہو کر وحید مراد کو ٹرک سے نکل کر اپنے چاہنے والوں کے درمیان آنا پڑا۔ ان کے پرستاروں نے انہیں پھولوں سے لا دیا۔ وحید مراد نے ان سے کہا۔ ”اگر آپ لوگ حقیقی متنوں میں مجھ سے پیار کرتے ہیں تو میرے سامنے وعدہ کیجیے کہ سینما گھر میں گندی، بے ہودہ اور بلیو فلمیں نہیں دیکھیں گے۔“

لاہوریوں نے ان سے وعدہ کیا۔ ”وحید مراد! ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ نہ صرف ہم سینما گھروں میں ایسی فلمیں نہیں دیکھیں گے بلکہ عریانی اور فحاشی کا پرچار کرنے والے سینما گھروں کو بھی جیس جیس کر دیں گے۔“

وحید مراد نے کہا۔ ”دیکھو دوستو! پہلے انہیں شرافت سے سمجھانا کہ یہ گندہ کھیل تماشا بند کرو۔ اس پر وہ رضامند ہو جائیں تو انہیں کوئی نقصان نہ پہنچانا اگر آپ لوگوں کی بات نہ مانیں اور ضد کریں اور اپنی حرکت سے باز نہ آئیں تب ان کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانا۔“

وحید مراد کے پرستاروں نے ایسا ہی کیا اور ان کے ڈرانے دھمکانے پر سینما گھروں میں بلیو فلموں کا تماشا دکھانا بند کر دیا گیا۔

وحید مراد کے چاہنے والوں میں نوجوان ہی پیش پیش نہیں تھے۔ بڑی عمر کے اور بزرگ حضرات بھی انہیں عزت

واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔

معروف فلم پروڈیوسر چوہدری محمد سلیم کے فرزند محمد حسین چوہدری بتاتے ہیں کہ میرے والد 1960ء سے فلم پروڈکشن سے وابستہ تھے۔ ان کی مشہور فلموں میں من موعی، آج اور ابھی، سانول، ماجھو، لکھاں وغیرہ شامل ہیں والد مرحوم کے دفتر (ایورینو اسٹوڈیو) میں فلمی لوگوں کا جھکھا لگا رہتا تھا۔ ظاہری بات ہے فلمی لوگ تھے فلمی لوگوں ہی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ والد صاحب وحید مراد سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ دفتر میں اگر کسی سے یہ غلطی ہو جاتی کہ غلطی سے بھی وحید مراد صاحب کی شخصیت یا فن پر کوئی تنقید کرتا تو اسے مارنے کے لیے اپنا جوتا اٹھا لیا کرتے تھے اور کہتے۔ ”پہلو خود کو اس قابل تو بنا کہ تو کس عظیم آدمی کا نام لے رہا ہے۔“

والد صاحب ہم سب سے کہتے۔ ”وہ درویش صفت انسان ہے۔ میں نے رات کے بجھلے پہر میں بارگاہ الہی میں اسے تہجد کی نماز پڑھتے اور گڑگڑا کر روتے ہوئے عبادت کرتے دیکھا ہے۔ وہ تو کوئی عجیب ہی دنیا کا بندہ ہے۔“

والد صاحب سے اگر کوئی یہ کہتا۔ ”آپ اگر وحید مراد کی اتنی ہی عزت کرتے ہیں تو انہیں اپنی فلموں میں ہیرو کیوں نہیں لیتے؟“

والد صاحب جواب دیتے۔ ”وہ جس کلاس کا آرٹسٹ ہے اس لیول کا ہمارے ہاں کوئی ڈائریکٹر ہی نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میں بھی اوروں کی طرح اسے ضائع کروں۔ کم از کم جو میرے دل میں ان کے لیے احترام اور ان کی شخصیت کا خاکہ ہے وہ تو قائم رہے۔“

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ فلمی فنکاروں کے پرستار عام لوگ اور ناچنے ذہن کے افراد ہوتے ہیں۔ سنجیدہ لوگ پرستاری کے چکر میں نہیں پڑتے مگر مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ معروف ڈراما نگار سیمار غزل وحید مراد کی پرستاروں میں تھیں۔ اس بارے میں ان کی ہی زبانی ان کی کہانی سنئے۔

”جب میں ریڈیو سے منسلک تھی تو میری یہ خواہش تھی کہ میں اپنے فوٹو ہیرو وحید مراد کو کبھی دیکھ سکوں۔ ان سے بات کروں۔ ان سے آؤ گراف لوں۔ آخر کار ایک دن میری یہ حسرت پوری ہو گئی۔ جب وہ ریڈیو پاکستان کی دعوت پر ریڈیو کے مہمان بنے۔ ان کا انٹرویو ریکارڈ ہونا تھا لیکن ریڈیو انجینئرن کے باہر عوام کا اس قدر جم غفیر تھا کہ خدا کی

پناہ۔ کئی گھنٹوں کے بعد ہی وہ اندر آ سکے اور ان سے میری ملاقات آخر ہو ہی گئی اور یوں میں نے اپنے خوابوں کے شہزادے کو پہلی بار دیکھا۔ ان سے ہمکلام ہوئی اور آج ایک طویل عرصے کے بعد بھی ان لمحوں کی خوشبو اپنے آس پاس محسوس کرتی ہوں۔“

کبھی عجیب بات ہے کہ وحید مراد کو اگر ایک طرف لاکھوں لوگ پیار محبت سے یاد کرتے ہیں تو دوسری طرف آج بھی ایک طبقہ ایک مخصوص طبقہ ان کی موت کے بعد بھی ان پر تنقید کرنے کا موعظ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ان کی زندگی میں ایسا ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ان پر تنقید کر کے اپنا ہتھ بڑا کرتے تھے اور ان کی موت کے بعد آج بھی ایسے افراد موجود ہیں جو ان کی ذات اور ان کے فن میں کیڑے نکال کر ان کی عظمت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر جسے اللہ رب العزت نے عزت دی ہو اسے کون ماندر سکتا ہے۔ وہ ایک بے ضرر اور اخلاص و محبت کی مٹی سے گوندھے ہوئے پیکر تھے۔ اس لیے اپنی زندگی میں بھی ایسے لوگوں کو کچھ نہیں کہا۔ کبھی منفی جذبات کے شکار نہیں ہوئے اور اب جب وہ اس دنیا میں نہیں، ان کے چاہنے والے لوگ بھی ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگتے۔ قدرت کی طرف سے انہیں یہ ہمت اور دکھا دیا جاتا ہے کہ وہ حقیقتاً ایک اچھا اور نیک انسان تھا اس لیے چوتھائی صدی سے بھی زیادہ کا عرصہ گزرنے کے بعد زندہ ہے بے شمار لوگوں کے دلوں میں دھڑکن بن کر اب بھی دھڑکتا ہے۔

دنیا نے فلم کی تاریخ اٹھا کر دکھ لیجیے۔ آپ کو ایسی کوئی دوسری مثال نہیں مل پائے گی کہ کسی اداکار کی بری اس کے مداح اس قدر شان و شوکت اور عقیدت و احترام سے مناتے ہوں۔

گزرتے وقت کے ساتھ حالات میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ پہلی تاریخ سے چودہ تاریخ تک چاند چڑھتا ہے۔ پھر پندرہ تاریخ سے گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی زندگی میں بھی ایسا اتار چڑھاؤ آتا ہے۔ وحید مراد کی شہرت اور مقبولیت کا سورج نصف النہار میں چمکتا تھا، آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا اور اس کے لیے پریشانی کا سبب بنتا چلا گیا۔ مصنف، ہدایت کار اور صحافی شوکت ہاشمی اس دور کی روداد کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

”وحید مراد کی اوپر تلے اتنی فلیس فلاپ ہو چکی کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو گیا۔ مالی پریشانی تو نہیں تھی لیکن

کاروباری اعتبار سے وہ ہیرو سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ہفتوں مہینوں اس کی کوئی شونگ نہیں ہوتی تھی۔ وقت کاٹنے نہیں کھتا تھا۔

ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وحید مراد بیمار ہے اور ڈیوس روڈ پر ایک کلینک میں داخل ہے۔ میں اس سے ملنے گیا وہ بستر پر لیٹا ہوا کوئی انگریزی ناول پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ میں نے میز پر پھل رکھے تو کہنے لگا۔ ”مجھے تو کچھ بھی کھانے کی اجازت نہیں۔ آپ ناحق لے آئے۔“ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں بچوں کے کام آجائیں گے۔“

وحید مراد بچوں کے ذکر پر کچھ بولا نہیں، چپ رہا۔ کچھ دیر کرے میں خاموشی رہی۔ میں نے اس کی صحت کے بارے میں پوچھا۔ تو کہنے لگا۔ ”ابھی تو ٹیسٹ ہو رہے ہیں شاید آپریشن ہوگا۔“

میں نے اسے تسلی دی مگر وہ بہت دل برداشتہ تھا۔ شاید اس کے گھر کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ میاں بیوی کے درمیان جس قسم کی مفاہمت سے گھر بیٹے ہیں اور زندگی خوشگوار ہوتی ہے۔ وہ شاید سسلی اور وحید کے درمیان نہیں تھے۔ اس نے کچھ باتیں کیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ شدید قسم کے ڈپریشن کا شکار ہے۔ اس ڈپریشن کی وجوہات بہت سی تھیں۔ ایک سال قبل اس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ان کے انتقال کی وجہ سے کراچی کا ڈسٹری بیوٹن آفس بالکل بند ہو گیا تھا اس کی فلمی ساکھ اور ویلیمو بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ہر وقت گھر میں رہنے سے اس کی زندگی اجیرن بن گئی تھی اور وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

ایک ماہ بعد وحید صحت یاب ہو کر کلینک سے چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ آپریشن کے بغیر ٹھیک ہو گیا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی لیکن دو ماہ بعد ایک روز وحید سے ایورنیو اسٹوڈیو کے باہر ملاقات ہوئی تو میرے قدموں تلے سے گویا زمین نکل گئی۔ وہ بہت کمزور اور بہت دبلا ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کوئی اور شخص ہے جو وحید مراد سے تھوڑی مشابہت رکھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم تو بالکل بدل گئے ہو وحید! تمہاری صحت تو ٹھیک ہے؟“

اس نے کہا۔ ”اب تو میں بہت بہتر ہوں شوکت صاحب۔ پہلے آپ مجھے تو پہچان نہ پاتے۔“

”وحید! تمہیں مکمل طور پر صحت یاب ہونے اور اپنا کھویا ہوا رنگ روپ اور وزن حاصل کرنے سے پہلے تمہیں

اسٹوڈیو نہیں آنا چاہیے تھا۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”اس سے تمہاری ویلیمو پر اثر پڑے گا۔“

ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اس کے بعد بولا۔ ”اب بھی ہمیں کون لے رہا ہے ہاشمی صاحب۔ اب تو ہم صبرت کا نشان بن کر رہ گئے ہیں۔ سوچتا ہوں اب اپنی ہی فلم شروع کر دوں۔“

اس رات گھر آ کر میں بہت دیر تک وحید کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے فلمی کیریئر کا آغاز اور انجام دونوں میرے سامنے تھے۔ وقت کا شکر بھی کتنا بے رحم ہوتا ہے۔ دلوں پر کیسے کیسے گھاؤ ڈالتا ہے جو کسی مرہم سے مندل نہیں ہوتے۔

وحید مراد کی خواہش کے مطابق ان کی آخری ذاتی فلم ”ہیرو“ بنی مگر اس کی کامیابی یا ناکامی انہیں خود دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ 11 جنوری 1985ء میں نمائش پذیر ہوئی جب کہ وہ 1983ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے۔

ان کی موت کے بعد ریلیز ہونے والی ان کی آخری فلم ”زلزلہ“ تھی جو 13 مارچ 1987ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ یعنی ان کی موت کے 5 سال بعد۔

وحید مراد کی زندگی میں زہر گھولنے والے گھر کے باہر کے لوگ ہی نہیں تھے گھر میں بھی موجود تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وحید مراد کے گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ محمد علی اور ندیم کے مقابلے میں وحید مراد کی گھریلو زندگی پرسکون اور خوشگوار نہیں تھی۔ ایک عالم جس شخص سے پیار کرتا تھا اس کی بیوی، اس کی شریک حیات اس سے خوش نہیں تھی۔

اب جب وحید مراد کے چاہنے والے انہیں وحید مراد کی شریک حیات ہونے کے حوالے سے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ انہیں ہر محفل اور تقریب میں صدر محفل بتاتے ہیں تو یقیناً سسلی بیگم کو احساس ہوتا ہوگا کہ وہ ایک عظیم شخص تھا۔ اب وہ اس کی یاد میں چپ چپ کر روتی ہوں گی۔ تڑپتی بھی ہوں گی اور انہیں اس کی فلم ”دوراہا“ کا گیت یاد آتا ہوگا تو ان کی حالت دیدنی ہونی ہوگی۔ وحید مراد نے خود پر قلایا ہوا یہ گیت کیا میرے ہی لیے گایا تھا وہ سوچتی ہوں گی اور باہمی بے آب کی طرح تڑپتی ہوں گی۔

مجھے تم نظر سے گرا تو رہے ہو
مجھے تم کبھی بھی بھلا نہ سکو گے

نادر معلومات

وحید مراد کے قومی شناختی کارڈ کا نمبر 32-G-158328-39-270 اور پتا مکان نمبر 32-G-158328 گلبرگ III لاہور ہے۔ شناختی علامت پشت پر کائے کا نشان درج ہے۔ میٹرک سائنس، انتخابی مضامین طبیعیات و کیمیا، لازمی مضامین، انگریزی، ریاضی، تاریخ و جغرافیہ اور عربی کے ساتھ اپریل 1954ء میں درجہ دوم میں پاس کیا۔ بورڈ آف سینڈری ایجوکیشن کراچی کی 18 مئی 1954ء کو جاری کردہ سند پر وحید مراد کی تاریخ پیدائش 12 اکتوبر 1938ء درج ہے۔ انہوں نے میٹرک کے سالانہ امتحان میں طبیعیات اور کیمیا کے مضامین میں اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔

ایک خامی

وحید مراد کی جہاں بہت سارے روشن اور باعث فخر پہلو ہیں وہیں ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ وہ اپنے سارے کیریئر میں اولڈ کیریئر کرنے سے گریزاں رہے۔ یہی وہ خامی تھی جس نے انہیں بہت سا پتھر اور ناقابل فراموش کام کرنے سے باز رکھا۔

رشیدی نے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ میں ان کی اس تحریر کے کچھ اقتباسات پیش کر کے اس دغراش وقوع سے آپ کو باخبر کرنے کی کوشش کروں گا۔

”میں نگار کی آخری کاپی کی تکمیل میں مصروف تھا کہ یکایک ٹیلی فون کی کھٹی بجی۔ جب فون کی کھٹی ٹی بارنچ پکٹی تو میں نے نہایت غصے سے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے سنگیتا کی آواز آئی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”الیاس صاحب! میں لاہور سے بول رہی ہوں۔“

”بولو کیا بات ہے؟“

”میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ لاہور میں یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے کہ وحید مراد کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ آپ اس خبر کے بارے میں صحیح بتائیں کہ حقیقت کیا ہے؟ خدا کرے کہ یہ افواہ ہو۔“

میں نے جواب دیا۔ ”یہ سراسر افواہ ہے۔ وحید مراد کے کسی دشمن نے اڑائی ہوئی اگر یہ جی خبر ہوئی تو مجھ تک ضرور پہنچتی۔“

میری بات سن کر سنگیتا نے خدا کا شکر ادا کیا اور فون

نہ جانے مجھے کیوں یقین ہو چلا ہے مرے پیار کو تم مٹا نہ سکو گے میری یاد ہو گی جدھر جاؤ گے تم بھی نفہ بن کر بھی بن کے آنسو ترپتا مجھے ہر طرف پاؤ گے تم شمع جو جلائی ہے میری وفانے بجھاتا بھی چاہو بجھا نہ سکو گے تبھی نام باتوں میں آیا جو میرا تو بے چلن ہو ہو کے دل تھام لو گے کسی نے جو پوچھا سبب آنسوؤں کا بتانا بھی چاہو بتا نہ سکو گے

انسان پر جب برا وقت آتا ہے تو ساری بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ وحید مراد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جب اس کی فلمیں یکے بعد دیگرے ناکام ہونے لگیں تو قلم سازوں اور ہدایت کاروں نے اس سے کڑا نثار شروع کر دیا۔ وہ سنگی سا مٹی جن کو لے کر اس نے ایک ٹیم بنائی تھی، انہوں نے بھی اس موقع پر کسی صورت میں اس کا ساتھ نہیں دیا۔ پہلے وہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی ڈیمانڈ پر کام کرتے رہے مگر اس برے وقت میں اس کے پاس آکر یہ نہیں کہا کہ وحید تم اپنی فلم بناؤ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ اس کا پاپا جو اس کا سب سے بڑا اور مخلص رہنما اور دوست تھا، اب وہ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ زندہ ہوتے تو شاید وہی اسے سنبھال لیتے۔ اس بھری دنیا میں آپ اگر کوئی اس کے ساتھ تھا تو اس کی والدہ اور اس کا ننھا بیٹا عادل مراد تھا۔

سوچئے اور غور و فکر کرنے کا مقام ہے کہ ایسے برے حالات میں کس کا جی جیسے کو چاہتا ہے؟ ایسے میں ان کی کار کا حادثہ۔ ان کا چہرہ دشمنوں سے بد نما ہو گیا تھا۔ ایک ایسا شخص ایسا اداکار ایسا ہیرو جس کی شکل و صورت کے ہزاروں نہیں لاکھوں فریفتہ ہوں، اس کے دل پر کیا بقی ہو گی؟ وہ اپنے چند ہی خواہوں کے مشورے پر اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرانے کے لیے ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے کراچی چلے آئے۔ کراچی میں اب ان کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ لہذا ان کی منہ بولی بہن ممتاز مسز کرٹل ایوب اپنے گھر لے گئیں۔ جہاں وہ چند دنوں کے بعد مردہ حالت میں پائے گئے۔

لاکھوں دلوں کی دھڑکن وحید مراد کی وفات حسرت آیات کی روداد ہفت روزہ نگار کے مالک و مدیر الیاس

بند کر دیا۔

”سو فیصد درست ہے۔“ اور پھر انہوں نے جلدی

میں فون بند کر دیا۔

اب میں نے اس خبر کی تصدیق کے لیے مختلف تقسیم کاروں کو فون کرنا شروع کر دیا لیکن جسے فون کیا اس کا فون آنکج ملا جس کے بعد میرا شبہ یقین میں بدلتا چلا گیا کہ شاید تقسیم کار اس سلسلے میں آپس میں بات کر رہے ہیں۔ بعد ازاں میں نے منظور صاحب کو دوبارہ فون کیا تو انہوں نے کہا۔

”حتیش صاحب کو اس خبر کی مکمل طور پر تصدیق ہو گئی ہے۔“

اب اس خبر کی صداقت پر یقین کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ لہذا میں نے نگار کے صفحہ اول کی ساری خبریں نکال کر ان کی جگہ وحید مراد کی موت کی ہیڈ لائن لگائی اور وحید مراد کی پرانی فلموں کی تصویریں لگا دیں۔ اس شمارے میں وحید مراد کی موت کی پوری تفصیلات درج نہ ہو سکی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی نگار ایوارڈ کی تقریب جو 29 نومبر کو کراچی میں منعقد ہونے والی تھی اور جس کی خبر ہیڈ لائن کے طور پر شائع کی جا رہی تھی، اس تقریب کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد مجھے یہ جتنو ہوئی کہ کسی نہ کسی طرح اس کی موت کی وجہ معلوم کی جائے۔ جس کے لیے سب سے پہلے اس کی قیام گاہ کا پتا چلانا تھا۔ لہذا میں نے اور روزنامہ جنگ کراچی کے فلمی رپورٹر سلیم باسط نے وحید مراد کے ایک خاص دوست قادر موسانی، جن کی چوہدری کی دکان ”بھراپتا“ طارق روڈ پر ہے ان کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ ان کی دکان سے وحید مراد کی منہ بولی بہن مسز ممتاز کرمل ایوب کا پتا اور ان کا فون نمبر حاصل کیا۔ پھر کرمل صاحب کی کوشی پر بار بار فون کیا لیکن کسی نے ریسپونڈ نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد ہم دونوں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ کرمل صاحب کی کوشی چلانا چاہیے۔ چنانچہ سلیم باسط کی کار میں ہم کرمل ایوب کی کوشی کی تلاش میں ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف چل پڑے۔ ہمیں کوشی کا جو نمبر بتایا گیا تھا وہ غلط تھا۔ دو دو حاتی کھننے کی تک دود کے بعد بھی ہمیں وہ کوشی نہ ملی۔ کوشی کے ٹیلی فون نمبر پر بھی رابطہ نہ ہو سکا۔ لہذا ہم مایوس ہو کر دفتر واپس آ گئے۔

میں نے سلیم باسط سے کہا۔ ”مرحوم کے چچا اور اس کی والدہ اگر لاہور میں مقیم ہیں تو اس کی میت بھی لاہور بھیجی

چند منٹ بعد ہی یاسین گورچہ صاحب کا لاہور سے فون آ گیا۔ انہوں نے بھی مجھ سے وہی سوال کیا جو سنگیتا نے پوچھا تھا۔ میں نے یاسین گورچہ کو بھی وہی جواب دیا جو سنگیتا کو دیا تھا۔ گورچہ نے میری بات پر یقین کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

میں نے نگار کے اسٹاف صلاح الدین پراچہ سے کہا۔ ”لاہور سے دو فون سنگیتا اور یاسین گورچہ کے آئے ہیں کہ کیا وحید مراد کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ ایک تردیدی نیوز بتادیں کہ یہ محض افواہ ہے۔“

پراچہ صاحب نے فوراً ہی نہ صرف تردیدی خبر لکھ دی بلکہ اس کی کثابت بھی کرا دی۔ اس دوران گورچہ صاحب کا دوبارہ فون آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”الیاس بھائی! کراچی میں جہاں وحید مراد مقیم تھے وہاں سے وحید کے چچا عظیم مراد جولاہور میں فلم تقسیم کار ہیں کو فون پر وحید مراد کی حرکت قلب بند ہونے کی خبر کفرم ہو گئی ہے۔ آپ ہیں کہ اتنی اہم خبر کراچی میں رہتے ہوئے بھی اسے افواہ سے تعبیر کر رہے ہیں۔“

یاسین گورچہ کی زبان سے یہ خبر نہ کر جو اس قدر وثوق سے کہہ رہے تھے مجھے بھی احساس ہوا کہ وحید مراد کی موت کی خبر درست ہو سکتی ہے۔ چنانچہ میں نے پراچہ صاحب کے ساتھ اپنے صاحبزادے اسلم الیاس کو وحید مراد کے ذاتی قلیٹ جہاں وہ اکثر کراچی میں اقامت پذیر ہوا کرتے تھے بھیجا۔ قلیٹ پر فون بھی کیا لیکن کسی نے ریسپونڈ نہیں اٹھایا۔ تب مجھے بھی فکر لاحق ہوئی کہ کسی کارسیور نہ اٹھانا چہ معنی دار؟ چنانچہ میں نے نگار کی آخری کاپی چھپنے کے لیے پریس نہیں بھیجی۔

کچھ دیر کے بعد پراچہ اور اسلم الیاس بھی آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وحید مراد کے قلیٹ کے چوکیدار نے بتایا ہے کہ وحید صاحب دو روز پہلے قلیٹ چھوڑ کر اپنی بہن کے کمر چلے گئے تھے چوکیدار سے جب ان کی بہن کا پتا معلوم کیا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔

اسی دوران ایور ریڈی پکچر کراچی کے جنرل منیجر منظور صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ ”وحید مراد کی خبر آپ نے سن لی ہوگی؟“

میں نے ٹھہرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا اس کی موت کی خبر درست ہے؟“

بتایا۔ ”لاہور جانے کے لیے وحید مراد کا ایک تابوت ضرور
بک کرایا گیا ہے مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہ کون وحید مراد
ہے۔“ ”ارے صاحب! یہ پاکستانی فلموں کا چاکلیٹی ہیرو
وحید مراد ہے۔“

”اوہ!“ اس نے حیرت اور افسوس کا اظہار کیا اور
کہا، ہمیں تو بس یہ بتایا گیا کہ تابوت میں وحید مراد کی میت
ہے۔“ اس کے بعد ہم لوگ بڑی شدت اور بے چینی سے
میت کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ سوا سات بجے ہمیں ایک
سوزوکی آتی ہوئی نظر آئی۔ ہم نے اس پر کوئی توجہ نہ دی مگر
جب وہ ہمارے سامنے سے گزرتی ہوئی کار کو کی طرف
جانے لگی تو اچانک میری نظر سوزوکی میں رکھے ہوئے
تابوت پر پڑی۔ تابوت کا ایک حصہ سوزوکی سے نکلا ہوا تھا۔
اسے دیکھ کر ہم لوگ سمجھ گئے یہ تابوت وحید مراد ہی کا ہے۔
چنانچہ ہم لوگ دوڑتے ہوئے سوزوکی کے قریب پہنچے۔ ہم
نے دیکھا کہ اس سوزوکی میں اگلی نشست پر صرف ایک
ڈرائیور بیٹھا ہے۔ آگے گئے تو ایک اور آدمی بھی نظر آیا ہوتا
نہیں وہ ڈرائیور کا میپر تھا یا تابوت کو کھول کر کھانے والا

جائے گی یا پھر اس کے رشتے دار کراچی آکر اس کی تدفین
کریں گے۔ لہذا لاہور سے رابطہ کر کے اصل صورت حال
کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔

سلیم باسل نے میری بات سے اتفاق کیا۔ میں نے
لاہور میں رو بن گھوٹ کوفون کر کے اس بارے میں پوچھا۔
روبن نے کہا۔ ”میں ابھی ابھی وحید مراد کی کوشی سے واپس
آیا ہوں۔ مجھے وہاں پتا چلا کہ رات 8 بجے کی فلائٹ سے
وحید کی میت روانہ کی جائے گی اور ساڑھے نو بجے تک یہاں
پہنچ جائے گی۔“

اس اطلاع کے بعد ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ کہیں
اور جا کر وقت ضائع کرنے کی بجائے ہمیں ایئر پورٹ جانا
چاہیے۔ لہذا ہم دونوں صلاح الدین پراچہ، رضوان حیدر
برنی، ذیشان صدیقی اور اسلم الیاس کو ساتھ لے کر
ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچنے کے بعد سی این پی ایس
کے سربراہ سعید الظفر اور کچھ دیگر ایڈیٹرز اور ناگزنگ
کے زاہد شیرازی بھی ایئر پورٹ پہنچ گئے۔

سب سے پہلے ہم لوگ پی آئی اے کے کارگوانہ خارج
سے ملے۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ انہوں نے

ذرا سی بات

زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی
بات کسی کی جینٹ بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر
ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک پر فکر داستان

سانچہ

تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے طبقات کی تفریق کیے بغیر صرف بڑے
اور منفرد کام کرنے والوں کو اپنے ادراک پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی
صفحات پر **علی اختر** کی ایک چوڑا دینے والی دلنشین تحریر

باغی

ثبت اور متنی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی.....
خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم و بناوت بلند
کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان..... ایک یادگار تحفہ

وقت

اکثر لمحات پر لگا کر اڑ جاتے ہیں مگر..... کچھ سوچا تیس
بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے
جاتے ہیں۔ **حسام بٹ** کے قلم کی روانی

ستمبر 2017ء کا قریب شہزاد ایک نظر میں



اس کی عیادت

منظر امام، تنویر ریاض، سلیمہ انور، محمد الیاس، نسر عباس
اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

اور پھر بند کرنے والا تھا۔

وحید مراد کی لاش کو اس طرح بے یار و مددگار دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ آہ پاکستان کا ایسا نامور فنکار اور صاحب ثروت شخص اور اس کمپرسی کی حالت میں اس کی میت لاہور بھیجی جا رہی ہے جیسے اس کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ اس وقت سب ہی لوگ دل گرفتہ تھے۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈرائیور سے پوچھا۔ ”تمہارے ساتھ کسی اور نے آنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟“

”صاحب! ہم کو ایک صاحب نے اتنا ہی کہا تھا کہ تم ایئر پورٹ پہنچو، ہم تمہارے پیچھے اپنی کار میں آرہے ہیں۔“ یہ سوچ کر غم و الم سے میرے آنسو چھلک پڑے کہ کراچی کا وہ شہزادہ جو کل تک قیمتی کاروں میں کراچی کی سڑکوں پر گھومتا تھا۔ آج اس کی میت ایک کرائے کی سوزوکی پر رکھ کر لائی گئی ہے۔ اس سوزوکی میں نہ وحید مراد کا کوئی دوست تھا، نہ کوئی اور۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی منہ بولی بہن خود بھائی کے تابوت کے ساتھ ہوئی۔

ذرا دیر بعد تابوت کو سوزوکی سے نکال کر سامان تولنے والی مشین پر رکھ دیا گیا۔ وزن کرنے کے بعد تابوت کو کھول کر پی آئی اے کارگو کے عملے کو دکھایا گیا کہ اندرونی لاش ہے یا کوئی اور چیز۔ اس کے بعد ڈرائیور کے ساتھ آنے والے نے تابوت میں ٹیلیں ٹھونک کر تابوت بند کر دیا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا۔ ”وحید مراد کی میت کو غسل بھی دیا گیا۔ اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی گئی یا نہیں؟“ دونوں بیک زبان ہوئے۔ ”ہم نے تو وہاں نہ کسی غسل دینے والے کو دیکھا نہ ہی کسی نے جنازے کی نماز پڑھوائی۔“

میں نے وہاں موجود تمام ساتھیوں سے کہا۔ ”اگر اس غریب کو کراچی میں کسی نے غسل نہیں کرایا اور اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تو دوستو! ہم ہی کم از کم اس کے لیے فاتحہ خوانی کر دیں۔“

چنانچہ وزن کے کانٹے پر رکھے ہوئے تابوت کے قریب پہنچ کر ہم سب نے فاتحہ پڑھی۔ اس کے بعد پی آئی اے کا عملہ تابوت کو جہاز کی طرف لے گیا۔

چند منٹ بعد کیا دیکھتا ہوں کہ وحید مراد کی منہ بولی بہن ممتاز کے شوہر ریٹائرڈ کرنل ایوب اور وحید کے دوست قادر موسانی پی آئی اے کارگو آفس تشریف لے آئے اور پوچھنے لگے۔ ”تابوت کو جہاز پر سوار کر دیا گیا یا نہیں؟“

”ابھی ابھی جہاز پر بھیجا گیا ہے۔“

کرنل ایوب سے تو میں واقف نہیں تھا البتہ قادر موسانی سے واقف تھا۔ میں نے ان سے کہا۔ ”قادر صاحب! اصل بات تو بتاؤ کہ وحید مراد کی موت اچانک کیسے واقع ہو گئی؟“

قادر موسانی بولے۔ ”میں اپنے کام کی وجہ سے دو ایک روز سے وحید سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ تین چار روز قبل وحید اپنے بیٹے کی سالگرہ کے لیے کافی سامان خرید کر میری دکان پر رکھ گیا تھا۔ میں نے اس سے ازارہ مذاق کہا۔ ”تم پہلے تو بھی اتنا سامان نہیں خرید کرتے تھے۔ اس بار بہت مال خرچ کر رہے ہو۔“

”پتا نہیں آئندہ سال تک زندہ بھی رہتا ہوں یا نہیں، اس لیے اس سال دل بھر کر تجھے تحائف لایا ہوں۔ خوب دھوم دھام سے بچے کی سالگرہ مناؤں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

قادر موسانی نے بتایا۔ ”جس روز وحید مراد کا ہارٹ ٹیل ہوا، صبح ساڑھے 10 بجے کے قریب وحید مراد کی منہ بولی بہن ممتاز میرے پاس آئیں۔ وہ بہت بھرائی ہوئی تھیں انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”وحید کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ آپ جلدی چلیں۔“

میں ممتاز کے ہمراہ ان کی ڈیفنس سوسائٹی پہنچا۔ جب میں اوپر گیا، جہاں وحید کا بیڈروم تھا تو میں نے دیکھا۔ وہ بجلی کے سوچ بورڈ کے پاس دیوار کے سہارے گرا ہوا ہے۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بالکل زرد تھا۔ نبض دیکھی وہ بالکل بھی نہیں چل رہی تھی۔ میں نے ممتاز سے کہا۔ ”شاید وحید مراد کا انتقال ہو چکا ہے۔“

ممتاز نے فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد موت کی تصدیق کر دی۔

میں نے قادر موسانی کی زبانی وحید مراد کی موت کی کہانی سننے کے بعد کہا۔ ”تم تمام ڈسٹری بیوٹرز کو جاننے ہو۔ میرے دفتر کا بھی تمہیں علم ہے۔ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا اور تم نے اس کی کسی کو اطلاع نہیں دی۔ تم کسی کو فون ہی کر دیتے۔“ قادر موسانی نے جواب دیا۔ ”اس کو فون ہی

خراب ہے۔ دوسرے ہم سب پریشان تھے۔“ ”اس کو فون کا فون خراب تھا تو ڈیفنس کی کسی بھی کٹھی سے فون کر دیتے۔ وہاں تو ہر گھر میں فون ہے اور صبح پتا لکھوا دیتے۔ کم از کم کچھ کو فون کو تو علم ہو جاتا اور وہاں اس کا

مونگ پھلی

مونگ پھلی ایک لذیذ میوہ ہے۔ یہ موسم سرما میں کھائی جاتی ہے۔ یہ سستا میوہ ہے۔ غریب آدمی بھی آسانی سے خرید سکتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں لحاف میں بیٹھ کر اس کا کھانا بہت لطف دیتا ہے۔ مونگ پھلی آپ جتنی بھی کھالیں، اس کی چٹائی سے کوئی شرول نہیں بڑھے گا۔ اسے خالی پیٹ نہ کھائیں کیونکہ یہ ہجوک کو ختم کر دیتی ہے اس لیے ہمیشہ کھانے کے بعد کھائیں۔

جرمنی کی بربادی

گلیڈ بآپریشن 9/11 سے پہلے یورپ اور جنوبی امریکا تک انسداد کیونست آپریشن کے نام پر پھیلا دیا گیا۔ پیٹیم، ناروے، جرمنی، یونان، پرتگال، اسپین اور دوسری مغربی یورپی جمہوریوں نے ان برسوں میں گلیڈ ب کی دہشت گردی برداشت کی۔ 1970ء کے نصف آخر میں جب میں اسکاٹ لینڈ میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا اس وقت بدر منہاف گروہ اچانک خبروں پر چھا گیا۔ اس گروہ کو عام طور پر سرخ فوج یا آراء ایف کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ ان کے مشہور ہونے کی وجہ 1977ء میں ہانز مرٹن اسکیر کا اغوا تھا جو مغربی جرمنی کے سرمایہ دار طبقے کا نمائندہ تھا۔ اس کا اغوا پانچ ستمبر کو ہوا۔ بالکل اسی تاریخ کو جب اسرائیلی کلاڑیوں کو 1972ء میں مارا گیا تھا۔ یہ گلیڈ ب کے تنظیم کا مشہور طریقہ کار تھا۔ وہ بائیں بازو کی تحریک میں خفیہ طور پر شامل ہو جاتے اور اس سمت میں اس کی قیادت کرتے جو ست گلیڈ ب کے تنظیمین کے لیے موزوں ہوتی۔

مصری سائنسدان کا

منفرد کارنامہ

جاپان میں خدمات انجام دینے والے ایک مسلمان مصری سائنسدان ڈاکٹر شریف المصنعی نے ماحول، پانی اور مٹی سے تباہ کاری کو یکٹھہ اور ختم کرنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کر کے ایٹمی ترقیات کے شعبے میں اہم کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وہ دنیا کے پہلے سائنسدان ہیں جنہوں نے اس گراں ترین اور مشکل ترین کام کو اپنی ٹیم کے ساتھ صرف چند ہفتوں میں مکمل کر کے ایٹمی ٹیکنالوجی کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

آخری دیدار کر لیتے۔ اس کی میت کو کا ندھا بھی دے دیتے۔ آخر قہم لوگوں نے وحید کے چچا کو لاہور بھی تو فون پر اطلاع دی تھی۔ ہمیں بھی وحید کی موت کی خبر لاہور ہی سے ملی۔ میں نے کہا۔ ”کراچی سے جس طرح وحید کی میت کسمپرسی کے عالم میں لاہور بھیجی جا رہی ہے اسے تو میں پڑا سرطور پر ہی کہوں گا اگر ہم چند لوگ ایئر پورٹ نہ پہنچتے تو ہمیں مرحوم کی مغفرت کے لیے فاتحہ خوانی کی توفیق بھی نصیب نہ ہوتی۔ آپ لوگوں نے تو حد کر دی۔ وحید کی میت کو بے یار و مددگار ہی لاہور بھجوا رہے ہیں۔“

”ہمیں یہ بات نہیں۔“ قادر موسانی بولے۔ ”میت کے ہمراہ وحید کی ساس ممتاز اور وحید مراد کا بچہ بھی اسی فلائٹ سے لاہور جا رہے ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ جاتا لیکن وحید کی بیگم سسلی اور ان کی بیٹی عالیہ امریکا سے کل کراچی پہنچنے والی ہیں میں انہیں اپنے ہمراہ لے کر لاہور جاؤں گا۔“

میں نے وحید مراد کی موت کو اس لیے پراسرار کہا ہے کہ قادر موسانی اور ممتاز کے بیانات میں تضاد نظر آتے ہیں۔ قادر موسانی نے کہا۔ ”جب میں کمرے میں گیا تو وحید بجلی کے سوچ بچوڈ کے نیچے دیوار کے سہارے گر ہوا تھا اور وہ فوت ہو چکا تھا۔“ جب کہ وحید کی منہ بولی بہن نے لاہور پہنچ کر اخبارات کو دو متضاد بیان دیے ایک بیان میں وہ کہتی ہیں۔ ”جب میرا نوکر وحید بھائی کو چگانے کے لیے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا وحید مراد اپنے بستر سے نیچے گرے پڑے ہیں اور فوت ہو چکے ہیں۔“

جب کہ ایک اور بیان میں موصوف نے کہا۔ ”جب ہمارا نوکر کمرے کے قریب گیا اور اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے نہ کسی نے دروازہ کھولا نہ کوئی آواز آئی۔ چنانچہ اس نے آکر مجھے یہ بات بتائی۔ پھر ہم کمرے کا دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وحید بھائی اپنے بستر سے نیچے پڑے ہیں اور وہ فوت ہو چکے تھے۔“

ایسے متضاد قسم کے بیانات پڑھ کر لوگوں کے شکوک و شبہات میں جتلا ہونا بڑا فطری ہے۔ پھر جس خاموشی کے ساتھ وحید کی میت لاہور بھیجی گئی اس سے ان شبہات کو اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔

الیاس رشیدی صاحب کی تحریر کے اقتباسات سے پاکستانی فلموں کے ایک سہرا شکاری ایسی کسمپرسی کی موت اور

اس کے بعد ایک باوقار اور صاحب حیثیت شخص کی میت کی ایسی بے پروائی رونگھٹے کھڑے ہو جائیں۔

اللہ وحید مراد کو غریق رحمت کرے۔ اب اس کی میت کی لاہور آمد کی داستان یاسین گورپچہ صاحب کی زبانی سنئے۔ ”ملک کے خوب رو اور اپنے دور کے کالکینی ہیرو وحید مراد کو جمعرات کی صبح ساڑھے دس بجے ان کی کوشی سے بلحقہ قبرستان میں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اس موقع پر کون سی آنکھ تھی جو انگھار نہ تھی۔ سوگوار عورتوں کا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ بدھ کی رات دس بجے پئی آئی اسے کے ذریعے وحید مراد کی میت جب کراچی سے لاہور پہنچی تو وحید کے چچا سلیم مراد اور محمد علی کے علاوہ درجنوں فلمی شخصیات ایئر پورٹ پر موجود تھیں۔ ان کی موجودگی میں میت کا تابوت ایک دین کے ذریعے مرحوم کی کوشی گلبرگ پہنچایا گیا۔ کوشی میں میت کی آمد پر بے حد دل خراش مناظر دیکھنے میں آئے۔“

وحید کی بیمار والدہ نے اپنے اکلوتے جوان بیٹے کی میت دیکھی تو چیختے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ وحید کو کس میں بند کر کے کیوں لائے ہو؟“

”اس کی والدہ کی آہ و بکا دیکھ کر اس جگہ موجود ہر شخص بری طرح رو رہا تھا۔ وحید کی والدہ نے اپنے سات سالہ پوتے عادل مراد کو سینے سے چٹالیا اس کے بعد ان کی زبان گنگسی ہو گئی۔ ان پر سکنتہ سا طاری ہو گیا۔“

”وحید مراد کی موت کی اطلاع بدھ کی صبح بارہ بجے کے قریب لاہور پہنچی تو کسی نے بھی اس پر یقین نہیں کیا۔ میں نے جب وحید مراد کے چچا سلیم مراد کی کوشی فون کیا تو پتا چلا کہ اطلاع واقعی درست ہے۔ وحید مراد کی موت کی خبر جب دن کے دو بجے کے قریب میں نے دفتر ٹھار کو بذریعہ فون دی تو مدیر ٹھار کو اس کا یقین نہ آیا۔ کیونکہ وحید مراد تو اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کے لیے ڈاکٹروں سے مشورہ کر رہے ہیں۔“

یہاں لاہور میں یہ خبر بے حد حیرانگی اور افسوس کے ساتھ سنائی کہ کراچی میں فلم سے واسطہ شخصیات کو کسی نے بھی وحید کی موت کی اطلاع نہیں دی۔

لاہور میں وحید مراد کے جنازہ کو اٹھانے کا وقت دوسری صبح دس بجے دیا گیا تھا۔ جیسے ہی یہ خبر لاہور میں صبح کے اخباروں میں شائع ہوئی وحید مراد کے ہزاروں پرستار مرحوم کی کوشی گلبرگ پہنچ گئے۔ دس بجے تک فلمی صنعت سے

وابستہ ہر شعبہ کے افراد وہاں موجود تھے۔ ان میں فلم ساز بھی تھے، ہدایت کار بھی، اداکار بھی اور ٹیکنیشن بھی۔ تمام اداکاراں میں بھی صبح ہی وحید کی کوشی پہنچ گئی تھیں۔ اداکار محمد علی اور ہدایت کار یقین اختر جنازہ اٹھانے کے انتظامات میں مصروف تھے۔ قبر کے لیے جگہ کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ دس بجے تک جھوم اتنا بڑھ گیا کہ کوشی کا لان اور باہر کی سڑک مرحوم کے پرستاروں سے بھر چکی تھی۔ سوا دس بجے جنازہ اٹھانے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے پہلے وحید مراد کی میت دیدار کے لیے لان میں رکھ دی گئی تھی۔

چونکہ لان میں اتنے سارے لوگ جمع نہیں ہو سکتے تھے لہذا فیصلہ کیا گیا کہ کوشی کے سامنے وسیع میدان میں نماز جنازہ ادا کی جائے۔ جنازہ اٹھا تو پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔ بے شمار خواتین جن میں اداکاراں بھی شامل تھیں بے اختیار پیچ پیچ کر رو رہی تھیں۔ انفرس انگھار آنکھوں اور کانٹے ہاتھوں سے لوگوں نے جنازہ اٹھایا اور کھلے میدان میں رکھ دیا۔ بے پناہ جھوم کی وجہ سے مٹیس درست کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ نماز جنازہ کے بعد ساڑھے دس بجے قبرستان لے جانے کے لیے جنازہ اٹھایا گیا۔ اس موقع پر ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ وہ آگے بڑھ کر وحید کے جنازے کو کندھا دے سکے۔ چند منٹ بعد جنازہ قبرستان پہنچ گیا۔ یہاں بھی بڑی مشکل سے جھوم پر قابو پایا گیا۔ چند بڑوں نے وحید مراد کے پرستاروں سے منت ساجت کی تب کہیں جھوم قبر سے ذرا دور بٹھا اور آخر کار گیارہ بجے میت کو دفنانے کے بعد بھی بے شمار لوگ کافی دیر تک کوشی کے باہر موجود رہے۔

اگلا روز جمعہ کا تھا۔ سہ پہر تین بجے رسم قل ادا کی جانی تھی۔ اس موقع پر بھی عوام کی بڑی تعداد پہنچ چکی تھی۔ فلمی صنعت سے وابستہ افراد کے علاوہ درجنوں کی تعداد میں عزیز رشتے دار اور پرستار تھے جو راولپنڈی، سیالکوٹ، پشاور، گوجرانوالہ اور فیصل آباد سے آئے تھے۔ نماز عصر کے بعد قرآن خوانی شروع ہوئی۔ جس کے اختتام پر مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ اس موقع پر وحید مراد کی بیوہ سلمیٰ بیگم کا بڑی شدت سے انتظار کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا جہاز رات کو پہنچے گا۔

وحید مراد کی بیوہ سلمیٰ مراد کو بذریعہ فون امریکا میں ان کے شوہر کی وفات کی اطلاع دی گئی تھی جسے سن کر انہوں نے پہلے تو اس پر یقین نہیں کیا اور کہا۔ ”یہ جی خبر نہیں افواہ ہے۔“ لیکن انہیں یقین دلایا گیا کہ یہ خبر صد فیصد سچ ہے۔

وحید واقعی اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ جب انہیں شدید رنج ہوا اور انہوں نے التجا کی کہ ان کے آنے تک ان کی تدفین نہ کی جائے۔

لیکن ان کی اس خواہش پر عمل نہ کیا جاسکا کیونکہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق میت کو اتنی دیر تک روکنا ممکن نہیں تھا۔ لہذا جتنی جلدی ممکن ہو سکا تدفین کر دی گئی (غالباً اس دور میں کولڈ اسٹوریج کا بندوبست نہیں تھا جیسا اب ہے)۔

بہر حال سلسلی مراد جمعہ کی شب جب قل کی رسم بھی ادا کی جا چکی تھی اپنی گیارہ سالہ بیٹی عالیہ مراد کے ہمراہ لاہور پہنچیں۔ جنہیں لینے محمد علی، زیبا، قوی خان، ان کی بیگم اور چند عزیز رشتے دار ایئر پورٹ پہنچے ہوئے تھے۔

جہاز سے اترتے ہی سلسلی نے دھڑیس مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ محمد علی اور زیبا وغیرہ نے انہیں دلاسا دیا اور اپنے ہمراہ اس کی رہائش گاہ پر لائے۔ یہاں پہنچتے ہی سلسلی اپنے بیٹے عادل مراد کو اپنے سینے سے لگا کر زور دھار روئے لگیں انہیں اس موقع پر بھی بڑی مشکل سے چپ کرایا گیا۔

اس وقت وہاں موجود کچھ لوگ ان کی بھری جوانی میں بیوگی پر دل ہی دل میں افسوس کر رہے تھے۔

دوسری طرف عالیہ اپنی دادی کے گلے لگ کر روتی رہی۔ وحید مراد کی والدہ کی حالت اس وقت بھی نارمل نہیں تھی۔ وہ ہلکی ہلکی باتیں کر رہی تھیں۔ کچھ اس قسم کی باتیں گویا نیم بے ہوشی کے عالم میں کہہ رہی ہوں۔

”ختم سب کیوں رو رہی ہو، جب اسے تمہاری ضرورت تھی تم اسے چھوڑ کر اس سے دور چلی گئیں۔ تمہاری اس بے مروی پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ کار کے حادثے سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔“

وہاں موجود لوگوں نے ان کی ہڈیانی بڑبڑاہٹ کو روکنے کے لیے انہیں دوائی کھلا کر سلا دیا۔ ان کے لیے جوان بیٹے کی جدائی ایک کاہ صدمہ تھا۔ جب ایک عام آدمی ایک عام پرستار سے اس قدر غمگین تھا تو انکو تے بیٹے کی ماں کا کیا حال ہو سکتا ہے، سوچنے اور غور و فکر کرنے کا مقام تھا۔ بہر حال یہ بھی حقیقت تھی کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ یہ وقت سلسلی مراد کو بھی دکھ دینے کا نہیں تھا۔ وحید بہر حال ان کے شوہر تھے۔ جیون سا بھی تھے۔ میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ میاں سے لڑ کر امریکا چلی گئی تھیں مگر وہ یہ کب چاہتی تھیں کہ وہ

ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہو جائیں۔

مرحوم کے دوستوں، بھئی خواہوں اور رشتے داروں نے اس موقع پر سلسلی بیگم کو سنبھالنے اور سہارا دینے کے لیے ان کی دل جوئی شروع کی۔ ساس کی باتوں کو نظر انداز کرتے کو کہا۔

جب سلسلی بیگم کی طبیعت ذرا سنبھلی تو انہوں نے پوچھا۔ ”یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟“

”دو ماہ پہلے لاہور میں ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ چہرے پر خاصا زخم آیا تھا۔ اللہ نے اتنا کرم کیا کہ دونوں آنکھیں سلامت رہیں۔ کچھ دنوں تک اسپتال میں زیر علاج رہے۔ پھر صحت یاب ہو کر گھر آ گئے۔ زخم مندمل تو ہو گئے مگر چہرہ و انداز ہو گیا تھا۔ صحت بالکل ضائع ہو چکی تھی۔ اس موقع پر وہ بالکل تنہا تھے۔ کوئی اپنا ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں تھا۔ ان کے کچھ دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کرا لو۔“

انہوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بھی یہی کہا۔ ”جی ہاں آپ کے لیے ضروری ہے کہ اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالیں مگر اس کے لیے آپ کو بیرون ملک جانا پڑے گا یا کراچی میں یہ کام کروانا پڑے گا۔ یہاں لاہور میں پلاسٹک سرجری نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وحید مراد صاحب کراچی چلے گئے۔“

”جب بہن مسز ممتاز ایوب کو معلوم ہوا کہ ان کے بھائی وحید مراد اکیلے اپنے فلیٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں تو وہ وہاں پہنچیں اور ضد کر کے اپنے گھر ڈیفنس لے گئیں۔ وہاں وہ منگل کی رات تک ٹھیک ٹھاک تھے۔ خوشگوار موڈ میں گپ شپ کرتے رہے تھے۔ بدھ کی صبح جب وہ دس بجے تک نہیں جاگے تو کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور جب کانی دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو دروازہ توڑ کر اندر دیکھا گیا۔ وہ اس دہر فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔“

سلسلی مراد چپ رہیں۔ کچھ دیر تک کچھ نہیں بولیں۔ پھر دھیرے سے خود گلابی کے انداز میں بولیں۔ ”ایک شخص جو رات کے وقت بالکل بھلا چکا تھا۔ صبح ایک دم مردہ حالت میں پایا گیا کیا یہ مس ٹیرس نہیں؟ پراسرار نہیں؟“

اور پھر کئی دنوں کے بعد جب نگار اور دوسرے اخباروں میں وحید مراد کی موت کی روداد شائع ہوئی تو ان کا موڈ بہت جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ بہت کچھ بولنا چاہتی تھیں کہنا

چاہتی تھیں، اس پر اسرار موت کی تعذیبی کر دانا چاہتی تھیں مگر انہوں نے بہت صبر و ضبط سے کام لیا۔ کسی کا نام لے کر یا بغیر نام لے کر کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا۔ جانے اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے شاید اس مسئلے کو اس لیے نہیں چھیڑا کہ..... ایسا کرنے سے ان کی شخصیت کو بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

بہر حال ان کا چپ رہنا ہی بہتر تھا۔ سانب تو گزر چکا تھا۔ اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر پر لاٹھی پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں تھا کہ وحید مراد کا گزرتا، اس کے گھروالوں ہی کے لیے نہیں بے شمار لوگوں کے لیے صدمہ عظیم تھا۔ مصنف و ہدایت کار شوکت باہمی نے اپنے جذبات و احساسات کا جو اظہار کیا ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھئے۔

”اس سے میری آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب اس کی میت لحد میں اتارنے سے پہلے میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ خاموش لب، پرسکون چہرہ، زندگی کے تمام تفکرات سے آزاد۔ اب وہ کسی ڈپریشن کا شکار نہیں تھا۔ اب اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنے قدر دانوں، اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں سے بے نیاز آنکھیں بند کیے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کے جسم پر بھول بھڑے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کوئی فلم باکس آفس پر بہت ہو گئی ہے اور اس کے دوستوں نے اس کو پھولوں سے لا دیا ہے۔“

قبرستان کے گرد اس کے ہزاروں پرستار پھیلے ہوئے تھے لگ بھگ پچیس تیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اور وہ سب ایک آواز نعرہ لگا رہے تھے۔ ”وحید مراد زندہ باد۔ وحید مراد زندہ باد“

ادور گورکن اس عظیم فنکار کی میت پر مٹی ڈال رہا تھا جس کی اداکاری نے پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک نیا اسلوب دیا تھا اور جس نے فلمی صنعت میں تعلیم یافتہ فنکاروں کی آمد کے راستے کھولے تھے۔ جس کی جواں مرگی پر پاکستان ٹیلی ویژن نے صرف ایک سطر خبر ٹیلی کاسٹ کی تھی۔ ”مشہور اداکار وحید مراد آج صبح کراچی میں انتقال کر گئے۔“

ٹی وی کے اس رویے سے وحید مراد کی فنی شخصیت اور ان کی شہرت اور مقبولیت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ پاکستانی

فلموں کے ون اینڈ اوٹی شو میں سید نور ان کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

”میں آج تک ان کی یادوں کے گھرے سے نہیں نکل سکا۔ میں آج بھی اس خوشبو کو محسوس کرتا ہوں جو ”ارمان“ دیکھتے ہوئے میں نے اپنی ٹین انچ میں پہلی بار اپنے دل سے اٹھتی ہوئی محسوس کی۔ مجھے یقین ہے وہ خوشبو، وہ احساس وہ جاہت و حید صاحب اور ان کی فلموں کے لیے مرتے دم تک قائم رہے گی۔“

وحید مراد صاحب پاکستان فلم انڈسٹری کا وقار تھے، ہیں اور رہیں گے۔ ان کی ذاتی زندگی شاید بہت شاندار نہ رہی ہو لیکن ان کی فلمی زندگی اور اس کی یادیں پاکستان فلم انڈسٹری کے لیے بہت بڑا خزانہ ہیں۔

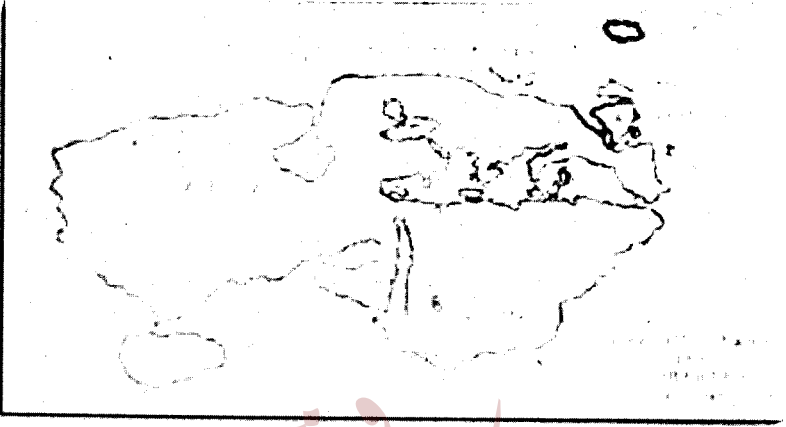
مصنف و ہدایت کار پرویز کلیم نے وحید مراد کے نام ایک ایسا خط لکھا جو پتا نہیں اس کے پاس پہنچا یا نہیں مگر اس کے بے شمار پرستار اسے بڑھ کر اپنے محبوب فنکار کی عظمت اور بڑائی سے اور ان کی مقبولیت اور جاہت سے ایک نئے انداز سے ضرور واقف ہوئے ہوں گے۔ اس خط کے کچھ اقتباس۔ ”تمہاری ہر بری بری تمہاری یادیں تمہارے چاہنے والوں میں پاشا نہیں بھولتا۔ لگتا ہے تمہاری موت نے تمہیں بھی عمر کی ایسی دعادی دی ہے جو تمہیں لگ چکی ہے۔“

”وحید! تمہیں یاد ہے تم نے اپنی ایک ہیر وٹن کا نام رادھا رکھا تھا۔ تمہاری رادھا بوزی ہو چکی ہے اس کے سر میں چاندی کے تار اتر آئے ہیں مگر اس کی آنکھوں کا گرم پانی آج بھی جوان ہے۔“

”تمہاری تصویر دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ ہم اسے کیا تسلیاں دیں۔“

”زیبا، دیبا، عالیہ، جنم، بارہ، سنگیتا، کویتا، نشو یہ سب تمہیں بھی فراموش نہیں کر سکتیں۔ جاننے ہو کیوں؟ اس لیے کہ فلمی بحثیں بھول ہے مگر وہ لمحے، وہ ہل، وہ گھڑیاں نہیں بھلائی جاتیں جو ہنس ہنس کے گزاری ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو ماضی کا ہاتھ تھام کر اپنے آج پھر چپ کر رو لیتے ہیں اور کچھ چپتے ہوئے چہرے، رونی ہوئی آنکھوں سے جنہیں خراب حسین پیش کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔“

تمہیں بھلا نا ہی اول تو دسترس میں نہیں جو اختیار بھی ہوتا تو کیا بھلا دیتے؟



بابائے جغرافیہ

طارق عزیز خاں

جغرافیہ ہی وہ کلیہ ہے، وہ ذریعہ ہے جو کرثہ ارض کی معلومات فراہم کرتا ہے لیکن یہ علم بہت زیادہ پرانا نہیں، اس علم کی بنیاد رکھنے والے نے کس طرح اسے تخلیق کیا کن مصائب سے گزر کر اس نے دوسروں کے لیے رہنما طریق کار واضح کیا اسی کا بیان۔

معلومات کے شائقین کے لیے تحفہ خاص

ہے۔ اسے زمین کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔ آج تک بنی نو انسان نے جتنی بھی ترقی کی ہے وہ سب جغرافیہ کی ہی مرہون منت ہے۔ اس علم کا آغاز بطور سائنس یونان میں ہوا۔ وہ پہلا انسان جس نے لفظ جغرافیہ استعمال کیا، ابراہیم الہیری

جغرافیہ جسے انگریزی میں Geography کہتے ہیں دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین کا مکان..... یہ وہ علم ہے جس میں زمین کی خصوصیات، اس کے اقدار اس کے مظاہر اور اس کے نقوش کا مطالعہ کیا جاتا

(Eratosthenes) ایک یونانی تھا۔

قدیم جغرافیہ دانوں کی زمین سے متعلق تحریریں نہایت دلچسپ ہیں۔ ارسطو کا خیال تھا کہ ہوا زمین میں داخل ہو کر محبوس ہو جاتی ہے اور جب وہ واپس غلامی جانے کی کوشش کرتی ہے تو زلزلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان عجیب و غریب نظریات کے باوجود یونانیوں نے جغرافیہ کے حوالے بعض حیرت انگیز دریافتیں بھی کیں۔ دو سو سال قبل مسیح کے قریب ارسطارخس نے مدوجزری لہروں میں تناسب معلوم کرنے کے بعد اعلان کیا کہ نہ صرف بحر اوقیانوس اور بحر ہند آپس میں منسلک ہیں بلکہ بحر اوقیانوس کے مغرب میں ہزاروں کلومیٹر دور شمال سے جنوب کی طرف ایک بڑا اخلہ زمین واقع ہے۔ ارسطارخس کی اس تحقیق کے 1700 سال بعد کولمبس نے امریکا دریافت کیا۔ یونانیوں کے بعد قرون وسطیٰ میں مسلم ممالک میں جغرافیہ کے حوالے اہم پیش رفت ہوئی۔ اس دور کے اہم جغرافیہ دانوں میں ابن بطوطہ، ابن خلدون اور اریسٹی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مسلمانوں کے علمی زوال کے بعد یورپ میں زمین کے جغرافیہ سے متعلق ٹھوس اور مستند تحقیقات سامنے آئیں۔ آج ہم کرہ زمین سے متعلق جس قدر معلومات رکھتے ہیں ان کا بیشتر ماخذ یورپین جغرافیہ دانوں کی تحقیق ہے۔

آج کی جدید غلامی تحقیق ہمیں بتاتی ہے کہ گگ بھگ 13 ارب 70 کروڑ سال پہلے بگ بینک دھماکے کے ذریعہ کائنات کی تشکیل شروع ہوئی۔ قریب 4 ارب 60 کروڑ سال پہلے نظام شمسی وجود میں آنا شروع ہوا اور تقریباً 4 ارب 50 کروڑ سال پہلے کرہ ارض کی پیدائش ہوئی۔ زمین کی پیدائش کے ابتدائی 50 کروڑ سال کے دوران پوری زمین پر محیط ابتدائی سمندر ظاہر ہوا۔ اگلے 2 ارب سال کے دوران سمندر کی تہہ کے نیچے موجود ٹیکٹونک پلیٹس (Tectonic Plate) میں ہوئی حرکت کی وجہ سے سطح سمندر پر ابھرنے والے خشکی کے عظیم خطوں میں جغرافیائی تبدیلیاں رونماں ہوتی رہیں۔ آج ہم جانتے ہیں کہ گگ بھگ 300 سو ملین سال پہلے کرہ ارض پر صرف ایک عظیم براعظم پانگیا (Pangaea) اور اُس کے چاروں اطراف میں ایک ہی وسیع و عریض سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ 280 ملین سال پہلے پانگیا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا اور قریب ترین اندازہ ہے کہ تقریباً 20 ملین سال پہلے کرہ ارض پر موجود سات براعظم (ایشیا، افریقا، شمالی امریکا، جنوبی امریکا، یورپ، انٹارکٹیکا) اور تین بڑے سمندر

(بحرالکابل، بحر اوقیانوس، بحر ہند) اُس مقام پر موجود تھے کہ جہاں آج ہم اٹھیں دیکھتے ہیں۔

گگ بھگ 300 قبل از مسیح تک خلیج فارس اور بحیرہ روم کے اطراف میں بسنے والی اقوام کی خلیج جنوب مغربی ایشیا، وسطی ایشیا اور وسطی و مغربی یورپ کے کچھ علاقوں کے ساتھ ساتھ افریقا کے دور دراز خطوں تک پہنچی تھی۔ افریقا اور ایشیا میں ابتدائی مہمات کے بعد مصری، ایرانی اور فونیسیائی تو تھک ہار کر پیٹھ گئے لیکن یونانیوں کی بے چین طبیعت نے انھیں چین لینے نہ دیا۔ اُن کی فطرت ایسی تھی کہ وہ ہر روز ایک نیا ہنگامہ جا چتے تھے۔ اُن کی آنکھیں ہر روز ایک نیا تماشا اور اُن کی زبانیں ہر دن کسی نئے مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتی تھیں۔ یونانیوں کی یہ خصوصیات انھیں ایک مخصوص ڈگر پر چلنے سے روکتی تھیں۔ وہ خود کو اس عہد کی سب سے ترقی یافتہ تہذیب سمجھتے تھے، تاہم کرہ ارض سے متعلق ان کے خیالات دنیائوس تھے۔ اہل یونان کے نزدیک زمین چھٹی اور کائنات کا مرکز تھی۔

مشہور زمانہ یونانی فلسفی ارسطو (Aristotle) نے 340 ق م میں اپنی کتاب ”افلاک پر“ (On the Heavens) میں پہلی بار زمین کے گول ہونے کے بارے میں دلائل دیے۔ عام یونانیوں نے تو ارسطو کے خیالات کا مذاق اڑایا، تاہم اس کے سب سے قابل شاگرد نے اپنے استاد کے نظریات کو درست ثابت کرنے کے لیے کرہ ارض کو دریافت کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ اسکندر نے 334 سے 323 قبل از مسیح کے دوران شمال مشرقی افریقا سمیت جنوب مغربی ایشیا کے وسیع علاقے کو دریافت کیا۔ تاہم وہ زمین کے گول ہونے کو ثابت نہ کر سکا۔ اسکندر کی ایشیا میں مہمات کے دوران یونانی طراح پائے تھے اس نے شمال مغربی یورپ میں مہمات سرانجام دیں۔ لیکن وہ بھی بحیرہ شمالی (بحر اوقیانوس) کی وسعت کے آگے بڑھ نہ سکا۔

یونانیوں میں اسکندر کا کوئی وارث تو پیدا نہیں ہوا، تاہم اسکندر اعظم کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ایران، مشرق وسطیٰ اور مصری علاقوں پر مشتمل ایک وسیع یونانی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ یونانی سلطنت کے دور عروج میں شمالی مصر میں اسکندر کا قائم کردہ شہر اسکندریہ، بحیرہ روم کی اہم بندرگاہ کے ساتھ ساتھ تجارت، ثقافت اور تحصیل علم کے عالمی مرکز کے طور پر ابھرا۔ انسان کی بہت سی اہم دریافتوں کی طرح کرہ ارض کے بارے میں بنیادی نوعیت کی تمام اہم دریافتیں عظیم عروس

البلاد اسکندریہ میں کی گئیں۔ یونانیوں نے اسکندریہ کی تعمیر پر بے شمار دولت خرچ کی تھی۔ شہر کو 30 میٹر چوڑے کشادہ بازاروں تیس انداز تعمیر، مجسمہ سازی، اسکندر کے یادگاری مقبرے اور ایک بہت بڑے مینارہ نور فیروز (Pharos) (قدیم دنیا کے سات عجوبوں میں شامل ایک عجوبہ) سے نمایاں و سرفراز کیا گیا تھا۔ ان سب کے علاوہ اسکندریہ کا سب سے بڑا عجوبہ اُس کا کتب خانہ اور اس سے ملحقہ عجائب گھر تھا۔ مصر کے یونانی بادشاہ جاننے اور سیکھنے کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ انھوں نے اس کتب خانے کے قیام کے بعد اگلی کئی صدیوں تک تحقیقی کام کی اعانت کی اور اسکندریہ کے کتب خانے میں اپنے عہد کے بہترین اذہان کے لیے ایک علمی ماحول قائم رکھا۔ کتب خانے کے 10 بڑے کمرے اور ہر کمرہ علیحدہ موضوع کے لیے وقف تھا۔ چشمے اور ستونوں کی قطاریں نباتاتی باغ، چڑیا گھر، جراح خانے، رصد گاہ، کھانے کا کمرہ اور پانچ لاکھ نادر و نایاب کتابیں اس کتب خانے کی شان تھیں۔ یونانی حکمرانوں کو اسکندریہ میں کتابیں جمع کرنے کا اس حد تک شوق تھا کہ ان کی پولیس یونانی سلطنت کی حدود میں داخل ہونے والے ہر بحری جہاز کی تلاشی لیتی اور جہازوں سے کسی بھی قسم کے کتابی نسخے کے برابر ہونے کے بعد ان کی نقل تیار کر کے اسکندریہ روانہ کر دیتی۔

240 قبل از مسیح میں اسکندریہ کے اس عظیم کتب خانے کا ڈائریکٹر ایراتو تھمیز تھا۔ ایراتو 276 قبل مسیح میں لیبیا کی بندرگاہ بن غازی (Banghazi) سے 180 کلومیٹر مغرب میں واقع ایک قدیم صحرائی قصبے سائے رہنے، قدیم نام Cyrene موجودہ شاہات Shiahhat) میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن لیبیا کے ساحلی علاقوں میں گزرا۔ بہت کم عمری میں ہی وہ ایک بحری جہاز پر ملازم ہوا اور اس نے تیونس اور الجزائر کی سیاحت کی۔ اسے جغرافیہ سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ نوجوانی کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اپنے ہم عصر جغرافیہ دانوں کی بیشتر تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اب اس کی دلچسپی کا مرکز بحیرہ روم سے پار کی دنیا میں تھیں۔ وہ دنیا کے چہنچہنے سے متعلق نظریات سے بھی متفق نہیں ہوا۔

ایراتو کا دلپسند مشغلہ بن غازی کے ریتیلے ساحلوں پر دنیا کے نقشے بنانا تھا۔ وہ اپنے ہم عصر نوجوانوں کو ساحل پر جمع کرتا اور پھر چھڑی کی مدد سے نقشے بنا کر انھیں دنیا کے جغرافیہ سے متعلق اپنے خیالات سے آگاہ کرتا۔ بیس سال کی عمر میں وہ بحیرہ روم کے قرب و جوار کی سیاحت کر چکا

تھا۔ اس دوران وہ اسکندریہ پہنچا اور محض 36 سال کی عمر میں اپنے علم و تحقیق کے بل بوتے پر اسکندریہ کے عظیم کتب خانے کا نگران مقرر ہو گیا۔ اسکندریہ میں قیام کے دوران اسے اپنے زمانے کے نامور جغرافیہ دانوں کی تصنیفات کے مطالعے کا موقع ملا۔ خود اس نے بھی فلکیات، تاریخ اور جغرافیہ سے متعلق مقالے تحریر کیے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ زمین کی پیمائش سے متعلق درست نقشے بنائے۔ بد قسمتی سے اسکندریہ میں قیام کے دوران ہی ایراتو کی نظر اس حد تک کمزور ہو گئی کہ اسے مطالعے اور تحقیق کے لیے اپنے شاگردوں کی مدد لینا پڑتی تھی۔

چالیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ایراتو کی تصنیفات کی تعداد سو سے زیادہ ہو چکی تھی۔ اُس کی کتابوں کے عنوانات فلکیات سے لے کر ”ذکھ سے نجات“ تک محیط تھے۔ تاہم اس کی دلچسپی کا مرکز کردہ ارض کا جغرافیہ تھا۔ اپنے ہم عصر یونانیوں کی طرح وہ زمین کو چھپا نہیں مانتا تھا۔ اس کے دن رات اسی تحقیق و جستجو میں بسر ہو رہے تھے کہ زمین کا ٹھیک ٹھیک طول و عرض معلوم کرے۔

اس دوران اس نے ایک کتاب میں پڑھا کہ سائے شہر (قدیم نام سائے Syene موجودہ نام اسوان (Aswan) کے جنوبی سرحدی علاقے میں دریائے نیل کی پہلی آبشار کے نزدیک، 21 جون کو عین دوپہر کے وقت زمین پر گاڑی عمودی چھڑی کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ موسم گرما کے اس طویل اور گرم ترین دن میں دوپہر کے وقت سائے شہر کے جنوبی حصے میں واقع معبدوں کے ستونوں کے سائے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت کسی گہرے کنویں کی تہ میں سورج کا عکس دیکھا جاسکتا ہے کیونکہ وہ عین سر پر چمک رہا ہوتا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس مشاہدے کو نظر انداز کر دیتا۔ سائے، کنویں میں عکس، سورج کا مقام اور عمودی چھڑی جیسے بے سرو پا الفاظ کی بھلا کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ لیکن ایراتو تھمیز جغرافیہ دان ہونے کے ساتھ ساتھ ریاضی دان بھی تھا۔ اس نے ایک تجربہ کرنے کا فیصلہ کیا اور 21 جون کے دن اسکندریہ میں اپنی لامبری کے صحن میں عین دوپہر کے وقت ایک عمودی چھڑی گاڑی اور پایا کہ چھڑی کا زمین پر سایہ پڑ رہا تھا۔ لیکن قریب ہی کھودے گئے کنویں کی گہرائی میں موجود پانی میں سورج کا عکس غائب تھا۔ ایراتو نے خود سے سوال کیا، ایسا کیوں تھا؟ ایک ہی تاریخ کے ایک ہی وقت میں شمالاً جنوباً واقع دو مصری شہروں میں کیے گئے ایک جیسے تجربے کے نتائج

مختلف کیوں تھے؟

کا شوق، امیراتو کے آلات تھے اور ان آلات کی مدد سے اُس نے صرف چند فی صد کی غلطی سے کسی سیارے کا محیط بالکل ٹھیک ٹھیک ناپا تھا۔

گھوڑا اگلے ایک ہزار سال تک عام یورپین باشندے زمین کو چپنا ہی مانتے رہے لیکن امیراتو ستمبر کی تحقیق نے کرہ ارض کے بارے میں پڑھے لکھے اور باشعور طبقے کی رائے کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ عظیم محقق، تحقیق اور مطالعے کی زیادتی کی وجہ سے اپنی آخری عمر میں اندھا ہو کر 196 ق م میں مصر کے شہر اسکندریہ میں انتقال کر گیا۔ امیراتو ستمبر کے دور میں بحیرہ روم سیاحت اور تجارت کے لیے مشہور اور اسکندریہ وہاں واقع سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔

امیراتو کے ہاتھوں کرہ ارض کا محیط دریافت ہونے کے بعد اسکندریہ میں گلوب تعمیر کیے گئے۔ ان گلوب میں دنیا کو خطا سے دیکھے جانے کے انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ تاہم یہ گلوب بحیرہ روم اور اس کے گرد واقع تین براعظموں کی حد تک تو ٹھیک تھے۔ لیکن چونکہ امیراتو مغرب میں واقع غیر دریافت شدہ خطوں (امریکا اور بحر الکاہل) کے بارے میں نہیں جانتا تھا اس لیے بحر اوقیانوس کی وسعت میں دور جاتے جاتے یہ گلوب غیر درست ہوتے جاتے تھے۔ امیراتو کا ماننا تھا کہ اگر بحر اوقیانوس کی وسعت رکاوٹ مذہبی توہم مغرب کی طرف سے سمندر کے راستے ہندوستان تک چلے جاتے۔

امیراتو کی تحقیق کے بعد اطالوی جغرافیہ داں اسٹرابو (Strabo) نے سمندروں کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ زمین گول تھی اور کرہ ارض کے تمام سمندر آپس میں ملے ہوئے تھے۔ اسٹرابو نے اپنی زندگی (63 ق م سے 24 عیسوی) میں یونان کی تاریخ و جغرافیہ سے متعلق 43 کتابیں لکھیں۔ اس نے ارتقائے کے نظریات کا دفاع کرتے ہوئے بحر اوقیانوس کے پار ایک خطہ زمین کے ہونے کی حمایت کی۔ اسٹرابو کی رائے میں دنیا کے گرد چکر لگانے کی ناکام کوشش کرنے والے واپس آ کر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ کسی براعظم نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔ بلکہ اُن کی ناکامی کی بڑی وجہ ہمت حوصلے اور رسد کی قلت تھی۔ اسٹرابو نے امیراتو کی تحقیق کا دفاع کرتے ہوئے لکھا کہ زمین کا خط استواء پر محیط چالیس ہزار کلومیٹر کے قریب ہی ہونا چاہیے تھا۔

امیراتو نے قدیم مصر کا ایک نقشہ لے کر اسکندریہ اور سائنے پر دو چھوٹی تیلیاں عمودی کھڑی کیں۔ وہ سوچنے لگا فرض کریں کہ سورج کے عین سر پر ہونے کی صورت میں کسی ایک لمحے میں دونوں ہی چھڑیوں کا سایہ زمین پر نہ پڑے یا ایک ہی وقت میں دونوں چھڑیوں کے سائے ایک ہی جگہ لے جاتے لے جاتے ہوں تو اس کا ایک ہی مفہوم نکلے گا یعنی زمین چھٹی اور اسٹرابو ہے۔ لیکن ایک ہی وقت میں کسی ایک چھڑی کا سایہ پڑنے اور دوسری کا نہ پڑنے کا کیا مطلب تھا؟ امیراتو نے غور کیا کہ کرہ ارض کی سطح کا خمیدہ ہونا اس پہلی کا واحد ممکنہ جواب تھا۔ مطلب یہ کہ زمین گول تھی۔ ایک بار کرہ ارض کو گول تصور کر لینے کے بعد امیراتو کو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ دونوں چھڑیوں کے سایوں میں مشاہدہ کیے گئے فرق کے لیے اسکندریہ اور سائنے کے درمیان فاصلہ کرہ ارض کی سطح کے ساتھ 7 ڈگری ہونا چاہیے تھا۔

یعنی اگر ہم چھڑیوں کو کرہ ارض کے مرکزی نقطے تک پہنچے ہوئے تصور کریں تو وہاں وہ ایک دوسرے کو مسات ڈگری پر قطع کر رہی ہوں گی۔ امیراتو نے اسی پر بس کرنے کی بجائے ایک آدی کو اُجرت دے کر سائنے اور اسکندریہ کے درمیان فاصلے کو ناپا جو اس وقت کے اندازے کے مطابق 800 کلومیٹر سے کچھ زیادہ تھا۔ امیراتو کے لیے بعد کا حساب آسان تھا یعنی 7 ڈگری کا فاصلہ کرہ ارض کے کل محیط 360 ڈگری کا 50 واں حصہ تھا اور یوں 800 کلومیٹر کے 50 گنا کا مطلب 40 ہزار کلومیٹر کے قریب تھا۔ امیراتو نے اعلان کیا کہ خط استواء پر کرہ ارض کا محیط 40 ہزار کلومیٹر یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔

امیراتو ستمبر کی دماغ سوزی کے مقابلے میں آج کی جدید تحقیق کے مطابق دنیا کے نقشے پر کھینچے گئے ہرایک ڈگری کے خط کا درمیانی فاصلہ 111.32 کلومیٹر ہوتا ہے۔ اسکندریہ 31.15 ڈگری شمال جبکہ سائنے 23.97 ڈگری شمال پر واقع ہے۔ دونوں شہروں کے درمیان 7.18 ڈگری کے فرق کا مطلب 799.27 کلومیٹر فاصلہ اور اس کے 50 گنا کا مطلب 40 ہزار کلومیٹر ہے۔ اور یہی کرہ ارض کا کل محیط ہے۔ زیادہ آسان الفاظ میں کہیں تو ہمیں عین خط استواء پر زمین کے گرد ایک دھا کا لپٹنے کے لیے کل چالیس ہزار کلومیٹر لے دھا کے کی ضرورت ہوئی۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح میں محض چھڑیاں، پاؤں اور دماغ کے ساتھ تحقیق

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا سترھواں حصہ

شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمین پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر اشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



کوشش کر رہا تھا۔ میرے جوابات نے انہیں کچھ حد تک نرم کر دیا تھا۔ اس سفر کے چرے پر جو بے بسی کی چھاپ بھی وہم ہو چکی تھی۔ ڈھالی گھٹنے سے زیادہ ہو چکا تھا، تفتیش مکمل ہو کے نہ دی تھی مگر وہ سب کچھ حد تک مطمئن ہو چکے تھے۔ اسی لیے مجھے

روزمرہ کے استعمال کی معمولی سی دوا اموسکیل میرے گلے کا پھندا بن گئی۔ تفتیش کرنے والے افسران مجھے یوں گھبرے کھڑے تھے جیسے میں کوئی خطرناک مجرم ہوں۔ وہ سوالات پر سوالات کر رہے تھے اور میں انہیں مطمئن کرنے کی

جا کر یہ کالی رات ٹلی تھی۔ اتنے میں ایک آفیسر میرے پاس آیا اور پوچھا۔ ”بس کا انتظار کر رہے ہو؟“ اس کا احقنا سوال سن کر بھی میں نے اپنے آپ کو خوشگوار رکھا اور مسکرا کر ہاں میں جواب دیا۔ اس نے پھر پوچھا۔ ”کیا بس ٹلی تھی؟“ میں نے سارا ماجرا اسے سنا دیا۔ سن کر بولا۔ ”کوئی بچہ تم کو دیا ہے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا تو کہنے لگا۔ ”پھر تم پر کوئی کیس نہیں ہے مگر منہ نہ ہو۔“ وہ چلا گیا مگر میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیا شکل سے میں اسے مگر منگ رہا تھا؟ جس کی وجہ سے وہ افسر مجھے اطمینان دلانے آیا تھا۔

مزید آدھا گھنٹا گزر گیا تھا جا کر گرے ہاؤس کی بس آئی۔ میں نے ٹکٹ دکھایا تو اس نے میرا سامان نیچے کپار ٹسٹ میں رکھ دیا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور کچھ دیر بعد اس دہشت ناک ماحول سے نکل آیا۔

بس نیا گرا میٹ میں رکی، لیکن مجھ میں نیا گرافل دیکھنے کا کوئی جوش و خروش باقی نہ تھا۔ حالانکہ دن نکلا ہوا تھا اور نیا گرا میٹ کا چھوٹا سا حسین شہر میرے سامنے تھا۔ پریشانی میں دل بھجا ہوا تو رنگ اچھے لگتے ہیں اور نہ ہی نظارے۔ مجھے خدشہ یہ تھا کہ جب شہریت ملتی ہے تو سارا ریکارڈ دوبارہ سے کھنگالا جاتا ہے اور اگر یہ بات سامنے آگئی تو پھر فیصلہ عدالت کرتی ہے کہ میں آیا سٹیشنز کا اہل ہوں بھی یا نہیں۔

میں نے طارق کو فون ملایا۔ اسے سارا ماجرا بتایا تو اس نے سر پکڑ لیا اور مجھ پر برس پڑا کہ اس کے پوچھے بغیر میں نے یہ حرکت کیوں کی۔ وہ چلا رہا تھا۔ ”میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے۔ میں نے برف بٹائی ہیں، کالنگ کارڈ نیچے ہیں، کوئی چھوٹے نہیں بچتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

بس نے ڈیڑھ گھنٹے میں ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو میں اپنے ٹریٹل پر اتارا۔

☆.....☆

بڑی مشکل سے میں اپارٹمنٹ پہنچا۔ ٹیکسی کا کرایہ بچانا چاہتا تھا، اسی لیے ایک سے دوسرے سب دے میں اپنے ہماری بھر کم بیگڑ کے ساتھ اپنا پوجھل جسم اور سن داغ بھی ٹھسٹ کر لایا تھا۔ راستے بھر میں یہ سوچتا آیا تھا کہ اگر پولیس نے زیادہ تفتیش کی اور کچھ نہ کچھ میرے کھاتے میں ڈال دیا تو میرے پاس جواب کیا ہوگا؟

امید ہو چکی تھی کہ اب وہ لوگ مجھے جانے کی اجازت دے دیں گے۔ ذہن پر چھائی دھند بھی صاف ہو چکی تھی اور میری کھوکھی ہنسی بھی لوٹ آئی تھی۔ میں مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس افسر نے پھر مجھے دہلا دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں تو بہت حد تک مطمئن ہو چکا ہوں لیکن ابھی ایک پولیس آفیسر آ رہا ہے۔ اگر تم نے اسے بھی مطمئن کر دیا تو ہم تمہیں جانے کی اجازت دے دیں گے۔“

اس جملے نے مجھے پھر سے دہلا دیا۔ میری امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اب میں پولیس آفیسر کا انتظار کرنے لگا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا رات ڈھل چکی تھی کمریج کے پانچ بجے ایک پولیس آفیسر آ گیا۔ وہ کئی عمر کا تھا اور اس کے سر پر بال خال خال رہ گئے تھے۔ لمبا قد اور کسرتی جسم۔ پہلے والا آفیسر اٹھا اور پولیس آفیسر نے اس کی سیٹ سنبھال لی۔ اس کا انداز بھی ایسیکیشن افسر جیسا تھا۔ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں پیوست کر کے وہ بولا۔ تم زیر حراست ہو اور اپنے وکیل کو بلا سکتے ہو؟ میرا وہی جواب تھا کہ مجھے وکیل کی ضرورت نہیں ہے اور میں خود ہی جواب دے سکتا ہوں۔

اس کے وہی سوالات تھے جن کے جوابات جو میں ایسیکیشن آفیسر کو دے چکا تھا۔ اب تو وہ جوابات مجھے ازبر ہو چکے تھے۔ وہ سوال کرتا اور میں فی الغور جواب دے دیتا۔ جو میں ایسیکیشن آفیسر کو دے چکا تھا۔ اس نے تین گھنٹے کے بجائے دو گھنٹے مجھ سے تفتیش کی۔ میرے سارے سامان کو بھی کھنگالا۔ اب میں بھی تھک چکا تھا۔ ارد گرد کھڑے لوگ بھی یور ہونے لگے تھے۔ آخر میں وہ بولا۔ ”ہم کیس کی تفتیش پھر سے کریں گے اور پھر کوئی فیصلہ کر کے تم کو اطلاع کر دیں گے۔“ اس نے مجھ سے میرا فون نمبر اور ایڈریس لے لیا۔ اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میری بس تو جا چکی ہے، اب میں کیسے جاؤں گا۔“

کہنے لگا۔ ”اگر ٹکٹ تمہارے پاس ہے تو وہی دکھا کر ٹورنٹو جانے والی کسی بھی بس میں بیٹھ جاؤ۔“

جب میں باہر نکلا تو صبح کے ساڑھے سات بج چکے تھے۔ رات کی سیاہی روشنی میں بدل چکی تھی۔ میں شدید تھکتا ہوا اور تھکاوٹ کی حالت میں تھا اور بس کے انتظار میں اپنے ہماری سامان کے ساتھ ایسیکیشن آفس کے باہر کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ سردی نے بے حال کر رکھا تھا۔ پوری رات کا جاگا ہوا تھا اور بدن جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ بہت ہی سخت وقت سے گزرا تھا اب

کئی ایک خدشات میرے ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔ میں جب اپنے سامان سمیت بس اسٹاپ پر تھکا ہارا اتر اٹھا تو ایسا لگا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ ساری رات کا سطر اور پھر پولیس کی تفتیش نے میرا اور میرے دماغ کا کچھور لال دیا تھا۔ اب اسٹاپ سے سوکڑا دربار ٹنٹ تک آنا میرے لیے دو بھر ہو گیا تھا۔ اپنے سامان کو اوارپنے آپ کو گھینٹا ہوا میں اپنے کمرے کی ڈور وال کے قریب آیا تو بے بسی سے ہتھیار ڈال دیے۔ سامان کو ڈور وال کے باہر جھاڑیوں کے قریب رکھا اور خود متصل سا پارٹمنٹ میں آگیا، مگر میں کوئی نہ تھا۔ سب دے کے دھکے کھاتا، اپنے سامان کو گھینٹا پارٹمنٹ پہنچا تو دن کے بارہ بجے تھے۔ مفتی جاب پر گیا ہوا تھا۔ سرجی اور شہباز کہیں گئے ہوئے تھے۔

میں نے کمرے میں جا کر ڈور وال کو کھولا اور باہر پڑا سامان اندر کمرے میں گھینٹ لیا۔ ڈور وال بند کی ادھر بے ہوش سا اپنے میز پر گر پڑا اور غور و فکر کرتے کرتے میں سو گیا۔ کچھ دیر ہی سویا ہوں گا کہ مفتی جاب سے واپس آگیا۔ اس نے کمرے میں جھانکا اور چیخ کر کہا۔ ”تم کب آئے؟“ میں بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹا سویا تھا کہ مفتی نے اٹھا دیا۔ اٹھ کر بیٹھا اور اپنے مرتعش ذہن کو یکجا کیا تھا لیکن مفتی سوالات پر سوالات کر کے میرے دماغ کے پرچے اڑاتا رہا۔ میں نے پورے محل سے یہ کہا۔ ”یارت تم چائے بناؤ! میں ابھی منہ دھو کر آتا ہوں۔“

ہم سوئے ہوں تو کبھی کبھار انجانے میں دوسرے آپ کی نیند کا خیال نہیں کرتے۔ پاکستان میں جب میں اپنے کمرے میں گہری نیند میں ڈوبا ہوتا تو میرا ایک کزن ہر وقت شاید اسی تاک میں رہتا تھا کہ میں کب سوؤں اور وہ کدور وازہ کھول کر شور مچاتے ہوئے پوچھتے۔ ”کیا سو رہے ہو؟“ میں جب امریکا سے ایک بار سردیوں میں پاکستان گیا۔ اپنے بستر میں گرم رضائی میں لپٹا سو رہا تھا۔ میرا ایک دوست ملے آیا تو مجھے گہری نیند میں سوتے دیکھا تو اتنا خیال کیا کہ مجھے نیند سے نہ اٹھائے اور پھر اسی رضائی میں گھس کر میرے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ ارد گرد کوئی مخلوق ہے تو میں جڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے خاموشی سے سوچوں میں گم اپنی رضائی کے اندر بیٹھے دیکھا تو دبل گیا۔ اپنے حواس میں آیا تو وہ ہلکے سے کہنے لگا۔ ”دن میں تو ملتے نہیں، سوچا کہ فجر پڑھ کر ہی مل آتا ہوں۔“ میں خود فجر پڑھ کر سویا تھا۔ اس دن مفتی نے بھی اچھے ایسے ہی جگایا تھا۔

میں واش روم سے لیونگ روم میں آیا تو اس نے چائے بنا رکھی تھی۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔ میں اس کے لیے ایک جیکٹ لایا تھا جو اس کے حوالے کی اور اس کے بھرپور شکریے پر میں نے مخصوص الفاظ کہے۔ ”اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟“

چائے پی کر سرجی اور شہباز کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ دونوں جاب پر گئے ہیں اور ایک کھنٹے تک آئیں گے۔ مفتی سڑکا اور امریکا کا احوال پوچھ رہا تھا جو سرجی نے پہلے ہی اسے گوش گزار کر دیا تھا۔ میں کچھ بتاتا تو یہی جواب ملتا کہ ”سرجی بتا چکے ہیں۔“ لیکن اب میں نے کہا کہ ”وہ بتاتا ہوں جو سرجی نے نہیں بتایا ہوگا۔“

پھر میں نے بارڈر پر اپنے ساتھ ہونے والے سارے واقعے کی مختصر تفصیل بتائی۔ وہ سن کے حیران و پریشان بیٹھا تھا۔ اسی وقت اس نے خان قیصر کو فون کیا۔ وہ گھر پر ہی تھا اور اسے آنے میں چند منٹ ہی لگے۔ اب دونوں بیٹھ کر پھر سے سب کچھ سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ سوالات بھی کرتے جا رہے تھے۔

خان قیصر نے ہمیشہ کی طرح قہقہہ لگا کر ایک تلی دی اور کہا۔ ”کچھ نہیں ہونا! اور اگر کچھ ہو گیا تو میں انہیں پھوڑ دوں گا۔“

مفتی نے مجھے تلی دی اور کہا۔ ”میرا ایک کزن مارحم کا کونسلر ہے۔ میں اس سے بات کر کے سب معاملہ ختم کر دوں گا۔“

دوست مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ میری پریشانی اب اتنی نہ تھی جتنی یہ میری نقشی کر رہے تھے۔ یہ تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ کوئی کیس بنانا چاہتے تو مجھے یا تو کوئی پیسہ دیتے اور یا پھر مجھ کو ہی اپنے پاس رکھ لیتے مگر میرے دوست مجھے تسلیاں نہ دے رہے تھے بلکہ پولیس کی غیر موجودگی میں دھمکا رہے تھے اور میں بھی ان کی ان ”تسلیوں“ میں آنے والا نہ تھا مگر ان کے غلوں سے میں انکاری بھی نہ تھا۔ میں مطمئن تھا مگر ان دونوں کی تسلیاں زیادہ سے زیادہ پانے کے لیے اپنا منہ بسورے بیٹھا تھا۔ ان دونوں کو غم میں تھلے ہوئے دیکھ کر مجھے اندر سے طمانیت مل رہی تھی کہ میرے خیر خواہ بھی موجود ہیں۔

اسی دوران دو اور خیر خواہ سرجی اور شہباز ایک ساتھ وارد ہوئے۔ سرجی ماشاء اللہ ماشاء اللہ کہتے ہوئے بغل گیر ہوئے۔ شہباز پہلے ہیسل بنورد بکھتا ہوا اور پھر یولا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی نیا سا پا ضرور ہوا۔“

خان اور مفتی دونوں نے مل کر میرے ساتھ ہونے والی پوری واردات کچھ مروج مصالحوں کے گوش گوار کی تو وہ دونوں پریشان ہو کر میرے ارد گرد بیٹھ گئے۔ اب ہم پانچ بندے بیٹھے نئے سیپا کا نام کر رہے تھے۔ کوئی تسلی دیتا اور کوئی کسی خدشے کا اظہار کرتا۔ اور میں ڈور وال کی کمزری سے باہر دیکھتا تھا کہ موسم بدل رہا تھا۔ آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ برف باری تمام ہوئی اور زمین جیسے کسی مچھر کے کی شہتر مٹی۔ بہار آنے میں گویا چند لمحوں کے تھے۔

ہماری یہ پارلیمنٹ کسی نتیجے کی کسی حل تک پہنچنے سے پہلے برخاست ہو گئی۔ خان قیصر سر جی کے ہاتھوں کی چائے پینے کے بعد شہباز کو گالیاں دیتا اور اس سے کچھ نہ کر رخصت ہوا۔ مفتی کو میں نے جیکٹ کا تختہ دیا تو وہ خوش ہو کر میز پر چڑھ بیٹھا۔ شہباز اس بات پر خوش تھا کہ دو بیٹے بعد اسے ایک لیب میں ایڈلسٹ کے Op-Co پروگرام میں جاب شروع کرنی تھی۔ سر جی مطمئن ہو کر فریج کھولے چلیپوں بھرے لفافے پر لاپچی نظریں گاڑے کھڑے تھے۔

میں اپنے دل میں کوئی ترنگ لیے کمرے میں آیا اور نسرین کو فون ملایا۔ فون اس کے بیٹے سعد نے اٹھایا۔ میں نے پوچھا۔ ”ماما گھر پر ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں ہیں۔“
میں نے پوچھا۔ ”بات کروا سکتے ہو؟“
جواب دیا۔ ”آپ کون؟“

مجھ میں سر جی کی آواز آئی۔ ”ماموں بات کر رہے ہیں۔“

سر جی نے اردو میں کہا تھا جو بچے کی سمجھ میں نہ آیا۔ میں کمرے میں بیٹھا فون کر رہا تھا۔ سر جی کی کو فون کرنے کیونگ روم میں آئے اور ریسیور اٹھایا تو اسی وقت میں سعد سے بات کر رہا تھا۔ اس نے میرا پوچھا تو سر جی نے اپنے جواب کی توپ چلا دی۔ میں نے غصے میں فون بند کر دیا اور کیونگ روم میں آ کر ان کی گردن پکڑ لی۔ وہ ابھی تک ریسیور تھاے کھڑے تھے۔ میں سخت غصے میں تھا۔ شہباز اور مفتی نس نس کر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ قصور سر جی کا بھی نہ تھا۔ وہ تو اچانک مجھ میں نادانستہ طور پر داخل ہوئے اور پھر غیر ارادی طور پر بول پڑے تھے۔ اب مجھے زیادہ غصہ کر کے اپنا دل نہیں جلاتا تھا۔ میں سونے چلا گیا۔ دن کے کچھ لمحوں کے بعد کوئی آکر سوپا تو پھر دوسری صبح اٹھا۔

بعد کے دنوں میں اپارٹمنٹ کا فون ٹیپ ہوتا رہا۔ جب

بھی میں کہیں کال کرتا یا پھر کال آتی تو کچھ ہی لمحوں میں کوئی کلک کی آواز آتی اور مجھے محسوس ہو جاتا کہ سچ میں کوئی ہے۔ ایک بار شہباز کا فون آیا تو میں نے اس سے کہا کہ تمہاری وجہ سے اور اپنی بیوی کی وجہ سے مجھ میں کیا تھا۔ اس نے سب معاملہ نہ تو پھر اس کا فون بھی نہ آیا۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ اپارٹمنٹ سے نکلنے وقت ایک پولیس کی گاڑی باہر کھڑی نظر آتی تھی۔ یہ معاملہ کچھ دن چلتا رہا اور دو ڈھائی ماہ بعد پولیس آفیسر کا فون آیا، اس نے کہا کہ ہم نے تمہارا سارا کیس دیکھ لیا ہے۔ تم اس میں محصور تھے اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ فون بند کرنے سے پہلے اس نے مزید کہا۔ ”تمہاری فائل اب بند کر رہے ہیں۔“ پھر اچھے دن کی نوید سنائی اور فون بند کر دیا۔

آج مجھے کا دن تھا۔ منگل کو مجھے بیوسال کو جوائن کرنا تھا۔

میرے ذہن میں یہ چل رہا تھا کہ بیٹے کے پانچ دن بیوسال میں جاب کروں گا اور ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر میں دن بارہ بجے سے رات بارہ بجے بارہ گھنٹے کی شیفتیں آکر مل گئیں تو وہ بھی کر لیا کروں گا۔ اسی طرح ہولڈنگ سینٹر سے نو سو ڈالر ایک ماہ میں بن جایا کریں گے۔ میرا ماہانہ خرچ پانچ سو ڈالر تھا اور اس کے علاوہ بیوسال کی تنخواہ کی بھی سیونگ ہو جایا کرے گی۔ بیوسال میں ایک بیٹے مارننگ یعنی صبح سات بجے سے تین بجے شیفت ہوتی تھی اور دوسرے بیٹے دوپہر تین سے رات گیارہ بجے۔ وہاں رات کی شیفت کا ایک الگ عہدہ تھا جو صرف رات میں کام کرتا تھا۔ اسی طرح آرٹیشن بیٹے میں پانچ دن چوبیس گھنٹے چلتا تھا۔ میری فیملی نے پاکستان سے آتا تھا اور مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ اپارٹمنٹ بھی لینا تھا اور گھر کا سارا خرچہ اور دوسرے ضروری سامان کے لیے بھی ڈالر چاہئیں تھے۔ اس لیے مجھے دن رات کام کرنا تھا۔ جب سے بیوسال کی جاب ہوئی تھی تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ ماہانہ دو ہزار ڈالر وہاں سے مل جایا کریں گے۔ کینیڈا کی حکومت بچوں کا الاؤنس بھی دیتی ہے اور میرے دو بچوں کو چار سو ڈالر تک ملنے کی امید تھی۔ اب مالی گھرمندی نہ تھی۔ بچوں کے اسپانسر کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ چند ماہ میں وہ میرے پاس کینیڈا میں ہوں گے۔ سر جی نے بھی فیملی اسپانسر کی ہوئی تھی۔ موسم بدل رہا تھا اور مشکل دن بھی بدلنے والے تھے۔

اپارٹمنٹ آٹھ سو سے نو سو ماہانہ کرائے پر ملتا تھا۔ گاڑی ابھی میرے پاس نہیں تھی مگر گاڑی خریدنے کی زیادہ فکر نہ تھی بلکہ ڈرائیونگ لائسنس لینا دشوار تھا۔ مفتی ڈرائیونگ ٹیسٹ میں

ہو جاتی ہیں۔

آج درجہ حرارت غیر یقینی طور پر یس کے قریب تھا۔ سر جی نے چولے پر ہنڈیا چڑھا رکھی تھی۔ وہ متواتر اسی جانب متوجہ تھے۔ میں نے اعلان کیا کہ نماز جمعہ کے بعد کسی پارک میں جا کر لطف اندوز ہوں گے۔ شہباز پھر کراہا۔ سر جی یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ ہمارے کپڑے استری کر دیں گے۔ شہباز اور میں نے انہیں سختی سے ہنڈیا کی جانب توجہ رکھنے کی ہدایت کی اور کہا کہ ہم اپنے کپڑے خود استری کر لیں گے۔

جمعہ نماز پڑھ کر نکلے تو ہمیشہ کی طرح سر جی نے سڑک پار دیسی دکانوں کی جانب دوڑ لگائی۔ میں اور شہباز ایک دوسرے کو خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ اب سر جی کی جلیبیوں پر ہم نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ واہس آئے تو خالی ہاتھ نہ تھے۔ ایک لفافے میں سموسے ڈالے ہمارے سامنے کھڑے سکرا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”اب جلیبیوں کی جگہ کیا سموسوں نے لے لی ہے؟“

کہنے لگے۔ ”اپنا تو یہ اصول ہے کہ آتا نہ چھوڑے اور جاتا نہ موڑے۔“

شہباز اور میں نے اس بار اس مثل کی کوئی وضاحت نہیں مانگی۔ میں یہ تو سمجھ چکا تھا کہ آج انہیں جلیبیاں نہیں ملیں اور سمو سے اٹھالائے۔ اسی پس منظر میں وہ اب آتا جاتا کر رہے تھے۔

یہاں آپ کسی اسٹور میں آگ جلا کر اس پر کوئی کڑھائی نہیں رکھ سکتے کہ جس میں سمو سے یا پکڑے تلے جائیں یا پھر کوئی اور چیز تیار کی جائے۔ چولہا جلانے کے لیے باقاعدہ ایک لائسنس لینا پڑتا ہے اور لائسنس بھی اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔ ہمارے ایک جاننے والے نے ریسٹورنٹ کھولا۔ تندر کا لائسنس نہیں ملا۔ مٹی کو اعتراض تھا کہ حفاظتی اقدامات ٹھیک نہیں، جگہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ خطرے کی صورت میں یا آسانی باہر نکلا جاسکے۔ میرا دوست چھ ماہ خوار ہوتا رہا اور آخر کار ہتھیار ڈال کر اپنا نقصان کر گیا۔

میں سوچتا تھا کہ دیسی اسٹوروں میں جو سمو، توڑے برورٹیوں کے بنے پک اور یہ جلیبیاں شاید اسٹور والے اپنے گھر سے بخا کر لاتے ہوں گے۔ بعد کے دنوں میں یہ عقدہ کھلا کہ کم آمدنی والے لوگ گھروں میں یہ چیزوں بناتے ہیں اور جس قیمت پر اسٹوروں کو سپلائی کرتے ہیں اسٹور والے دوگنی قیمت پر گاہکوں کو بیچتے ہیں اگر کوئی دکان میں سمو سے بیچے

ایک بار اس لیے ٹپل ہوا تھا کہ کوئی کتاب اس کے ٹیبلٹ کے دوران لکھ سے نکل آ کر مرے مرتے بچا تھا۔ اس کے بعد مفتی نے اعلان کر دیا تھا کہ یہاں ڈرائیونگ لائسنس لینا ایسے ہی ہے کہ کسی بھوکے شیر کے منہ سے نوالہ چھین لیا جائے۔ مفتی کے اس ٹوڑے کے بعد ہم سب ڈرائیونگ ٹیبلٹ دینے سے تو بہت تاب ہو چکے تھے۔ ویسے گاڑی خریدنا اتنا مشکل نہ تھا۔ ڈیڑھ سو ڈالر ماہانہ انشورنس دینی ہوتی تھی وہ ایک اضافی بوجھ لگتا تھا۔ اتنا تو ایک ماہ کا گرمی کا خرچ ہوتا ہے۔

شہباز اور سر جی اپنے ایک ہفتے کی سیکورٹی گاڑی کی جانب کا کوئی مکمل کرنے کے بعد آکر گھر پر بیٹھے تھے۔ سر جی ڈور ال کے باہر ان سوکھی چھڑائیوں پر نظر رکھے ہوئے تھے جن پر سے اب برف ہٹ چکی تھی۔ شہباز ان دھکوں کو ردور دیتا تھا جو اس کی زندگی میں یا کسی کی بھی زندگی میں بھی آسکتے تھے۔ مفتی اپنی جانب پر تھا۔ سر جی نے مجھے دیکھ کر اپنی کل فون والی حرکت پر معذرت کی۔ میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں، میں نرسن سے آج بات کر لوں گا۔“

وہ خوش ہوٹا اور کہہ اٹھے شہباز کو دیکھ کر بولے۔ ”آخر تو کب تک شام کے مردے کو روئے گا؟“ سر جی اپنے محاوروں سے کب باز آنے والے تھے۔

شہباز غصے سے بولا۔ ”اب آپ بدعائیں بھی دینے لگے ہیں۔“ پھر میری جانب دیکھ اپنی بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ نہیں سمجھتے تو یہ بھی خاموش تھا اور جب سے آپ واپس آئے ہیں ان کی زبان نیچی کی طرح چلنے لگی ہے۔“ سر جی نے شکایت کی کہ انہوں نے کوئی بدعا نہیں دی بلکہ یہ کہا ہے کہ کب تک اپنے دکھ بیان کرتے رہیں گے۔ شہباز ہر وقت کوئی نہ کوئی شکایت اور اپنا غم کھول کر بیٹھا ہوتا تھا تو سر جی نے ایک طرح سے نصیحت کی تھی۔

مارچ کے درمیانی دن چل رہے تھے۔ موسم بہار کی جانب گامزن تھا۔ امیدوں اور مسرتوں کے پھول کھلنے کو تھے۔ آسمان وقفے وقفے سے آئندہ دنوں کی جھلک دکھلا کر پھر کہیں کھوجا جاتا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ اب آگے کے دن کڑے نہ ہوں گے۔ مجھے وہ کینڈا دیکھنا تھا جو بہار اور گرمیوں کے دنوں میں وہ نظارے لے کر آتا ہے جو خواب مستی میں نظر آتے ہیں۔ یہاں کی گرمیاں ایسی ہوتی ہیں کہ درجہ حرارت تیس کے آس پاس بھٹکتا رہتا ہے۔ تیس ہو تو بلا کی گرمی کہلائی جاتی ہے۔ اگر بتیشیں ہو جائے تو لوگ ہلکا اٹھتے ہیں۔ پھر قدرت کا ”تسم“ ایک دو دن بعد نرم پڑتا ہے اور بلا کی بارشیں شروع

توبانے والے کو پچاس ڈالرز ملے ہیں۔ خرچہ نکل کر اسے پچیس تیس ڈالرز بچتے ہیں۔ یہ امریکا اور کینیڈا ہے جہاں کچھ لوگ اس طریقے سے اپنی گزربس کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ گھروں میں کیرنگ کرتے ہیں اگر کسی کے گھر پر پارٹی ہو تو وہ کیرنگ کر دیتا ہے۔ بریانی، بہاری، حلیم اور قورمہ کے علاوہ سیخ کباب بھی آپ کو ہول کی نسبت بہت کم قیمت پر پڑتے ہیں۔

صبحہ خانہ ہمارے ملک کی بہت بڑی اداکارہ تھیں۔ ان کی سنشوش کمار سے شادی ہوئی۔ ایک باعزت مقام پایا۔ لاکھوں پرستار تھے۔ لوگ آگے پیچھے پھرتے تھے۔ بچھلے دلوں ایک خبر پر بھی کہ وہ اسٹور پر سو سے بنا کر بیچ رہی تھیں۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر مقامی اخبار کی خبر تھی۔ اس کو میں برا نہیں سمجھتا۔ ہر انسان اپنے موجودہ عہد میں زندہ رہتا ہے اور یہ ان کی بڑائی ہے۔

سری سمسوں کا بھرا لقاؤ پکڑے مطمئن کڑے تھے اور کھڑے تھے کہ پارک میں بیٹھ کر پکک منائیں گے۔ سری ہر وقت بھلے ہی وہ دلت کتا ہی کڑا ہوا، اس میں مثبت پہلو نکال لیتے تھے۔ یہ صفت ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ میرے کچھ بڑھنے والے اس بات پر غصہ کرتے ہیں کہ سری آپ کو تنگ بہت کرتے تھے۔ میں انہیں بتاتا چلوں کہ سری جی کی وجہ سے ہم بھی پریشان نہیں ہوئے بلکہ جہاں میں ذرا لکڑ لایا تو سری جی کا ہاتھ میرے کندھوں پر ہوتا۔ جب میری اور ان کی تعلیمی کینیڈا آئی تو ہم ایک ہی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں رہتے تھے۔ ہمارے روکنے کے باوجود ہر روز ان کا کوئی نہ کوئی بچہ کھانے کی ٹرے پکڑے ہمارے دروازے پر آ جاتا تھا۔ وہ اپنے گھر جب بھی کھانا بناتے تو ہم کو بھی اس میں ہمیشہ شامل رکھتے تھے۔ سری جی پر مالی مشکلات بہت آئیں مگر وہ خاموشی سے کن کو کچھ بتائے بغیر ایلے سہتے رہے۔ میں مالی طور پر بہتر ہوا تو میں نے انہیں پکھرم دینا چاہی۔ میری منت سماجت کے علاوہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئی اور انہوں نے تم آنکھوں کے ساتھ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے حالانکہ معلوم تھا کہ انہیں اس کی اشد ضرورت ہے۔ ایسی خود داری بہت کم دیکھنے میں آئی ہے اور خاص کر جب کسی کے بچے عمر دیوں کا شکار ہوں۔ اگر سری جی اپنی کچھ خصوصیات کے حامل نہ ہوتے تو شاید میں اسے سے انہیں نہیں اور شفٹ کر دیتا۔

ہم اپارٹمنٹ والوں پہنچے تو مفتی چکن میں لکڑا کچے میں جھانک رہا تھا۔ مفتی کا چکن سے واسطہ صرف یہی تھا کہ کھانا کھالیا اور اس کو چکن صاف لے۔ شہباز کو اعتراض ہوتا تو سری صفائی کر لیتے۔ مفتی نے ہمیں دیکھا اور پھر سری جی کے ہاتھ میں

پکڑے لقاؤ کو دیکھا۔ پھر وہ لقاؤ کی جانب لپکا اور سر ہانے لقاؤ پیچھے چپا کر کہا۔ ”یہ پکک میں کھائیں گے۔“ حیرا مفتی کو پھر بتایا گیا کہ آج پہلی بار اچھے موسم کا فائدہ اٹھا۔ ہوئے کسی پارک میں کھلے آسمان اور فضاء میں بیٹھنے کا ارا ہے۔

ٹورنٹو میں آپ کہیں بھی رہیں۔ آپ کے ارد گرد متہ پارک ہوتے ہیں۔ اکثر میں جاگنگ ٹریکس بنے ہوتے ہیں خوب صورت گھاس سے ڈھکے لان اور ان کے کناروں پر درختیں۔ ساتھ کوڑے دان رکھے ہوتے ہیں اور اسی لیے ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی آپ کو نظر نہیں آتا۔ ہم بھی ایک ایسے ہی پارک میں گھاس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ ایک قمریاس میں گر چائے پی۔ ساتھ چائے کے گک اور ڈسپوزبل پلیٹیں تھیں۔ شہباز چادر پر لیٹا تھا۔ مفتی اسے گھور رہا تھا بلکہ ہم سب سے ناخوش کیونکہ ہم بیٹھ کر کھائے گھاس پر بیٹھے تھے۔ پاکستان کی طرح کوئی یہاں گھاس کو نہیں رو دنتا جس طریقے سے ہم ”جاہلوں کی طرح اس کا ستیاناس کر رہے تھے۔ سری جی اور مفتی کی بجز شروع ہو چکی تھی۔ سری جی کہنے لگے۔ ”یہ کیا پکک کرنا کرنا بیچو پر بیٹھیں۔“ مفتی نے کہا۔ ”اوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ شہباز بولا۔ ”اگر کوئی بیٹھ کر بیٹھنا چاہے تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں درختوں کے سايوں میں نرم دھوپ پر بیٹھا اس چا آسمان کو دیکھ رہا تھا جو صدیوں بعد ایک بڑے انتظار کے بعد ہم پر چھایا تھا۔ آسمان کی نیلا ہٹ میں کچھ بادل ہماری طر آداری سے گھوم پھر رہے تھے۔ ہوا میں قدرے خشکی تھی مگر ابھی جینکوں اور گرم ٹوپوں کی وجہ سے بے آرام نہ ہو رہے تھے۔ گرم چائے مجھے دلا سے دیتی اور میں بہل رہا تھا۔ مارٹن گر روڈ پر گاڑیاں اور بسیں آتی جاتی نظر آ رہی تھیں مگر ان کا شور، سے دور تھا۔ کوئی بے تحکم ٹریفک نہ تھی اور نہ ہی دھکم پیل۔ سار نظام ایک قاعدے اور قرینے سے چل رہا تھا سوائے ہمارے جو قدرے بدتمیزی سے چادروں پر پاؤں پارے لینے تھے۔ کچھ دیر میں مفتی بھی نادل ہو گیا اور پھر ہماری طرح وہ بھی نظر سے چرے لینا تھا۔ مطمئن کھوں میں نیلے آسمان تلے تیرنے بادل رگ وپے میں کیا کیا سرسبز بھرتے ہیں، اس کا احساس مجھے پہلی بار کینیڈا میں ہو رہا تھا۔ پہلے ہم چائے اور سو سے کھا کے خاموش پڑے رہے اور پھر ایک دوسرے سے دلوں کے حال جاننے لگے۔ دلوں کے تار پھرنے تو ہماری باتیں سروں کی طرح بننے لگیں۔ باتیں کرتے بھی آنکھیں خالی خالی نظر آتے لگتیں اور کبھی مسکرانے لگتیں۔

شام سے ذرا پہلے ہم اپارٹمنٹ آئے۔ سردی کہیں دیکھی
بڑی تھی اور سورج کے جاتے ہی وہ باہر آکر ہم پر برسنے لگی۔
ٹورنٹو کڑکنے لگا تھا کہ ہم اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ سر
جی نے مجھے شہو کا دیا۔ ”کمرے میں جا کر نرسین کوفون کرو۔ میں
اتنی دیر میں کھانا لگاتا ہوں اور باہر کے فون کو شہباز کی دسترس
سے دور بھی رکھوں گا۔“

”فون تو پہلے بھی آپ نے ہی اٹھایا تھا اور اب مجھے بچ میں
کیوں کھسیٹ رہے ہو۔“ یہ شہباز تھا جو سر جی پر لال بھسوکا
ہو رہا تھا۔

میں جب کمرے میں جا رہا تھا تو سر جی شہباز سے یہ کہہ
رہے تھے۔ ”تم آڑے ترہٹے کیوں ہوتے ہو جب دل میں
کوئی میل نہیں ہے؟“ ان کی بات آگے بڑھ رہی تھی کہ میں نے
کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

میں نے فون ملایا تو نرسین نے ہی اٹھایا۔ مجھے یہ گمان
تھا کہ وہ شکوے شکایتیں میرے سامنے رکھے گی اور میں جواب
میں اپنے معروضات پیش کروں گا۔ مجھے مایوسی ہوئی جب وہ
شکوہ طراز نہ بنی۔ میری وضاحتیں دھڑکی کی دھڑکی رہ گئیں۔ اس
نے پوچھا۔ ”کب آئے؟“
میں نے جواب دیا۔ ”کل میں نے فون کیا تھا تو سعد
نے اٹھایا تھا۔“

وہ بولی۔ ”مہرفون بند کر دیا تھا؟“
میں نے سر جی کی غلطی بیان کی تو جواب میں
صرف۔ ”ہوں“ کہا۔ میں نے پوچھا۔ ”ناراض ہو؟“
جواب آیا۔ ”نہیں، بالکل نہیں۔“
میں نے پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“
جواب دیا۔ ”کچھ نہیں۔“

میرے سوالوں کے اس کے ہاں جوابات ختم ہو گئے
تھے۔ میں خاموش رہا تو بولی۔ ”کوئی اور سوال نہیں؟“
میں نے کہا۔ ”ابھی کیا سوال پوچھوں جب کہ تمہارا
جواب مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کراس کی پٹی مجھے سنائی دی۔ میں
نے پوچھا۔ ”نہیں کیوں رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”ہیو سال کب جوائن کر رہے ہو؟“
میں نے کہا۔ ”تین دن بعد منگل کے روز۔“
اس نے جواب میں کہا۔ ”میں نے اپنے سوالات اسٹے
کر رکھے ہیں لے پوچھوں گی۔“ پھر ایک وقفے کے بعد
بولی۔ ”کل ویک اینڈ ہے۔ کیا مل سکتے ہو اگر فرصت ہے تو؟“

کسی نے سر جی کو کریدنا تو وہ پہنے لگے۔ دروازہ کھان کی
آٹھوں سے چپکنے لگا۔ باہر کی کھلی صاف ہوا کے جھونکے انہیں
بہار کر گئے۔ وہ کہنے لگے۔ ”میں پاکستان میں بڑی محنت اور
شہقت کے بعد اپنے مقام پر پہنچا تھا۔ میں نے پڑھائی کی اور
اس کا خرچا اٹھانے کے لیے فٹ ہاتھوں پر سامان بیچا۔ شادی
ہوئی تو معلوم ہوا کہ میری کوئی سالی امریکا میں عالیشان زندگی
گزار رہی ہے۔ میں رشوت اور حرام کی آمدنی پر لعنت بھیجتا تھا۔
اپنی تنخواہ سے گھر جیسے بھی چلاتا مگر اچھا چلا رہا تھا۔ امریکا میں
سالی صاحبہ ہر بار فون کر کے بہن کو ہتھی کر آپ لوگ بھی سب
پھوڑ چھا کر امریکا آجائیں۔ میں جاب سے گھر جاتا تو ہر
وقت یہی سننے کو ملتا۔ اسی جبر کے تحت میں نے کینیڈا کی
ایمریشن کے لیے درخواست دے دی۔ ایمریشن ملی تو گھر میں
میرے علاوہ سب پر شادی مرگ کی کیفیت تھی۔ سب نے مل
کر ”پوگرام“ یہ بنایا کہ میں کینیڈا میں استری دوں گا اور فیض
صاحب وہیں سے مجھے لے کر امریکا چلے آئیں گے اور پھر
میری زندگی بھی انہی کی طرح عالیشان ہو جائے گی۔ مجھے بھی
آنے سے پہلے سب نے امام خاں بنانا شروع کیا۔ داتا دربار بھی
گیا۔ بہت سی امیدیں لے کر کینیڈا ایئر پورٹ آیا تو معلوم ہوا
کہ فیض صاحب تو نہیں آئے۔ یہ تو اللہ کا شکر تھا کہ ندیم بھائی کا
فون نمبر میرے پاس تھا۔ انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ میری تو
لام آرزوئیں خاک میں مل گئی تھیں مگر میں اپنے منہ سے کچھ نہ
کہتا تھا۔“

پھر وہ کہتے کہتے رک گئے۔ اپنی آنکھیں صاف کیں۔
ہم تینوں حالانکہ یہ سب جانتے تھے مگر ان کی دل سے نکلتی باتیں
سن کر خاموش اور اداس تھے۔

انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی اور پھر آسمان کی
اعتوں میں نظریں گاڑ کر بولنے لگے۔ ”میں اپنی جاب چھوڑ
آیا ہوں۔ یہاں شاہد سیکورٹی گاڑڈ کی جاب کے علاوہ مجھے کوئی
اور جاب نہ ملے گی۔ فیملی کو اسپانسر بھی کر لیا ہے۔“ وہ پھر
خاموش ہو کر سوچوں میں ڈوب گئے۔ پھر سوچوں سے باہر نکلے
تو بولے۔ ”کوئی بات نہیں۔ اللہ سب خیر کرے گا۔“ یہ کہہ کر وہ
خاموش ہو گئے ان پر ایک سکوت طاری ہو گیا تھا۔

سارا ماحول بے رونق ہو گیا۔ مفتی جیسا شخص بھی کوئی
آٹھوں سے انہیں تک رہا تھا۔ ہم دل گرفتہ بیٹھے تھے اور سر جی
ہر میری جانب دیکھ کر بولے۔ ”نرسین کوفون نہیں کیا؟ اس
معلوم پر کیا گزر رہی ہو؟“ اور ہم سب کے کیوں پر مسکراہٹ
اکٹیل پٹی۔

وہ ایک اکھڑ مزاج شخص تھا۔

باکمال جہازوں کی حیثیت سے اسے بہت شہرت حاصل تھی۔ لیکن اس کی یہ خرابی بہت نمایاں تھی کہ وہ اپنے آگے کسی کا پس نہیں لاتا تھا۔

اس وقت اس کا دماغ اس لیے آسمان پر تھا کہ اسے دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مضبوط مسافر بردار بحری کپتان بنا دیا گیا تھا۔

اس کپتان کا نام تھا کیپٹن ایڈورڈ راسمٹھ اور جہاز کا نام تھا ٹائی ٹینک۔ یہ وہی ٹائی ٹینک ہے جو ایک داستان بن کر رہ گیا۔ نہ جانے کتنی کہانیاں اس پر لکھی گئی ہیں۔ ایک شاندار فلم بھی بن چکی ہے۔ دنیا کا بچہ بچہ اس جہاز کے نام سے واقف۔ کیپٹن ایڈورڈ راسمٹھ کو وہ لمحات بہت اچھی طرح یاد تھے جب اس عظیم الشان بحری جہاز کو پہلے سفر پر انگلینڈ سے روانہ کیا گیا تھا۔

کیا شاندار انداز میں جہاز کی رخصتی ہوئی تھی۔ سیکڑوں لوگ بندرگاہ پر موجود تھے۔ ہزاروں غبارے اور کبوتریں چھوڑے گئے تھے۔ شاہی بیڈز مسلسل دھنیں بجا رہی تھیں۔ خود کیپٹن راسمٹھ کو لوگوں سے مبارکبادیں وصول کرتے کرتے تھک چکا تھا۔

اس جہاز کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ اس جہاز کو اگر خدا بھی چاہے تو ڈیوئیس سکتا (نوحو بال اللہ) اس کی بناوٹ اتنی ہی اور شاندار تھی۔

بالآخر یہ جہاز اپنے سفر پر کوروانہ ہوا۔

منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا وہ جہاز آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کینن میں سویا ہوا تھا۔ اور خواب میں بھی

میں چپ رہا تو بولی۔ ”سعد کے لیے کل بے بی سنگ کردالوں گی۔“

میں نے ہائی بھری اور کل کیل سب دے پر گیارہ بجے ملنے کا وعدہ کیا اور فون بند کر دیا۔

آج وہ ابھی ہوئی تھی یا کہ میں، اس کا مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا اور سوچوں کو باہر پھینکا۔ مجھے

معلوم نہ تھا کہ کل کیا بات ہوئی ہے؟ کوئی بات ہوئی ہے یا آج فون والی ہاں ہوں میں بات ختم ہوئی۔ میں پرنس چارمنگ سے دوبارہ وہ ندیم بن گیا جوڑ رنڈ کی تختیوں سے لڑتا چلا آ رہا تھا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو سرجی اور شہباز کی سوالیہ نظریں میری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور میرے جوابات وہی

صرف ہوں یا ہاں میں تھے۔ ان کی جانب سے کوئی سوال نہ آیا کیونکہ شاید میرے چہرے پر لکھے جوابات انہوں نے پڑھ لیے تھے۔

دوسرے دن کا موسم وہی تھا جیسا کل تھا۔ ٹھہرا ہوا اور خوشگوار۔ ہوا میں چل رہی تھیں مگر خوش ہونے والوں کو کئی دہائی

ہوئیں۔ نیلا آسمان میرے سر پر چھایا تھا اور وہی بادلوں کے چند آوارہ کٹڑے ہواؤں کی سمت رواں دواں تھے۔ میں نے

جبکہ کی جیب میں نسرین کے لیے خریدا گیا پرغصہ رکھا۔

دوری جیب میں ادنی نوٹی رکھی اور ناشتا کرنے کے بعد چا۔ کا ایک کپ کی کر باہر نکل آیا۔ مفتی، سرجی اور شہباز کی خاموش تھے، مجھے معلوم نہ تھا۔ میں اپارٹمنٹ سے باہر آیا تو

نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ شاید سب جا۔ تھے کہ باہر کا موسم میرے اندر آ بیٹھا ہے۔

میں کپٹنگ سب دے جانے والی بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا۔ شیشے کے کینن سے ٹیک لگائے میں، لم

کے انتظار میں تھا۔ ویک اینڈ پر ہمیں کچھ دیر سے نمودار ہوئی تھی اور میں اس انتظار میں موسم کو سردی سے باہر آتے محسوس کر

تھا۔ برف پگھل کر کبھی کی غائب ہو چکی تھی۔ درجہ حرارت در کے قریب تھا اور سب لوگ اسی کو بہار کی آمد بتا رہے تھے

درخت گوا بھی تک بے برگ تھے۔ تھے مگر اب وہ بھی مسکراتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ لگتا تھا کہ بہار کی آمد کی نوید انہوں

سے بھی کہیں سے سن لی ہے۔ میرا ہنسا دل بھی مجھے نئے موسموں کے

استعاروں کی خبریں دے رہا تھا۔ آج بھی موسم سرد تھا مگر

چینی نہ تھی۔ اسے میں ایک مظلوم الحال شخص کوئی پرانی کا جبکہ اپنے اوپر ڈالے کاٹتا ہوا آیا اور شیشے کے کینن میں رکھا

تھوڑا سا آ بیٹھا۔ میں بھی تھک کر کینن میں آ گیا تھا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کن انہیوں سے کینن کے کونے میں دیکھ رہا

اگر ہاتھ کہ جب وہ امریکا کی بندرگاہ پر اترے گا تو وہاں کتنا شاندار استقبال ہوگا۔

بہت سہانا خواب تھا اور اس سہانے خواب میں اس وقت گڑ بڑ ہوگئی۔ جب کسی نے دروازے پر زور زور سے دھک دینی شروع کر دی۔

وہ بہت جھٹلایا ہوا بستر سے اتر اٹھا۔ چاڑھ کھانے والا انداز تھا اس کا۔ اس نے اپنے کیمین کا دروازہ کھولا تو اس کا ایک ماتحت بہت بوٹھلایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کیا بات ہوگئی۔ کیا قیامت آگئی۔“ اسٹھ نے پوچھا۔

”جناب آئیں برگز.....“ ماتحت نے بتایا۔ ”جہاز کے راستے میں آئیں برگ آ رہے ہیں۔“

”کس نے بتایا تم کو۔“

”ہمیں اطلاع دی گئی ہے جناب۔“

”بے وقوف انسان۔ کیا تم لوگوں نے ٹائی ٹینک کو معمولی بوٹ سمجھ رکھا ہے کہ آئیں برگ سے ٹکرا لٹ جائے گی۔“

”پھر بھی جناب۔ خطرہ تو ہے نا۔“

”کوئی خطرہ نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ یہ جہاز خود اپنی رکاوٹ صاف کر دے گا۔“

اور کپٹن اسٹھ اور اس کے محلے کے کچھ افراد کی بیبی ایک ایسی زبردست غلطی تھی جس نے ٹائی ٹینک جیسے جہاز کو برف کے ٹکڑوں سے ٹکرا کر پاش پاش کر دیا۔

اسٹھ نے مائٹرنک کو نظر انداز کر کے تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی کی تھی جس کی وجہ سے ایک اتنا بڑا حادثہ ہو گیا جو داستان نہ کر رہ گیا۔

دوسرے کی نظروں کی زد میں تھے۔ آج اس نے سیاہ ڈریس پینٹ پر ہلکی نیلے رنگ کی شرٹ پہنی تھی اور اس پر براؤن جیکٹ بال شافٹوں پر بکھرے تھے اور رنگ پورے پلٹ فارم پر حادثہ تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھی اور ہنستی ہوئی میرے گلے میں جھول گئی۔ میرا اپنا وزن ٹورنٹو کی شدتوں نے بہت کم کر دیا تھا مگر میں اس کے وزن کو با آسانی سہہ گیا۔ میں اپنی فطرت کے تحت سہم کر ارد گرد دیکھنے لگا۔ ایک دو لوگ پاس سے گزرے بھی تو اچھے جیسے کچھ دیکھا بھی نہ تھا۔ اس نے پہلے دن مجھ سے کہا تھا کہ نسرین ایران میں ایک پھول کا نام ہے اور اس دن واقعی معلوم ہو گیا کہ نسرین ایک پھول ہے۔ اس پھول کو توڑنے کی بجائے میں نے سوچ کر احتیاط سے اپنی ٹخن پر رہنے دیا مگر اس کی خوشبو میرے وجود میں بھری تھی۔

وہ مسکرا رہی تھی، پھر کہنے لگی۔ ”شکر ہے تم نے اپنے جنگلی بال تو کٹوائے۔“ پھر مجھے دیکھ کر بولی۔ ”بال کٹوانے سے کوئی فرق تو نہیں پڑا مگر ٹھیک ہے۔“

میں خاموش کھڑا مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دراصل اس کے اس طرح گلے لگنے سے میں ذرا گھبرا گیا تھا۔ کین سینٹر میں تو ایک دو بار کسی نہ کسی وجہ سے ہاتھ پکڑا تھا یا ایک آدھ بار

ہے۔ میں ذرا متوجہ ہوا تو وہ سامنے شیشے کے پار سڑک پر آتی ہال ٹریفک دیکھنے لگ گیا۔ یہ تماشا پھر شروع ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ کیمین کے کونے میں کوئی قیمتی چیز پڑی ہے اور وہ میری طرفیں بھا کر اسے اٹھانا چاہتا ہے۔ میں نے غور سے جواب لیکن کے کونے میں زمین پر دیکھا تو دس سینٹ کا سکہ پڑا تھا۔ ”قیمتی چیز“ اس کی نظر میں قارون کا خزانہ تھی جو وہ مجھ سے اپ کر اسے چھیننا چاہتا تھا۔ میں اندر سے دہل گیا۔ میں دنیا لہرتی یافتہ ملک میں کھڑا تھا اور وہ ملک جو ناروے اور ایلن کی طرح سوشل امداد دیتا ہے۔ اب اس شخص نے اپنی ٹیٹا ٹیک کو لپکایا اور اپنے پاؤں سے آہستگی سے اس خزانے کی طرف کھینچنے لگا اور آخر کار وہ کامیاب ہو گیا۔ کینیڈا کی اسٹاک نام ہوئی۔ میرے ذہن میں یہ خیال اسی لمحے اتر کر کے علاوہ کوئی بھی ہر ایک کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔

لہذا دیکھا کہ امیر ترین ملک ہی کیوں نہ ہوں۔ بس آئی اور میں کینکٹ سے ہوتا ہوا کیل سب دے پر ایک فارم خالی پڑا تھا اور سامنے پچھلے فرش پر رکھی بیچ پر مارین بیٹھی تھی۔ اس کی نظریں اترتے مسافروں پر ہلکے لوگ میرے ہمراہ اترے اور ہم ان لمحے ایک

اس حادثے میں 1514 افراد ہلاک ہوئے اور ایک سو اسی ملین کا نقصان ہوا تھا۔

انسان اگر غلطیاں نہ کرے تو اتنے بڑے حادثے کیوں رونما ہوں۔ ایسے حادثے نہ یاد دلاتے ہیں کہ انسان خطا کا پتلا۔ بعض غلطیاں انسان کی اپنی ذات یا اس کے گمراہیوں تک محدود رہتی ہیں۔ لیکن کچھ خطائیں ایسی ہوتی ہیں جو تاریخ کا بن جاتی ہیں، اور ان کی وجہ سے تاریخ بدل جاتی ہے۔ اور بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔

جو زمین اور دل سن کی جوانی گزر چکی تھی۔ اور اب بڑھاپا آ گیا تھا۔

ان کی شادی کو چالیس سال ہو چکے تھے۔ چالیس سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ نسلیں پیدا ہوتیں اور جوان ہو جاتی ہیں۔ لیکن کی زندگی میں کبھی وہ دن نہیں آئے تھے جب انہیں معاشی طور پر فراغت حاصل ہوتی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ میکس ویل قصبے گزر رہا تھا۔ وہ اسی قصبے میں بڑھی کا کام کیا کرتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ فرخچر بنایا کرتا گویا جوانی محنت کرتے ہوئے ہی گزرتی۔ دونوں میاں بیوی ملازمتیں کیا کرتے اور اچھے دنوں کے خواب دیکھتے۔ بیوی ہمیشہ ایک خواب دیکھا کرتی کہ ان کے اچانک کہیں سے دولت آگئی ہے۔

وہ جب اپنا یہ خواب اپنے شوہر کو سناتی تو وہ اس پر انفسوس ہی کرتا رہ جاتا۔ دن اسی طرح گزرتے چلے گئے۔ اولاد بھی ہوئیں اور وہ اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں۔ بیٹے انگلینڈ سے امریکا چلے گئے اور وہیں جا کر آباد ہو گئے۔ اب یہ دونوں میاں بیوی بوڑھے ہو چکے تھے اور اپنے اپنے خوابوں کے ساتھ زندگی گزارتے تھے۔ بیوی کو لاٹری کے خریدنے کا شوق تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کوئی نہ کوئی لاٹری اس کے نام نکل آئے گی۔ اس بار بھی اس نے ایک ٹکٹ خرید کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس بار ضرور کوئی معجزہ ہوگا۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی۔ ”فرض کرو۔ اگر ہمارے پاس ڈھیری دولت آگئی تو ہم کیا کریں گے۔“

رکے۔ جمیل کے بچوں بیچ ایک وسیع رقبہ پر پھیلا ہمبر پارک میری اور جمیل نظروں سے نکل کر اپنے دلکش منظروں میں پھیلتا چا گیا۔ ہم پارکنگ میں گاڑی سے نیچے اترے اور میری نگاہیں نیلے شفاف آسمان پر جمیں جہاں کہیں کہیں بادل میٹلا رہے تھے۔ جمیل کا پانی برف کی تہوں سے نکل کر آسمان کے رنگوں میں رنگ گیا تھا۔ سردی تھی مگر گدازدہات بھی تھی، اسی لیے ستانی تھی۔ میں دل میں سرسبز کے ذوق پر اسے داد دے رہا تھا۔ کب چلی گئی تھی۔ سرسبز مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔ ”کہہ ان مناظر میں کھو کر مجھے بھول ہی نہ جاؤ؟“

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب میں کہا۔ ”تمہیں یاد رکھنے کے لیے یہ مقام اور وقت ہی بہت ہے۔“ یہ پارک جمیل کے اندر ایک جزیرہ نما میں بنایا گیا تھا۔ دریا ہمبر نورڈن کے مغربی حصوں سے گزر کر اس میں آگرتا ہے اس جزیرے میں کئی ایک چھوٹی چھوٹی شفاف پانیوں والا جھیلیں تھیں۔ ان جھیلوں پر مرغیاں تیر رہی تھیں اور بہت سے پانیوں پر اپنی پرواز بھری تھیں۔ پختہ اور کچے راستے تھے جنم کچھ لوگ ہماری طرح چل رہے تھے۔ درخت تھے مگر سونے تھے۔ چند ماہ بعد انہی پر سبز لباس اترتا تھا اور وہ مختلف رنگوں کے سکوں میں پانیوں کے اندر نظر آنے لگتے۔ گھاس کے لالہ

مجھ سے کھرائی تھی۔ آج کا دالہا نہ پن میں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔ ٹرین شور چاتی چلی گئی اور ہم ابھی وہیں کھڑے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا یہیں کھڑے رہنے کا پروگرام ہے؟“ وہ بولی۔ ”آج میں تمہیں کہیں لے چلوں گی۔“ پھر کچھ لمبے میری آنکھوں میں دیکھتی رہی اور سوال کیا ”چلو گے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سب دے کی میز چیاں چڑھ کر باہر نکل آئے۔ موسم ایک دم سہانا ہو گیا تھا۔ میں دونوں ہاتھ اپنی جیکٹ میں ڈالے کھڑا تھا تو وہ کہنے لگی۔ ”خاموش کیوں ہو؟“

میں نے جواب دیا۔ ”تمہیں معلوم تو ہے کہ میں ایسے ہی رہتا ہوں۔“

وہ مجھ سے گئی اور میرا بازو پکڑ کر بولی۔ ”کبھی تو میرے ساتھ اپنی اس خاموشی کو توڑ دیا کرو۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک کب کو اشارہ کیا۔ ڈرائیور سے بولی۔ ”ہمبر پارک جانا ہے۔“

ڈرائیور کو گھورا۔ اس نے سر ہلایا اور ہم دونوں کھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کب نے موڑ کاٹا اور جنوبی سمت بڑھتی چلی گئی۔ پندرہ منٹ بعد کب نے گاڑی ٹرانسپیرینس وے کر اس کی اور پارکلائنڈ سے ہوتے ہوئے ہم اٹار یو لیک کے سامنے آ

”کرنا کیا ہے۔ دنیا کی سیر کو کل جائیں گے۔“ شوہر جواب دیا کرتا۔
ایک صبح بیوی نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے شوہر کو جھنجھوڑا کر بے دار کیا۔ ”یہ دیکھو۔ یہ دیکھو۔“
”کیا دیکھوں۔“

”یہ ڈائری۔ یہ اخبار۔“ بیوی نے کہا۔ ”میں نے اس پر لائٹری کے ٹکٹ کا نمبر لکھ لیا تھا۔ یہ نمبر دیکھو۔ یہ اخبار دیکھو۔ ملاؤ نمبر۔“
”نہیں پہلا نمبر مل چکا ہے۔“

اب تو شوہر کی بھی نیند ہوا ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی نمبر ملایا۔ دونوں ایک ہی نمبر تھا۔ اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔ ”ہاں اس۔ وہی نمبر ہے۔ جاؤ، جلدی سے ٹکٹ لے کر آ جاؤ۔“

بیوی دوڑتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد آئی تو اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ ”وہ۔ وہ ٹکٹ تو نہیں ہے۔“
”نہیں ہے۔ کہاں رکھا تھا تم نے۔“

”میں نے کافی کی خالی شیشی میں رکھا تھا۔“

”اوہ گاڈ۔“ شوہر نے اپنا سر تمام لیا۔ ”وہ شیشی۔ وہ تو میں ڈسٹ بن میں پیچیک آیا ہوں۔“

”کیا۔“ بیوی کے بھی ہوش اڑ چکے تھے۔

”اس کے بعد نہ تو ان بے چاروں کو وہ ٹکٹ مل سکا اور نہ ہی انعام مل سکا۔ آپ کو معلوم ہے۔ انعام کی رقم بنتی تھی۔ 181

ن۔

جی ہاں 181 ملین۔ میرا خیال ہے کہ کسی انعام کے حوالے سے کسی غلطی کی اتنی بڑی سزا کسی کو نہیں ملی ہوگی۔

نعمان اشرف، راولپنڈی

نسرین نے میرا دیا پر فیوم اپنی جیکٹ کی جیب سے نکالا جو میں نے منٹھن سے نسرین کے لیے خریدا تھا۔ وہ بہت خوش لگ رہی تھی اور تاویرا سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ ”کیا تم نے مجھے نیو یارک میں یاد رکھا یا پھر سرجی تم کو یاد کرتے رہے؟“
میں نے ہنس کر کہا۔ ”تم یاد تو نہیں مگر سرجی کو شاید بہت یاد آ رہی تھیں۔ جیسی تو وہ اپنی طرف سے مجھے یاد دلاتے رہے تھے۔“

وہ خاموش ہو کر جمیل کے غلے بانیوں کے پار ڈاؤن ٹاؤن کی سر بلند عمارتیں دیکھنے لگی۔ ایک مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔ سکوت کی دیوار بھی جو ماحول میں کہیں کھڑی تھی۔ اس فضاء میں بولنا جرم لگ رہا تھا اور ہم بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔ یہاں کی خاص بات مختلف پرندے اور ان کے گھونسلے تھے۔ پرندے بگلی پرواز مہرے اور ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتے تھے۔ انہی کی آوازیں تھیں جو تہائی کو زیادہ اجاگر کر رہی تھیں۔

اس نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ”تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں کتنا ڈارک لگتا ہے۔“
میں ہنس پڑا اور کہا۔ ”نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ میرے

تھے، جن پر ہر وہ اس موسم میں بھی نمایاں تھا۔ بعد کے مہینوں میں انہوں نے کیا کیا رنگ و روپ دکھانے تھے اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ یہاں تہائی کے گوشے تھے جن میں کوئی محل نہ

ہم ایک راستے پر چلے جا رہے تھے۔ اگر گرد و بانی تھا اور مانے لیک انٹاریو کا حد کا تنگ نیلا پانی جھلجھل کرنا نظر آ رہا تھا۔ دوسری جانب اونچی اپارٹمنٹ بلڈنگز تھیں اور دور بڑے لوہو کا ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتیں آسمان کی بلند یوں کو چھوئی نظر آ رہی تھیں۔ ان کے درمیان سی این ٹاور اونچائی میں سب سے بلند نظر آ رہا تھا۔ جمیل کے بانیوں پر کچھ کشیتان معلوم نہیں غلے انہوں میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ بس ایک منظر تھا جس نے اٹھ سہر کر دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے جمیل کنارے ایک درخت تلے رکھی بیچ پر اچھے۔ دھوپ ہم پر پڑتی تھی اور آج اس کی ہلکی سی چش محسوس ہو رہی تھی۔ وقت گہرا سا گیا تھا۔ آسمان چپ تھا اور سارے آسمان سے چپ تھے۔ دھیرے سے چلتی ہوئی ہم خاموش تھے اور ہمارے علاوہ سب ہی ہماری باتیں کر رہے تھے۔ ایسا نظارہ

الہامی تھا جو مجھے آج نسرین کے ذریعے ملا تھا۔

ہاتھوں میں بھلے لگتے ہیں۔“ بات سمجھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا اور ہمارے سر کے اوپر گزرتے پرندوں نے اس کی ہنسی شاید پہلی بار سنی کیونکہ ایسا لگا کہ وہ ذرا دیر کو ختم کئے ہوں۔

میں نے پوچھا۔ ”اس پارک کو تم نے کہاں سے ڈھونڈا؟“

وہ جمیل کے نیلے پانی میں کنکر پھینکتے پھینکتے گئی۔ کچھ سوچا اور پھر کنکر پھینک کر بولی۔ ”اگر بتا دوں تو میرا یقین کر لو گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں کر لوں گا۔“ اتنے میں سرد ہوا کا کوئی جھونکا کہیں سے نہیں ڈھونڈتا آیا اور وہ میرے ساتھ آگئی۔ جھونکا چلا گیا تھا مگر وہ جدا نہ ہوئی۔ کہنے لگی۔ ”تم ہر وقت مجھ سے کہتے تھے کہ ہائی پارک مجھے لے چلا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں تنہائی اور خوب صورت مناظر بہت پسند ہیں۔ تم نیو یارک میں تھے اور میں نے تمہارے پیچھے اسے ڈھونڈ نکالا۔“ وہ لمحاتی توقف کے بعد بولی۔ ”ایک بار میں یہاں اکیلی آئی تھی۔ یہ دیکھنے کہ کیا واقعی تمہیں پسند آسکتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر تم نے کیا ڈھونڈا؟“ کہنے لگی۔ ”میں تین گھنٹے اس میں پھرتی رہی۔ اس میں تین چھوٹی چھوٹی جمیلیں دیکھیں۔ بہت سے پرندے اور خاموشی پھر محسوس کیا کہ تمہیں یہ سب بہت پسند آئے گا۔“

میں حیران ہوا کہ میں بھی اس قابل ٹھہرا کہ ایک مہتاب جیسی لڑکی مجھ جیسے کے لیے یہ سب کر سکتی ہے۔ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی مسکرائی آنکھوں میں چمک تھی۔ پہلی بار میں نے اپنی گرفت اس کے کاندھوں پر جمائی اور اس نے سر میرے کندھے پر رکھ لیا۔

پادوں کے در پیچھے وہ دبتی رہیں دستک نقل رات بہت جگہ کو ستانی رہیں وہ آنکھیں

میں اتنے سالوں بعد یہ یادیں تحریر کر رہا ہوں اور اب بھی میرے ذہن کے پردے وہ چمکتی اور مسکرائی آنکھیں نمایاں ہیں۔ ہم بہت دیر بیٹھے رہے۔ زیادہ دیر خاموش رہے مگر کچھ نہ کچھ سنتے رہے۔ شاید کچھ سرگوشیاں، کچھ چاہیں، کچھ سرسراہٹیں اور کچھ ان کی باتیں۔

وہ اپنے ساتھ کچھ سینڈویچ بنالائی تھی۔ کوک کے دوڑن پیک اور دو پانی کی بوتلیں۔ مجھے بھوک نہ تھی مگر پھر بھی میں نے اس کے ہاتھوں سے سینڈویچ لے لیا۔ ایران میں مریج کا استعمال نہیں ہوتا۔ اچھا ہوا کہ نرسین نے بھی نہیں ڈالی تھیں۔

ہم اس لچ کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ کچے اور پکے راستے تھے۔ مجھے راستے کی ساخت نہیں بلکہ راستہ دہ تھا۔ اس جزیرے میں ایک جمیل کے سبز پانی اور اس پر تیر مرغایاں تھیں۔ ہم وہیں ایک شیخ پر بیٹھ گئے۔

میں اب اپنے اصلی سوال پر آیا۔ ”بھائی نے وہ رابطہ کیا؟“

وہ کچھ اداس ہو گئی۔ پھر بولی۔ ”ہاں اکتی بار۔“ ”پھر کیا سوچا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ چپ ہو گئی۔ میں نے اس کا رخ اپنی طرف کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”اگر نہیں چاہتی تو مت جاؤ۔“

اس نے مجھ سے سوال کیا۔ ”تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ ”پھر سے ایک بار بتاؤ؟“ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ میں نے جمیل میں تیرتی مرغایوں پر نظر ڈال کر کہہ لےجے میں کہا۔ ”تمہارا دل اس طے جانا ٹھیک ہے۔“

وہ رک گئی۔ بہت سی پرچھائیں اس کے چہرے آئیں۔ اس کی آنکھیں برسنے کو تھیں۔ میں نے اس کا سر تھکرا اپنے کندھے پر رکھ دیا اور پھر وہ آنکھیں برس پڑیں۔ خود آبدیدہ ہو گیا تھا۔ میری جیکٹ کندھوں پر گیلی ہو رہی تھی میرے ہاتھیں ہاتھ کی انگلیاں اس کے بالوں میں تھیں دائیں ہاتھ اس کے گرد اسے تھامے ہوئے تھا۔ بہت دیر گزر گیا۔ وہ تب تک بیتی رہی جب تک اس کے اندر کا دربا نہ گیا۔ ہم اٹھے تو سائے لے رہے تھے۔ ہم خاموش تھے۔ کہنے لگی۔ ”اب کہاں جانا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”تم نے ہی تو کہا تھا کہ ڈنر تمہارے گھر ہوگا۔“

دوسرے آنکھیں میری جانب اٹھیں اور بولیں۔ ”نہیں اب تم گھر جاؤ۔“

میں سمجھ گیا۔ اسے کیب پر اس کے اپارٹمنٹ کے اتارا۔ جانے سے پہلے وہ بولی۔ ”پھر ملو گے؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ ”سعد کا اسکم جون تک ہے۔ جب تک مجھے برداشت کرنا اور رابطہ ختم کرنا۔“

میں نے وعدہ کیا اور اس نے اعتبار شاید نہ کیا۔ پھر آنکھیں بھر آئیں اور انہی نظروں سے دیکھا تو اسے اعتبار اور وہ مجھے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ تادیر سسکیاں لیتی رہی اور

خاموش کھڑا رہا۔ وہ قسمی تو آہستگی سے اسے اپنے سے جدا کیا۔
پھر سوچوں میں ڈوبا کیب میں آبیٹھا۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو
ان سوچوں کا ربط ٹوٹ گیا۔ میں خالی خالی سا اپارٹمنٹ کی
جانب بڑھ گیا۔ مڑکر دیکھا تو لان میں کھڑے درخت بھی
سوچوں میں ڈوبے تھے۔

☆.....☆

مہینوں گزر گئے مگر ہمارے اپارٹمنٹ کا ماحول تبدیل نہ
ہو سکا تھا۔ ہم اس ماحول کے عادی ہو گئے تھے بلکہ اس کیفیت
سے لگنا بھی نہ چاہتے تھے جس دن سرجی اور شہباز کے چپکلے نہ
ہوں وہ دن بہت بھاری گزرتا تھا مگر ایسے دن کم تھے جب ہم
مسکرائے نہ ہوں۔ میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی سمیت
تینوں کی بحث اور شور شرابے میں گھرے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھا
اور کوئی میری طرف زیادہ متوجہ نہ ہوا۔

معاملہ یہ تھا کہ شہباز کی Op-Co کے پروگرام کے
تحت ایک لیب میں انالسٹ کی جاب ہو چکی تھی۔ وہاں اسے
ایک دو ماہ بعد مستقل جاب ملنے کی پوری امید تھی۔ وہ سرجی کو
کہہ بیٹھے تھے کہ آپ کو اپنی جاب کی فکر بھی نہیں اور ہمیشہ ایسے
فی نہ رہ جائیں۔ ایسے نہ رہ جانے کا مقصد یہ تھا کہ اسی سیکورٹی
گارڈ کی جاب میں پھنسے نہ رہ جائیں۔ سرجی نے اس کو طفر بھجا
اور بہت کچھ اور سنوانے کے بعد یہ بھی بول گئے تھے۔ ”واہ
بھائی واہ کیا تھے اور کیا اپنے آپ کو کچھ بیٹھے ہیں۔ یہ تو ایسے ہوا
کہ چھو ندر کے سر چنبیلی کا جیل۔“

اب آج کے فسادی وجہ تو چھو ندر تھی۔ شہباز نے اسے
اپنے دل پر لے لیا تھا اور سرجی اپنی بات پر جم چکے تھے کہ انہوں
سے صبح بولا ہے اور ساتھ ساتھ رات کے کھانے پر بھی شہباز پر
ابندی لگا دی تھی۔ کیونکہ وہ انہوں سے ہمیشہ کی طرح خود بنایا
تھا۔ مفتی میٹرز سے فیک لگائے سرخ بننا بیٹھا تھا۔ شہباز لال
بھدکا ہو کر کارپٹ پر ہوٹک رہا تھا اور سرجی اپنے گھٹنوں کے
گرد ہاتھ باندھے اپنے چہرے پر آزدرو کی طاری کیے خفا بیٹھے
تھے۔ میرے لیے یہ صورت حال کوئی نئی نہ تھی اور اسی لیے میں
اٹل روم میں داخل ہو گیا اور نہا کر نازہ دم ہوا۔ کپڑے تبدیل
لے اور باہر لیونگ روم میں آیا تو سبھی اپنی اپنی پوزیشن پر
راجمان تھے۔

سب نے مل کر سارا واقعہ میرے گوش گزار کیا۔ میں نے
انہما کو بھجایا کہ سرجی نے تمہاری بات کو طفر سمجھا اور مجھارہ بول
لگا جو تمہاری سمجھ میں نہ آیا۔

شہباز کہتا رہا کہ چھو ندر ایک گالی ہے۔ میں نے سرجی

سے بمشکل اس مجاورے کا مطلب پوچھا اور انہوں نے اس کا
مطلب غلط بتایا کہ اللہ سب پر ایک نہ ایک دن اپنا کرم کرتا
ہے۔ شہباز نے سنا تو اس کے زرد چہرے پر سوج کی ایک لہر
آئی۔ مفتی نے بھی میری بات کی تائید کی تو شہباز بہل گیا۔
حالانکہ سرجی نے بعد میں جو مطلب مجھے سمجھایا وہ یہ تھا کہ
چھوٹے آدمی کو بڑا تبدیل کیا ہے مگر ہمیں شہباز کو راکرنا تھا اور
وہ ہو گیا۔ جب وہ مسکرایا تو سچی دھل گئی۔ سرجی نے ماحول کو نرم
پایا شہباز سے مذاق کے موڈ میں آ گئے۔ پہلے اس سے ہنس
گرا باتیں کیں اور پھر اس سے مخاطب ہوئے۔ ”یار مجھے تمہاری
عقل کی سمجھ نہیں آتی کہ تم آدمی ہو کہ بے دال کے بوم۔“
مطلب ہم سب کو سمجھ میں آ گیا کہ تم تو نرمے احمق ہو۔
شہباز ہنستے تھے تو اکڑا اور ساتھ مفتی بھی۔ پھر کوئی شور مچا اور
میں سیدھا کمرے میں جا گھسا اور دروازہ بند کر کے لیٹ گیا۔

☆.....☆

خان قیصر کا ایک دوست شیخ صاحب پاکستان سے
امیگریشن لے کر آیا ہوا تھا۔ اس کا شاید کسی امیر کبیر خاندان سے
تعلق تھا اسی لیے خان صاحب اسے ہر وقت آنکھوں پر بٹھائے
رکھتا تھا۔ خان صاحب نے اسے اپنے گھر پر رکھا ہوا تھا بلکہ شاید
گود لیا ہوا تھا۔ ہر جگہ اسے ساتھ رکھتے۔ پہلی بار تعارف اس
طرح سے ہوا۔ ”یہ میرے دوست شیخ صاحب ہیں۔ میرے
کلاس فیلو تھے۔“ یہ تعارف کرار وہ ان کے من گانے لگتے کہ
ان کی اتنی فیکٹریاں ہیں، اتنے پلازے اور اتنے گھر ہیں۔“ یہ
سب کہہ کر وہ مروجہ نظروں سے شیخ صاحب کو دیکھتے اور پھر شیخ
صاحب مسکرائی اور تائیدی نظروں سے اس کے بیان کی تصدیق
کرتے۔ یہ سب ہو چکا ہوتا تو خان صاحب دوبارہ سے وہی
تعارف ایک نئے انداز میں شروع کر دیتے۔ ایک دن میں اس
تعارف کا قصیدہ ہمیں ازبر ہو گیا۔ یہ قصیدہ کوئی اتنی بڑی کنگی
بارش صاحب اپنے تعارف پر سوج میں بھی پڑ جاتے تھے۔
شیخ صاحب پہلے بھی کینڈا آپٹکے تھے اور ان کے پاس
ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔ وہ کوئی پرانی سی گاڑی خریدنا چاہتے
تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”شیخ صاحب! کون سی گاڑی لے رہے
ہیں؟“

شیخ صاحب نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا
کہ ہمیشہ کی طرح خان صاحب بول پڑے۔ ”یہ ہماری طرح کا
کنکلا تو نہیں ہے۔ شیخ صاحب نئی گاڑی نکلو انیس گے۔“ پھر
خان نے کئی کئی والا مخصوص تہقیر لگایا مگر شیخ صاحب کی سنی گم
تھی۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب خان قیصر کی کھٹارا

گاڑی پانچ چھ سو اڑھائی میں لیتا چاہتے تھے مگر خان صاحب نے ان کا مرتبہ اتنا زیادہ بلند کر دیا تھا کہ وہ اب اس مقام سے باعزت اترنا چاہتے تھے مگر خان انہیں اترنے کا موقع نہیں دے رہا تھا اور شیخ صاحب بہت بے چینی کا شکار تھے۔ میں معاملے کو سمجھ گیا تھا۔ خان اس کی دولت سے ہمیں متاثر کرنا چاہتا تھا جیسے اس کی جاہلاد میں کچھ خان کو بھی ملے گا۔ شہباز یہ کہتا پایا کیا تھا۔ ”خان اور شیخ کا سیایا جلد سامنے آجائے گا۔“ بقول شہباز کے کہ شیخ صاحب بس کے کہیں میں اپنا بستر لگا لے گا برقی گاڑی کبھی نہیں لے گا۔ سرجی پوچھ بیٹھے۔ ”ماشاء اللہ اتنی دولت ہے پھر برقی گاڑی لینے میں حرج کیا ہے؟“

شہباز بولا۔ ”تم یہ نہ دیکھو کہ اس کے پاس دولت ہے۔ بس یہ دیکھو کہ شیخ صاحب شیخ ہیں۔“
دوسرے دن خان صاحب اپنے کم شدہ سے شیخ صاحب کے ساتھ آئے۔ شہباز کو پہلے کچھ گالیاں دیں اور پھر بولے۔ ”شیخ صاحب آئے ہیں اور تم نے ابھی تک چائے کا بھی نہیں پوچھا؟“

سرجی بولے۔ ”ہمیں ان کا چہرہ مبارک دیکھ کر لگا کہ شاید آٹھ پھری روزے سے ہیں۔“
خان صاحب نے ان کے چہرے کو بغور دیکھا اور تادیب دیکھتے رہے پھر بولے۔ ”پیلا ہٹ تو ہے۔ گلتا ہے آج سے انہیں روزانہ اناروں کا جوس پینا پڑے گا۔“
اناروں کے ذکر پر شیخ صاحب اور زیادہ پہلے پڑ گئے۔

اناروں کے جوس کی جگہ چائے نوش کی۔
خان ہم سے مخاطب ہوا۔ ”شیخ صاحب کوئی گاڑیاں دکھانی ہیں۔ تم لوگ بھی جی ایم موٹرز کے شوروم ہمارے ساتھ چلو۔“

میں نے کہا۔ ”گاڑی شیخ صاحب نے لٹی ہے پھر ہم جا کر کیا کریں گے۔“
جواب آیا۔ ”اسی بہانے تم لوگوں کو بھی گاڑیوں کی کچھ سمجھ بوجھ ہو جائے گی۔“

سرجی نے ترنت ہاں کر دی۔ میں نے بھی سوچا کہ اسی بہانے پہلی بار کوئی گاڑیوں کا شوروم بھی دیکھ لوں گا۔
ہم تیار ہوئے اور میں نے بھانپ لیا تھا کہ شیخ صاحب گہری سوچوں میں گم ہیں۔ حالانکہ خان نے اسے گھر میں کرا دیا ہوا تھا، کھانا خود سے میں سجا کر دیتا تھا۔ اس کے کپڑے بھی استری کر دیتا تھا مگر شیخ صاحب ایسے لگ رہے تھے کہ کسی جنگل میں پھنس گئے ہوں۔

ہم خان کی گاڑی میں بیٹھے تو اس نے آگے بڑھ کر خان صاحب کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ شیخ صاحب ایلے بیٹھے جیسے انہیں ہم انوار کے لیے جا رہے ہوں۔ سرجی گاڑی پچھلا دروازہ کھولنے کے لیے اپنی تمام تر توانائی لگاتے ہوئے میرے کان میں منگنائے۔ ”یہ خان اپنی آبرو خاک میں ملارہے۔“

میں نے جواب میں اپنی دھن ان کے کان میں چھیڑی۔ ”مجھے لگتا ہے یہ شیخ کو خاک میں ملارہا ہے۔“
ہم مسکی سا گام میں جی ایم موٹرز کے شوروم کی پارکنگ میں آ کرے۔ میں متعجب تھا کہ کسی ایک شوروم میں اتنی زیادہ گاڑیاں ہو سکتی ہیں۔ پارکنگ کا ایک بڑا حصہ گاڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم تو صرف حیران تھے اتنی ساری گاڑیاں دیکھ کر مگر خان صاحب کو ٹو فٹس بڑے ہتھے۔ ایسا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خ نہیں بلکہ ہمیں دلانے آئے ہیں۔

خان شیخ صاحب کو پیچھے سے سہارا دیا دھکا دے کر شوروم کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ہم بھی اس کے پیچھے اندر اس ہال میں کھڑے تھے جہاں چھوٹی بڑی کئی گاڑیاں چھٹی دکنی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ گودن کا وقت تھا مگر شوروم کا دوا ہال ٹیوب لائٹوں کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کئی ایک مین اور سٹیل گرلز بھاگی پھر رہی تھیں۔ مردوں نے کالے سور پہنے تھے اور لڑکیاں گھٹنوں سے ذرا نیچے سیاہ اسکرٹس پہنے رہی تھیں۔

شہباز بولا۔ ”یہاں تو بڑا رونق میلہ لگا ہے۔“
سرجی نے فرمایا۔ ”گلتا ہے میں ناٹم اسکوٹز آ رہوں۔“

میں نے کہا۔ ”سرجی! خدا کا خوف کریں۔ کیوں نا اسکوٹز کو ایک شوروم سے ملارہے ہیں؟“ میں اندر سے خود بخود اتنی زیادہ گہما گہما دیکھ کر خوش تھا۔ ایک نیا تجربہ مجھے درپیش تھا بعد کے سالوں میں یہ تجربہ کھلا کہ شوروم میں اکثر لڑکیاں خور صورت اور بے حجاب رہی جاتی ہیں۔ خان قیصر اب شیخ صاحب کو تھامے کسی سیل فون کی تلاش میں تھا۔

اتنے میں ہم سب کی دعا قبول ہو گئی۔ ایک ایسی لڑکی جسے کسی شوکیس میں ہونا چاہیے تھا کہیں قریب سے طلوع ہوئی سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں اور رنگت جاندنی جیسی۔ کالے رنگ کے اسکرٹ تلے نیگی ناگیں اور بڑی ہنسی کی جوتی میں وہ سر سے نمایاں تھی۔

خان بے خیالی میں دو قدم آگے بڑھ گیا۔ شیخ صاحب

مرغ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ میں شہباز اور سرجی اپنی اپنی دنیا ہائے کھڑے تھے۔ لڑکی نے جھپٹے دانت دکھاتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور خان نے اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔ خان بعد چھوڑنے والا نہ تھا جب تک شہباز نے آگے بڑھ کر اپنا حصہ نہ مانگ لیا۔ شہباز کی بدولت ہم رہ جانے والے بھی میرا ب ہوئے۔ شیخ صاحب کی اداسی ذرا دیر کو کم ہوئی مگر پھر دوبارہ سے طاری ہو گئی۔

لڑکی نے اپنا تعارف کر دیا۔ نام مجھے یاد نہیں آ رہا مگر لسل سے مشرقی یورپ کی کئی تھی۔ اس کا سوال سب سے تھا۔ ”میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

جواب میں خان صرف بولا اور بات شیخ صاحب کے قصیدوں سے شروع ہوئی۔ ساری فیکٹریاں، پلازے اور سب کچھ کو اپنا کھانا لڑکی نے پوچھا۔ ”آپ کو گاڑی چاہیے؟“

شیخ صاحب کی بجائے خان نے زور زور سے سر ہلا دیا۔ اس لڑکی نے اس خیال سے کہ کہیں یہ امیر و کبیر عرب شہزادہ اپنی توہین پر تھملا نہ اٹھے، وہ سیدھے ہم سب کو لے کر آٹھ سیٹر اسکیلیپر کی طرف آئی۔ وہ کسی بادیانی کشتی کی طرح کشادہ اور وسیع تھی۔ اس گاڑی کی ہوشربا قیمت اور دل ربا خصوصیات ایک بڑے پوسٹر پر آویزاں تھیں۔ سرجی تو گاڑی کو ہاتھ بھی ایسے لگا رہے تھے کہ جیسے وہ چھوٹے برکرنٹ مارتی ہے۔ گاڑی کی قیمت دیکھ کر خان بھی گرتے گرتے بچا۔ ہمارے چہروں کے بدلنے رنگ دیکھ کر لسل گرل ہمارے بارے میں خلک و شبہات میں پڑ گئی۔ وہ شیخ صاحب کو پہلے کوئی عرب شہزادہ سمجھ بیٹھی تھی اور خان کو شاید دربان۔ پھر وہ ہماری ”اصلیت“ بھی تو کسی اور کو نے میں لے آئی۔

وہ پھر اس سے چھوٹی گاڑی دکھلانے لگی۔ قیمت خان کی نظر میں شیخ صاحب کے لیے مناسب تھی۔ خان انہیں راضی کرنے لگا کہ صرف چالیس ہزار ڈالر قیمت ہے اور ٹیکس وغیرہ الال کر پچاس کے قریب کی پڑ جائے گی۔

اب شیخ صاحب نے فیکٹری لائن لی اور کہا۔ ”میں نے گاڑی لیٹی ہی نہیں۔“

خان انہیں سمجھانے کے لیے اس کی جانب بڑھے اور انہوں نے وہیں سے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے انہیں روک لیا۔ وہ لڑکی اب حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ ہم محنت کے عالم میں اس لڑکی کے بے پناہ حسن سے لطف اندوز بھی نہ ہو سکتے تھے۔

نہ نہ کرتے ہوئے خان شیخ صاحب کو زبردستی پکڑ کر امپالا کی

طرف لے آیا۔ قیمت میں وہ کم نہ تھی۔ شیخ صاحب اب باقاعدہ ناراض نظر آ رہے تھے۔ ہم تینوں نے تو سمجھ چکے تھے کہ شیخ صاحب کسی ہزار پندرہ سو ڈالر کی گاڑی کے پیچھے ہیں۔ خان شیخ صاحب کی یہ ”رسوائی“ برداشت نہ کر سکتا تھا اور خان کے لیے یہ شیخ صاحب کی کسر شان کے خلاف تھا کہ وہ پچیس ہزار ڈالر سے نیچے کی گاڑی لیں۔ اس لڑکی نے بھی ہمت نہ ہاری۔ دوسرے بھی مختلف ماڈل دکھائے مگر یہاں اس کی دال گھنے والی نہ تھی۔

آج کی ساری جدوجہد اور مشقت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہم سب باہر خان کی گاڑی کے قریب کھڑے تھے۔ اور گرد گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ سرجی دور کسی نامعلوم گاڑی کی جانب اشارہ کر کے یہ بتا رہے تھے۔ ”میرے خیال میں وہ ٹھیک رہے گی۔“

شیخ صاحب سرجی کو گاڑی میں دھکا دے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ میں شیخ صاحب کی جگہ آگے والی سیٹ پر براجمان تھا۔ شہباز ہنسی روکنے کی پھر کوشش کر رہا تھا۔

بعد کے سالوں میں مجھے گاڑیوں کی خرید و فروخت کے بارے میں زیادہ معلومات ملنا شروع ہوئیں۔ دنیا میں سب سے کم قیمت کی گاڑی امریکا میں ہے۔ کینیڈا میں ایک تو لکھن زیادہ ہے اور ڈالر بھی کمزور ہے جو گاڑی کینیڈا میں پچاس ہزار کی ہے وہ امریکا میں پینتیس کی مل جاتی ہے۔ امریکا کی مارکیٹ اتنی بڑی ہے کہ ڈیڑھ دو سو ڈالر منافع پر گاڑی سیل کر دیتا ہے۔ آپ کینیڈا سے امریکا داخل ہوں تو سب سے بڑا فرق پانی ویز اور بڑی گاڑیوں کا دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہونڈا اکارڈ چھ سیلنڈر فلی لوڈیڈ اور زید میٹر کار جو امریکا میں تیس ہزار ڈالر کی ملتی ہے وہ کوئی بتا رہا تھا کہ پاکستان میں ایک کروڑ کی بیچی جاتی ہے۔ اسی طرح ٹیڈا کسمری بھی اسی قیمت پر ملتی ہے۔ امریکا میں زیادہ مقابلہ جرمن، امریکن اور جاپانی گاڑیوں کے درمیان رہتا ہے۔ جرمن گاڑیاں اونچے درجے کی ہیں پر مہنگی بہت ہوتی ہیں۔

یہاں آپ گاڑی لیز پر بھی لے سکتے ہیں اور فنانس بھی کرواتے ہیں۔ لیز پر ایسے ہی ہے کہ دو یا تین سال کے لیے گاڑی آپ کو کرائے پر دے دی جاتی ہے۔ سال میں بارہ یا پندرہ ہزار میل سے زیادہ نہیں چلا سکتے۔ آپ ہر ماہ کرایہ دیتے ہیں۔ فنانس اب زیر و فہم ہو جاتی ہے۔ پانچ سالوں میں آپ کو گاڑی کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے اور کوئی سود نہیں لیا جاتا۔ پاکستان میں تو پیک پاکستانوں سے تیس فیصد تک سود لے رہے ہیں۔

ہم گاڑی میں بیٹھے تو سرجی نے خان سے کہا۔ ”ہمارے آب و خورش میں آج کل کچھ فرق آ رہا ہے، کیا آپ ہمیں البین مارکیٹ اتار سکتے ہیں تاکہ کچھ دوسری کر لی جائے۔“

میں سرجی اور شہباز ایک ساتھ البین مارکیٹ پر اتر گئے۔ البین مارکیٹ ایک دیسی بازار ہے۔ اس میں حلال گوشت کی ایک بڑی دکان ہے جسے افغانی چلاتے ہیں۔ نام المیزان ہے۔ ایک ہی جانور کے مختلف حصوں کے گوشت کے نرخ علیحدہ ہوتے ہیں۔ دان کا گوشت اور چانپیں سب سے مہنگی ہوتی ہیں۔ سب سے علیحدہ علیحدہ کر کے شوکیوں میں سجا کر رکھے ہوتے ہیں۔ قیہ چر پی اور بغیر چر پی کے دونوں طرح کا دستیاب ہوتا ہے اور نرخ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ شوکیوں کے پیچھے افغانی سفید اپرن پہنے کھڑے مسکراتے ہوئے ہم سے بات کر رہے تھے۔

بکری کے پائے بھی صاف و شفاف کر کے ہوئے تھے۔ سرجی نے پہلے کچھ پائے خریدے۔ شہباز بولا۔ ”اسنے زیادہ پائے کھانے سے نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے۔“ پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں نہ کھاؤں گا اور نہ ہی میرے حساب میں انہیں درج کرتا۔“

سرجی بولے۔ ”یہ مردوں کی خوراک ہے، مردوں کی تمہارا اس سے کیا لینا دینا۔“ سرجی کا شہباز کو مرد ہونے کا طعنہ دیتے سن کر افغانی بھی زیر لب مسکرانے لگے۔ شہباز پیش میں آچکا تھا اور لال بھسوکا ہو کر سرجی کو کہنے لگا۔ ”میں نام کا نہیں عملوں کا بھی شہباز ہوں۔ کسی کو آزمانا ہو تو آزما لے۔“ سرجی بولے۔ ”ایسے شہباز ہم نے بہت پڑھے ہیں۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”پڑھے ہیں یا دیکھے ہیں؟“ بولے۔ ”اقبال نے اسی شہباز کا بولا تھا جس کو مولے نے مار بھگا تھا۔“

سرجی کا اشارہ دراصل اقبال کے ساتی نامہ کے اس مصرعے کی جانب تھا

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے مولے کو شہباز سے

اس سے پہلے بات آگے بڑھتی افغانی نے مداخلت کی۔ ”اور کیا کیا چاہیے۔“

سرجی سب بھول کر قیہ، گوشت اور پکن کے بھاؤ پوچھنے لگے۔

یہ سب سامان خرید اگیا۔ پھر دوسری شاپ سے آٹا مصلے، دالیں اور سب کچھ خرید اگیا جو ہم پچھلے ایک ماہ میں ختم کر چکے تھے۔ المیزان سے تازہ بجنی پکن اور پکن لیک ہم دستیاب تھی۔ سرجی جاتے جاتے وہ بھی لیتے آئے۔ شہباز چاہا کہ بہت خرچہ ہو رہا ہے۔ یہ سارے سامان سرجی کا پھیلا ہوا۔ اور یہ بھی دھمکی دی کہ آج وہ مفتی سے بات بھی کرے گا۔

سرجی نے یہ کہہ کر شہباز کو چپ کر دیا۔ ”تو ٹھیک ہے اپنا پکن علیحدہ کر لو۔“ شہباز فق کھڑا رحم طلب نظروں سے لے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شہباز کو سمجھایا۔ ”سرجی کا جودل چاند خریدنے دو۔ آخر کیا کرکھانا تو ہمیں ہی ہے ناں۔“

ہم اپارٹمنٹ پہنچے تو مفتی جاب سے آچکا تھا۔ ہمیں لہ پھدا دیکھا تو خاصا غافل نظر آنے لگا۔ پھر مجھے یقین دہانی کر دیا کہ کل نو بجے سے پہلے پچھوسال جاب پر بھی پہنچتا ہے۔

رات کو سوئے تو درجہ حرارت سترہ تھا۔ صبح میں جلد اٹ گیا۔ آج میرا پچھوسال میں پہلا دن تھا۔ صبح کی نماز پڑھی۔ رنجی نے بھی سیکورٹی کی جاب پر جانا تھا۔ وہ بھی کلمہ پڑھنے آتا ہے۔ ان کا کلمہ مکمل ہونے سے پہلے میں وائش روم میں گھسا۔ وہ وائش روم کے دروازے تک میرا پیچھا کرتے چھ کچھ بڑھ کر پھونکتے رہے۔ میں شاور لے کر تیار ہو کر باہر نکلا۔ سرجی کمرے کا پردے ہٹا کر حیران و پریشان کھڑے تھے۔ میری باہر نظر پڑی تو میں بھی ششدر رہ گیا۔ باہر کی ساری زخما اور درخت برف سے ڈھکے تھے۔ رات بھر برف پڑتی رہی تھی، ہمارے مکان میں بھی نہ تھا کہ سترہ درجے سے رات کو یہ مفتی دم ہو جائے گا۔ یہ نورنٹو ہے۔ موسم بدلتے یہاں چند گھنٹے بھی ٹپکتے۔ کل تک ہم ہماری آہ کو محسوس کر رہے تھے اور آج کا برف نے ایک دلربا منظر زمین پر بچھا دیا تھا۔ ایک خاموش اور نواں گوردن جیسے ہمارے انتظار میں غم کر کھڑا تھا۔ برف کا چادر پر ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔ جیسے کسی مستری نے قرعے اس کو ہموار کر دیا ہو۔ درخت برف تھامے جیسے مسکرا رہے کیونکہ آج میری جاب کا پہلا دن تھا۔

سرجی حیرت کے سمندر سے باہر نکلے تو بے لگام ہو گئے۔ ان کے بولنے پر سوئے شہباز کے جسم نے پہلے جھکے اور پھر سیانہ سیانہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہا تمہاری ہے اور سرجی کو کیا خوشیاں چڑھی ہیں؟“

سرجی نے باہر کے منظر اور برف باری کے قصہ پڑھے تو وہ باقاعدہ گالیاں دینے لگا۔ ”یہ برف کا سیانہ ہمارے مرنے تک جاری رہے گا۔“

سرجمی نے قرآنی آیات پڑھ کر ترجمہ کیا۔ ”تم اللہ کی کن نعمتوں کو ٹھکراؤ گے۔“

شہباز نے ہل بھر کے لیے باہر کی نعمتیں دیکھیں اور پھر کروٹ لے کر کے بڑبڑاتا ہوا دوبارہ سو گیا۔

لیونگ روم میں سرجمی نے ناشتا تیار کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے تئیں اٹھا لیا س پہنا۔ مفتی کو دو پھر کی شفٹ میں جانا تھا۔ اس نے مجھے کچھ نصیحتیں کیں اور پھر ان نصیحتوں کو مجھ سے زبانی سنا۔ سن کر خوش ہوا اور اسی کے صلے میں اپنا خفیہ پرفیوم نکالا اور ہلکا سے مجھ پر چھڑکا۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے اپنے لباس پر جیکٹ ڈالی جس کو میں نے آئندہ کی سردیوں تک کے لیے بھلا دیا تھا۔ سرجمی اسی دوران کچھ زیر لب پڑھتے رہے اور میرے اپارٹمنٹ سے نکلنے تک مجھ پر پھونکتے رہے۔

بیموسال کے مین دروازے کے بائیں جانب ایک آراستہ کمر تھا۔ ایک بڑی بیضوی میز کے گرد آرام دہ کرسیاں بڑی چمیں جن پر ہم چھنے بھرنے کیے ہوئے لوگ بیٹھے تھے۔ دو فلپائن کے تھے۔ دو چائنا کے اور میرے علاوہ ایک ساؤتھ امریکن ڈیانا تھی۔ ڈیبا (Debby) بیموسال کی ٹریز تھی۔ کمر اردشیں سے سجھا رہا تھا۔ فرش پر دیب کارپٹ بچھا تھا۔ دیواروں پر گہرے رنگ کا دیبہ بچہ لگا تھا۔ ڈیبا اگر آج یہاں نہ ہوتی تو کوئی ماڈل ہوتی۔ دراز قد، نیلی اسکرٹ پر سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ براؤن بال کندھوں تک جھوم رہے تھے اور سبز آنکھوں کے ساتھ گوری رنگت میں وہ خامی دلکش لگ رہی تھی۔ میز پر اس نے موٹی موٹی فائلیں رکھیں تھیں۔ پروجیکٹر اور اسکرین کی مدد سے وہ ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب خالی خالی نظروں سے اسے ہلتا جلتا دیکھ آ رہے تھے۔ ڈیبا کے علاوہ جو چیز متحرک تھی، وہ ڈیانا تھی۔ دہلی تکی، گندی رنگ اور کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ اس کی یہ خصوصیت مجھے بے چین کر رہی تھی کہ ڈیبا کی ہر بات کو وہ دہرائی اور پھر ہتھہ لگاتی تھی۔ اس کے ہتھہ سے جو کچھ میں سمجھ پا رہا تھا وہاں میں اڑ جاتا تھا۔ میں یا تو ڈیبا کو مسکرا کر دیکھتا اور یا پھر ڈیانا کو گھور کر۔

یہاں ہر ٹیکسری میں سیلٹھ اینڈ سیفٹی لاء پر پورا عمل کیا جاتا ہے۔ قانون حکومت بناتی ہے اور ہر جگہ اسے لاگو بھی کروانی ہے۔ میں مختصر طور پر بیان کر دیتا ہوں کہ اگر آپ نے ٹیکسری میں کسی سیکشن کا دروازہ کھلی کھول کر جانا ہے تو اس کا ایک طریقہ کار لکھا ہوتا ہے۔ آپ کو وہ طریقہ سمجھایا جاتا ہے۔ اس کو دہرایا جاتا ہے۔ پھر آپ کی ٹرینگ شیٹ برآپ کے دستخط لیے جاتے ہیں اور وہ شیٹ آپ کی فائل میں لگ جاتی ہے۔ اگر کوئی دروازہ

سرخ پیاز کینسر کے لیے مفید

نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں پیاز کا استعمال زیادہ کیا جاتا ہے، ہر گھر سے لے کر ہوٹل پر کھانا کھاتے وقت اسے سلاہ کے طور پر بھی کھایا جاتا ہے۔ پیاز کو جہاں گھروں میں کھانے تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہیں اسے گھر بیٹوں کو لگوں کے لیے آزمایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں پیاز کی کم سے کم 5 اقسام پائی جاتی ہیں جو تقریباً ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ پاکستان میں زیادہ تر تو سفید پیاز ہوتی ہے، تاہم ملک میں ہلکے سرخ رنگ کی پیاز بھی پائی جاتی ہے۔۔۔ جو طبی حوالے سے پیاز کی دیگر اقسام سے نہایت مفید ہیں۔ ماہرین صحت کے مطابق سرخ پیاز بریسٹ اور کولون سمیت کینسر کی تمام اقسام کے لیے نہایت ہی مفید ہیں۔ سائنس جرنل میں شائع کیپٹا کی یونیورسٹی آف گیولف اونٹاریو کے ماہرین کی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق سرخ پیاز میں اینٹیٹھو سائین اور کیورسٹین کی مقدار زیادہ پائی جاتی ہے، جو کینسر کے سیلز کی افزائش کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ یونیورسٹی آف گیولف کے ماہرین نے پیاز کی 5 اقسام کا تجزیاتی مطالعہ کیا، اور ان کے استعمال کی وجہ سے صحت پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لیا۔ مطالعہ سے پتا چلا کہ پیاز کی پانچوں اقسام انسانی صحت کے لیے مفید ہیں، مگر باقی تمام اقسام میں کوئی اضافی فائدہ نہیں ہے، لیکن سرخ پیاز دنیا کی بڑی بیماری کے جراثیم کو پیدا ہونے سے روکتی ہیں۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں پیاز کی کسی بھی قسم کو نقصان دہ قرار نہیں دیا، جب کہ لوگوں کو تجویز دی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرخ پیاز کا استعمال کریں۔ سرخ پیاز نہ صرف کینسر کے مریضوں کے لیے مفید ہے، بلکہ یہ عام لوگوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کینسر کے امکانات سے محفوظ رکھنے میں بھی مدد فراہم کرتی ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

ساتھ ایک بڑا سبک تھا جس میں ہر ایک اپنے برتن دھوا کرتا تھا۔ کاؤنٹر کے نیچے ڈش واش تھا۔ یہاں ہر گھر میں اور کبھی کبھی روم میں ڈش واش کی موجودگی بڑی اہم ہوتی ہے۔ اپنے استعمال شدہ برتنوں پر پانی ڈال کر اسے ڈش واش میں رکھتے جاتے ہیں۔ جب بھر جاتا ہے تو ایک بن دبا کر اس کو چالو کر کر دیتے ہیں۔ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹا یہ اپنا کام خود کرتا ہے۔ برتنوں کو کئی بار ایک اپنے نظام کے تحت دھوتا ہے۔ واشنگ پاؤڈر سے صاف کرتا ہے، پھر پانی بہا کر انہیں چمکا تا ہے اور آخر میں گرم پھونکیں مار کر سب کو خشک کر دیتا ہے۔ آخری زحمت آپ کو یہ کرنی پڑتی ہے کہ انہیں نکال کر دو بار ہر ایک میں سجادیں۔ برتن جانے کی یہ ڈیوٹی کوئی درکار انجام نہیں دیتا۔ بلکہ مینیجر اور ڈائریکٹر کی سطح کے لوگ باری باری یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ کس دن کس نے یہ کام سرانجام دینا ہے اس کی لسٹ دیوار پر لگی ہوتی ہے۔

مجھے پہلے دن تو اس ماحول کا ادراک نہ ہوا۔ بعد میں ایک دن میں کافی پی رہا تھا کہ ہمارا ڈائریکٹر آپریشن روم میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کافی کاگ تھا۔ اس نے کافی مشین سے کافی نکالنا چاہی تو وہ خالی تھی۔ اس نے اوپر کے فیلٹروں کو کھولا۔ کافی کا ایک پیکٹ نکالا، مشین کو کھول کر اس میں کافی ڈالی اور مشین دبا کر گرم کافی نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر نہ کوئی ٹکسن اور نہ چہرے پر کوئی بیزار کی کمی کہ کافی کیوں ختم ہوئی ہے۔ اس نے پھوگ بھرا اور مسکرا کر مجھے دیکھا تو ہوا باہر نکل گیا۔ میں ششدر بیٹھا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا کہ میں یونیورسٹی میں پیکچر تھا۔ صبح اپنے آفس میں بیٹھا تو چپڑا اسی میرے پوچھے بغیر چائے بنا کر کپ میرے سامنے رکھ دیتا۔ ہم سب ٹیچرز کے ساتھ جلی ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ تو سر اٹھا کر چپڑا اسی کا شکر یہ بھی ادا نہ کرتے تھے۔ یہاں آپ کو کوئی چپڑا ہی نہیں ملے گا اور نہ ہی کوئی ایسی پوسٹ ہے۔ نہ کوئی کسی کا ڈرائیور ہے اور نہ کوئی گارڈ ہے۔ نہ کوئی آپ کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتا ہے اور نہ کوئی آپ کا بریف کیس تھامے آپ کے ساتھ چلتا ہے۔ کیا نظام ہے جو پتہ و قار انداز سے چل رہا ہے۔

پہلی بار میں نے ایک ڈائریکٹر کو ڈش واش سے پلٹیں اٹھاتے دیکھا تو میں نے سوچا کہ اس کی مدد کروں۔ میں اس کے پاس گیا اور اپنا مدد عیاں کیا تو وہ پہلے تو حیرت سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔ ”یہ میری ہی ڈیوٹی ہے۔ آپ کیوں زحمت کرتے ہیں؟“

کھولتے ہوئے اپنے آپ یا کسی اور کو معمولی سا زخمی کر بیٹھے تو وہ کہنی پر کیس کر سکتا ہے کہ مجھے دروازہ کھولنے کی ٹریننگ نہیں دی گئی۔ اس ٹریننگ کا کہنی کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ آنے والی کسی مشکل سے بچ جاتی ہے اور رو کر کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ ہر کام ایک ضابطے کے تحت کرنے لگتا ہے۔

جب تک ہماری دو ہفتے کی یہ ٹریننگ ختم نہ ہوتی، ہم کسی بھی طور فیکٹری کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ ٹریننگ آپ کو ہر سال دی جاتی ہے کیونکہ یہاں کا قانون اسی کا تقاضا کرتا ہے۔

ڈیوٹی آج ہمیں مختلف چیزوں پر ہیلتھ اینڈ سیفٹی کی ٹریننگ دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ ڈیٹا کی بلاجہ مداخلت پر مسکراتی بھی رہی تھی۔ بہت مشکل ہو گیا تھا میرے لیے کہ ایسے وجود کو نظر انداز کروں جو آپ کے ساتھ بیٹھا ہو اور ان کی ٹائلیں، سر، ہاتھ اور زبان متواتر چل رہی ہو۔ یہ ڈیٹا تھی جس کے ساتھ میں نے ڈھائی سال کا کام کیا۔ ہم سب اس آگے دینے والے پیکچر سے قدرے بیزار اپنی ٹریننگ فیلٹس پر دستخط کرتے جا رہے تھے۔

درمیان میں کافی کا وقفہ ہوا۔ ڈیوٹی ہم سب کو اپنے پیچھے لگا کر روم میں ایسے کئی جیسے بچ کے پیچھے اس کے چوڑے چلتے ہیں۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے روم تھا جس میں داخل ہوئے۔ پینتیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا روم تھا جس میں ہم جا بیٹھے اگلے سالوں میں وہ ہمارے لیے ایک بیٹھک کا کام کرتا رہا۔ کئی رنگین میزیں تھیں جن کے گرد کرسیوں پر سفید پینٹ شرٹ میں لمبوں کے در بیٹھے کافی پیتے تھے اور ساتھ آنکھوں سے مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہتے تھے۔ بیشتر گورے تھے۔ دیکھی بھی تھے جنہوں نے ایک میز کے گرد اپنا حلقہ بنایا ہوا تھا۔ ان میں پاکستانی اور انڈین تھے۔ دونوں ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں۔ اس میں منظر دائیں بھی بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی تراشیدہ داڑھی، چہرے پر بخوبی پھیلائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر خوش آمدید کہا۔ منظر نے میرا لپٹس دیا تھا اور یہ جاب ملنے میں بہت سی وجوہات میں منظر کی سپورٹ بھی ایک بڑی وجہ تھی۔

دائیں جانب پوری دیوار پر شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کے پار مرمر پر بکری برف نظر آ رہی تھی۔ مکمل سناٹا تھا باہر اور جو شور تھا وہ صرف روم میں گونجتا تھا۔ روم کی پچھلی دیوار کے ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر رکھا تھا جس پر بائیں جانب ایک بڑی کافی مشین تھی۔ کوئٹہ میں ایک بڑا فریج بھی موجود تھا۔ ساتھ ایک ریک میں گ، پلٹیں، پیچ اور کانٹے پڑے تھے۔

میں بہت بہتر تھی۔ فلپائن کا فرڈی اور دوسرا فرناڈس تھا۔ فرڈی شکل سے فرڈی لگتا تھا اور بعد میں میرا اندازہ بھی ٹھیک نکلا۔ چھوٹے قد کا فرڈی جس نے سر کو شیو کیا ہوا تھا۔ تاؤ تاؤ کر ہم سب کو دیکھ رہا تھا۔ پانچ بجے یہ ٹریڈنگ ختم ہوئی۔ درمیان میں پانچ بریک بھی تھا اور میرے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ منظر نے اپنی دو روٹیوں سے ایک مجھے دی اور آدھا سالن دیا۔ میں آج بھی اس کا مشکور ہوں۔

پانچ بجے میں باہر نکلا تو سردی اپنے عروج پر تھی۔ مجھے پیدل آدھا میل چل کر اتر پورٹ روڈ جانا تھا۔ وہاں سے بس لے کر ڈکسن اترتا تھا اور پھر ایک اور بس سے اتر کر اپنے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچتا تھا۔ گاڑی اپنی ہو تو دس منٹ بھی نہیں لگتے مگر ان بسوں سے پینتالیس منٹ کا یہ سفر پڑتا تھا۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو اسے خالی پایا۔ مفتی دوپہر کی شفٹ میں بیہوش لایا گیا ہوا تھا۔ اس سے وہاں ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ سرجی اور شہباز ابھی اپنی جاب سے واپس آنے والے تھے۔ اگلے پختہ شہباز کو بھی اپنی Op-Co کی جاب شروع کرنی تھی۔

میں نے خالی اپارٹمنٹ کو اپنے سکون کے لیے غنیمت جانا اور کپڑے بدل کر اپنے میٹرز پر جا لیٹا۔ آج مجھے انتہائی خوشی تھی کہ مجھے اللہ پاک نے اتنے کم عرصے میں اتنی اچھی جاب دے دی تھی۔ میری فمیلی کی امیگریشن کا پروسس چل رہا تھا اور امید تھی کہ چند ماہ میں وہ میرے پاس ہوں گے۔ میں اپنی سوچوں میں ڈوبا اپنے ایک ایک اس لمبے کو یاد کر رہا تھا جہاں سے گزر کر آج میں یہاں آ پہنچا تھا۔

ٹورنٹو اترنے کے دو دن بعد میں ایک ذہنی کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آگے کھائی نظر آتی تھی اور پیچھے کا ہر نشان کھو بیٹھا تھا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا تو اور زیادہ کمزور ہونے لگتا تھا۔ سر اور کندھے جھکا کر چلتا تھا۔ پھر مجھے سرجی اور شہباز کا ساتھ ملا تو آگئیں اوپر کو اٹھیں۔ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ ہمت نہیں ہاری۔ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ کر کے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ کین سینٹر میں گزرنا وقت اور نرسن کی دوستی نے مجھے بہت سہارا دیا۔ کین سینٹر نے مجھے کینیڈا کے نظام سے مکمل آگاہی دی۔ میں کینیڈا اور اس کے نظام کو سمجھنے لگا۔ نئے آنے والوں کے لیے یہاں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اس چیز کو سمجھنا اور جاننا بھی ضروری ہے کہ یہاں کے لوگ کون کون سے کھیلوں میں دلچسپی

میں شرمندہ ہو کر دلوں اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔ بعد میں دیکھا کہ اپنا کھانا یہ خود گرم کرتے تھے۔ کرسیاں بھری ہوتیں تو کوئی ان کے لیے اپنی کرسی نہ چھوڑتا تھا۔ وہ کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر کچھ نہ کچھ نگل لیتے۔ بعد میں ہم بھی بے تیز ہو گئے۔ کوئی ڈائریکٹر آ کر ہاتھ ہلا کر آپ کی جانب مسکرا کر اشارہ کرتا تو میں دو انگلیاں جوڑ کر بیٹھے بیٹھے جواب دیتا تھا۔ ہم سب کام کرنے والے برابر تھے۔ ہر ایک نے اپنا کام سرانجام دینا تھا نہ کہ افسروں کو خوش رکھنا تھا۔

یہ نہیں کہ یہاں پر سیاست یا گروپ بندی نہ تھی۔ ہر سپروائزر کا اپنا گروپ تھا۔ چغلیاں بھی ہوتی تھیں اور کان بھی بھرے جاتے تھے مگر شاید اپنے ملک کا دس پندرہ فیصد یہ کام یہاں ہوتا تھا۔

ہم چھ روم میں داخل ہوئے تو دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر تھا جس پر بہت سے چنچ بکس پڑے تھے۔ ایک کمپیوٹر بھی رکھا تھا۔

میں سیدھا اپنی ازلی عادت کے تحت دیسیوں کی ٹیبل پر گیا۔ منظر نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ اس میز پر سب ہم خیال لوگ بیٹھے تھے۔ میرا تعارف ہوا۔ سب نے مبارک باد دی۔ ان میں ایک فزیکل تھراپی گنڈی رنگ کا شخص بھی تھا۔ مولی ٹیک کے پیچھے سے مجھے جھانک رہا تھا۔ یہ تیزانہ کاربے والا یہودی تھا۔ وہ دیسیوں کی محفل میں خوش رہتا تھا اور ہماری اردو یا ہندی کو سمجھنے کے باوجود ہمارے لطفیوں پر ہم سے زیادہ ہنستا تھا۔ ایک پاکستانی اختر بھی تھا۔ چہرے پر ہر وقت غصہ چڑھا رہتا تھا۔ گوروں سے بہت متاثر تھا اور اپنا دیکسی مذاق اسی وجہ سے ہمارے کانوں میں کرتا اور ہنسنے سے بھی منع کرتا تھا۔ ایک ہندوستانی ٹیک تھا جو سب سے ان کی تنخواہ پوچھتا رہتا تھا۔ ایک سریش تھا جو سکھوں کو گالیاں دیتا پایا جاتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ تھے اور ان کی کئی قسم کی باتیں تھیں۔ یہ چھ روم نہ تھا بلکہ ایک کلب تھا جہاں بیٹھ کر سب ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے۔ لڑتے بھی تھے اور کئی دن خوار رہنے کے بعد مان بھی جایا کرتے تھے۔

پہلے دن منظر نے مجھے کافی بنا کر دی۔ میں میز پر خاموش بیٹھا سب لوگوں کا مزاج پرکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک دو گھنٹ بھر کے میں نے کافی کام سک میں رکھا جس کو منظر نے آ کر ڈش واشر میں رکھ دیا۔

ہماری کلاس ٹریڈنگ دوبارہ شروع ہوئی۔ ڈسٹی کے انداز اور ڈیٹا کی کھلی دیکھتا رہا۔ ایک چینی لڑکی کینی تھی۔ شکل

شہباز کھینا ہو کر اٹھا اور بولا۔ ”ہم مل کر کھانا بناتے ہیں۔“

سرجی نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا اور یہ کہہ کر کچن میں گھس گئے۔ ”آپ کام مہا کام“ مطلب یہ تھا کہ اپنے ہاتھ سے کیا کام سب سے اچھا ہوتا ہے۔ شہباز کو میں نے مطلب بتایا تو وہ کراہتا ہوا دوبارہ کارپٹ پر ڈھیر ہو گیا اور اپنے پیٹ کو سہلانا لگا۔

سرجی نے آلو تھپہ بتایا اور اسے بھون بھون کر اس کا طبلہ بنا ڈالا۔ میں نے روٹیاں گرم کیں اور رائیہ بنایا۔ شہباز نے دسترخوان لگایا اور ساتھ پانی کا جگ بھر کر رکھا۔

اتنے میں مفتی آپہنچا۔ پہلے اس نے دیکھے میں چھانکا اور پھر مجھے مبارک باد دینے کے بعد آج کا احوال پوچھنے لگا۔ ڈیسی کی برائیاں پہلے لیں کہ وہ ہم لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔ منس کر اگر ملے تو اس پر اعتبار نہ کرنا۔ اس نے سب کا ایک ایک کر کے غائبانہ تعارف کروایا اور اس تعارف میں کوئی بھی اس کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔

کھانے کے دوران وہ ان سب کے ”شر“ سے بچنے کی ترکیبیں میرے دماغ میں بٹھانے لگا۔ کون کتنا زیادہ برا ہے اور کس کس سے کیسے بچ کر رہتا ہے، یہ سب میرے گوش گزار کرتا رہا۔ وہ تب خاموش ہوا جب میں نے سرجی کا محاورہ دہرایا۔ ”آدمی جانے بے سونا جانے کے“ اس کی تشریح شہباز نے کی اور پھر مفتی سرخ آنکھوں سے بڑے بڑے نوالے لینے لگا۔

مفتی مجھے بتانے لگا کہ بیسویں سال میں سب سے زیادہ تکنیکی کام دو ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا ہے۔ ایک کرومیٹوگرافی (Chromatography) ہے اور دوسرا ڈیپارٹمنٹ کراس لنکنگ (Linking-Cross) ہے۔ باقی سب ڈیپارٹمنٹ ایسے ہی ہیں جیسے کوئی برتن دھوئے جاتے ہیں۔ وہ خود کرومیٹوگرافی میں کام کرتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”گناہیں کہ تمہیں ان دونوں میں سے کسی ڈیپارٹمنٹ میں بھیجیں اور اگر بھیج دیا تو معجزہ ہی ہوگا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بعد کے دنوں میں معلوم ہوا کہ ہر ایک کی خواہش یہی تھی کہ انہیں ان میں سے کسی ایک ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا جائے۔ یہ دونوں ڈیپارٹمنٹ ہائی ٹیک مشینوں پر کام کرتے تھے جو یہاں کا تجربہ بے لے لینا تو اسے کسی بھی بائیو ٹیک انڈسٹری میں با آسانی جابل سکتی تھی۔

یہ سب بتا کر مفتی نے میرے اندر خواہشات کے نئے سانپ کھڑے کر دیے۔ انسان کی ایک مقام کو جب پاتا ہے تو

لیتے ہیں۔ آپس میں بیٹھ کر کزن چیزوں کو زیادہ موضوع سخن بناتے ہیں اور کزن چیزوں سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا مذاق کیسا ہوتا ہے اور کہاں کہاں کیا کرتے ہیں۔ آپ ان کے ملک میں آتے ہیں تو ان کو کھانا ضرور دی ہوتا ہے۔ وہ محاوروں میں بات کرتے ہیں اور مذاق بھی محاوروں میں کرتے ہیں۔ میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی نے کوئی جملہ لگایا لیکن میں نے سمجھ سکا اور اس پر وہ رد عمل نہ دیا جس کی وہ توقع کر رہا ہوتا تھا۔ اس سے نقصان یہ ہوا کہ درمیان کے فاصلے بڑھتے چلے گئے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گورے اور دیسی علیحدہ علیحدہ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے ہوتے جیسے میں بیسویں سال میں پہلے دن دیکھ آیا تھا۔ یہ ملک آپ کو اپنا ٹھکانا مذہب چھوڑنے کا نہیں کہتے بلکہ یہ دوسرے کچھ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

پہلے سرجی وارد ہوئے اور کچھ دیر بعد شہباز داخل ہوا۔ سرجی آج کا احوال پوچھنے لگے۔ جب میں نے یہ بتایا کہ ہماری انٹرکلیڈ ڈیسی بہت حسین نازنین ہے تو اس کا فخرہ نصب پوچھنے لگے۔ میں نے جب انہیں کچھ میرے ہمراہ سنے بھرنی ہونے والے درکروں کے بارے میں بتایا تو بولے۔ ”یہاں کوئی نسرین والا چکر نہ چلا لیتا۔“

مجھے غصہ تو بہت آیا پر خاموش رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ اپنا رد عمل دینا ایسا ہی تھا جیسے آئینل مجھے مار۔ میں تو خاموش رہا مگر شہباز سرجی سے مخاطب ہوا۔ ”آج تو پہلادان ہے اور ایک دن میں تو ان کو روں کے تانم بھی بشکل زبان پر چڑھتے ہیں۔“

سرجی نے دانشمندی سے سر ہلایا اور شہباز سے بولے۔ ”تم بجا فرما رہے ہو۔ آدمی جانے بے سونا جانے کے۔“

شہباز تملایا اور میں نے بڑھ کر کاپی پیش کر ڈالی۔ مطلب یہ بتایا کہ آدمی کی پہچان ساتھ رہنے سے ہوتی ہے جیسے سونا کسوتی پر پہچانا جاتا ہے۔ سرجی کے بروقت محاورے مغلغل کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ جب کبھی برخل بولنے تو اس کی بھی توجی بہت خوبصورت انداز میں کر لیا کرتے تھے۔

شام اتر چکی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر اندھیرا نہ تھا بلکہ لیپ پوسٹ کی دو دیوار و شینوں میں بے موسموں کی برف زرہ زرہ چمک رہی تھی۔ شہنشاہ سے زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ہم آج سب مطمئن بیٹھے تھے۔ سرجی یہ کہہ کر اٹھے۔ ”کسی کو بھی رات کے کھانے کا احساس نہیں ہے۔“ کچن کی جانب جاتے جاتے شہباز کو کوری طرح گھورا اور بولے۔ ”لوگ بھوک لگنے پر میری طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے بچہ ماں کی جانب دیکھتا ہے۔“

اگلے دن اس کے آگے کا سوچنے لگتا ہے۔ خواہشوں کے گھوڑے لمبی جھٹکتے نہیں۔ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں مگر ہر وقت سر پٹ بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ میں ذرا تھنا چاہتا تھا مگر مفتی نے ایک تازہ چارہ میرے آگے ڈال دیا۔ میرے اندر کے ناگھرے انسان کے منہ سے ایک بار پھر رال کھینچنے لگی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچھایا، ڈانٹا تو پھر کہیں جا کر ذرا پرسکون ہوا۔

کھانا کھا کر شب بازنے قبوہ بنایا۔ ہم اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے قبوہ پل رہے تھے۔ میرا مقام ڈور وال سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ جہاں موری پیٹھے سے لگی ڈک سے گرم ہوا خارج ہو کر کمرے کی حدت بڑھاتی تھی۔ اس ہوا کا لمس میرے پیٹھے گرم کر رکھا تھا۔ اس جگہ بیٹھ کر میں ہر وقت طمانیت محسوس کرتا تھا۔

قبوہ کے چسکی بھر کر مفتی بولا۔ ”پرسوں بقرعید ہے۔“ چھوٹی عید کی خبر بھی مفتی نے ہم پر اسی طرح کرائی تھی اور آج کا ہم بھی اس طرح آج ہم پر چھوڑا تھا۔ اس دن بھی ہم سکتے میں آگئے تھے اور آج بھی ہم اسی ماحول میں زرد چہروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔

یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ عید کا تہوار ہو اور میں بے خبر رہوں؟ مگر میں بے خبر ہی رہا تھا۔ تہوار ماحول سے جنم لیتا ہے تاکہ کلینڈر سے۔ میرے اور مفتی کے علاوہ سب ساتھیوں کے لیے ضبط نامکن ہو گیا تھا۔ ہم تینوں پھر ان نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ آج میں جاب کی خوشی لا کر پارٹمنٹ پہنچا تھا مگر عید کی ”خوشی“ اسے نگل گئی تھی۔ یہ کسی عید کی جو ہمیں افسردہ کر گئی تھی۔

ذواج کا چننا نظر آ جاتا اور عید کا ڈنکا بجنے لگتا تھا۔ اس عید پر سب سے بڑی خوشی قربانی کا جانور لینے کی ہوتی تھی۔ آج کل جو پیسوں کی ریل چل جانور لانے میں نظر آتی ہے وہ پہلے نہ تھی۔ ہر ایک اپنی استطاعت کے مطابق کوئی جانور خرید لاتا۔ ہم عید سے ایک ہفتہ پہلے بھیڑ لے آتے۔ ہمارے علاقے کے لوگ بکرا نہیں کھاتے ہیں اور اسی لیے بھیڑ کا رواج تھا۔ پہلے ایک نائی کو گھر بلا کر اس کے بدن کے سارے بال اتارے جاتے۔ بال کاٹنے کے بعد اس کی صحت کا ٹھیک سے اندازہ ہو جاتا۔ پھر اس پر مختلف رنگ لگائے جاتے۔ ایک عدد ہار اس کے گلے میں ڈالا جاتا۔ پھر اسے لے کر بچے بالے گھر گھر گھومتے۔ جس گھر جاتے وہ یا تو ہمیں نظر انداز کر دیتا یا کوئی تہرہ کرنے کے بعد کہتا۔ ”ماں سے کہنا ہمارے گھر اچھا حصہ ہے۔“

یہ پیغام لے کر ہم کسی دوسرے گھر میں داخل ہو جاتے۔ پھر ایسا بھی کئی بار ہوتا کہ ہم ان جانوروں کی آپس میں لڑائی بھی کرواتے۔ جیسے جیسے عید قریب آتی اور ہمارا جوش و خروش بڑھتا جاتا۔ اس عید پر کپڑوں اور نئے جوتوں کی فکر نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ ہم نے خریدنے بھی نہ ہوتے تھے۔ ہم وہی کپڑے پہنتے جو چھوٹی عید پر پہنتے تھے۔ ماں انہیں سنہال کر لوہے کے ٹریک میں کہیں چھپا کر رکھ دیتی تھیں۔ جوتے بھی کسی خفیہ جگہ پر محفوظ پڑے ہوتے۔ مڑے کی بات یہ تھی کہ یہ سب خفیہ مقامات مجھے معلوم ہوتے۔ اس عید پر میری خوشی یہ ہوتی کہ ماں کی نظر بچا کر میں ان خفیہ خانوں میں اپنے خزانے کو ایک نظر دیکھ کر شاد ہو جاتا۔

عید کی نماز پڑھنے کے بعد گھر آتے۔ اس عید میں سوایا بہت کم کھاتا کیونکہ کچھ دیر بعد گوشت کھانا ہوتا تھا۔ قسائی کا انتظار بہت بے چینی سے ہوتا۔ میں گلی میں کھڑا ہوتا۔ قسائی لیٹ ہو جاتا اور پھر مایوس ہو کر یہ ”اندھناک“ خبر سب کو سناتا۔

جانور ذبح سے بولیاں بنانے تک کا ایک ایک مرحلہ دیکھا جاتا۔ قسائی چلا جاتا تو میں کوشش کرتا کہ ان گھروں میں گوشت کا حصہ میں لے جاؤں جہاں سے عید کی لٹنے کی امید ہوتی۔ بقرعید پر عید کی دینے کا زیادہ رواج نہیں ہوتا تھا مگر میں نے امید کا دامن بھی نہ چھوڑا۔ کہیں سے کچھ نہ کچھ لے لی آتا۔ پھر گوشت بھوننے کا مرحلہ آتا۔ بھینگی کی ہنڈیا اماں جی بنا تیں مگر وہ اتنے بڑے کٹنے پر پوری اترتی۔ گوشت بھونا جاتا اور ہمیشہ کی طرح کچا پکا اتار کر کھاتے۔

پورے علاقے میں گوشت کی ایک مخصوص بو پھیلی ہوتی۔ زیادہ تر کے پیٹ خراب ہو جاتے اور دوسرے دن اکثر ڈاکٹر اپنے متوقع مریضوں کے لیے اپنے کلینک کھولا کرتے تھے۔ ویسے ہی عید میلے ہوتے۔ وہی سنیا گھروں پر رش پڑتا جیسے چھوٹی عید پر ہوتا تھا۔ تین دن خوب گزرتے۔ خوشی محسوس ہوتی تھی۔ آج کل تو خوشی صرف اپنے ایشیئس پر لکھی جاتی ہے۔ ان دنوں خوشی لپٹ جایا کرتی تھی۔ ان دنوں خوشیاں چھوٹی چھوٹی بھی ہوتی تھیں اور بڑی بھی ہوتی تھیں۔ ہر ایک کا اپنا لطف ہوتا تھا۔ ان دنوں ایک چپل بھی خرید لی تو گھنٹوں اسے دیکھتے رہے۔ آج کل کے منجے جوتے بھی لے آئے تو انہیں صرف پہننے وقت ایک نظر دیکھنا ہی بہت ہوتا ہے۔ آج کل سستی چیزیں منجی ہو گئیں اور ہنگی سستی ہو گئیں۔ اچھا کھانا ہم دس روپے میں کھا لیتے تھے اور جوتا پچاس روپے میں مل جاتا تھا۔ آج کل کھانا

وہ خاموش ہو کر مجھے تنکے لگے۔ بعد کو میں اپنے اس لہجے پر پچھتا یا بھی تھا۔ دوسرے دن ان سے اس کا اظہار نہ بھی کیا۔ سن کر بولے۔ ”میں بھی سمجھوں کہ کل آپ کیوں آستیں چڑھائے بیٹھے تھے؟“

دوسرے دن وہی رخ دن تھا۔ میں وقت سے پہلے ہی ہوسال پہنچ گیا۔ فلپائن کا فرڈی مجھ سے پہلے آیا ہوا تھا۔ ڈیانا اپنی کرسی پر اسی حالت میں بیٹھی تھی جیسے کل اسے چھوڑ گیا تھا۔ ڈیانا کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک دو بار اچھٹی اور پھر مجھے گڈ مارننگ کہہ کر زیادہ اچھٹنے لگی۔ میں اسے جواب دے کر فرڈی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ کھڑکی سے باہر سرگرمی برف کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے گڈ مارننگ کہا تو جواب میں کہنے لگا۔ ”ایک اور لمبا اور یورنگ دن شروع ہونے والا ہے۔“

میں نے کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جواب نہ پا کر فرڈی میری جانب مڑا اور پوچھا۔ ”لگتا ہے تم کو ایسی یورنگ کلاس میں لطف آتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں خود بچپن سے یہاں رہا ہوں اور کچھ دیکھنے سے میں یورنگ نہیں ہوتا۔“

پھر یہاں کیا کر رہے ہو؟“

پھر اپنے کچھ سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”تم کو تو کسی یونیورسٹی میں جاب کرنی چاہیے۔“ میری تعلیم پوچھ کر جواب میں کہا۔ ”ہم میں سے کوئی یہاں پر گریڈ بارہ سے اوپر نہیں ہے۔“

میں خود حیران رہ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بی ایس سی کی ڈگری یہاں سب سے بڑی ڈگری بھی جاتی ہے۔ ڈیسی خود بی ایس سی تھی اور سپروائزر لگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ ماسٹر ڈگری لے کر اس لیے پیچھے تھے کہ ہماری ایک تو تعلیم معافی نہ تھی اور نہ ہی کوئی تجربہ تھا۔ ہمارے مطمئن ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جب ہم اپنی تنخواہ کا موازنہ پاکستان سے کرتے تھے تو اسی کو اپنے لیے بہت بڑی نعمت سمجھ لیتے تھے اور مطمئن ہو جاتے تھے۔

دوسرے لوگ بھی آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ڈیسی کل سے مختلف لباس میں ہماری فائیکو کا بوجھ اٹھا کر ہنسی مسکراتی اندر داخل ہوئی۔ سب کو گڈ مارننگ کہا۔ جواب میں سب نے گڈ مارننگ کہا اور ڈیانا ایک بار کہہ کر درہائی چلی گئی۔ جب قہمی تو بلا وجہ ہنسنے لگی۔

کلاس شروع ہوئی۔ کچھ نئی باتیں سیکھنے کو ملیں۔ میں نوٹس

ڈیڑھ ہزار میں اور جوتا ایک ہزار میں۔ عید کی یاد میں سب کو مفتی نے ڈوبا دیکھا تو سب سے مخاطب ہوا۔ ”میری بہن، میں نے آپ تینوں کو میرے سمیت عید رات کو دعوت دی ہے۔ ہم رات وہیں ٹھہریں گے۔ دوسرے دن عید کی نماز پڑھ کر اور دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آئیں گے۔“ یہ سب سنا کر وہ ہم سب کو خاموش پا کر حیرانگی سے دیکھتا تھا۔ اس کی حیرت بجا تھی کیونکہ ہمیں رزائل کے طور پر خوشی سے شور مچانا تھا۔ نعرے لگانے تھے مگر ہم اس لیے خاموش تھے کہ برسوں سب کی جاب تھی۔ میری تو فی جاب کا تیسرا دن تھا اور میں چھٹی کرنے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔

سب کو اپنی بجوریوں بتائیں مگر مفتی اڑ گیا۔ سرجی اور شہباز نے تو کہہ دیا کہ ہم کل فون کر کے سیکورٹی کی جاب سے برسوں کی چھٹی لیے لیں گے۔ اب مسئلہ میرا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا کہ میں جاب کے تیسرے دن اپنی ٹریننگ میں چھٹی نہیں کر سکتا۔ لمبی بحث ہوئی۔ مفتی نے لٹکار لٹکار کر مجھے سمجھایا۔ محبت میں اس کی آنکھیں تک سرخ ہو گئیں۔ منہ سے جھانک بیٹھ گئی۔ مجھے وارننگ دی کہ اگر تم نے چھٹی نہ کی تو دوستی ختم۔ میں نے پوچھا۔ ”آخر یہ دوستی کیوں ختم۔“

کہنے لگا۔ ”بہن کے سامنے میری بے عزتی ہو گئی۔“ پھر چلا کر بولا۔ ”اس نے رات کے کھانے صبح کے ناشتے اور پھر عید کے دن کھانے کا سارا انتظام کیا ہوا ہے۔“

مفتی کی بہن اور بہنوئی اکاؤنٹنٹ تھے۔ مالی حیثیت بہت اچھی تھی۔ رہن بہن بہت ادب کرتے تھے۔ مفتی ان سے چھوٹا بھی تھا اور پھر سب کچھ ملا کر وہ ان دونوں کے آگے دیتا تھا۔ اپنی بہن کے سامنے تہذیب و تمدن کا بہت خیال رکھتا تھا۔ خود تو رکھتا اور ساتھ ہمیں بھی سب کروانا تھا۔ جب اس کی بہن کسی اس سے ملنے آتیں تو یہ پہلے ہمیں لپکھ دیتا۔ سرجی سے تو ایک دو بار ریپرسل بھی کروا چکا تھا۔ مجھے اس ماحول میں رات گزارنا ہماری بھی لگ رہا تھا مگر مفتی نے بقول شہباز ”سیا“ ڈال دیا تھا۔ میں نے کل ڈیسی سے چھٹی کی بات کرنے کی ہامی بھری مگر اندر سے میں سخت غصے میں تھا کہ یہ مجھ سے زبردستی کروا رہا ہے اور اسے میری نئی فی جاب کی فکر بھی نہیں ہے۔

میں کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ میں غصے میں تھا۔ سرجی پھر سے نازل ہوئے۔ میرا چہرہ دیکھ کر بولے۔ ”آپ بھی ہمیشہ آٹھ پہر سوگی بنے رہتے ہیں۔“

میں جھجھلا گیا اور غصے میں کہا۔ ”یہ محاوروں کا مذاق ہر وقت نہ چلایا کریں۔“

لیٹا رہا۔ فرڈی اٹھتا رہا۔ ڈپانا ہلتی رہی اور کینٹی اپنے چند دار
چشموں کے پیچھے پلٹیں چھپا کالی رہی۔

لچ بر بک ہوا اور ہم اسی لچ روم میں آ بیٹھے۔ منظر نے کل
کی طرح اپنی ایک روٹی مجھے دی۔ سالن گرم کیا۔ کچھ میری
پلیٹ میں ڈال کر چہرے پر سنجیدگی کا ماسک لگائے سر جھکا کر
کھانے لگا۔ منظر سے میری زیادہ دعا سلام نہ تھی۔ وہ میرا من
تھا مگر اتنی سنجیدگی مجھے ہنسم نہ ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک ساتھ کام
کرنا تھا۔ بھی کو یہ کرخت ماحول توڑنا تھا۔ کھاتے کھاتے میں
نے منظر سے پوچھا۔ ”ایک روٹی میں تمہارا پیٹ بھر جاتا ہے؟“
اسی متانت سے سر ہلا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“ جواب
دے کر پھر سے کھانا کھانے لگا۔

میں نے خود سے اپنا جواب دیا۔ ”میرا تو گزارہ نہیں
ہوتا۔ آپ بھابی سے کہہ کر کل سے تین روٹیاں اور کچھ زیادہ
سالن لایا کریں۔“

یہ سن کر اس کا چہرہ منہ اور چلتے ہاتھ رک گئے۔ میری
جانب دیکھا تو میں مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بیٹھے نس
رہے تھے۔ اتنے میں ایک آفت لڑکی رنج روم میں داخل ہوئی۔
سرخ و سفید رنگت ایسے کہ دودھ میں شہد ملا دیا گیا ہو۔ خاموش
چہرہ اور اداس آنکھیں۔ پینٹ پر ایک تنگ جرسی پہنی تھی، میں
اسے دیکھنے لگا۔ وہ آئی اور سیدھا کافی مشین سے کافی لے کر اسی
طرح چلی گئی۔ منظر بھی یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے جویت زدہ دیکھ
کر ہنسنے لگا اور بتایا۔ ”یہ تھی ہے۔ کوئی کنٹرول میں کام کرتی
ہے۔“

میں سر جھکا کر اپنا کھانا ختم کرنے لگا۔ منظر کچھ اور کھلا
پھر نس کر بولا۔ ”گلتا ہے۔ کتنی پسند آگئی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”ایسی خوب صورت لڑکی کس کو پسند نہ آئے
گی؟“

یہ سننے کے بعد منظر کچھ اور کھلا اور اسے بھابی بھابی کہنے
لگا۔ آج بھی جب ملتا ہے تو اس کا ذکر بھابی کہہ کر کرتا ہے۔
اگلے چند ماہ میں کتنی سے اچھی خاصی گپ شپ ہوگئی اور اسے
بھی بتا دیا گیا کہ وہ اب بھابی کہلائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب
بھی بتا دیا گیا اور پھر اسے باخبر رکھا جانے لگا کہ کہیں بھول نہ
جائے۔

منظر کے ساتھ سنجیدگی کا پردہ میں نے پھاڑ ڈالا تھا۔ بعد
میں ہماری دوستی اتنی بڑھی کہ آج تک قائم ہے۔ ہم اب بھی بیٹھ
کر بیس سال کے دن اور وہاں کے لوگوں کو یاد کرتے ہیں۔
کلاس دوبارہ شروع ہوئی۔ میرے سامنے ایک پھاڑ

کھڑا تھا کہ کس طرح ڈھبی سے کل بقر عید کی چٹھی کا یوں؟ آج
میرا روز راز دن تھا اور چٹھی کا کہتے ہوئے شرم آ رہی تھی مگر دوسری
جانب مفتی کا اصرار تھا کہ چٹھی لینی بھی ضروری ہے۔ اس نے
اپنے وقار کا مسئلہ بتایا ہوا تھا۔

بیچ میں ڈھبی سے میں نے کہہ دیا کہ کل ہماری عید ہے
اور اگر ایک دن کی چٹھی مل جائے تو مسائل بے حد مشکور ہوگا۔
پہلے تو عید کے نام پر اس نے اپنی مینز آنکھیں سکڑیں۔ پھر
پوچھا۔ ”یہ عید کیا ہونی ہے؟“

مجھے سمجھ نہ آئی کہ کس طرح اس کی بابت اسے بتاؤں۔
میں نے صرف یہ کہا کہ جس طرح آپ کی کرکس ہوتی ہے تو
مسلمانوں کی عید ہوتی ہے۔ اس کی سکڑی آنکھیں کوئی چمک
لیے پھیل گئیں۔ کچھ اور پوچھا میں نے سنت ابراہیمی اور رنج کی
بابت بتایا اور پھر عید کا ذکر دوبارہ نہایت احترام سے کیا۔ اس
نے پوچھا۔ ”کیا سب مسلمان یہ تہوار مناتے ہیں؟“ میں نے
اثبات میں سر ہلایا۔

میں تو ذرا رہا تھا کہ وہ بھڑک نہ جائے مگر اس کا جواب
نہایت حوصلہ افزا تھا۔ کہنے لگی۔ ”ہم کوسارے لوگوں کے گھر اور
مذہبی رسومات اور تہواروں کا احترام کرنا چاہیے۔“ پھر اس نے
بیسو سال کی پالیسی بتائی کہ گینڈا کے قانون لے مطابق ہر ایک
کو اپنے مذہب اور گھر کو اپنانے کی مکمل آزادی ہے۔ اس نے
پھر میری تعریف کی کہ اس کو اپنے تہوار کے بارے میں بتایا۔
مجھے اس نے کل کی چٹھی دے دی۔ اس سے بڑھ کر یہ ایسا کہ
منجھنت سے بات کر کے جھسٹا جانتے بھی مسلمان بیسو سال
میں کام کرتے تھے، ان کی چٹھی بھی مشکور کر وادی۔

مفتی تو پہلے ہی اپنی سالانہ چٹھیوں میں سے ایک چٹھی
لے چکا تھا مگر منظر کے ساتھ باقی سب کو بھی عید کی چٹھی مل گئی۔
میرا پہلا تاثر بہت اچھا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے اپنا نیت
لے کر کا احساس ہوا۔ بعد کے دنوں میں اپنی اہمیت کا احساس تو آنا
ہوتا گیا۔ ہر سال بیسو سال کا سالانہ کنونشن ہوتا تھا۔ اتفاق سے
وہ جب بھی ہوا تو وہ رمضان شریف کے دن تھے۔ بیسو سال میں
کام کرنے والے تمام مسلم روزے سے ہوتے تھے۔ پہلے
کنونشن صبح سے شام تک جاری رہا اور بیچ میں لچ کا وقفہ ہوا۔ ہم
تو روزے سے تھے۔ اسی لیے ایک منیجر سے اجازت لے کر
باہر چلے آئے تھے اگر روزے سے نہ بھی ہوتے تو ان کا کھانا ہم
سے نہیں کھایا جاسکتا ہے۔ ان کے کھانوں میں سلاوا کچھ کٹے
ہوئے پھل، پھلکی چکی سی پھلی اور اسی ڈانٹنے کی چکن ہوتی۔
لیکن بھی ہوتا جس کی طرف ہم نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

چکن، چیز ابھی ہمارے لیے ممنوع تھا۔ خیر ہم وہاں سے چلے آئے۔ واپس آئے تو کسی نے ہمارے واک آؤٹ کی وجہ پوچھی تو ہم نے رمضان کے مہینے کے بارے میں بتایا اور پھر بھول گئے۔

کچھ دن بعد ہم سب مسلمانوں کو کمپنی کے سی ای او کا لیٹر ملا۔ بہت معذرت کی گئی تھی کہ آپ لوگوں کا مقدس مہینہ تھا اور ہم نے لُج رکھا ہوا تھا۔ بار بار کی معذرت کے بعد آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانے کی یقین دہانی کروائی گئی۔

اگلے سال کنونشن سے پہلے مسلمانوں سے رابطہ کیا گیا کہ آپ کس وقت کھانا کھا سکتے ہیں تاکہ ہم کنونشن کا ڈنر سی وقت پر اسٹارٹ کر سکیں۔ ہم نے آپس میں بیٹھ کر مشورہ کیا اور ہوش ریسور ڈیپارٹمنٹ میں اپنی افطاری کا ٹائم بتایا اور یہ بھی مطلع کیا کہ ہم حلال فوڈ استعمال کرتے ہیں۔ پھر باہمی مشورے سے ہم نے ایک کثیر تنگ والے کافون نمبر دیا اور ساتھ ہی دسکی کھانوں کی فہرست دی جس میں بریانی، چکن روٹ، قورمہ، رائیہ اور ساتھ ساتھ سمو سے پکڑے بھی لکھوا دیے۔ اب ہم مسلمان چھ سات سے بڑھ کر پندرہ کے قریب ہو چکے تھے اور انٹرن بھی ہمارے ہموان بن گئے۔ وہ اپنے ملک میں شاید چکن نہیں کھاتے مگر اکثر باہر کے ملکوں میں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

کنونشن شروع ہوا اور ہماری افطاری سے آدھا کھٹنا پہلے ختم ہوا۔ ہم سے ٹائم پوچھا گیا اور ہم نے ٹائم بتا دیا۔ اعلان ہوا کہ کوئی غیر مسلم اس ٹائم سے پہلے کھانا شروع نہیں کرے گا۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ سب گوروں نے اپنی چٹنیں پکڑی ہیں اور لائن میں گنگے کھڑے ہیں تاکہ افطار کا ٹائم ہو اور وہ کھانا شروع کر سکیں۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ ان کی نظر میں ہم غیر مذہب لوگ تھے اور ہمارے مذہب اسلام کا یہ احترام مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہم نے ہی اپنی افطاری کا اعلان کیا اور انہوں نے اپنا ڈنر شروع کیا۔

ہمارا کھانا ایک سائیڈ پر میزوں پر رکھا تھا۔ سب کچھ بڑی مقدار میں تھا جس کی ہم نے فہرست دی تھی۔ دیکھتے دیکھتے تمام گورے ہمارا کھانا جیسے لے لے کر چٹ کر گئے۔ کھانا اتنا زیادہ تھا کہ ہم بھی بھوکے نہ رہے۔ گورے تعریف کرتے نہ تھکتے تھے۔ ہم بھی اس طرح خوش ہو رہے تھے کہ جیسے یہ سب کچھ ہم نے بنایا ہو۔ کچھ انٹرن ہماری آواز پر اُکھٹے اور ناراض بھی نظر آ رہے تھے مگر ان کی اپنی جرأت نہ تھی کہ کوئی بات کر سکتے۔ بعد میں جب بھی کوئی فنکشن ہوا تو حلال فوڈ کھانے والے زیادہ گورے ہوتے۔ وہ اب ہم سے فرمائشیں بھی کرنے لگے تھے

کہ کچھ نہ کچھ ہم لُج میں ان کے لیے بنا کر لایا کریں۔ میری ایک سپروائزر لوئیس (Louise) تھیں۔ اس کو ایک بار نے ان کے ساتھ مرج مسالے والے پیاز اٹے کھائے تو وہ میری گرویدہ بن گئی۔ ایک بار مجھے آفر دی کہ جب میں اسے اپنے گھر کا کھانا لاکر اسے کھلایا کروں گا تو وہ نیچے واڈ کا بدلے میں پلائے گی۔ اس آفر پر منظر کے علاوہ سب دسکی میرا مذاق ابھی اڑاتے تھے۔ جب کوئی چیز بنا کر لاتا تو کہتے۔ ”آج واڈ کا پینے کا موڈ ہے۔“

مجھے عید کی چھٹی مل گئی تھی بلکہ مجھے آج۔ جلدی جانے کی اجازت بھی دے دی گئی تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ چھوڑ کر یہ خبر مفتی کو دی تو وہ بھی بہت حیران ہوا۔

کچھ دیر بعد ہمیں سب دے سے مارکھم جانا تھا۔ مارکھم میں میکاؤن سب دے پر ہمیں مفتی کی بہن ملتی جو ہمیں ساتھ لے جاتی۔ کل بڑی عید تھی اور ہم نے اسی حساب سے کپڑے ایک بیک میں ڈال لیے۔ رات وہیں گزارنی تھی۔ شہباز نے مفتی سے پوچھا۔ ”معلوم تو کر لو کہ کل عید ہے؟“ مفتی بولا۔ ”سارے ٹورنٹو کو پتا ہے کل عید ہے تو میں کس سے کیا معلوم کروں۔“

سرٹی کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ بولے۔ ”کیا معلوم مارکھم میں عید نہ ہو جیسے پاکستان میں ہوتا ہے کہ آدھے گاؤں دیوالی آدھے گاؤں ہوتی۔“

میں نے کہا کہ یہ نقش صرف چھوٹی عید پر ہوتی ہے تو شہباز کے ساتھ سرچی بھی راضی ہوئے۔

میں نے سرین کو فون کیا۔ اپنے بیسوا سال میں جاب جو ان کرنے کی خبر دی۔ مبارک یاد وصول کی اور اپنی جانب سے عید کی مبارک باد دی۔ کنبہ لگی کہ عید پر میرے گھر آ جاؤ۔

میں نے کہا۔ ”اس دن تو گھر کے باہر سے بھاگ دیا تھا اور آج بلاری ہو۔“

پہلے خاموش رہی اور پھر کہا۔ ”ہاں! اب بلاری ہوں۔“ اس آفر پر میں خاموش ہو گیا۔ مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا۔ ”اگر نہ آئے!.....“ وہ کچھ اور کہتی کہ میں نے جلدی سے کہا۔ ”کل ہمیں مفتی کی بہن کے ہاں جانا ہے۔“ میرا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ وہ بولی۔ ”کچھ بھی ہو جنہیں آتا ہے۔“

اس نے مجھے ہل صراط پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک جانب مفتی تھا تو دوسری جانب سرین۔

(جاری ہے)



قلم کار کی پیگم

سلمیٰ اعوان

وہ عالمی شہرت کا حامل ایک بڑا قلم کار تھا۔ اس کی تحریروں کو پسند کرنے والے ہر ملک میں ملیں گے لیکن خود اس کی زندگی الجھی ہوئی تھی اگر اس کے ساتھ اس کی شریک سفر نہ ہوتی تو شاید وہ ایسا نامور مصنف بھی نہ بن پاتا۔

ایک بڑے مصنف کی زندگی کا عکس

تغیر کی فنکاریوں، فنون لطیفہ کی معمیر تاؤں اور ان کی بولمونیوں میں یوں الجھی کہ دستوں کی دل سے اوجھل ہو گیا۔
چوتھے دن صبح سویرے مجھے اس کی ہڑک اٹھی تھی۔ میں
بک گائیڈ ہاتھ میں پکڑے ریپشن پر چلی گئی۔ ریپشن پر ہر

سچ تو یہی تھا کہ میں اس عظیم ناول نگار کے گھر جانے
کی خواہش میں بے جا تھی۔ پر مصیبت یہ تھی کہ میری ساتھی
محل بیناروں کی شیدائی تھی۔ وینز پیلس اور ہر سچ کا سبق گھر
سے پڑھ کر آئی تھی۔ میں خود بھی محلات اور چرچوں کے طرز

دوسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی۔ دوستو و سکی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے میں نے ہاتھ فضا میں استغما یہ تاثر دیتے ہوئے لہرایا۔
 ”جیسی“ وہ بولی۔

”نیت“ (نہیں) میٹرو یا بس۔ میں نے جوابا کہا۔
 گوہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی کہ تم جیسی کر ٹھیک رہو گی۔
 ”ارے مجھے کتنے نے کاٹا ہے جو جیسی کر لوں۔ ایک دو کلومیٹر کا راستہ اس نے گھما پھرا کر دس کا کر لیتا ہے اور پانچ سو چار سو روپے مل جھٹا لیتے ہیں۔ روس کے جیسی ڈرائیور بھی اول درجے کے کانیاں ہیں غیر ملکیوں کو لوٹنا جانتے ہیں۔ ایسی ایسی پھرتیاں دکھاتے ہیں کہ مانو لگتا ہے جیسے سواری کو تو اوپر پہنچا کر ہی دم لیں گے۔“

لڑکی ہنس پڑی اور بولی۔ ”آپ تو میرے سامنے زمین پر زندہ سلامت کھڑی ہیں۔ یہ بڑے ماہر ڈرائیور ہوتے ہیں۔
 ”گھبرا یا نہ کریں۔“
 ”بس تم مجھے سمجھا دو۔ میٹرو یا بس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں۔“

”میٹرو سے۔“ اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔
 اس کی حیرت پر مجھے اچھٹا ہوا۔
 ”لو یہ ہمیں کیا گاؤ کی سمجھ رہی ہیں۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا۔

کچھ زبان اور کچھ اشاروں نے سمجھا اور سمجھایا۔ اور ہم لوگ نکل پڑے۔ سادو وایا Sadovya میٹرو سے دوستو و سکی سکا میٹرو پر اترے۔ باہر آئے۔

”گاڑیوں بسوں سے بھرا ہوا یہ چوک جس کے عین سامنے خوبصورت ولا دی میر چرچ تھا جس کے ساتھ ہی کز چچی لین ہے۔ نقشے پاس ہونے کے باوجود ہم لوگوں کو روک کر پوچھنے میں ذرا سہارا نہیں کرتے تھے۔ پرانی ہم-کایا اسٹریٹ جواب دوستو و سکی کہلاتی ہے۔ یہیں کوئے پر وہ چار منزلہ عمارت کھڑی ہے جس کے ایک اپارٹمنٹ میں اکتوبر 1878ء میں میرا محبوب لکھاری انٹی نیسکی کے ساتھ شفٹ ہوا اور یہی وہ گھر تھا جہاں 1846ء میں بھی اس نے کچھ وقت کرایہ دار کی حیثیت سے گزارا تھا۔ گویا یہ گھر اس کی تخلیقی زندگی کی ابتدا اور انتہا تھا۔

میں دروازہ بسمتھ کی چند سیڑھیاں اتر کر تھا۔ پہلے پوڑے پر قدم دھرنے سے قبل میرا جی چند لمحوں کے لیے چوہرے پر بیٹھ جانے کو چاہا۔

میں کچھ جذباتی ہو رہی تھی۔ نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بے اختیار ہی میری پلکیں اظہار تشکر کے طور پر جھجک سی گئی تھیں۔ بھلا میری اتنی اوقات کہاں تھی کہ میں تاریخ و ثقافت سے بالاب بھرے اس شہر میں آنے اور اس عظیم مصنف کے در پر حاضری دینے کا سوچ سکتی۔ تیری عنایت ہی ہے۔

اور پھر میں بھاری بھر کم چوبی دروازے کو دھکا دے کر فیدور دوستو و سکی کے گھر میں داخل ہوئی۔ سوروبل کا ٹکٹ خرید کر چھوٹی سی راہداری میں کرسی میز بجائے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں کام کرتی خاتون کے گائیڈ کرنے پر سیڑھیاں چڑھتی ہوں سامنے ایک بڑا کمراسنا آتا ہے۔ یہ ہال کرا تھا جس میں رکھے لی وی کی اسکرین پر اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی ڈاکو میٹری پل رہی تھی۔ صوفے پر بیٹھا ہوا۔ صوفے پر ہی آرام کرتا ہوا کھانے کی میز پر، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، دریائے نیوا کے کنارے سیر کے لیے جاتا ہوا، کینڈل پکڑے، برقباری کے دوران بچنے سے برف ہٹاتے، پودوں کو پانی دیتے، اس کی زندگی کے بے شمار روپ ہم نے زہر مہرہ رنگے میٹ پر چکڑی مار کر بیٹھتے ہوئے دیکھے۔ اس کمرے میں ہمارے علاوہ ساؤتھ کوریا کے دولڑکے اور کرسی پر براجمان مولی تازی رومی نگران خاتون تھی۔

فلم ختم ہونے کے بعد بھی میں ویسے ہی بیٹھی تھی۔ میری آنکھوں میں محبت اور عقیدت کے دیئے مل رہے تھے۔ بند کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر دیکھتی اور یہ سوچتی ہوئی کہ اس گھر میں اس کا دوبارہ آنا کس قدر شدید جذباتی صدمے کا نتیجہ تھا۔

میرے سامنے اس کی بیوی ”اینا“ کی وہ تحریر تھی جس میں منٹا کا وہ دکھ جھلکتا تھا کہ جب ان کا سب سے چھوٹا بیٹا لائیو شافٹ ہوا۔ اسے مرگی کی بیماری اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ دونوں میاں بیوی گوہ گھر جس کے چنے چنے پران کے لاڈلے بیٹے کی یادیں ٹکری ہوئی تھیں کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔

بیٹے کے اس دکھ نے انہیں ایک نئے تجربے سے روشناس کیا۔ جہاں انہوں نے گھر بدلا، وہیں وہ ولادی میر سلوویو کے کہنے پر آئین مناسٹری زیارت کے لئے گئے جہاں ”ایبلڈر“ نے ان کی پریشان اور گرم حالت پر اپنی محبت اور دعاؤں سے نوازا۔ دوستو و سکی کا یہ روحانی تجربہ اور فطی طمانیت اس کے ناول The Brothers Karamazov میں نمایاں ہوئی۔

ناٹ شفٹ میں کام کرنا

امراض کا شکار بننا سکتا ہے

ماہرین نے انکشاف کیا ہے کہ جو لوگ رات میں بھر پور نیند نہیں لیتے ہیں یا ناٹ شفٹ میں کام کرتے ہیں ان میں ڈی این اے کی مرمت کرنے والا قدرتی نظام متاثر ہوتا ہے جو آگے چل کر کئی امراض کی وجہ بن سکتا ہے۔

اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مطالعہ ہے لیکن اس میں دیکھا گیا ہے کہ رات کی شفٹ میں کام کرنے والے افراد کے جسموں سے ایک خاص کیمیکل 8-OH-dG کم خارج ہوتا ہے جو انسانی جسم میں ڈی این اے کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اگر مسلسل یہی عمل جاری رہے تو اس سے موتا پنے، ذیابیطس اور امراض قلب کے علاوہ کینسر کا خطرہ بڑھ سکتا ہے۔ امریکی شہر سائیکس میں فریڈ ہینسن کینسر سینٹر کی پروڈیجی نے یہ تحقیق کی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس تحقیق سے ان امراض کے خطرات کی ایک وجہ سامنے آئی ہے۔ ہمارے جسم میں قدرتی طور پر ڈی این اے کی ٹوٹ پھوٹ جاری رہتی ہے لیکن اس کی مرمت کا قدرتی نظام بھی موجود رہتا ہے اور جیسے ہی ڈی این اے کی مرمت ہوتی ہے تو پیشاب میں 8-OH-dG کی زائد مقدار خارج ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی زائد مقدار کا خارج ہونا ظاہر کرتا ہے کہ شاید ڈی این اے کی درستگی مناسب نہیں ہو رہی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ڈی این اے متاثر ہونے سے کئی امراض لاحق ہو سکتے ہیں جن میں کینسر بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ناٹ شفٹ میں کام کرنے سے ایک جسمانی ہارمون میلانٹون بھی کم ہو جاتا ہے، جو جسم کی اندرونی گھڑی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دیگر ماہرین کا اصرار ہے کہ اس تحقیق کی یہ تشریح کرنا درست نہ ہوگا۔ سائنسدانوں کے مطابق اس تحقیق میں میلانٹون کا کردار واضح نہیں ہو رہا۔ اسی طرح ششوں میں کام کرنے سے ڈی این اے متاثر ہونے کے بھی مزید ثبوت درکار ہوں گے، تاہم پروڈیجی کی ٹیم نے انکشاف کیا کہ تحقیق کے مطابق جب ملازمین رات کی نیند لینے لگے تو... ان میں 8-OH-dG کی شرح واپس بحال ہو جاتی ہے۔

اس تحقیق میں 223 افراد کا جائزہ لیا گیا ہے جو مختلف ششوں میں کام کر رہے تھے۔ ان میں سے دن کی نیند اور رات کی نیند لینے والوں کے جسم میں 8-OH-dG کا جائزہ لیا گیا۔

مرسلہ: شمیمہ خانم، ملتان

چھ کمروں کے اپارٹمنٹ میں بھی وہ ہال تھا جس کا ذکر اینا نے بہت تفصیل سے کیا تھا۔

میں اٹھی۔ سامنے دیوار پر پیئرز برگ کی اٹھارویں صدی کی طبعی صورت کی بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ جب گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ مردوں کے لیے فرائمک نما پہناوے اور عورتوں کی زمین بوس ہوتی فرائمک نما میکیساں، سروں پر اسکارف نمابہ اور کوٹ نمابہ گاؤں تھے۔ سینا اسکوئر میں خرید و فروخت کا ایک منظر زندہ تھا۔ ہال نایاب تصویروں، خوبصورت کچھ پینٹنگز جن میں لندن کا سینٹ پال کیتھیڈرل، کرسٹل پیلس، روم کا پیٹریا اسکوئر اور میلان کے کیتھیڈرل چرچ بہت نمایاں تھے۔

پھر یوں ہوا میں ٹھنک گئی۔ ایک ایسی تصویر میرے سامنے تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

”یہ ہمیں ہولین دی ینگر“ کی ”دی ڈیٹھ آف جیسس“ The death of jesus پر وہ شاہکار اور نایاب پینٹنگ تھی جس میں اس نے جیسس کے پورے وجود پر بکھری موت کی اذیت اور درونا کیوں کو پینٹ کیا تھا۔ جیسس کے جسم کی اذیت کی عکاس ایک ایک ہڈی پہلی، زخمی ہاتھ پاؤں خوفناک کرب و درد سے ستا چہرہ، ہر احساس سے بے نیاز نیم کھلی آنکھیں، ناک ٹھوڑی اور منہ نیلا ہٹوں میں ڈوبا ہوا۔

بہی وہ پینٹنگ تھی جسے دیکھنے کے لیے وہ خصوصی طور پر ہاسل سویٹز لینڈ گیا اور اسی کے بارے میں اس نے کہا تھا۔ ”اس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔ پر ہولین ایک حیرت انگیز آرٹسٹ اور شاعر ہے۔“

انٹرنس ہال میں اس کی چھتیاں، پیٹ اور صندوق دیکھتے ہوئے نرسری میں داخلہ ہوا۔ جب یہ خاندان یہاں شفٹ ہوا، اس وقت لیو بوئی نو سال اور بیٹا فو دو دو سال کا تھا۔

کمرا ایک خوبصورت گڑیا، رانگ ہارس، چند کرسیوں، بچوں کی رائٹنگ ٹیبل اور میز پر رکھے بیڑی کی طرف سے باپ کو لکھے ہوئے لفافے سے سجا ہوا تھا۔

دوستوں کی اپنے بچوں سے کس قدر پیار کرتا تھا اور ان کے بارے میں کتنا فکر مند رہتا تھا اس کا اظہار اس تحریر سے ہوتا ہے جو اینا نے اپنی یادداشتوں میں لکھی۔ اگر وہ اپنے طابع یا کاروباری معاملات کے سلسلے میں ملک سے باہر ہوتا تو ”اینّا“ کو ملنے والے خطوط اس کی اور بچوں کی محبت سے بھر پور ہوتے۔ وہ اپنے بچوں کو کم عمری سے ہی روسی اور یورپی ادب

گئے۔ انہی دنوں اس نے ایک جگہ لکھا۔ ”میری زندگی ٹوٹ کر بکھر گئی ہے۔“

اپنے بھائی کے قرضے اتارنے کے لیے وہ کمیشن پر لکھنے لگا۔ وقت کی ایسی ہی کڑی گھڑیوں میں اسے ایک ایسا ناول لکھنے کی پیشکش ہوئی جس کی مدت تکمیل صرف ایک ماہ تھی۔ معاہدے کی رو سے ناکامی کی صورت میں وہ مستقبل میں اپنے کام کی رانٹلی سے محروم ہو جاتا۔

”تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے اپنے دوست سے مشورہ کیا۔

”ایک اسٹینوگرافر رکھو۔“ دوست نے حل بتایا۔

تب چار اکتوبر 1866ء کی ایک آبرو آلود و پھر کو کتابی چہرے پر بے ستوں ناک اور خوبصورت آنکھوں والی دلکش لڑکی جس کے براؤن فراک کے گلے اور اسٹیو پر لگی دیدہ زیب لیسیں لہرائی تھیں، اس کے گھر میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے داخل ہوئی اور ٹائپ رائٹر پر بیٹھی۔

”The Gambler“ چھپیں دنوں میں مکمل ہو گئی۔

کام کے اختتام پر اسے احساس ہوا کہ وہ اس مہربان اور ہمدرد لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

”میں اس سے کیسے بات کروں؟“ اس کے باریک بھینچے ہوئے ہونٹوں سے تذبذب میں ڈوبا ہوا یہ سوال ابھرا جو دل کی سرگوشی میں اپنے آپ سے تھا۔

دو روز کے جانے سے ڈرتا تھا۔ پھر اس کا عندیہ لینے کے لئے اس نے فرضی ناول کا پلاٹ گھڑا۔ ایک چوالیس (44) سالہ مرد جو مریض بھی ہے کایس (20) سال کی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہوتا اور اپنا سے یہ پوچھتا کہ ذرا سوچو تو کیا امنگوں سے بھری ہوئی اس نوجوان لڑکی کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے مرد کی محبت کا جواب محبت سے دے؟

”کیوں نہیں۔“ اپنا نے نگاہیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر نقشہ بھری لکیریں تھیں۔ ”محبت تو ان سب باتوں سے بالا ہوتی ہے۔“

بس تو جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے۔ وہ بھی کھیل اٹھا اور اپنا آپ کھول کر سامنے رکھ دیا۔

”اپنا میں جانتا ہوں میری عمر کا ایک مرد تم جیسی نوجوان لڑکی کے لئے طبعی موزوں نہیں پر پتا نہیں میرا دل کیوں کہتا ہے کہ تم مجھ جیسے نکھرے ہوئے انسان کو سیٹ لوگی۔ مجھے پیار دو گی کہ تمہیں پیار دینا آتا ہے۔“

پڑھانے کا ممتی تھا۔ گوگول، پلٹن، ڈکنز اور وکٹر ہوگو سے تو بے چھوٹی عمر میں ہی مانوس ہو گئے تھے۔ وہ اکثر بچوں کو پاس بٹھا کر بائبل کو اونچی آواز میں پڑھتا۔ ایک بار بیٹے کی شکایت پر اس نے لکھا۔

”اپنا تم فیودور کے باہر جانے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے پر پریشان ہوتی ہو۔ دیکھو وہ بچپن سے بلوغت میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کی شخصیت کے بارے میں بہت سی گہری باتیں میرے مشاہدے میں آئی ہیں۔ گھبراؤ نہیں شاید تمہیں اس کا احساس نہ ہو کہ میں یہاں اس کے متعلق کتنا فکر مند رہتا ہوں۔ ہمیں ایک طویل مدت تک اس کے ہاتھوں میں کتابیں دے کر اسے پڑھانا ہے۔“

اور یقیناً یہ اسی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ اس کی بیٹی لیو نے بہت سی کتابیں جن میں ”Sick Girl“ ویمین لائر اور ”دوستو وکی اپنی بیٹی کی نظر میں“ بہت مشہور ہوئیں۔

فیودور گھوڑوں میں دلچسپی کے باعث ایک کامیاب ٹرینر اور ماہر ہارس بریڈر بننے کے ساتھ ساتھ شاعر اور تنقید نگار بھی تھا۔

زسری سے ہی میں اپنا کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اپنا جبرجوریتا کا کمرہ اسادگی کا نمونہ تھا۔ کھڑکی کے پاس کونے میں رکھی رائٹنگ ٹیبل، ایک الماری، صوفہ نما کرسی میرا اپنی کہانی خود بیان کر رہی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ روس میں ہر تاریخی محل، میوزیم، پارکوں، شاہراہوں پر جا بجا صوفے آرام دہ کرسیاں اور بیچ رکھے ہوتے ہیں۔ سیاح پیدل چلتے چلتے تھک جائیں تو بیٹھیں، سستانیں، سوچیں، خلقت کو دیکھیں، جو مرضی کریں۔ اسٹیبلوں میں کہیں بیٹھنا تو دور کی بات کسی دیوار کے ساتھ کمر بھر کی ٹیکے بھی ڈھونڈ پائی پر حاضر پولیس والوں کی نگاہ میں فی الفور آ جانی ہے اور وہ کسی شکاری کی طرح حملہ آور ہو جاتا ہے۔

یقیناً میں وہاں بیٹھ کر کچھ دیر کے لیے اس عورت کی قربت کی مہک محسوس کرنا چاہتی تھی جو صرف بیس سال کی عمر میں اپنے سے دو گنی عمر کے شخص کی زندگی میں ایک ایسے وقت داخل ہوئی جب وہ مصائب کے ہاتھوں حد درجہ پریشان تھا۔

دوستو وکی کے لیے 1854ء کا سال بہت پر آشوب تھا۔ اس کی بیوی ماریا بھائی میخائل اور گھر اور دوست نامور محقق اور شاعر اپلون جو اس کے ذاتی اخبار ”دی ٹائم“ اور ”دی آپوچ“ میں اس کا معاون تھا کیے بعد دیگرے اسے تنہا چھوڑ

اور اپنا نے اس کے چہرے کو دیکھا جو اپنی چمکتی بھوری آنکھوں میں آرزوؤں کا ایک جہان سمیٹے اسے دیکھ رہا تھا۔
تب اس نے خود سے کہا کہ اگر وہ نفی میں جواب دیتی ہے تو یہ اس کی خود داری، اس کے پندار اور اس کی عظمت کے لیے لکھا ہوا دھچکا ہوگا۔

”نہیں۔ میں اسے افسردہ اور ملول نہیں دیکھ سکتی۔ یہ انسان مجھے بے حد عزیز ہو چکا ہے۔“

بیاد کا دن پندرہ فروری طے ہوا۔ اور رسم کی ادائیگی کے لئے ٹرنٹی ٹھیٹر ل کا نام تجویز کیا گیا۔

یہ سب تو ہو گیا۔ پر کچھ مصمیر سے مسائل ابھی بھی اس کے سامنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان میں سرفہرست اس کا ویدنگ ڈریس تھا۔

یہ کیا ہو؟ اور اس کی خریداری کہاں سے کی جائے؟ دوستوں کی کے لیے تو پیسے کی فراہمی بھی مسئلہ تھی۔

کچھ دھڑلہ بن لڑکی نے ان بہت سارے سوالوں کو جنہوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا جواب دے کر اس کے نقلات کو تحلیل کر دیا۔

”بھئی آخر میں سلائی کڑھائی کی اتنی ماہر ہوں۔ اپنا عروسی جوڑا خود پڑاؤں میں کروں گی اور اسے خوبصورت ڈیزائن سے خود ہی سجالوں گی۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ رہا کپڑا تو وہ میرے پاس ہے۔“

شادی ہوئی اور مصائب کا آغاز بھی ہو گیا۔ ابھی استقبال و دعوت تھی۔ جب نئی توہنی دہن کو دو لہا سنبھالنا پڑا کہ دوستوں کی نے مصمبین ضرورت سے زیادہ پی لی تھی۔ مرگی جس کا وہ پرانا مریض تھا اسی کا دورہ پڑا تھا۔ ٹھنوں وہ درد سے بے حال رہا اور دہن اسے اپنی ہانہوں میں اور بھی اس کا سراپا بنی گود میں رکھے اسے سنبھالتی رہی۔ پہلے ہی دن سے اسے اپنی ہانہوں میں سمیٹنے اور اس کے دکھ کو بانٹنے کا یہ کام اسے مل گیا تھا جو اسے ساری زندگی کرنا پڑا۔

صحت کا مسئلہ تو ایک طرف۔ اس کے ساتھ معاشی مصائب بھی خون چوسنے والی جوگوں کی طرح چبے ہوئے تھے۔ قرض خواہوں کی خوفناک دھمکیاں، ان کا آتے دن تنگ کرنا، اس کی جائیداد بھینانے کی سازشیں، بیس (20) سالہ لڑکی ان سب کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ذاتی چیزیں بیچیں اور کچھ سالوں کے لیے شوہر کو ان کے چنگل سے نکال کر باہر لے آئی۔

بیرون ملک یہ زندگی مشکلات اور مصائب سے بھری

بلوچ، پٹھان اور اوبتہ لکھن

دو بڑی قومیں، پٹھان اور بلوچ، پنجاب کے

تمام مغربی علاقہ پر محیط ہیں۔ کوہ سلیمان کے مغربی رخ

سے لے کر ڈیرہ غازی خان کے سامنے تقریباً کوئٹہ

کے مغرب تک پھیلنے والے خطہ کے جنوب میں بلوچ اور

شمال میں پٹھان نسل آباد ہے لیکن سندھ پارک وادی

میں اور کوہ سلیمان کے پنجاب والے رخ پر بلوچ شمال

کی طرف اس سے بھی آگے تک ہیں اور ڈیرہ

اسامیل خان تحصیل کی جنوبی حد مشترکہ حد کی بہم

نشانہ دی کرتی ہے۔ جب کہ دریا کے اس طرف پھر

بلوچی دوسری طرف کی نسبت کچھ اور آگے تک پھیلے

ہوئے ہیں۔ ان کی مشترکہ حد پر دریا کے دونوں

کناروں کے ساتھ مخلوط راجتوں کا حامل قبیلہ سمیٹھران

آباد ہے، جو ڈیرہ غازی خان میں بلوچ، ڈیرہ

اسامیل خان میں پٹھان اور غالباً دونوں ہی میں جٹ

ماخذ سے ہے جب کہ تھل میں انتہائی جنوبی پٹھان قبیلہ

بلوچ (مل + اوج) ممکن طور پر بلوچ نسل ہے۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں از: سر ڈیوڈ ایلسن

مترجم: ندیم احسن صدیقی۔ لاہور

ہوئی تھی۔ بچے کی تنگی، مشرقی یورپ میں خانہ بدوشوں جیسی زندگی، بسا اوقات کمرے کا کرایہ ادا نہ کر سکنے پر لینڈ لارڈ کی صلواتیں، دوستوں کی خراب محبت، اکثر اس کا جوا کھیلنا اور سب کچھ ہار جانا۔

ان کے پہلے بچے صوفی کی سونیئر لینڈ میں پیدائش اور تین ماہ بعد اس کا مر جانا۔ سب وہ کڑی آزمائشیں تھیں جنہیں اگر اپنا نے جوصلے اور محبت کے بل پر سہا تو وہیں اس نے Idiot حقیقت کی۔

مہر النساء کوئی دو بار سارے کمروں کا چکر لگا آئی تھی۔ اور میں ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جب اس نے کہا۔

”سارا دن یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے کیا؟“

میں چپ چاپ تھی۔ اس وقت میرے سارے جذبے اس عورت کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے جس نے بقیہ زندگی کرائے کے گھروں میں گزاری۔ جس نے کسی مہربان اور مشفق ماں کی طرح اس پر اپنی حسرتوں کی بارش کی۔ جس نے اس کے مرنے کے بعد اپنے بقیہ سارے سال اس کے ادھورے کاموں کو مکمل کرنے اور اپنی یادداشتوں کو مرتب

کرنے میں گزار دیئے۔
میں خاموشی سے اٹھ کر لمحہ ڈانٹنگ روم میں آگئی۔
ڈانٹنگ روم کی سجاوٹ پینڈز برگ کے روایتی گھروں جیسی
تھی۔ دوستو و سکی کے خاندان کا انداز زندگی سادگی سے بھرپور
تھا۔ میز پر کپ سجے تھے۔ کونے میں دھری چھوٹی میز پر پیتل کا
وہ سادہ اور چائے دانیاں تھیں جس کا ذکر اپنا کی یادداشتوں
میں ملتا ہے۔ الماری چینی کے تھیں برتنوں سے لگی تھی۔
خاندان رات کے کھانے پر ضرور اکٹھا ہوتا۔ اکثر عزیز
دوست اور رشتہ دار بھی شامل ہوتے۔ اپنا کو اپنے شوہر کا گھر
واہی پر رات کے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ لا بہت پسند تھا۔
پراسے آئے دن دوستو و سکی کا بچوں کو ٹریٹ دے دے کر
خراب کرنے پر بھی لگ رہا تھا۔

اسٹڈی روم میں کچھ وقت گزارنے کی ضرورت تھی اور
وہ میں نے گزارا۔ کمرے کی کھڑکیاں باہر
Kuznechny Lane پر کھلتی تھیں۔ ولادی میر چہرچ
بھی سامنے تھا جہاں دوستو و سکی اپنے آخری ایام میں عبادت
کے لئے جایا کرتا۔

بہی وہ کرا تھا اور میرے سامنے ہشت پہلو میز پر دھرا
وہ کلاک تھا جس کی سویاں 28 جنوری 1881ء بروز بدھ کی
شام آٹھ بج کر 36 منٹ پر اس کمرے کے کین کے ساتھ ہی
ساکت ہو گئی تھیں۔

کمر اسادگی کی تصویر تھا۔ عین وسط میں رائٹنگ ٹیبل اور
دیوار کے ساتھ صوفہ تھا۔ مائع زدہ فریم میں اس کی تصویر کے
عین نیچے لیٹر تھا۔ تین خانے والے ریک کے پر حصے میں
کتابیں تھیں۔ الماری میں بھی کتابیں جچی ہوئی تھیں۔ اس
سادہ سے کمرے میں اسی میز پر اس نے اپنا آخری شاہکار
ناول The Brothers Karamazov تخلیق
کیا۔

پیدائش تو اس کی ماسکو کی تھی۔ 11 نومبر
1821ء۔ بچپن ہی سے اسے قلم اور کاغذ سے دلچسپی تھی۔
سوچنے کا شوق تھا۔ ماں کے مرنے پر اس کے باپ نے جبراً
اسے ملٹری انجینئرنگ اکیڈمی پینڈز برگ بھیج دیا اور گویا اس کی
قسمت پینڈز برگ سے وابستہ ہو گئی۔ فوج میں اپنی نوکری سے
بالا خرابیک دن اس نے یہ کہتے ہوئے استعفیٰ دے دیا کہ میں
اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ رشتہ داروں کے اعتراضات
پر اس کا جواب تھا۔ ”میں اپنے بارے میں پُر امید ہوں۔
انسان ایک سربستہ راز ہے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنی
چاہیے۔“

آغاز کا کچھ وقت اس نے فرانسیسی لکھاریوں کے
ترجموں میں صرف کیا۔ یورپ اور روس کے رائٹرز کو پڑھا۔
پڑھنے سے اس نے ہمیشہ ایک روحانی آسودگی محسوس کی۔
ابتداء میں اس کے محبوب ڈانس، گولگول، شلر اور پشکن تھے۔

چائے اور اس کا اہتمام دوستو و سکی کی زندگی میں بہت
اہم تھا۔ چمکتے پیتل کے سادہ کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے
میرے سامنے اپنا کی تحریر تھی۔ ”ابھی چائے اس کی کمزوری
تھی۔ سونے سے قبل میں سادہ کو ڈانٹنگ روم میں ضرور چپک
کرتی۔ چائے بنانے کا اہتمام خصوصی ہوتا۔ سب سے پہلے وہ
اچھے پانی سے لکٹی کو کھنگال، اس کا چمچ مخصوص تھا جسے بچے پایا
کا چمچ کہتے تھے۔“

میری نظروں کے عین سامنے وہ چمچ اور چائے دانی
تھی۔ میں اسے ہاتھ لگا کر چھو نہیں سکتی تھی کہ آگے حد بندی
تھی۔ وہ تین بچے چائے ڈالتا اور چائے دانی کا 1/3 حصہ پانی
سے بھر کر اسے نیپکین سے ڈھانپ دیتا۔ پورے تین منٹ بعد
وہ چائے دانی کے بقیہ کو کھولتے پانی سے بھرتا اور پھر اسے
کپڑے سے ڈھانپتا۔

اس کی بیٹی Liubov کا کہنا تھا کہ پاپا ہمیشہ چائے
کے رنگ کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔

”ہائے“ میں نے سرشاری کے سرور آگئیں احساس
کے زیر اثر خود سے کہا۔

چلو اور کچھ نہ سہی پر یہ قدر تو مشترک ٹھہری کہ زندگی میں
اچھی چائے کے سوا کوئی دوسرا شوق نہیں رہا۔ چائے کا رنگ
کمزوری اور چائے بنانے اور پینے کا اہتمام خوشی۔

گلاس ہاتھ میں تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں آتا اور لکھنے
میں مجھو جاتا۔ چائے میں چینی کی ہمیشہ دو کوبز ہی استعمال
ہوئیں۔ چائے سے اس کی یہ محبت اس کے ناولوں کے
اکثر کرداروں میں جھلکتی۔ ”The Devils“ کے کردار
اسے زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

پر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ حقیقت بذات خود بڑی خوبصورت شاندار اور حیرت انگیز ہے۔ آغاز کا لکھا ہوا سارا کام اس نے ضائع کر دیا اور نئے اعتماد اور چیلنج کے ساتھ Poor Folk میں ظاہر ہوا۔ اس کا پیر و کوئی رومانوی کردار نہیں تھا بلکہ معاشرے کا تسم رسیدہ غیر اہم شخص ایک کلرک تھا۔ انسان کے اندر کی سچائی کی تلاش کو اس نے اپنی تحریر کا منہجا ٹھہرایا۔

اور یہ بھی وہ دن تھے جب اس کا تعارف میخائل پٹیراشو شکائے سے ہوا جو روس کے بہتر مستقبل کے لیے درد رکھنے، انقلاب فرانس اور سوشلسٹ نظریات سے محبت کرنے والے نوجوانوں کو اپنے گھر بلاتا اور روسی معاشرے اور اس کے موجودہ حالات پر لمبی چوڑی بحثیں کرواتا۔

1848ء میں یورپ میں انقلابی تحریک چلی تو نکولس اول نے خوف زدہ ہو کر روسی وزارت داخلہ کو ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں رپورٹ کے لیے کہا جو روس میں سرگرم عمل تھیں۔ اور نتیجتاً دوستوئسکی سمیت میٹنگ کے تمام افراد 23 اپریل 1849 کو گرفتار ہوئے۔ چند ماہ پٹیراشینڈ پال قلعے میں گزارنے اور تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ آنے پر سائبیریا کے شہر ادسک کی سینٹرل جیل میں منتقل ہوئی۔

آٹھ ماہ بعد نکولس اول کا انہیں عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ مظہر عام پر آ گیا۔

یہ پائیس دسمبر 1849 کی سرد ترین صبح تھی۔ سمیو اسکائے اسکوار میں ایک بڑے شو کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا اسکرپٹ زار نے خود لکھا اور خود ترتیب دیا تھا۔

اسکوائر کے ڈھلانی چھتوں والی عمارتیں برف باری سے سفید ہوئی پڑی تھیں۔ لوگوں کا ایک جم غفیر میدان میں موجود تھا۔ فوج اور پولیس کے دستے مستعد کھڑے تھے۔ پادری موجود اور جلا دھاضر۔ نکولس اول بہ نفس نفیس یہاں تھا۔ اس شو کو ایک عبرت انگیز مثال بنانے کے لیے ریاستی فنڈز بھی بے دریغ استعمال ہوئے تھے۔

مجمروں کی لمبی قطار موت کے انتظار میں کھڑی تھی۔ کیسا دل دہلانے والا نظارہ تھا۔ پلیٹ فارم سے کوئی بیس قدم پرے تین پوشیں بنائی گئیں۔ پہلے تین مجرموں کو پوسٹ پر لا کر گاؤں پہنائے جاتے جن کے ساتھ لیے لیے بڈ ہوتے جوان کی آنکھوں کو ڈھانپ لیتے۔ پادری ”کراس“ کے ساتھ ہر ایک کے پاس جاتا۔ بازوؤں سے تمام کرلمزموں کو پلیٹ فارم پر لایا جاتا۔ فروجرم اوچی آواز میں پڑھی جاتی۔ ڈورم بچتا

کیلغورنیا ایسٹی ٹیٹ آف ٹیکنالوجی (کیلپلیک) میں ایرانی نژاد سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے دنیا کا سب سے پتلا کیرا ایجاد کر لیا ہے جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی عدرہ موجود ہی نہیں جبکہ عدرہ ہی کیرے کی روح ہے۔ بغیر عدرے کے کیرا کام ہی نہیں کر سکتا۔ آپٹیکل سوسائٹی آف امریکا ٹیکنیکل ڈائجسٹ (اولس ای ٹیکنیکل ڈائجسٹ) میں شائع تحقیق کے مطابق اس ڈیجیٹل کیرے کو عدرے کی ضرورت سے آزاد کرنے کے لیے انتہائی باریک ”آپٹیکل فیئرڈ ایرے“ (او پی اے) پر مشتمل ٹیکنالوجی وضع کی گئی ہے جس کا نفاذ سائبرکٹ بہت کم جگہ استعمال کرتے ہوئے عین وہی کام کرتا ہے جو دوسرے کیروں میں عدرے کے ذمے ہوتا ہے یعنی روشنی کو حسب ضرورت کی خاص مقام پر اور کسی خاص انداز سے مرکوز کرتا، تاکہ عکس حاصل کیا جاسکے۔ اسے کیلیپلیک کے تحقیقی انجینئرز رضا فاطمی اور بہر وزیر پزنی نے پروفیسر ملی حاجی میری کی نگرانی میں مشرقی طور پر ایجاد کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کیرے کا فوکس (ارکار) قریب سے دور کی چیز تک ایک سینکڑے صرف ارب وں حصے یعنی محض ایک ٹریلو سینکڑ میں منتقل کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک ایسی صلاحیت ہے جو اس وقت دنیا کے کسی دوسرے کیرے میں اتنی تیز رفتاری کے ساتھ وجود نہیں رکھتی۔ پروفیسر حاجی میری کہتے ہیں عدرے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے اس کیرے کو اتنا زیادہ مختصر کیا جاسکتا ہے کہ جتنا اختصار کسی اور قسم کے کیرے کے لیے فی الحال ممکن ہی نہیں۔ علاوہ ازیں جب یہ ٹیکنالوجی پختہ ہو کر تجارتی پیمانے پر پہنچ جائے گی تو امید ہے کہ یہ کیرے بہت ہی کم خرچ پر تیار کیے جاسکیں گے۔ طبی شعبے سے لے کر عسکری میدان تک او پی اے ٹیکنالوجی والے کیرے کے لیے اطلاق کی ایک وسیع دنیا موجود ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جس طرح 1980 کے عشرے میں سی سی ڈی (چارج کپلڈ ڈیوس) کی ایجاد نے آج کے جدید ترین ڈیجیٹل کیروں کی بنیاد رکھی تھی اسی طرح آنے والے برسوں میں عدرے کی ضرورت سے آزاد او پی اے کیرا ٹیکنالوجی بھی ڈیجیٹل عکس نگاری کو ایک نئے انقلاب سے ہم کنار کرے گی۔ ایک مسلمان سائنس دان کی اس ایجاد نے ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔

مرسلہ: دویم بن اشرف۔ مامان

اور ”موت فائرنگ اسکوڈ کے ساتھ۔“ الفاظ گونجنے اور زندگی بل جھپٹنے میں موت کے ہاتھوں میں جھول جاتی۔

اگلا جرم نئی فرد جرم کے ساتھ ملایا جاتا۔
دو موتوں کے درمیان بیس منٹ کا وقفہ اور تیاری کے بعد پانچ منٹ کا۔ اس پانچ منٹ کے جس تجربے سے دوستوں کی زراہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش تھا۔

سمیو و سکائے اسکوڈز کے چرچ کی سنہری چھت اور گنبد، لوگ، دھوپ، چمکتا سورج، ہوائیں، آسمان اور میدان میں موت کے سچے بازار سے پھوٹی نہیں آس اور امید کی کوئی موہم سی کرن۔ ٹکس اول موت سے خاصا محفوظ ہو چکا تھا۔ بقیہ کے لیے قید یا مشقت کا حکم دیتا اٹھ گیا تھا۔

”ایڈیٹ میں پرنس ماسکن کی زبان سے اس نے اپنے اسی تجربے کو دہرایا ہے۔ زندگی ہمارے اندر ہے۔ باہر نہیں۔“
اوسک جیل میں چار سالہ مشقت بھری قید نے اسے اتنی تکلیف نہیں دی جتنی قلم کا غذا اس کے ہاتھ سے جھننے پر ہوئی۔ اسے اسی کا ڈر تھا اور یہی اس نے کہا۔ ”اگر مجھے لگھنے نہ دیا گیا تو میں مرجاؤں گا۔ کاغذ اور قلم کے ساتھ میں پندرہ برس کی سزا کبھی بخوشی کاٹنے کے لئے تیار ہوں۔“

بیسروں میں یہ چار سال چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ گزارے۔ ان کرداروں میں جو گہرائی، توانائی اور خوبصورتی اس نے دیکھی وہ کہنے پر مجبور ہوا۔ ”یہ تو بد صورت سپیوں میں بند وہ سونا ہے جن کی دریافت میں نہ مجھے اپنے برسوں کے ضائع ہونے اور نہ کاغذ قلم نہ ہونے کا دکھ ہے۔ میں نے ان حیرت انگیز لوگوں کو تفصیل اور سچائی سے پڑھنے اور ان کے کرداروں کی بے شمار جہتوں کو پرکھنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ میرے لیے بہت بڑا اثاثہ ہے۔ میں نے روس کو نہیں پروردی لوگوں کو ضرور جانا اور سمجھا ہے۔ Crime and Punishment اس کے بعد لکھی گئی۔“

اور اگلے چھ سال اس نے سائبیریا کے قصبے میں ڈرل اور مارچنگ کرتے ہوئے گزارے، پر یہاں اسے لکھنے پڑھنے کی آزادی تھی۔ اپنے ہر خط میں وہ اپنے بھائی کو اپنی پسندیدہ کتابوں اور رسالوں کے نام بھیجتا۔

اور سائبیریا میں اس نے

”The اور ”My Uncle's Dream“
”Village of Stepanchikovo“ لکھیں۔
ٹکس اول کی موت نے ملکی حالات کو تہدیل کر دیا اور وہ اپنے پیڑز بزرگ کے دوستوں کی کوششوں کے نتیجے میں رہا

ہو گیا۔ مئی 1854ء میں اس نے ماریا سے شادی کی جو بیوہ تھی۔ اپنے بھائی کو ماریا کے بارے میں بتاتے ہوئے اس نے لکھا تھا۔ ”وہ صرف اٹھائیس سال کی ہے۔ چھ سال کا بیٹا بھی اس کے پاس ہے۔ وہ ایک ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت ہے۔ اور میں نے اسے مستقبل میں تحفظ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

زندگی کے آخری برسوں میں اس کے پڑھنے والوں کے سامنے اس کا ایک اور رخ آیا تھا۔ ہمارے اشفاق احمد صاحب کی طرح اس کا رجحان بھی روحانیت کی طرف ہو گیا تھا۔ لوگوں کے مسائل سننا، اپنی مشکلات سے بھرے ہوئے ان کے خط پڑھنا، ممکنہ حد تک ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور ان میں آسانیاں بانٹنے کی کوشش کرنا اس کا مطمح نظر ہو گیا تھا۔

اور پھر وہ دن آیا جب اس نے کہا۔ ”آج مجھے مرجانا ہے۔“

طبیعت تو دو تین دنوں سے خراب تھی۔ پھیپھڑوں کی بیماری تو بہت پرانی تھی۔ اینا نے ڈاکٹروں کو بلایا۔ ولادی میر چرچ کے بادی بھی آئے۔

اٹھائیس 28 جنوری کی صبح اس نے کہا۔ ”اینا آج مجھے دنیا سے چلے جانا ہے۔ تم انجیل لاؤ۔“

اور اینا اسی انجیل کی کاپی لے کر آئی جو سائبیریا جاتے ہوئے راستے میں اسے فونوینازا Fonvizina نے دی تھی 14 دسمبر کو زاروں کے خلاف انسانی حقوق کی ناکام بغاوت کے بافیوں میں سے ایک کی بیوی تھی۔ جو دسمبر کی کہلائے تھے۔

اس نے ہمیشہ اسے سنبھال کر رکھا اور جب بھی وہ پریشان یا کسی مشکل میں ہوا اس نے ہمیشہ اسے کھولا اور پڑھا ”پس جیسو نے اسے کہا۔ اب ایسا ہونے دو۔“

اور اس نے آنکھیں کھول کر ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اینا تم سستی ہو۔ Let it be so now“

”تم سمجھتی ہو میں مر رہا ہوں۔“
اس نے آنکھیں موند لیں۔

گھڑی کی سوئیاں ساکت کر دی گئی تھیں۔ یہ اٹھائیس جنوری 1881ء تھا اور وقت آٹھ بج کر چھتیس منٹ کا تھا۔ جب ایک عظیم لکھنے والا دنیا سے رخصت ہوا تھا۔



دیوار گریہ

خالد قیوم

وہ دیوار دو ملکوں کے بیچ میں کھڑی تھی۔ اس دیوار کی وجہ سے بہت سے خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایسے خاندان کے تمام لوگ صرف ایک ہی دعا کرتے تھے کہ یہ دیوار گزر جائے۔ وہ بھی یہی دعا کرتا تھا لیکن جب وہ دیوار گری تو وہ دنیا سے جا چکا تھا۔

دلوں کے بچ کھڑی ایک دیوار کا تذکرہ

مال بردار بحری جہاز کے عرشے کے غلیظ اور پگھلے فرش پر تیل سے لٹھرے ہوئے موٹے رسوں کے بڑے سے بڑے ہنڈل پر میں اور برائن بیٹھے تھے۔ گو کہ اس وقت ہم تھکے ماندے اور ساری دنیا سے بدظن تھے مگر حیرت سے ستاروں بھرے آسمان کو دیکھے جاتے تھے۔ ایک دوسرے سے منہ موڑے ہوئے کہ یوں مشقت کا احساس بڑھتا نہیں۔ ہم اپنے اپنے سگریٹ بے دریغ پھونک رہے تھے۔ اس وقت یہ واحد عیاشی تھی۔ کڑوے کپلے دھوئیں کی عیاشی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ پیر بہت سے امراض کی نشاندہی کر سکتے ہیں جن میں جان لیوا مرض بھی شامل ہو سکتا ہے۔ ایک پیر میں 33 جوڑ، 100 کے قریب پٹھے، عضلات اور لاتعداد خون کی رگیں اور شریانیں ہوتی ہیں جو دل، دماغ، حرام مغز اور بڑھ کی ہڈی سے جڑی ہوتی ہیں۔

پیر میں ایٹھن اور تکلیف: پیر میں تکلیف اور تباؤ کی وجہ جسم میں پانی کی کمی بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پیروں تک آکسیجن نہیں پہنچ رہی ہے۔ اسی طرح پیروں میں تکلیف بعض دواؤں کے سائڈ انیٹس کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس کا حل ہے کہ پانی زیادہ پیا جائے، آرام دہ جوتا پہنا جائے اور باقاعدہ ورزش کی جائے تاکہ دوران خون بہتر رہے۔ اگر ہڈیوں میں تکلیف ہے تو یہ یورک ایسڈ کی زیادتی کی طرف ایک اشارہ ہے جس کا ایک حل تو ڈاکٹر کو دکھانا ہے اور احتیاط یہ ہے کہ سرخ گوشت ترک کر دیا جائے۔

پیروں کا غیر معمولی ٹھنڈا ہونا: پاؤں اگر مسلسل سرد رہتے ہوں تو یہ کئی کیفیات کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو ذیابیطس، خون کی کمی اور دوران خون کی کمزوری کو ظاہر کرتے ہیں۔

پیروں میں موجزن: پیروں میں اگر مسلسل سوجن ہو تو یہ کئی پیچیدہ امراض کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ خون کی کمی، کمزور دل، جگر اور گردوں کے امراض سے بھی پیروں پر سوجن آ سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈی وی کی یا بڑی رگ میں خون کے کوٹھڑے بننے یا دوران خون متاثر ہونے سے بھی یہ مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ علاج کے دوران ورزش کریں، نمک کا کم

”ہوسکتا ہے۔“

”تمہیں مانتا ہی بڑے گا خالد!“

”مان لیا..... تو پھر؟“ میں بحث کے موڈ میں نہیں تھا

اور ویسے بھی وہ ایک کھرا انسان تھا۔

”تمہیں یہ تو بتایا چکا ہوں کہ میں ایک غریب گھرانے

کا فرد ہوں۔“

”ہاں کئی بار بتا چکے! جو کچھ بھی کہتا ہے بلا توقف کہو

برائے، تجسس مت پیدا کرو۔“

”اس سناٹے اور چاندنی کی قسم، شہر کے مضافات میں

ہمارا چھوٹا سا گھر موسم سرما کی بے پناہ برف باری میں تقریباً

کھوسا جاتا تھا۔ اس سنگین موسم میں موت کے بھیانک سائے

ہمارے ارد گرد منڈلانے لگتے تو خوراک کے ایک معمولی سے

ڈزے کی توقیر اور قیمت کئی گنا بڑھ جاتی تھی۔ تمہیں اندازہ

نہیں موت کے مقابل چند بھوکے نادار اور ناتواں انسانوں کی

بقا کے لیے جدوجہد کا۔ ایک دفعہ ایسے ہی موسم میں ہمارے

پاس خوراک بہت کم رہ گئی۔ بہت ہی کم۔ ماں میرے لیے

دودھ کا ایک گلاس لائی اور نہایت لمبائیت سے کہ جس کا شیشہ

ہے مجھے تاکید کی کہ میں پی لوں، لیکن مجھے شک گزرا کہ ماں

اکتوبر کی خشکی شب کے اولین پہر کی چاندنی اور پھر اہوا

سمندر۔ جہاز سوئے منزل دواں دواں تھا اور منزل بھی گونے

مالا جو کہ دودن کی مسافت پر واقع تھی۔ یاد بخیر کی بیزار کنجی

سے جسم چپچپے ہو رہے تھے۔ میرے سر کے بال تیل اور ہاتھ

انجن کی صفائی کی بدولت جلی ہوئی گر لیں سے آلودہ تھے جبکہ

جوتوں میں پسینے اور نمی سے بھیگی ہوئی بدبو دار جراثیں تھیں۔ کئی

دن سے شیونے بنانے کی وجہ سے داڑھی کے بال کھر دے

بے ہنگم اور سپرے کے کانٹوں کی طرح کھڑے تھے۔

دفعاً برائے نے بولنا شروع کیا تو یاد جو داس کے کہ وہ

مجھ سے منہ پھیرے ہوئے تھا مگر اس کی آنکھوں میں جو ایک

داغ کی اداسی اور ہر لفظ کے ساتھ جو نمایاں سی سسکی نما آواز منہ

سے خارج ہوتی، مجھے بخوبی محسوس ہوتی تھی۔ میں دل گرفتگی

کے احساس سمیت ہمتن گوش تھا۔

برائے نے کہا۔ ”میں ثابت کر سکتا ہوں۔“

”کیا؟“ میں نے چاند کے روشن پن کو بغور دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”یہی کہ دنیا میں سب کچھ برائی نہیں ہوتا۔ کچھ خوبیاں

بھی ہوتی ہیں۔“

استعمال اور وزن گھٹانے کی کوشش کریں۔

پاؤں کے چچرنا ناخن: اس مرض میں پاؤں کے ناخن ابھرے ہونے کی بجائے جھپے کی طرح ہوتے ہیں اور یہ غذائی کمی، خون میں فولاد کی کمی یا اندرونی جریان کی علامات ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیر کے انگوٹھے کا چچرنا شکل کا ہونا جینیاتی امراض اور خون میں کمی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

انگوٹھے کے زرد ناخن: عموماً نیل پالش لگانے والی خاتون کے پیر کے ناخن پیلے ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ دیگر امراض کی علامت بھی ہو سکتے ہیں۔ جگر کی خرابی، بی لی اور تھائی رائیڈ غدود میں گڑبڑ کی وجہ سے بھی ناخن پیلے ہو سکتے ہیں۔

پاؤں میں سویاں چھینا: پاؤں میں سرسراہٹ اور سویاں چھینتی محسوس ہوں تو یہ اعصابی نظام میں خرابی کو ظاہر کرتی ہیں۔ ایپائٹس کے مرض میں اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور سویاں چھینتی محسوس ہوتی ہیں۔

پیروں کے جوڑ میں اینٹھن اور تکلیف: پیروں کی انگلیوں کے جوڑ میں اگر تکلیف اور مستقل اینٹھن ہو تو یہ گھٹیا کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ گھٹیا میں جوڑوں کا اسٹر (لائنگ) سوچ جاتی ہیں اور ٹشو متاثر ہونے لگتے ہیں۔ اس میں ضروری ہے کہ مریض کو متاثر مقام پر پرف سے گھور کیا جائے اور ادویہ دی جائیں لیکن یہ سب ڈاکٹروں کے مشورے کے بعد ہی ممکن ہے۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان

نے خود کچھ بھی نہیں کھایا۔۔۔۔۔ تو میں نے پوچھ لیا اپنی ماں ہے؟
”بولتے رہو برائے۔۔۔۔۔ رکومت!“ آہ جیسے لفظ میرے لبوں سے نکلے۔

”پوچھا اس لیے کہ مجھے گھر میں موجود خوراک کی مقدار کا خوب اندازہ تھا۔“ برائے نے بات جاری رکھی۔ ”دراصل خالد، وقت جب کڑا ہوا تو آگہی کا کرب کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے اور یہ جو مانیں ہوتی ہیں اپنی اولاد سے کبھی کبھی پورا بچ نہیں کہتیں۔ اس وقت ماں کے چہرے پر غصہ کا سکون تھا۔ بدلتا ایثار اور اپنی بھوک پر ضبط کا سکون۔ ماں نے پونہی اشیائے میں سر ہلا دیا اور کہا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے اور پھر میری تسلی کو بھرے پیٹ کی ایک ڈکار کی آواز بھی نکالی لیکن ماں جھوٹ بول رہی تھی۔ دنیا کا سب سے سچا جھوٹ، بتاؤ اگر میں اصرار کرتا تو کیا ماں وہ دودھ پی لیتی؟“

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔“ میری آواز زندہ گئی۔

”پھر وہ ماں تو نہ ہوئی۔“ برائے کی آواز جذبے کی شدت سے تھر تھرا گئی۔ ”ایسی ہی ہوا کرتی ہیں ماںیں۔ مہربان دم دل اور وفا پیشہ۔ اس دن ماں کے اس ایثار میں گندھے

نے سچے جھوٹ نے مجھے ایک سبق دیا کہ ہمیشہ اپنی ضرورت

”تجہیں ماں یاد آتی ہے برائے؟“ کتنا فضول سا سوال تھا میرا۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔

”ہاں..... بہت زیادہ۔“ اس نے تڑپ کر جواب دیا۔
”میری عزیز ماں جو ساری دنیا میں صرف میری واپسی کے دن گن رہی ہوگی۔“

اور یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ برائن رور ہاتھا اور میں نہ دیکھنے کے باوجود دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی نہ تھی البتہ وہ چمکی تھی جو بہادروں کی سوتلی ہوئی کناروں میں ہوتی ہے۔

”میں وہ دن کبھی نہیں بھلا سکتا!“

”کون سے دن؟“ میں نے قریب الحتم سگریٹ کو اپنے جوتے کی ایڑی سے تلے گڑتے ہوئے پوچھا۔

”جب ماں ہمیں ہر ہفتے کی شام ایک تھکا دینے والے سفر کے بعد دیوار برلن کے پاس لے جاتی۔ ایک بلند چوڑے پر چڑھ کر وہ دیوار کی مغربی جانب نگاہیں جمادیتی۔ میں اور میری چھوٹی بہن اسٹھر دونوں ماں کی بے کراں محویت کے احترام میں سانس بھی اتر اتر احتیاط سے لیتے کہ ہمیں اس کی توجہ نہ ٹوٹ جائے۔ کیسوی کی اس عالم میں وقت ٹھہر سا جاتا اور جب بہت دیر بعد ماں اپنی نظر سیٹ کر ہمیں دیکھتی تو ہم چمک کر اس کے سامون دامن سے چٹ جایا کرتے۔ ماں کی مشفق ہاتھ کی لرزیدہ انگلیاں ہمارے سنورے ہوئے بالوں کو سہلانے لگتیں اور ہم اس ہستی کو دیکھتے جس کی آنکھوں میں دنیا کا سب سے قیمتی پانی چھلک رہا ہوتا۔ وہ بہت دھیرج سے ٹھوس اور مستحکم لہجے میں کہتی جاتی۔ آخر کب تک؟ کبھی تو جبر کی اس علامت کو گرنا ہوگا۔“

”کیوں کہتی تھیں وہ یہ سب برائن؟“ میں تجسس کے زیر اثر پوچھ بیٹھا۔

”اس لیے کہ.....“ برائن ذرا سا رکا اور پھر بولا۔ ”میرے باپ کی قبر دیوار کی مشرقی طرف ہے۔“

”اوہ..... اسفوس..... تو پھر؟“

”ماں بہت سے پھول اپنے لرزتے ہاتھوں سے دیوار کی دوسری سمت اچھا ل دیتی اور ہم بو جھل قدم اور خالی پیٹ لیے واپس گھر لوٹ جاتے۔“

خاموشی کا وہ وقفہ نہایت جان توڑ تھا۔
”برائن!“ میں نے ہمدردانہ جذبے کے تحت اسے پکارا۔

”کیا ہے؟“

”کیا ماں اب بھی جاتی ہوں گی؟ اس چوڑے تک جو دیوار کے ادھر ہے اور پھول اب بھی گرتے ہوں گے اس قبر

پر جو دیوار کے ادھر ہے؟ دو سال۔، گھر ذرا نہیں گئے تم کیوں؟ اور تمہاری چھوٹی بہن، کیا نام ہے۔ ہاں..... اسٹھر..... وہ کہاں ہے؟“ اتنے بہت سارے سوال پوچھے تو برائن تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے پانچ سالہ رفاقت میں اسے پہلی بار روتے ہوئے دیکھا۔ میں بھی اٹھا اور اس کے بچے آسو پوچھتا چاہے لیکن کمال نری سے اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ خاموش تھا اور اس کی آنکھوں میں ہنوز بہت سے آنسو تھے۔

”ہوسکتا ہے وہ دیوار اب تک گر چکی ہو۔ معلوم تو کرو۔“

”نہیں.....“

”کیوں برائن؟“

”زیادہ سوال مت پوچھو؟“ اس نے پلٹ کر عرشے پر پڑے موٹے تیل زدہ رسوں کے بنڈل کو ناراضی سے ٹھوکر مار دی اور ادھ چلے سگریٹ کو سمندر کی طرف اچھا ل دیا۔ تیز ہوا کی وجہ سے نمی بھی چنگاریاں ہی اڑیں جیسے جگنوؤں کا دست بکھر جائے۔ پھر یوں ہوا کہ تین سال کوئی سوال پوچھے بغیر گزر گئے۔ برائن کی یاد بھی بکھار ہی آتی تھی مگر جب بھی آتی تو پیٹ میں ایسی آٹھن محسوس ہوتی جو بے رحم برفانی موسم میں بھوک سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

شام کا وقت تھا۔ میں لان میں بیٹھا اخبار کی بچی کھچی خبریں پڑھ رہا تھا کہ نظر اچانک ایک شہرخی پر ٹھہر گئی۔ ”دیوار برلن گرا دی گئی۔“

میں دیوانہ وار اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف لپکا تا کہ برائن کو مبارک باد کا ایک زبردست سا خط لکھوں۔ خط تو لکھ ڈالا مگر اگلی صبح تک مجھے یاد ہی نہ رہا کہ اسے سپرد ڈاک بھی کرنا ہے۔ مصروفیات کچھ ایسی آڑے آئیں کہ خط کی طرف دوبارہ خیال ہی نہ گیا۔

کوئی ہفتہ بھر بعد دفتر سے تھکا ہارا شام کو گھر پہنچا تو ماں نے پانی کے گلاس کے ساتھ ایک زرد رنگ کا لفافہ بھی تھما دیا۔ یہ عجالت تمام لفافہ چاک کیا مگر وہ خط کیا بلکہ ایک درد ناک اطلاع تھی۔ ”پیارے خالدا!“

دیوار برلن تو آخر کار گر گئی لیکن میری عزیز ماں کی موت کے بعد۔

تمہارا۔

برائن (جرمنی)

نہ قصہ کہانی

افتخار مجاز

کہتے ہیں کہ سات سمندر ہیں، سات ہی آسمان ہیں، سات کو لکی نمبر کہا جاتا ہے۔ پاکستان بھی سات حروف سے لکھا جاتا ہے یعنی کہ یہ صرف ایک ملک نہیں برصغیر کے مسلمانوں کو شب قدر میں دیا گیا باری تعالیٰ کا تحفہ ہے لیکن ہم اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں۔

پاگل خانے میں متعبد ایک شخص کا دکھ بھرا پیغام

قیام پاکستان کا مقصد محض ایک الگ تھلک خطہ ارض کا حصول نہیں تھا بلکہ ایک ایسی نظریاتی مملکت کو وجود میں لانا تھا جہاں کے رہنے والے نہ صرف اپنے عقائد نظریات اور مذہب کے مطابق اپنی ترقی خوشحالی کے خواب دیکھ سکیں بلکہ ان خوابوں کی عملی تعبیر بھی پائیں۔ یہی وہ نصب العین تھا جس کے لیے قوم نے حصول پاکستان کی جدوجہد میں لاکھوں جانوں کی قربانی دی تھیں مگر ہماری بدقسمتی کہ قیام پاکستان کے بعد اس پاک سرزمین پر خود غرضی نفسانفسی اور لوٹ کھسوٹ کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ برائی برائی نہ رہی، نیک و بد، خیر و شر، آدم و ابلیس، حق و باطل اور حلال و حرام کی تعبیر ختم ہو گئی۔ جذبہ ملک و ملت سے سرشار پاکستانی پر اس صورت حال کے باعث کیا کیا گزر جاتی ہے اس کا اندازہ آپ کو اس واقعے سے ضرور ہو جائے گا جو پاکستان ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام پر ڈیوٹر کی حیثیت سے میرے ساتھ پیش آیا۔ اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔



یہ غالب نومبر 1982ء کے دنوں کی بات ہے میں راولپنڈی اسلام آباد سینٹر سے تھمیل ہو کر نیا نیا، لاہور ٹی وی سینٹر پر تعینات ہوا تھا انہی دنوں مجھے نفسیاتی امراض کے ماہر ڈاکٹر رشید چوہدری کے زیر انتظام چلنے والے ذہنی معذور افراد کی بحالی کے ادارے ”فاؤنٹین ہاؤس“ کے بارے میں ایک دستاویزی فلم بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اسے اس فرض کی بجائے آدھری کے دوران مجھے تین چار روز تک مسلسل پاگل، نیم پاگل اور ذہنی طور پر بیمار افراد کے ساتھ بہت سادقت گزارنے اور انہیں قریب سے دیکھنے پر کھنے کا موقع ملا۔ اس موقع پر کچھ تلخ محرمیر کو جگا دینے والے واقعات بھی دیکھنے کو ملے اور بعض ذہنی بیمار، پاگل افراد کی ہوشندانہ گفتگو بھی سننے کا اتفاق ہوا۔

فاؤنٹین ہاؤس میں تین چار روزہ شوٹنگ کے دوران میں نے اکثر ممبران (یہاں مریضوں کو ممبر کہا جاتا ہے) کو اوٹ پانگ حرکتیں کرتے دیکھا اور ان کی بے معنی و لائینی گفتگوئی لیکن اس سارے عرصے کے دوران اوٹ پانگ حرکتیں کرنے والوں کے درمیان صرف ایک رکن ایسا تھا جیسے میں نے مسلسل کم کم سنجیدہ اور نارمل Behave کرتے ہوئے پایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہماری شوٹنگ کے دوران وہ کمرے کے سامنے آنے سے مسلسل گریز کرتا رہا ہے جب کہ باقی ممبران کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر اپنی تصویریں بنواتے اور ذہنی مریض ہوتے ہوئے بھی مسلسل کمرے کے سامنے رہنے کی کوشش کرتے۔ یہ کم کم رہنے والا شخص مجھے سب سے مختلف لگا اور میرے ذہن پر سوار ہو گیا کہ آخر یہ ممبر سب سے منفرد کیوں ہے؟

فاؤنٹین ہاؤس میں زیر علاج ان مریضوں کو بطور علاج سیر و تفریح کے لیے بھی لے جایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہماری شوٹنگ کے دوران اس Sequence کی فلمینگ کے لیے انہیں ایک روز باغ جناح لاہور لے جایا گیا، یہاں بھی جب ہم شوٹنگ کر رہے تھے تو قریباً سب ممبران بے معنی اچھل کود اور اپنی سیدھی حرکتیں کرتے رہے مگر وہ واحد شخص تھا جو الگ تھلک بیٹھا فلک کی جانب معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھے جا رہا تھا۔ اسے چپ چاپ اور اکیلا پاکر میں اس کی جانب بڑھا، وہ مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر احترازا کھڑا ہو گیا۔

”آئیے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی بھی تھوڑی سی فلم بنائیں۔“

اس نے پوچھا۔ ”یہ فلم کہاں چلے گی؟“ پیشتر اس کے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا۔ کیرامین بولا۔ ”پاکستان۔“

ابھی کیرامین پاکستان ٹیلی ویژن کے الفاظ بھی نہیں کہ پایا تھا کہ حذکر ممبر جسے میں کئی دن سے مسلسل خاموش دیکھ رہا تھا نے پاکستان کا نام لے کر گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اگرچہ میں نے فوری طور پر شدید سبکدوشی کا اظہار کرتے ہوئے اسے سمجھایا کہ مادر وطن کو گالی نہیں دینی چاہیے۔ میری سرزنش پر وہ ذرا خفتا ہوا تو میں نے محل سے اسے وطن کی اہمیت اور مقام، مرتبہ بنا کر سمجھانا شروع کیا کہ یہ وطن تو ہماری ماں کی طرح مقدس اور قابل احترام ہے۔ اسے ہم نے لاتعداد قربانیوں کے بعد حاصل کیا ہے لہذا اسے گالیاں نہیں دینی چاہئیں۔“

وہ میری یہ جذباتی اور دروہانی گفتگو معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ چپ چاپ سن رہا، پھر یکدم اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اس نے غصے سے اپنے ہونٹ کھینچتے ہوئے میری طرف دیکھا اور گویا ہوا۔ ”یہنا ہے جدوجہد اور قربانیاں قیام پاکستان کے لیے تھیں مگر مجھے بتائیں کہ وہ پاکستان ہے کہاں جس کے لیے اتنی ذمہ ساری قربانیاں دی گئی تھیں۔ کیا یہ کہیں گمان تھا کہ نئے خط ارض میں جہاں ہم آزاد ہوں گے کوئی ہمارا استحصال کر سکے گا۔ کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں ہوگی، ہر شخص بلا امتیاز انصاف حاصل کر سکے گا۔ ہم آزاد بھی ہوں گے اور خود مختار بھی۔“ مجھے بہترین گوش دیکھ کر اس کے لہجے میں ٹھنڈا اور گفتگو میں زیادہ سنجیدگی در آئی۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم کہتے ہیں یہ وطن قربانیوں اور جدوجہد سے بنا ہے جب کہ ہمارے مخالفین ہندو کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ ملک لوٹ مار کر کے لوٹ مار کرنے کے لیے حاصل کیا ہے اور آج جب میں اپنے ارد گرد دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے مخالفین کا موقف درست لگتا ہے۔“

میں نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔ ”برادر عزیز! مجھے آپ سے اختلاف ہے۔“ میں نے بہت ہی ملائمت اور نرم لہجے میں کہا۔ ”بھائی اگر ایسا ہو رہا ہے تو یہ قصور پاکستان کا نہیں۔“

میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے بات کاٹ دی اور بولا۔ ”آپ اختلاف کریں۔ یہ آپ کا حق ہے بلکہ میں تو آپ سے یہ کہوں گا کہ مجھے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ نہ بھولے گا کہ آپ ایک پاگل سے محو گفتگو ہیں۔ برادرم!“ وہ زور دے کر گویا ہوا۔ ”اگر میری باتیں آپ کو بری لگیں تو انہیں ایک پاگل کی گفتگو سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔“

اس کا یہ جملہ نہ کر میں تقریباً سکتے میں آگیا تھا۔ تاہم اس کے متوجہ کرنے پر میں اس کیفیت سے باہر نکلا۔ وہ کہنے

۱۰۔ ”آپ دیکھ نہیں رہے کہ یہاں اکثریت لوٹ مار میں لگی ہوئی ہے اور اگر کوئی اس دوڑ میں شریک نہ ہو تو اس کا حال مجھ جیسا ہو جاتا ہے۔ اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جاتا ہے۔“

میں نے چونک کر کہا۔ ”میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا؟“ اس نے گفتگو کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تک مجھے پاگل قرار دے کر مینٹل اسپتال میں داخل نہیں کرا دیا گیا تھا میں بھی لاکھوں حساس اور آپ جیسے درد مند پاکستانیوں کی طرح پاکستان کے حوالے سے بڑی جذباتی سوچ رکھتا تھا مگر جب میں اپنے معاشرے خصوصاً اپنے گھر والوں کے لیے اپنی اسی حب الوطنی اور پاکستان سے وابستہ بے حد جذباتی سوچ کی وجہ سے ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے مجھے پاگل قرار دے کر یہاں داخل کرا دیا۔ یوں میں اب باقاعدہ ڈکٹیٹر اور Bonafide رجسٹرڈ پاگل ہوں، گویا میں اگر پاگل کے اعزاز سے بہرہ مند ہوں تو یہ اعزاز مجھے پاکستان کی محبت ہی میں ملا ہے۔ میں پاکستان کی محبت ہی میں پاگل ہوا ہوں۔“

اس نے نامی کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔ ”کوئی چندہ برس پہلے کی بات ہے، میں ایک ایماندار، دیانت دار، راست گو اور بے باک سچا محبت وطن جذباتی پاکستانی نوجوان تھا۔ معاشرے میں موجود بدعنوانیاں، بے ایمانیاں، بدعہدیاں، مجبوت فراڈ اور سب سے بڑھ کر منفی انداز نظر رکھنے والوں کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ میں اس صورت حال پر کڑھتا، لڑتا، احتجاج کرتا کیونکہ حصول پاکستان کی جدوجہد کے دوران بتایا گیا تھا کہ جب ہم آزاد ہوں گے تو ہمارے اپنے وطن میں یہ برائیاں نہیں ہوں گی۔ وہاں انصاف بھی ہوگا اور دیانت بھی ہوگی مگر مروج قدریں اور صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھیں۔ میری ہرج مرج کا آغاز ہی اس صورت حال پر میرے احتجاج سے ہوتا۔ ان دنوں میں ایک سرکاری ادارے میں ذمہ دار پوسٹ پر تعینات تھا۔ صبح اٹھ کر سب سے پہلے میں بازار سے دودھ لینے جاتا تو دودھ فروش سے جھگڑا ہو جاتا۔ سب اس روز کی جج جج اور بک بک کا یہ ہوتا کہ دودھ فروش پانی ملاطوت شدہ دودھ دیتا۔ میں احتجاج کرتا کہ میاں! جب تم نے دودھ کا ایک ریٹ مقرر کر رکھا ہے، دعویٰ بھی خالص دودھ بیچنے کا کرتے ہو تو پھر پورے پیسے لے کر خالص کی بجائے پانی والا دودھ کیوں دیتے ہو۔ البتہ یہ تھا کہ ہر روز میں اکیلا ہی احتجاج کرتا، چنانچہ وہ دیکھ کر پراثر آتا مگر کوئی اسے نہ روکتا تو کتا سب مجھے ہی ٹھنڈا

رہنے کی تلقین کرتے یا انداز دیگر کسی غلط کام کرنے والے ہی کی طرف داری اور حمایت کرتے جب کہ وہ خود بھی اس کی زیادتی کا نشانہ بن رہے ہوتے۔ بہر طور اسی صورت حال میں جلا، بھنٹا، کڑھتا کھر آ اور ناشائز ہر بار کر کے تیار ہو کر دفتر کے لیے روانہ ہو جاتا۔ یہاں میرا جھگڑا بس کنڈیکٹر سے ہوتا، جو کلٹ کے پورے پیسے لینے کے باوجود اکثر مسافروں کو کلٹ جاری نہ کرتا۔ چنانچہ میں حسب عادت یہاں بھی احتجاج کرتا مگر تم یہ کہ یہاں بھی ساکھی مسافر میرے مہوا ہونے کی بجائے اسی کا ساتھ دیتے اور کہتے چلو یا جانے دو بے چارہ غریب آدمی ہے۔ حالانکہ وہ اپنے اس کام کے عوض ہی تنخواہ وصول کرتا تھا مگر وہ اسی ادارے کی جزیں کاٹنے میں مصروف نظر آتا جو اس کے اور اس کے اہل خانہ کے رزق کا باعث تھا۔ چنانچہ جب میں اسے دیانت داری سے فرائض ادا کرنے کی تلقین کرتا تو لوگ یعنی ساکھی مسافر مجھے اس فعل سے روکتے ٹوکتے اور میری دیانتداری کا مسخرہ اڑاتے، یوں میں بھی غصے میں آ جاتا اور ناخوشگوار صورت حال پیدا ہو جاتی بعض اوقات لڑائی جھگڑے کی صورت بھی پیدا ہو جاتی اور ہمیشہ مجھے ہی سہارہ کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ بہر طور اس دلدل میں تسخیر کرنے کے بعد جب میں اپنے دفتر میں داخل ہوتا تو یہاں بھی مجھے ایک ایسی ہی دنیا سے واسطہ پڑتا جو ان خوابوں کی تعبیر نہیں تھی جن کی خاطر ہم نے یہ الگ تھلک خطہ ارض یعنی پاک سرزمین حاصل کی تھی۔ قصہ مختصر میرے دفتر میں جب مسائل اپنے کام کی غرض سے میرے پاس آتے تو میں ان کے کام نشتا نہ کو اپنا اولین فرض سمجھتے ہوئے دفتری اوقات کار کے بعد بھی اپنے صمیمی کر آواز پر دیر تک بیٹھ کر کام کرتا لیکن میرے رفقاء کو میرا یہ رویہ برا لگتا۔ وہ مجھے سانکوں سے نڈرانہ وصول کیے بغیر انہیں فارغ نہ کرنے کے مشورے دیتے گویا بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کی حصار میں مجھے جکڑنے کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے مگر جب میں یہاں بھی قابو میں آنے سے انکار کر دیتا بلکہ اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو افسران بالا سے میری شکایات لگا کر مجھے تنگ و پریشان کیا جاتا۔ دوسرے جواب طلبی تک کرا دی گئی۔ تاہم میں اپنے صمیمی کے مطابق ہر جگہ دیانتداری کے لیے سرگرم کل رہا اور جہاں بھی کوئی ناانصافی یا بددیانتی دیکھتا سرپا احتجاج بن جاتا کیونکہ میرے نزدیک پاکستان کا قیام لوگوں کی مشکلات میں اضافہ کرنے اور انہیں لوٹنے کے لیے کل میں نہیں آیا تھا بلکہ اس خطے کے رہنے والوں کے لیے دارالامان اور دارالرحمت کے طور پر حاصل کیا گیا تھا۔

بہر طور میں بات کر رہا تھا ہر نا انصافی اور غلط بات پر لازماً React کرنے کی۔ میرے اس طرز عمل کی وجہ سے رفتہ رفتہ گھر میں میری مشکلات بڑھنے لگیں۔ انفس یہ کہ ہر شخص مجھے ہی اتنا رویہ اور طریقہ کار تبدیل کرنے پر مجبور کرتا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ انصاف کا راستہ وہ ہے جس کے لیے میں لڑ رہا ہوں اور یہ درست ہے، ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جو قیام پاکستان کی اس حقیقی منزل کی طرف جاتا ہے جو ظلم، استحصاف، نا انصافیوں، بد اعمالیوں اور بد عملیوں سے بہت دور ہے۔ بہر طور قصہ مختصر جب گھر میں میری شکایات کی تعداد بڑھنے لگی تو میں جو پہلے معاشرے کے لیے ناقابل قبول تھا اب گھر والوں کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو انہوں نے اس مسئلے کا فوری حل بلکہ اثر میں یہ کہوں کہ مستقل حل ڈھونڈ لیا تو غلط نہ ہوگا۔ چنانچہ ایک روز ایک اسپتال کی انتظامیہ کو کچھ دے دلا کر انہوں نے مجھے پاگل خانے جسے مہذب زبان میں مینٹل اسپتال کہتے ہیں، میں داخل کرا دیا۔ پہلے چند سال میں وہاں کے پاگل خانے میں رہا اب کچھ برسوں سے یہاں فائٹین ہاؤس میں ہوں۔ آپ یقین کریں کہ جب مجھے پاگل ڈیکلر کر کے مینٹل اسپتال میں داخل کرایا گیا اس وقت میں واقعتاً پاگل نہیں تھا لیکن اب میں پاگلوں کے ساتھ اتنے برس گزارنے کے بعد حقیقتاً پاگل ہو چکا ہوں۔ آپ بتائیں مجھے پاگل کس نے کیا، کیا پاکستان کی محبت نے؟ کیا میں پاکستان اور اہل پاکستان کے ہاتھوں نہیں لٹا؟ کیا اپنی زندگی کے چند درختی سال پاگل خانوں میں گزارنے کے باوجود بھی میں پاکستان سے محبت کروں؟“

وہ دلیل کے ساتھ بات کر رہا تھا اور مجھے اس کی باتوں میں ترشی نہیں کڑواہٹ محسوس ہو رہی تھی کہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ فرض کرو اگر اپنی ماں اچھی نہ ہو تو کیا ہم الٹے تیلے کرکڑی ماں کہنا شروع کریں۔ وطن تو ماں کا ہی ایک دوسرا روپ ہے۔

دلیل سے بات کرنے والا وہ پاگل اس لمحے مجھے لا جواب نظر آیا۔ تاہم اس کی آنکھوں میں اختلاف کے ڈورے اب بھی دیکھے جاسکتے تھے۔ بہر طور میں فائٹین ہاؤس میں اپنی شوٹنگ مکمل کر کے دیگر مصروفیات میں لگ گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد مجھے فائٹین ہاؤس ہی میں یوم پاکستان کی ایک تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر شدید حیرت اور خوشی ہوئی کہ وہ جو کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کا نام سننا تک گوارہ نہ کرتا تھا سینے پر پاکستان کا جگ آویزاں کیے بار بار

پاکستان زندہ باد کے نعرے لگوار رہا تھا۔ اس کے طرز عمل میں ایسی تبدیلی سے مجھے ایک عجیب ساسرور اور شادمانی کا تاثر ملا۔ تقریب ختم ہوئی تو میں آگے بڑھ کر اس سے ملا، اس نے فوراً مجھے پہچان لیا اور بولا۔ ”الٹے تیلے بھی تو کسی کی ماں ہے اور مار کبھی بری نہیں ہوتی۔“ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے احساس دلایا تو میرے اندر سے یہ آواز اٹھی کہ اولاد میں سے اگر کچھ بچے ماں کی خواہشوں کی تکمیل نہیں کر رہے تو فرمانبردار بچوں کو نافرمان بچوں کے رویے کی گالی ماں کو نہیں دینی چاہیے بلکہ انہیں تو ماں کی اور بھی زیادہ فرمانبرداری کرنی چاہیے تاکہ ایک تو نافرمانوں کے رویے اور عدم توجہ کی بھی حلائی ہو اور دوسرے ممکن ہے کہ اچھے بچوں کا رویہ اور طرز عمل دیکھ کر نافرمان خود یا ان کی آئندہ نسل اپنا طرز عمل بدل لے اور اچھے ثابت رویے کا اظہار شروع کر دے۔“ وہ رکا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ ”سر میں پاگل ہوں ناں! ڈیکلرڈ پاگل، اس لیے اگر آپ کو میری باتیں اچھی نہ لگیں تو نظر انداز کر دیں۔“

وہ نظارہ تو پاگل تھا کہ اسے ڈاکٹری شٹیکٹ میں یہ اعزاز مل چکا تھا مگر اس کی باتوں میں بلا کی شجیرہ اور ذہانت بھی، کہنے لگا۔ ”برسوں پہلے جب کبھی میں نائل لوگوں میں رہتا تھا تو میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگر کوئی نماز پڑھنے نہیں آتا تو موزن کا یہ کام نہیں کہ وہ اذان دینا چھوڑ دے۔ آپ نے فائٹین ہاؤس میں مجھ سے ہونے والی گفتگو کو ایک پاگل کی گفتگو سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوتا تو شاید آج کی تقریب میں پاکستان زندہ باد کے نعرے اتنے جوش و خروش سے سنائی نہ دیتے۔ آپ یقین کریں یہاں ہیں تو بظاہر سب پاگل مگر آپ کی دی ہوئی روشی میں، میں نے انہیں پاکستان کی جو اصل تصویر دکھائی ہے اس کی بناء پر اب یہ آپ سے زیادہ اور پہلے سے بہتر پاکستانی ہیں، میرے ساتھ آواز ملا کر دیکھ لیجیے۔ چنانچہ ہم دونوں نے ہا آواز بلند کہا۔ ”پاکستان“ اُدھر سے ہر جوش جواب آیا۔ ”زندہ باد“

قارئین محترم! بطور بالا کا مرکزی کردار اب بھی گا ہے بگا ہے مجھے ملتا رہتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا نے مجھے موقع اور وسائل دیئے تو میں آنے والے وقت میں ایک ایسی دستاویزی قلم بنادوں گا جسے دیکھ کر چندہ نسلوں میں سے ہر بچہ اس فلاحی اور استحصاف سے پاک معاشرے کا اہم کردار ہو گا جس کی نوید بابائے قوم حضرت قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر قائدین نے قیام پاکستان کے وقت دی تھی۔ انشاء اللہ ہم اس کو دیا ہی پاکستان بنا کر دم لیں گے۔

انظریہ

ایاز راہی

اس دنیا میں مذاہب کی ایک قطار ہے۔ عجیب عجیب سے نظریہ پر چلنے والے لوگ ہیں۔ کوئی ایک خدا کی پرستش کرتا ہے تو کسی مذہب میں کئی کئی خدا کی پرستش ہوتی ہے۔

دلچسپ تحقیق پر مبنی ایک مختصری تحریر

سے بھی گزر جاتا ہے، اس صلی کی تمنا میں کہ وہ امر ہو جائے گا۔ تمام مصائب، تکالیف اور خوف سے اسے نجات مل جائے گی اور ہمیشہ کی آسودہ زندگی (سورگ۔ جنت) اس کا مقدر ٹھہرے گی۔ وہ آزاد رہے گا۔ خود کو قربان کرنے اور معبود پہ مرٹنے کا جذبہ بالآخر اس حد تک بڑھا کہ غالب جیسا دانا و مینا آدمی بھی بے اختیار کہہ اٹھا کہ۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اسی چیز کو شاعر مشرق علامہ اقبال کچھ اس رنگ میں بیان کرتے ہیں۔

متاع بے بہا ہے درد سوز آرزو مندی

مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

پوچتا، بندگی، آل کار، آسودگی، آزادی اور دوام۔ جس طرح کرۂ ارض کی تقسیم تین حصے پانی اور چوتھا حصہ خشکی (ربیع مسکوں) ہے اسی طرح دنیا کا غالب حصہ کسی نہ کسی مذہب (دھرم) کے زیر اثر ہے۔ بہت کم آبادی مذہب (دھرم) کی پابندیوں سے آزاد (دہریہ) ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال ہی

عبد و معبود، ساجد و معبود، بت اور پجاری کا موضوع تقریباً اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ آدمی۔ شاید حضری (تمدنی۔ ٹہری) زندگی سے پہلے آدمی جب غاروں اور درختوں پہ سیرا کرتا تھا تب وہ غالباً مذہب سے نا آشنا تھا۔ آزاد ذہن و وہن کے ساتھ کھاتا پیتا اور سوتا جاگتا تھا۔ ذہنی ارتقا اور برصورتی کا آغاز ہوا تو سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیت نے جنم لیا۔ ساتھ ہی رفتہ رفتہ زمینی اور آسمانی آفات و حادثات نے اسے خوف زدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ان آفات کے آگے بے بس ہو کے ان کی پوجا شروع کر دی اور بالآخر مختلف خداؤں اپوتاؤں کا پجاری بن بیٹھا۔ ان کے آگے جھکنا۔ ڈنڈوت یا بدمہ کرنا۔ دان پن یا نذر نیاز گزارنا حتی کہ اپنے آدمیوں، بیٹوں اور اپنی قربانی بھی بہ طیب خاطر دینا اس کا دتیرہ ٹھہرا۔ اپنی اور اپنی نسل کی بقا کا خیال۔ مرٹنے کا خوف۔ عجیب و غریب معبودوں اور دیوتاؤں کا جواز بنا۔ معروف مفکر سگنڈ فرائیڈ کے بقول مذہب بنیادی طور پر خوف ہی کی پیداوار ہے۔ اس قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو خوف زدہ آدمی اپنے خدا یا دیوتا کو مٹی کرنے کے لیے ہی بہادر بنتا ہے، اس حد تک کہ اپنی جان



کی زبان میں۔

”سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بے زار بھی ہیں۔“
(شکوہ)

دھرم والوں نے بھی اپنے خداؤں یا دیوتاؤں کے ساتھ عجیب متضاد بلکہ دلچسپ رویہ اپنا رکھا ہے کہ ایک طرف تو اس کے لیے قربانی، خیر خیرات اور دان پن کو لازم و فرض قرار دیا اور دوسری طرف مجبوروں (مجبوروں۔ بتوں) کو مکمل طور پر بے نیاز گردان کر ایک طرح سے آدمیوں سے لائق اور علیحدہ کر ڈالا۔ کچھ اس بحث میں بھی الجھے (اب بھی ہیں) کہ خدا نے آدمی کو تخلیق کیا یا آدمیوں نے اپنے اپنے خدا مگرے ہیں۔ ایک اور بات کہ تمام مذاہب (دھرم) میں خدا یا دیوتاؤں کا تصور و خیال آتے ہی آدمی کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں یا اپنے مجبوری کی جانب اشارہ کرتے اس کی انگلی بے اختیار اوپر آسمان کی طرف ہی اٹھ جاتی ہے، چاہے وہ بھگوان، خداوند، ربی یا بیز داں ہوا، اور والا ہی کہلاتا ہے جب کہ اسے ہر جگہ موجود بھی کہا اور مانا گیا۔ یہ قول علامہ اقبال

بات کہنے کی نہیں تو بھی توہر جاتی ہے۔ (شکوہ)
یہاں لفظ۔ ہرجائی۔ ہردو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یعنی بے دفا اور ہر جگہ موجود۔ ایک اور شاعر کے یہ قول۔
ہو بھی نہیں اور ہر جا ہو
اسی طرح اُن دیکھے خدا کی عبادت بھی حضرت انسان

کے لیے اک مسئلہ تھا اور ہے۔
خونگر پیکر محسوس تھی انسان کی نظر
مانتا پھر کوئی اُن دیکھے خدا کو کیوں کر
(شکوہ از اقبال)

سو، خوف زدہ اور فریب خوردہ آدمی نے اس کا صل یہ نکالا کہ چاند، سورج، ستارے، جھرمجھر اور مظاہر کائنات کی پوجا شروع کر دی جن میں جانور۔ چرند پرند اور درندے بھی شامل ہو گئے۔ یوں بے شمار دیوتاؤں کا اک سلسلہ سامنے گیا۔ وہی بات کہ دھرم خوف کی پیداوار ثابت ہوا۔ عقل انسانی نے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ پر پرزے نکالے تو اس نے دھیروں خداؤں سے جان چمڑانے کی سوچی اور بالآخر خست سنا کر تین۔ دو۔ اور پھر ایک خدا پر آن ٹھہرا۔ گو کہ ان گنت خداؤں کی پوجا آج بھی جاری ہے۔ مگر ان میں توحید (ایک خدا) تھیث (دودخدا) اور تثلیث (تین خدا) کے پیروکار نمایاں ہیں۔ توحید میں یہودی اور مسلمان۔ تثلیث میں پارسی، مجوسی یا آتش پرست اور تثلیث میں عیسائی دنیا شامل ہے۔ عیسائی پیروکاروں کی

تعداد سب سے زیادہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے صدیوں پہلے ایران میں محوی مذہب (دودخدا) نے جنم لیا جو غالباً یہودی توحید کا رد عمل تھا اس سلسلے میں حتیٰ بات کا تعین تاحال ناممکن ہے۔ اہل ہمدان گنت دیوی دیوتاؤں کی کثرت کا شکار تھے اب بھی ہیں یہی صورت حال روم اور یونان کی بھی تھی مگر یونان میں عقل و خرد کی شمع روشن ہو چکی تھی جو مذہبی چال (دیوی دیوتاؤں) کے مقابل علم کی روشنی بکھیر رہی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت اور یہودی توحید خود پرست علما اور پیشواؤں کے ہاتھوں منسوخ ہو چکی تھی۔ ایسے میں انسان کا بنیادی مسئلہ خیر اور شر تھا۔ خیر و شر کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کی ماہیت اور حدود کیا ہیں؟ یہ سلسلہ کہاں سے شروع ہوتا اور کہاں تک دراز ہے؟ خیر اور شر میں آدمی کی حیثیت کیا ہے؟ آدمی خیر ہے یا شر؟ یہودی اور بعد میں عیسائی اسلامی توحید کے مطابق اس کا نکتہ خالق ایک ہی ہے۔ تو خیر اور شر اسی ایک خالق سے منسوب ہیں؟ خیر اگر حسن ہی حسن ہے تو اس کے مقابل شر (بد صورتی) کا وجود کیوں عمل میں لایا گیا؟ یہ اور ان جیسے بے شمار سوالات کی بھول بھلیوں میں انسانی ذہن گم تھا۔ بھٹک رہا تھا۔ اسی بھٹکتے سے نجات کے لیے عقل کے پجاریوں اور مادہ پرستوں نے آخر کار خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا اور صرف مادیت تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ اسی کارگاہ فکر و خیال میں اک نئے مذہب نے جنم لیا جس نے انسانی فکر اور رویے پہ بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور صدیوں حکمرانی کی۔ آج سے چھبیس صدیاں، اڑھائی ہزار سال پہلے 600 (قبل از مسیح) ایران میں پارسی مذہب منصفہ شہود پ آیا۔ جس کی بنیاد دو خداؤں پر تھی اس مذہب کا بانی زرتشت 600 ق م 551 ق م تھا یہ کسی بہت بڑے آدمی کا بیٹا تھا اصل اور خاندانی نام۔ اختاما۔ یا اسپتام تھا۔ اس نے بھی گوتم بدھ 563 (ق م تا 483 ق م) کی طرح شادی کی مگر پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے جنگلوں میں نکل گیا۔ دنیا ترک کر دی اور غور و فکر میں اتر گیا۔ آدمی ذہن اور اعلیٰ شخصیت کا مالک تھا۔ واپس آیا تو منوچہر بادشاہ کی کونسل کا رکن منتخب ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق مشہور فلسفی فیثاغورث 580 (500 ق م قبل از مسیح) کا شاگرد بھی رہا۔ یہ شخص جنگل کی تنہائی میں گہرے سوچ بچار کے بعد روشنی لے کے آتا ہے۔ زرتشت کے لفظی معنی ہی سنہری روشنی کا مالک۔ ہیں۔ زرت یعنی سنہری اور تش بہ معنی روشنی۔ سو۔ سورج پوجا کی بنیاد پر ہی The Crisis of the Modern World کے مصنف

رین گینٹان (Rene Guenon) کا خیال ہے کہ لفظ زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے منصب کا نام ہے جس میں نبوت اور قانون سازی کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے زرتشت بہت سے گزرے ہیں جن میں آخری زرتشت کا زمانہ 600 قبل از مسیح ہے۔ زرتشتی ان کا نام ابراہیم بتاتے ہیں۔ بہر حال زرتشت نے دو خداؤں کا تصور پیش کیا کہ یزداں خیر کا خدا ہے اور اہرن شر کا خدا۔ لہذا دونوں خدا ایک دوسرے کے مقابل ہیں، کبھی یزداں غلبہ پاتا ہے تو کبھی اہرن کا زور ہوتا ہے ان دونوں خداؤں کی یہ کشمکش روزمرہ شکر رہے گی لیکن بالآخر فتح یزداں یعنی خیر کے خدا کی ہوگی۔ خیر کا بول بالا ہوگا۔ زرتشت کی اپنی کتاب تو نہیں البتہ اس سے منسوب پارسیوں کی مذہبی کتاب کا نام ”اوستا“ ہے جو عذربان میں بھی اب بھی شاید ہوگی۔ ژند زبان پہلوی زبان سے پہلے فارس (ایران) میں رائج تھی۔ آج کل اس کا شمار مردہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ مذہبی کتاب اوستا کی تفسیر پاژند کے نام سے ہے۔ اردو شعر و ادب میں خیر کے خدا یزداں کا نام اور ذکر تو بہت ہے مگر شر کے خدا ہرن کا ذکر کم پایا ہے۔ اردو زبان اور ادب فارسی کا خوش چمن ہے۔ پارسی اسے مردوں کو دفناتے ہیں نہ جلاتے ہیں بلکہ ایک مخصوص اونچی جگہ پہ نقش کو چھوڑ آتے ہیں اس جگہ کو ”منار خاموشی“ کہا جاتا ہے جہاں یہ میت حیواناؤں کی خوراک بن جاتی ہے۔ یہاں مجوسیوں کے دواہم بتواروں کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک جشن سدہ ہے جو ماہ بہمن (غالباً اگست) کی دسویں تاریخ کو ہوتا ہے۔ سدہ کے معنی بھڑکتی ہوئی آگ کے ہیں۔ یہ جشن نہایت پرانا ہے اور اس کی بنیاد یوں بڑی کہ ہوشنگ بن سیاک (سیاک بہت زیادہ دودھ پینے والا) نے ایک بڑے کالے سانپ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر پھرمارا۔ پھر یہ جانے سانپ کے دوسرے ٹہر پہ لگا اور اس سے آگ پیدا ہو کر ارد گرد کے خش و خاشاک میں لگ گئی۔ سانپ جل مرا۔ بس اسی وقت آگ کی پوجا شروع ہوئی کیوں کہ اسے خدا کا نور اور دھن کو ہلاک کرنے والا گردانا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس سے پہلے آگ کا ظہور بھی نہ ہوا تھا (دہی یونانی دیوتا پراوتھس کی کہانی)۔ دوسرا بڑا تہوار جشن نوروز ہے اس کے معنی نیا دن کے ہیں یعنی وہ دن جس سے نیا سال شروع ہوتا ہے اور سورج برج حمل میں آتا ہے (میں اگلے مارج) فارس والے دو۔ نوروز مانتے ہیں۔ (1) نوروز عامہ (2) نوروز خاصا۔ نوروز عامہ پارسی جنتری کے پہلے فروردیس۔ کا پہلا دن (میں بائیس مارج) ہے (موسم

بہار کا آغاز) مجوسیوں کا عقیدہ کہ اس دن دنیا لاپرواہی میں سیاروں کو حرکت کا حکم ہوا حضرت آدم کی تخلیق اولیٰ الہیہ روایت کہ بادشاہ جمشید جسے پہلے صرف جم کہتے تھے اپنی بی بی کر رہا تھا۔ آذربائیجان پہنچا تو حکم دیا کہ ایک مرغ مینہ کی اونچی جگہ پہ مشرق کے رخ بچھایا جائے۔ خود تاج پہن لے۔ تاج پہ بیٹھا۔ جوں ہی صبح سورج نکلا اس کے عکس سے تاج تخت پر گا اٹھے لوگ بڑے خوش ہوئے کہ آج نوروز (نیا دن) ہے۔ پہلوی فارسی میں۔ شید بہ معنی۔ شعاع (کرن) آتا ہے پس جم کے نام میں شید اور بڑھا دیا گیا (جمشید) اور اس دن بیماری جشن منایا گیا اور پھر مستقل طور پہ نوروز عامہ قرار پایا گیا۔ نوروز خاصہ وہ دن جسے یوم خرداد (خوشی دینے والا) بھی کہتے ہیں جو نوروز عامہ کے بعد ساتویں دن منایا جاتا ہے اسے جشن نیلوفر بھی کہتے ہیں اس دن بھی جمشید تخت پر بیٹھا اور خاصان شاہی کو بلا کر عمدہ عمدہ کسبے جاری کیں، فرمایا کہ آج ہی کے دن خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو۔ پاکیزہ پانی سے غسل کرو۔ خوب نہاؤ دھوؤ اور خدا کے شکر میں نماز و سجود ادا کرو۔ ہر برس آج کے دن عید مناؤ۔ کہتے ہیں اس کا سرہ یعنی شہنشاہ نوشیرواں کی اولاد اور اس کے خاندان والے ہر سال نوروز عامہ سے نوروز خاصا (سات دن) تک لوگوں کی مرادیں پوری کرتے۔ قیدی چھوڑتے، مجرموں کے گناہ معاف کرتے عید مناتے۔ شاہانِ دہلی اور مغل بادشاہ (شاہی خاندان) بھی آج کے دن خوشی مناتے اور انڈے لڑایا کرتے تھے۔ جب کہ مسلمان عورتوں کے نام بھی نوروزی خانم۔ نوروزی بیگم۔ نوروزی بی بی اور مرد نوروز خان، نوروز بیگ وغیرہ ہوتے۔ اس عمو (دودھائی) مذہب نے بہت عروج پایا۔ ایران اور افغانستان کے آتش کدوں میں صدیوں تک آگ مسلسل روشن رہی۔ پارسی پیشوایا ملاکو۔ موبد۔ کہا جاتا ہے (جمع موبداں) آج اس مذہب کے پیروکار پارسی لوگ ممبئی (بھارت) اور کراچی (پاکستان) تک ہی سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ کثرت معبود (دیوی دیوتاؤں) تین خدا (عیسائیت) دودھا (مجوسیت) اور ایک خدا (مسیحیت) توحید کے مقابل دین فطرت اسلام نے جب سیدھی سادی باعمل توحید پیش کی تو صدیوں سے فریب خوردہ انسانی ذہن بھر بھی نہ سنبھل سکا۔

کچھ نہیں جانتا کہاں ہوں میں
ہوش آئے گا تو بتاؤں گا
دو خداؤں کے درمیاں ہوں میں



قسط نمبر: 8

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ ذہیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو حوشرٹ نے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری آڈے کی یونین میں نائب مشعلی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بن کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ میٹری سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انکی پر لٹ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر رہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو حوشرٹ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر رہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی جہیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہن کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کر گئی ہے۔ جہیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا منہج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹول گیا ہے۔ اگلے دن ذہیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سننے جس نے رخت لٹ کے واقعے کو مزید ابھار دیا تھا۔ اس دن میں آڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس پر اختر کی بہن ذہیرہ کی گمشدگی کا ڈے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منہج کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سنا رہا تھا کہ کالیا کافون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف چھندرجیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ خبر سننے ہی میں آگیا کہ گڈرڈ اسپورٹ کی گاڑیاں آئی شروع ہو گئی تھیں۔ سہو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈرڈ کی آڈے میں شفا کا کاروبار ہوتا تھا۔ سہو کو رخصت کر کے میں بیٹھا تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری حفاظت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او لاہور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ کالیا کے آڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور جہیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ حوالہ میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں جہیم خیر دیکھ کر میں پریشان ہوا تھا۔ جہیم کے تھپڑ نے مجھے ہلکا دیا تھا۔ وہ مجھ پر مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں آڈے پر پہنچا تو وہاں صوبہ کے کل میں ملوث عزیر خان نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور اس سے صوبہ کے حلق پر چھا۔ وہ گھبراہٹ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے انھیں آیا پھر رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے فرک ڈرا میجر کی گلو خلاصی کر دی جس کے ٹرک نے ذہیرہ کی کار کو بٹ کیا تھا۔ مگر آیا تو کاشف ملے آگیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی غواہ کا سن کر پریشان ہو گیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بیٹے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کونون کیا کہ لڑکی کو لے کر آجائے۔ بھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار بھوت بول رہا ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

چھڑکا۔ وہ ہمز قہر آلود نظروں سے لڑکی کو گھورے جا رہا تھا۔ میں نے لڑکی سے سوال کیا۔ ”تم یہ کیسے اتنے یقین سے کہہ رہی ہو؟ تم خود اس کی سامھی بلکہ داشت لگ رہی ہو۔“
”میں اس شخص کی داشت ضرور ہوں مگر سامھی نہیں۔“
اس نے یہ کہتے ہوئے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ میں نے کچھ اور کہا چاہا تھا کہ کالیا نے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اس بار خود اس لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“
”رو۔۔۔۔۔ روزی، روزیہ۔۔۔۔۔“ اس لڑکی نے ہلکا سے ہونے اپنا نام بتایا۔

”تمہیں کیسے پتا ہے کہ راجو عاصم کی بجائے اپنے مسلہ ساتھیوں کو یہاں لا رہا ہے؟“
”یہ شخص، تم لوگوں کی سوچ سے بھی زیادہ چالاک اور مکار ہے۔“ وہ لڑکی سیٹھ ستار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
”اس نے ایسے نازک مواقعوں کے لیے کچھ کوڈ روا

میں اس حسینہ کی بات پر بری طرح ٹھنکا تھا۔ کالیا کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹ میٹھے اسی لڑکی کی طرف گھورے جا رہا تھا پھر تیزی سے بولا۔ ”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ مکمل کر کہو؟“
”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کالیا کی طرف دیکھا۔ ”اس نے عاصمہ نامی اس لڑکی کو گشتن حدید والے مکان میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ پر غافل بنا رکھا ہے اور جو راجو نامی شخص یہاں پہنچنے والا ہے اس کے ساتھ عاصمہ نہیں بلکہ اس کے مسلہ ساتھی ہوں گے۔“

اس لڑکی کے اتنے بڑے انکشاف پر میں ہی نہیں کالیا بھی چونک پڑا تھا۔ پہلی بار میں نے کالیا جیسے جفاوری کو بھی ابھرا ہوا پایا۔
”کیا کہو اس کر رہی ہے تو؟“ سیٹھ ستار کھانے والی نظروں سے لڑکی کو گھورتے ہوئے بولا۔
”تم اپنا منہ بند رکھو ذلیل آدمی!“ میں نے سیٹھ ستار کو

رکھنا۔ میں باہر جا رہا ہوں، تم ادھر رہ کر رہو اور میرے فون کا انتظار کرنا۔“ میں نے اس کی بات پر اثبات میں اپنے سر کو ہنسی دی تھی۔

وہ تیزی سے باہر نکلا چلا گیا۔ جاتے وقت میں نے اسے اپنا ٹی بی پتل نکالتے ہوئے دیکھ لیا تھا جبکہ سیٹھ ستار کا سیاہ ہسٹول میرے پاس تھا۔

اب میں اور روزی تہا خواب گاہ میں موجود تھے۔ روزی نے کپڑے بدل لیے تھے۔ میں نے اس کی طرف قدرے شامی نظروں سے نگلتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہاری سیٹھ ستار سے کیا دشمنی تھی؟“ میرے سوال پر اس نے ایک گہری ہنسی خارج کی تھی اور بولی۔

”یہ میری باجی بھیرا کا قاتل ہے اور میں اپنی بہن کے قتل کا انتقام لینے کی غرض سے اس کی داشتہ بنی ہوئی تھی۔ اس رڈیل شخص سیٹھ ستار نے میری بہن کو شادی کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ ملا کر اور پھر ایک دن اس کی عزت سے بھی کھیل گیا اور یہ شرمناک کھیل اس نے کافی عرصے تک جاری رکھا تھا یہاں تک کہ میری باجی بن بیانی حاملہ ہوئی۔

میری باجی نے جب یہ دیکھا کہ سیٹھ ستار شادی کے نام پر اسے اب تک ٹالنا چلا آ رہا ہے اور نوبت یہاں تک آگئی ہے تو اس نے سیٹھ ستار کو خودکشی کی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی لاش پر ایک پرچہ لکھ کر چھوڑ جائے گی، جس میں سیٹھ ستار کے کر تو تو کی ساری کہانی لکھ ڈالے گی تو اس ظالم نے میری بہن کو ہی مردوا دیا۔

باجی میری راز داں تھیں۔ ہم دونوں جیم ولیمسز اور اپنی ایک بیوہ خالہ کے ساتھ رہتے تھے۔ میرا دنیا میں باجی کے سوا اور کون تھا، میں نے اس کا انتقام لینے کی ٹھانی اور سیٹھ ستار کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا دیا اور اس کے سارے رازوں سے کسی حد تک واقف ہونے لگی مگر یہاں مجھے اور بھی کچھ تلخ حقیقتوں کا اندازہ... ہونے لگا کہ سیٹھ ستار کوئی معمولی آدمی نہیں، دولت تو اس کے پاس بے حساب ہے ہی مگر اس کے پاس خطرناک آدمیوں کا ایک پورا ٹولہ بھی ہے، نیز یہ بہت اثر و رسوخ کا مالک بھی ہے۔

غرض یہ کہ مجھے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کا ہلیم ہی نہیں مل رہا تھا۔ میں بہت مایوس ہو گئی تھی کہ شاید میں اپنی باجی کا انتقام نہ لے سکوں، بالآخر مایوسی اور افسوس نے مجھے مجبور کر ڈالا کہ میں خود ہی ایک سوئچ ہالڈر بن جائوں۔ ہاتھوں سے ہی جہنم واصل کر دوں اور... ۱۸ مارچ ۲۰۱۱ء

رکے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ شخص اپنے لہجے سے بھی اپنے زر خرید ساتھیوں کو خبردار کر دیتا ہے کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ تم دونوں خود بھی ذرا اندازہ لگائے کہ کوشش کرو کہ اس وقت سیٹھ ستار خاں کا اپنے آدمی کو فون کر کے یہ کہنا کہ اس لڑکی کو لے کر فوراً اس کے کلفٹن والے بنگلے پر پہنچو، کیا انہیں چونکا دینے کا باعث نہیں بنا ہوگا اور پھر تم نے اس کے الفاظ پر بھی غور نہیں کیا جب یہ اپنے راجو نائی سامی سے بات کر رہا تھا تو اس نے تمہاری ہدایت کے برعکس پہلا جملہ بھلاتے ہوئے ادا کیا تھا۔ یہی اس کا پہلا کوڈ ورڈ تھا۔“

مجھے اس لڑکی کی بات سمجھ میں آ رہی تھی، کٹک تو میں بھی گیا تھا اس بات پر مگر راجو نے بھی سوچا ہی ہوگا کہ آخر سیٹھ ستار اس وقت کیوں ایک اغوا شدہ لڑکی کو اپنے ہاں لانے کا حکم دے رہا تھا اسے..... مگر میں نے دیکھا کہ کالیا کچھ زیادہ اس کی بات پر بھروسہ کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ روزی سے بولا۔ ”ایک بات بتاؤ، تمہیں ہماری مدد کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ ہمیں یہاں آئے تھوڑی ہی دیر گزری ہے اور تم اتنی جلدی ہماری خیر خواہ بھی ہو گئیں؟ کیا تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے کہ اس غداری پر یہ ظالم اور سنگدل شخص تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا؟“

کالیا کی بات پر روزی نے نفرت انگیز نظر سیٹھ ستار پر ڈالی اور جوابا بولی۔ ”تم نے ٹھیک کہا ہے یہ شخص واقعی بہت ظالم اور بے رحم ہے۔ میں اس ظالم اور خونی شخص کے لیے اب تک آستین کا سانپ بنی ہوئی تھی اور اسے ڈنسنے کے لیے موقع کی منتظر تھی۔ آج مجھے اس کا شاید موقع مل رہا ہے۔ وقت کم ہے، باقی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتا دوں گی مگر خدا کے لیے پہلے میری بات کا بھروسہ کرو، ایسا نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے۔“

اس کا اشارہ بھانپ کر کالیا نے بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا، کیونکہ لڑکی کا بھوٹ سچ چھیننے والا نہیں تھا۔ راجو کی آدھی اس کے سچ اور بھوٹ کی گواہی فرما رہی تھی۔

کالیا نے لڑکی کو لباس پہننے کا حکم دیا اور مجھ سے کہا کہ میں کوئی رسی تلاش کر کے سیٹھ ستار کو رسی بستہ کر ڈالوں اور میں نے ایسا ہی کیا۔

دوسرے کمرے سے مجھے تالون کی ڈوری مل گئی اور میں نے اسی سے سیٹھ ستار کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور اچھے ہاتھ روم کے اندر اسی حالت میں ہی دھکیل دیا۔

اس کے بعد کالیا مجھ سے بولا۔ ”جگری! اپنا سیل آن

کرنے والی تھی کہ تم لوگ یہاں آگئے۔ میں اس کے ہی پتول سے اس کا خون کرنے والی تھی آج.....“
وہ اتنا بتا کر چپ ہو گئی اور ہولے ہولے سسکنے لگی۔
مجھے اس کی باتیں قابل اعتبار محسوس ہونے لگیں۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

”کیا تم جانتی ہو کہ میری بہن عاصمہ کو اس خبیث نے کہاں پر غمال بنا رکھا ہے؟“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ پورے اعتماد سے بولی۔ ”کیونکہ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں اس کے قریب رہتے ہوئے اس کے بہت سے رازوں سے واقفیت حاصل کرنے کی اسی لیے ہی کوشاں رہتی تھی کہ شاید کہیں مجھے اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا موقع مل جائے۔ میں نے اسے فون پر اپنے کچھ ساتھیوں کو تحفہ منانہ ہدایت دیتے ہوئے سنا بھی تھا تمہاری بہن کو لیاری کے علاقے میں کسی مکان میں پر غمال بنا کر رکھا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔“

میں اس کی بات کر چوٹا تھا مگر کالیا کی طرح اتنی جلدی اس کی باتوں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتا تھا، لہذا بولا۔ ”دیکھو اگر تمہاری کوئی بھی بات جھوٹ ثابت ہوئی تو پھر تم ہمارے ہاتھوں زندہ نہیں بچو گی۔ کیونکہ راجو کی یہاں آمد کے بعد تمہارا جھوٹ بھی کھل ہی جائے گا۔“

وہ ابھی کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک کالیا کا فون آگیا۔

میں نے جلدی سے اپنا سیل فون نکالا۔ کال کالیا ہی کی تھی۔ اپنے کان سے لگا کر میں نے کہا۔ ”ہاں، کالیا! کیا خبر ہے؟“

”ابے لے..... جگری! اس لڑکی روزینہ کی بات تو سینٹ پر سینٹ درست ثابت ہوئی۔ راجو کے ساتھ عاصمہ بہن نہیں بلکہ اس کے دوست ساتھی ہیں۔“

اس کی بات پر میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ بولا۔ ”کالیا! تو ان سے بھڑے بغیر یہاں چلا آ..... سینٹ ستار کو گن پوائنٹ پر لے کر انہیں با آسانی بھگا جا سکتا ہے۔“
”میں اپنا کام نہانا جانتا ہوں، جگری! تو بے غم ہو جا۔ میں گھات میں ہوں اور دشمن مات میں ہیں۔ دیکھتا جا۔“

دوسری طرف نے کالیا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میں فکر مند سا ہو گیا۔ کالیا کا سینٹ ستار کے تین خطرناک بد معاشوں سے تنہا نہ مٹا آسان نہیں ہو سکتا

تھا، اس کی مدد کے لیے مجھے بھی جانا چاہیے تھا۔ چونکہ روزینہ کی بات سچ ثابت ہوئی گی اس لیے میں نے اسے وہیں خواب گاہ میں ہی رکے رہنے کی ہدایت کی اور پھر دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ کالیا نے اس کو بھی کے کس حصے کی طرف گھات لگائی ہوگی، تاہم ایک محتاط اندازے سے میں نے گیٹ کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں پہنچا تو گارڈ سین سے ایک مسلح شخص باہر نکل رہا تھا، وہ شاید گیٹ کھولنے کے لیے نکلا تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی جگہ دکا کھڑا رہا اس کے بعد جب گیٹ کھلا تو میں نے ایک نیوی بلیو کمر کی کینٹینس کو اندر داخل ہوتے دیکھا، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے گارڈ کو اپنی طرف بلایا تھا کیونکہ کار اندر داخل ہوتے ہی وہ اس کے اشارے پر فوراً آگے بڑھا تھا اور اب کار کی کھڑکی کے سامنے جھکا اس کی کوئی بات سن رہا تھا۔

میں نے بد غور اپنی آنکھیں سیٹ کر کار کی طرف دیکھا تو اس کے اندر مجھے دو مزید افراد سوار دکھائی دیے۔ ایک تو ڈرائیونگ سیٹ والے کے برابر ہی بیٹھا تھا جبکہ دوسرا عقبی نشست پر براجمان تھا۔ میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے سچے لیے اور سوچنے لگا کہ کالیا کہاں ہو سکتا تھا؟

اچانک کار آگے بڑھی اور پورچ سے ذرا پرے ہی رک گئی اس کے اندر سے وہ تینوں باہر نکلے، ان کے ہاتھوں میں پستولیں تھیں اور گارڈ بھی اپنی گن نکال کر وہیں اپنے کہیں کے پاس چوکس کھڑا ہو گیا تھا، اس کی نظریں بار بار بالکونی کی طرف اٹھ رہی تھیں، جس کا صاف مطلب تھا کہ آنے والوں نے اسے بھی اندر کی صورت حال سے ”باخبر“ کر دیا تھا اور وہ محتاط ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ تینوں افراد تیزی کے ساتھ مگر آواز پیدا کیے بغیر مرکزی دروازے کی طرف بڑھے۔

میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ کالیا کہاں چھپا کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں پلٹ کر نیچے اتار اور اسی دروازے کی طرف بڑھا جدرہ سے وہ تینوں اندر داخل ہونے والے تھے، اطراف میں دمدمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور وہ تینوں اندر داخل ہوئے، میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں ابھی ایک فینسی طرز کے ستون کے پیچھے کھڑا یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک میں نے سب سے آخر میں داخل ہونے والے شخص پر کسی کو بچائی کی

میں تھا جس سے اس نے فائر کیا تو مذکورہ حملہ آور کر یہ ناک چب کے ساتھ گرا، اس کے آخری ساتھی نے زمین پر پڑے پڑے لوٹ لگا کر اور دروازے کی طرف بھاگا تو کالیا نے پیچھے سے کھڑے کھڑے اس پر گولی چلا دی۔ خاموش پستول کی گولی اسے بھی چاٹ گئی، وہ اپنے حلق سے آواز نکالے بغیر ہی زمین پر گر گیا۔

میں اپنا زخمی شانہ پکڑے فرش پر گر سا گیا تھا۔ شانے سے اب بھل بھل خون بہہ چلا جا رہا تھا۔

”ابے لے..... مگر یہ! یہ کیا کیا تو نے.....“ کالیا ایک دم میری جانب بڑھا اور مجھے زخمی دیکھ کر کرب انگیز لہجے میں بولا۔ سیٹھ ستار کا پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر لڑھک گیا تھا۔ وہ مجھے سنبھالنے لگا۔ میں نے ہونٹ بھیج کر اپنے حلق پڑتے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش چاہی تھی اور دانتوں تلے تکلیف کو سہتے ہوئے میں نے کالیا سے کہا۔

”مم..... میں ٹھیک ہوں..... مم..... مگر آگے کی صورت حال خراب ہے۔“

”دیکھ لیتے ہیں، پہلے تیری پٹی کتنا ضروری ہے۔“ اس نے ٹھکرے سے کہا ”تو پریشان نہ ہو مولا کا کرم ہے کہ گولی خطرناک جگہ پر نہیں لگی ہے۔“

اس نے سائنسنگر لگا پستول اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑوسا اور میرا پستول فرش سے اٹھا کر اسے بھی دوسری طرف اپنی بیلٹ میں اڑوس لیا اس کے بعد مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور خواب گاہ کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھٹک کر رکا۔ میں نے بھی اپنی نیم بازئی نظروں سے سامنے دیکھا۔ روزی کھڑی تھی۔

”اوہو..... اسے اندر لے چلو، میں تب تک ڈریسنگ کا سامان لاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف کو بڑھ گئی۔ کالیا مجھے سہارا دیے اندر خواب گاہ میں آ گیا جہاں خاصی روشنی تھی۔ اس نے میرے زخم کا جائزہ لیا اور بولا۔

”شکر ہے گولی گوشت چسپدی ہوئی نکل گئی ہے۔ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا ہے مگر زخم گہرا ہے۔ خون روکنا ضروری ہے۔“

تب تک روزی فرسٹ ایڈ کا ایک بکس اٹھا لائی۔ وہ جانے کب سے اپنے مقصد کی برادری کے لیے سیٹھ ستار کی رکھیل بنی ہوئی تھی جو اسے یہاں کی پوری آگاہی تھی۔

”تم ایک طرف ہو جاؤ.....“ اس نے باکس میرے قریب قالین پر رکھتے ہوئے کالیا سے کہا۔ ”میں ایک کوالیفائڈ نرس ہوں۔“

سی تیزی سے ٹوٹنے پایا۔ کمال مہارت سے ہی اس نے کچھ اس خاموشی اور کسی قسم کی بھی ”کٹھ بڑاہٹ“ پیدا کیے بغیر اس نے اپنے شاہکار کو اس طرح نہ صرف قابو کیا تھا بلکہ شاید اسے اغما غلیل بھی کر ڈالا تھا کہ صرف چند قدم آگے جانے والے اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنے اس تیسرے ساتھی کے شہر کا پتا بھی نہ چلا، اب وہی سایہ دہنے پاؤں دوسرے کی جانب لپکا تھا کہ نجانے دوسرے مسلح شخص کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے یکدم پلٹ کر دیکھا تو اس کے تعاقب میں آنے والے سامنے نے جو بلا شر کالیا ہی تھا، ایک دم اچھل کر اس پر جست لگادی اور اس کی ہوا میں اٹھی ہوئی لات دوسرے کے سینے پر اس زور سے پڑی تھی کہ وہ خاصا اچھل کر آگے جاتے ہوئے اپنے تیسرے ساتھی پر جا پڑا۔ دونوں دھڑام سے فرش پر آ رہے اور اسی وقت کالیا نے ان پر اپنا پستول تان لیا مگر دوسرے والے نے بھی یہ سرعت غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اپنی لات چلا دی۔ میں نے کالیا کو گرتے دیکھا اور ان دونوں کو اٹھتے تو میں خود کو نہ روک سکا۔ کیونکہ ان دونوں میں سے ایک نے اپنا پستول کالیا پر تان لیا تھا، کوئی بعد نہ تھا کہ وہ اس پر فائر بھی کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے پستول پر مجھے ایک لمبی نال ایچنڈ دکھائی دی تھی۔ بھینا کالیا بھی پل کے پل اس طرح خود کو موت کے سامنے دیکھ کر گنگم ہو گیا ہوگا۔ میں پلر سے ابھرتے ہی چلایا۔ ”خبردار! گولی مت چلانا۔“

وہ آدمی ٹھٹکا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ بے شک یہ اس کا ایک غیر ارادی رد عمل، یہ رہا ہوگا کہ اس نے اپنے پستول کا زرخ بھی میری جانب موڑ لیا تھا جب کہ میرے پستول کی نال کا رخ بھی اسی کی طرف تھا۔

مجھے پستول چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ بس تانے کھڑا تھا اور یہی میری بے وقوفی تھی، تاہم اس بے وقوفی نے مجھے خطرے میں ڈال کر کالیا کی زندگی بچا لی تھی۔ کیونکہ اس شخص نے اپنے پستول سے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ ”چوڑی“ کی آواز ابھری اور اس کے ”خاموشی“ پستول کی گولی میرے دائیں شانے پر لگی، مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کوئی سلاخ۔ سلگتے ہوئے انگاروں سے اٹھا کر میرے شانے میں کھوپ دی ہو۔ میرے حلق سے کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ ابھری اور آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا، میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیئے اور اسی دھندلائی آنکھوں سے میں نے کالیا کو اس پر جھپٹتے دیکھا۔ سائنسنگر لگا پستول حملہ آور کی بجائے اب کالیا کے ہاتھ

سینے کی کمائی ”اپنا گھر“ دلانے کے نام پر ہڑپ کی تھیں اور گنتوں کی جانوں اور عزتوں سے کھلیا تھا، عاصمہ کو اغوا کرانے والا بھی تو یہی ذلیل شخص تھا۔

”آہ..... ظالم! ات..... تو نے مجھے ایک آنکھ سے کاٹا کر دیا..... آہ..... میں مر گیا۔ میں دل کا مریض ہوں، یہ تکلیف نہیں برداشت کر سکتا۔“ وہ چیخنے لگا۔ ”میں مجھے اسپتال لے چلو۔“

”قبرستان جانے کی تیاری کر بے رحم اور بے حس آدمی!“ کالیا نے پڑپٹش لہجے میں اس سے کہا۔ ”اپنی ایک ذرا سی تکلیف اور ایک آنکھ سے محرومی پر تو یوں بلبلاتا تھا ہے اور جو دوسروں کے ساتھ تو نے حرام پائیاں کر رکھی ہیں اسے تو کس کھانے میں ڈالے گا؟“

سیٹھ ستار کے پاس اس کا جواب نہیں ہو سکتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ رن بستہ حالت میں اور بھی زیادہ اپنی آنکھ کی تکلیف کو محسوس کر رہا تھا کیونکہ وہ اپنے زخم کو چھو نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اپنی زخمی آنکھ پر ہاتھ رکھ پاتا تھا۔ خون اس کی پھوٹی آنکھ سے بہہ جا رہا تھا۔

کالیا نے روزی کو اشارہ کیا جسے سمجھتے ہی اس نے ایڈ باکس سے روٹی کا ایک بڑا سا پھانچا نکال کر کالیا کی طرف بڑھایا جسے اس نے تھوڑا گول کر کے اس کی آنکھ پر رکھ دیا تاکہ جریان خون بند ہو سکے۔

”بس سیٹھ! اب تیرا کھیل ختم ہوا۔ لیاری کے کون سے مکان میں تو نے ہماری بہن عاصمہ کو رکھا ہوا ہے؟ ہاں یا نہ میں جواب سنوں گا میں، اس سے زیادہ نہیں۔“ کالیا نے جتنی لہجے میں کہا اور اس کے سینے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”مم..... مجھے پپ..... پہلے اسپتال.....“ سیٹھ ستار نے کراہتے ہوئے صرف اسی قدر ہی کہا تھا کہ کالیا کے پاؤں کی ٹھوکراں کے پہلو میں لگی اور وہ تیل کی طرح ڈکرایا۔

”عاصمہ! بہن کے سوا کوئی اور بات نہیں سنوں گا کتنے! تو اسپتال کی امید کیسے لگا رہا ہے؟ کیا سمجھتا ہے تو ہم تجھے زندہ چھوڑ دیں گے، اب بھی تیرے اندر اتنا گھمنڈ ہے؟“ کالیا نے خون خوار لہجے میں کہا تو اس نے تکلیف سے ہانپتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر الفاظ بے ربط سے برآمد ہونے لگے۔ پھر وہ ترپنے لگا۔ جیسے اسے دل کا دورہ پڑنے لگا ہو۔

میری پیہ شانی بریک وقت انھیں اور فکر مند کی شکلیں نمودار ہو گئیں۔ کالیا مگر اس کے جھانسنے میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکراں کے

کالیا ایک طرف ہو گیا۔ روزی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے چند منٹوں میں میری ڈریسنگ کر دی ساتھ ہی پین کلر بھی کھلا دی۔ ایک انجکشن بھی بھر کر اس نے میری نرس میں لگا دیا۔ پھر کالیا کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”شکر ہے کوئی گوشت چھیدتی ہوئی نکل گئی ہے، اب جو کراتا ہے جلدی کر لو، ہم ابھی تک خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔“

کالیا ایک طرف کھڑا تھا۔ بولا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو عاصمہ کو یہ خیال بنا کر کہاں رکھا ہوا ہے؟“

”میں نے تمہارے ساتھی (مجھے) کو بتایا تھا کہ اس کی بہن عاصمہ کو لیاری کے علاقے میں کسی مکان میں رکھا ہوا ہے مگر اس کا پتا مجھے نہیں معلوم۔“

کالیا کچھ سوچ کر طوفانی بگولے کی مانند پلٹا اور انچ ہاتھ کے دروازے کو ایک لات رسید کر ڈالی۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد وہ سیٹھ ستار کے بھاری بھر کم وجود کو یوں گھسیٹتا ہوا خواب گاہ میں لے آیا جیسے قسانی کئے کوئی باغہ گنڈ بچھانے میں کھینچ لاتا ہے۔ کالیا نے فرسٹ ایڈ باکس سے وہ خالی سرخ اٹھالی جس کے ذریعے مجھے انجکشن لگایا تھا۔ اس میں سوئی (نیڈل) لگی ہوئی تھی۔ وہ اٹھالی اور رن بستہ حالت میں فرش بوس پڑے سیٹھ ستار کے سینے پر سوار ہو گیا پھر نفرت انگیز انداز میں ہونٹ سیکڑے سیٹھ ستار کو گھورتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”رزل کتنے! اس چالاکی کی میں تجھے سزا ضرور دوں گا۔“ کہتے ہوئے اس نے سرخ کو اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ایک آنکھ کے چوٹے کو کھولا اور سرخ کی سوئی سے اسی آنکھ کو پھوڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سیٹھ ستار مارے دہشت کے گھلیانے لگا۔

”نن..... نہیں رخ..... خدا کے لیے، یہ مت کر..... مم..... میری غلطی تھی، میں معافی مانگتا ہوں۔ مم..... میں اب سچ ہی بولوں گا۔“

”غلطی تھی تو پہلے تجھے اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔ باقی سچ تو اب تجھے بولنا ہی پڑے گا۔ وہ بعد کی بات ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے سرخ کی نیڈل سیٹھ ستار کی بائیں آنکھ میں گھونپ دی۔ خون کی دھاری بہنے لگی اور سیٹھ ستار کا وجود کالیا کے نیچے مابی بے آب کی طرح ترپنے لگا۔

قریب کھڑی روزی کے حلق سے سسکاری سی نکل گئی۔ خود میں بھی ایک لمحے کے لیے کالیا کی اس بربریت پر دم بہ خود سارہ گیا تھا لیکن سیٹھ ستار کے کالے کرتوتوں کے سامنے یہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس غیبت نے جانے کتنے غریبوں کے خون

پہلو میں رسید کر ڈالی اور دوسری پیٹ پر تو سیٹھ ستار نے اپنی اداکاری بند کر دی۔

وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ کالیا جیسے جفاور کو ڈانچ دینے کا مطلب تھا کہ خود کو اس کے زیر تشدد رکھتے ہوئے واقعی ایک عدد ہارٹ ایک کو دعوت دینا تھا۔ وہ بولا۔ ”بب..... بتانا ہوں۔“ اس نے لیاری کے اس مکان کا پتا بتا دیا جو کالیا کے ساتھ میں نے بھی ذہن نشین کر لیا۔ اس کے بعد کالیا نے سیٹھ ستار کو تہدید کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس بار یہ سب جھوٹ نکلا تو تیرا وہ حشر کروں گا کہ تجھے صرف موت میں ہی پناہ نظر آئے گی اور وہ تجھ سے دور ہوگی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ ہم تیری بات کی تصدیق کیے بغیر تجھے چھوڑ دیں، ابھی صبح کی گہما گہمی ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں۔ تب تک ہم تیرا جھوٹ جان لیں گے، بات سچ ہوئی تو ہم یہاں کارخ نہیں کریں گے اور تجھے صبح کا انتظار کرنا ہوگا۔ جب کوئی ملازم تجھے دیکھے گا۔ بہ صورت دیگر ہم دوبارہ یہاں آئیں گے اور پھر..... آگے تو جانتا ہے۔“ کالیا نے کہتے ہوئے تہدید ہی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور آخر میں بولا۔ ”اب بھی وقت ہے سچ بتادے، سمجھ لے کہ تو برا چھنسا ہے۔ سچ بولے بغیر کتنی نہیں ملے گی تجھے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں، خدا کی قسم کھاتا ہوں۔ ہم..... مگر مجھے اس حالت میں تو چھوڑ کر مت جاؤ، صبح تک جانے کیا ہو جائے میرے ساتھ، میں شوگر اور دل کا مریض ہوں۔“ اس نے کالیا کی منت کی جسے کالیا نے سنی ان سنی کرتے ہوئے روزی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کہاں جانا پسند کریں گی؟“

میں نے روزی کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور خوف کے ملے جلے تاثرات ہو رہے تھے۔ کالیا کا سوال اس نے جیسے خالی الذہنی کے عالم میں سنا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ کچھ ”آں..... ہاں.....“ کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مہ..... میں کہاں جا سکتی ہوں اب؟ اپنے گھر ہی جاؤں گی مگر.....“ کہتے ہوئے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور فرش پر جکڑ بند پڑے سیٹھ ستار کی طرف دیکھنے لگی۔ کالیا اس کی ابھمن سمجھ گیا۔ فوراً اس سے بولا۔

”تم ہمارے ساتھ آؤ اور یہاں سے اپنی تمام اشیاء بھی اٹھا لو جو یہاں بعد میں تمہاری آمد یا شناخت کی نشانی بن سکتے ہیں۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ کر جلدی جلدی اپنا مختصر سا سامان سیٹھ

ایک طبی تحقیق میں بتایا گیا کہ ایک ہفتے کے دوران ہستہ کی چادر ڈسٹ مائٹس، فنگل، فنگلے کے اجزائی، پلن اور مردہ انسانی غلیات سے بھر جاتی ہے اور اس طرح وہ ٹوائٹ سے بھی زیادہ جراثیموں سے بھر سکتی ہے۔ دن بھر میں اوسطاً ہر انسان سے 500 ملین غلیات کا اخراج ہوتا ہے جبکہ دیگر اجزاء بھی رات بھر ہستہ کی چادر پر جمع ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ڈسٹ مائٹس انسانی مردہ غلیات کو کھانا پسند کرتے ہیں۔ اگر چادر کو ہر ہفتے نہ دھویا جائے تو آپ خود کو سنگین وائرس اور انفیکشن کے خطرے کی زد میں لارہے ہوتے ہیں۔ جن میں جلد یا ذم کا انفیکشن، پیشاب کی نالی کی سوزش، نمونیا اور دوران خون کا انفیکشن قابل ذکر ہے۔ تحقیق میں ہر ہفتے ایک بار چادر کو دھونے کا مشورہ دیا گیا ہے یا یوں کہہ لیں ہفتے میں ایک بار اسے بدل ضرور دیں تاہم ایسا بہت کم افراد کرتے ہیں۔ چادر کو دھونے کے لیے گرم پانی کا استعمال کرنا چاہئے تاہم ایسا کرنے سے پہلے اس پر دیئے گئے لیبل پر ہدایات کو بھی ضرور دیکھ لیں۔ تاہم یہ واضح ہے کہ گرم پانی بیشتر جراثیموں کو ختم کرنے کے ساتھ ڈسٹ مائٹس کو نکال دیتا ہے۔ یہ تحقیق طبی جریدے برٹل آف الری ایڈیٹریل میں شائع ہوئی۔

مرسلہ: ابو عمر۔ ملتان
بچوں پر نیورسٹی کی تحقیق میں بتایا گیا کہ شام اٹھتے ہی کھانا نہ کھانا جسمانی وزن میں اضافے، لیڈ جٹا ہلڑ، اور امراض قلب سمیت ذیابیطس کا خطرہ بڑھانے کا باعث بن سکتا ہے۔ اس تحقیق کے دوران دو ماہ تک صحت مند افراد کے غذائی اوقات کا جائزہ لیا گیا۔ نتائج سے معلوم ہوا کہ جو لوگ رات گئے کھانا کھاتے ہیں، ان میں انسولین کی مزاحمت، کولیسٹرول میں اضافہ اور ذیابیطس کی گلیسڈ رکی سطح بڑھ پائی گئی۔ اسی طرح ہارمونز کے نظام میں بھی منفی اثرات دیکھنے میں آئے اور بھوک کو بڑھانے والے ہارمونز کی سطح میں تاخیر سے اضافہ دیکھا گیا۔ تحقیق کے مطابق ذیابیطس کی کے اثرات تو جسمانی وزن اور جٹا ہلڑ پر پڑتے ہی ہیں مگر رات گئے کھانا بھی صحت کے لیے فائدہ مند نہیں۔ محققین کا کہنا تھا کہ شام میں جلد کھانے سے مختلف امراض کا خطرہ کم کیا جاسکتا ہے جبکہ جسمانی توانائی اور ہارمونز کے نظام کو بھی بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تاخیر سے کھانا جسم میں گلوکوز اور انسولین کی مقدار بڑھاتا ہے جو کہ ذیابیطس جیسے مرض کا باعث بن سکتا ہے جبکہ کولیسٹرول اور ذیابیطس امراض قلب، فالج اور ہائی بلڈ پریشر جیسے جان لیوا امراض کا خطرہ بڑھانے والے عوامل ہیں۔

مرسلہ: شمیمہ خانم۔ ملتان

بل کے بل میں نے مزید کوئی لمحہ بھی ضائع کیے بغیر روزی سے کہا اور کالیا کے پیچھے بیٹھ گیا۔

جی تو او۔ ون ٹو فائیو کا داسا کی (اولڈ ماڈل) کی سیٹ خاصی دراز اور چوڑی تھی۔ کالیا کے پیچھے میرے بیٹھنے کے بعد بھی اتنی جگہ خالی تھی کہ روزی بھی پھنسا کر سہی خالص ”نسوانی انداز“ میں یعنی دونوں ٹانگیں ایک ہی سائیڈ پر رکھ کر بیٹھ گئی اور سہارے کے لیے اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ مجھے اس کے نرم و نازک وجود کا احساس ہوتا رہا مگر مجبوری کا نام ”شکریہ“ کے مصداق چل سوجھل۔

میرا خیال تھا کالیا، روزی کو ساتھ لے جانے پر معترض ہو گا مگر اس نے کچھ کہے بغیر ہی بائیک آگے بڑھادی۔ بائیک چلانے میں وہ ماسٹر تھیں۔ ایک جھٹکے سے اس نے بائیک آگے بڑھائی تھی کہ روزی میرے ساتھ مزید چپک گئی۔ بائیک ذرا ہی دیر میں ویران اور تاریک سڑک پر فرارے بھرنے لگی۔

لیاری میں اس دنوں حالات یوں بھی بہت کشیدہ تھے۔ جہاں مختلف اور بدنام زمانہ جرم تنظیمیں جولیا ری میں ہی نہیں بلکہ پورے کراچی میں ”لیاری کینگ وار“ کے نام سے جانی جاتی تھیں، اس کی دہشت اسی نام سے پورے کراچی پر طاری تھی۔ بلکہ اب تو اس کی شہرت کراچی سے باہر اور دیگر صوبوں تک میں پھیل چکی تھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔

یہاں ہر ایک نے اپنا علاقہ بنا ہوا تھا، جو دوسرے کے لیے ”نو گو ایریا“ کہلاتا تھا۔

دیگر علاقوں کے عام لوگ تو اس علاقے میں جانا تو کجا اس کے نام سے ہی کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے اور ہم رات میں اس طرف جا رہے تھے، جہاں دن میں بھی کوئی جانے سے گھبراتا تھا مگر مجھے تسلی تھی کہ میرے ساتھ کالیا تھا۔ جو بذاتِ خود بھی ایک ”کینگ وار“ ہی تھا۔

رات کے اس چہرہ ویران سڑکوں پر سناٹا چمک رہا تھا۔ کالیا بائیک کو طوفانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ وہ مائی کولا جی روڈ سے سیماڑی جانے والی سڑک پر آیا اور یہاں سے سیدھے ہاتھ کو ٹاور جانے والی روڈ پر مڑنے کی بجائے سیدھا ٹکڑا چلا گیا۔

راستے میں ایک دو پولیس موٹوں نے راستہ روکا تھا ہمارا۔ کالیا نے ان کے کان میں جانے کیا کہا تھا کہ انہوں نے کچھ زیادہ جگہ نہیں کیا اور ہم آگے نکل لیے تھے۔

لگی، جس میں پرس اور ہینڈی بیک اور ہاتھ روم میں جمولتے اس کے کپڑے وغیرہ تھے۔

کالیا پر سوچ انداز میں میرے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شاید کچھ سمجھتے ہوئے اپنی ایک آنکھ کی پھنڈوں کو اچکایا۔ یہ اس کا مخصوص اشارہ تھا، جیسے کسی بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد ہم کوشی سے باہر تھے اور اس سے آگے تقریباً دوڑتے ہوئے اس جگہ پر جا پہنچے جہاں ہم نے اپنی بائیک ایک تاریک گوشہ میں چھپا کر کھڑی کر رکھی تھی۔

”جگری! تو زخمی ہے۔ پہلے تجھے!“ کالیا نے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”کسی اور جگہ جانے کا وقت نہیں ہمارے پاس، روزی نے میری پٹی کردی ہے اور فرسٹ ایڈ دے دی ہے۔“ پھر میں قریب فکر مند کھڑی روزی سے بولا۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

ہم بائیک کے پاس ہی کھڑے تھے۔ کالیا گردشی نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔

”میں گلستانہ جوہر بلاک فور میں رہتی ہوں لیکن آپ میری فکر نہ کریں اور پلیز اپنی بہنا کو بچانے کی فکر کریں، میں چلی جاؤں گی اسے گھر۔“ روزی بولی تو میں نے کہا۔

”تمہیں تو رات کے اس پہر میں کوئی رکشایا جیسی بھی نہیں ملے گی؟“

”ابے! جگری! وقت گزرا چلا جا رہا ہے، جلدی کوئی ایک فیصلہ کر لے میں بائیک اشارت کرنے لگا ہوں۔“ کالیا اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور اس نے اپنی جی ٹو او۔ ون ٹو فائیو اشارت کر لی جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ یہ بائیک بیک وقت ٹک اور سیلف اشارت تھی۔

کالیا کا صاف مطلب تھا کہ اس نے روزی کی ”سر وردی“ میرے سپرد کر دی لیکن کالیا بھی شاید اس دورانِ اندیشی کا اندازہ نہیں لگا۔ کا تھا جس کا مجھے ہونے لگا تھا۔

روزی میرے لیے سینھ ستار کے خلاف تپ کا پتا ثابت ہو سکتی تھی۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ ٹھونے سے سے کھرا ہو سکتی تھی لیکن ایک حقیقت اور بھی اس کی ذات سے تھی تھی کہ اس کی اپنی جان بھی اب سخت خطرے میں تھی اس نے ہماری بہر حال مدد کی تھی اور اگر ہم آج کے آج عاصمہ بہن کو بازیا ب کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو

لا محالہ اس کا سہرا روزی کے ہی سر جاتا۔

”بیٹھو بائیک میں میرے پیچھے..... جلدی۔“

تھوڑا اور آگے جا کر ہم پھر دائیں جانب مڑے، اب ہمارے لائے ہاتھ پر لیاری ایک پھریس دے تھی اور ہم نیچے والی روڈ پر تھے۔ کیونکہ اس ہائی وے پر موٹر بائیکس کا داخلہ ممنوعہ تھا۔ یوں بھی ہم نے اس طرف جانا نہیں تھا۔ ہم میرا تاکہ جانے والی سڑک سے دائیں جانب بہار کالونی کی طرف مڑ گئے۔

علاقے میں سنائے اور ویرانی کا راج تھا۔ یوں بھی یہاں کے حالات کی وجہ سے سرشام ہی سناٹا طاری ہونے لگا تھا۔

اس کے بعد ایک گلی میں بائیک گھمانے لگے تو دو مسلح نوجوانوں نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس علاقے کا خوف میرے دل میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کالیانے بائیک روک دی۔ ”کون ہو تم لوگ؟“ ایک نے تو باقاعدہ اپنی کن کالیا کے سینے کی طرف تان لی تھی۔ میرا منہ خشک ہونے لگا۔ میرے پیچھے بیٹھی روزی بھی میرا کندھا تھامے کچھ اور دیکھ گئی۔ ”ہم مہمان ہیں فیاض جمالی کے، اس کے پاس آئے ہیں۔“ کالیانے بلا خوف اور خمیدگی سے کہا۔

”کون فیاض جمالی؟“ دوسرے نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ کالیانے بولا۔

”لاڈ کا ندوالے..... ساتھ ہی اس نے ایک اور نام بھی بتایا تو ہمیں جاننے کی اجازت مل گئی۔“

”کمال ہے یا رات کے اس پہر بھی یہ لوگ اس طرح پہرے پر ہیں جیسے یہاں دن پڑا ہوا ہے؟“ بائیک ذرا آگے نکلے ہی میں نے ہولے سے کالیانے کے کان میں تبصرہ کیا تو وہ بولا۔

”یہ لوگ صرف اپنے اپنے علاقے تک محدود بلکہ مجبوس رہنے پر مجبور ہیں۔“ کالیانے ایک تنگ سی گلی میں بائیک موڑتے ہوئے بتایا۔

”انہیں مطمئن کرنا آسان نہیں ہوتا جگہری! اگر ذرا سی غلطی سے بھی ان کے مخالف علاقے کے آدمی کا بھی نام لے لیا تو یہ ہمیں اپنے ساتھ ہی لے جاتے اور پھر ہماری واٹ لگا کر رکھ دیتے۔ ہمارا ایک آدمی محض اسی ذرا سی غلط فہمی میں مارا گیا تھا اور آج تک اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ اسی لیے یہاں آنے سے پہلے ہر علاقے کے کسی آدمی کا بغیر جانے... صرف نام ہی کافی ہوتا ہے۔ جوان کے علاقے سے بھی تعلق رکھتا ہو، چاہے وہ نیوٹرل ہی بندہ کیوں نہ ہو۔ اسی لیے اپنے استاد بھابھا کو جب بھی لیاری میں کسی کو بھیجتا ہوتا ہے وہ مجھے ہی یہاں

بھیجتا ہے۔“

”اوہ!“ میرے ساتھ اس صوتی تہرے میں ہم پہلے روزی نے بھی ساتھ دیا تھا۔

”اب کیا آگے بھی ایسے ہی لوگ ملتے رہیں گے؟“ میں نے پوچھ لیا۔

”ضروری نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ہماری منزل اسی علاقے میں ہے یا.....“ میں نے دانستہ اپنا جملہ اصورا چھوڑا۔

”ہاں! بس، آگئی منزل!“ اس نے جواب دیتے ہوئے ایک چھوٹی اور تنگ سی بندگلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی بائیک روکے بغیر ہی اس کا انجن آف کر دیا اور بائیک خاموش روٹی سے اپنے زور پر چلتی ہوئی مذکورہ گلی میں داخل ہو گئی، پھر ایک کونے میں لے جا کر اس نے روک دی۔

پہلے میں اور روزی نیچے اترے، اس کے بعد کالیا اتر ا اور اس نے بائیک کو سائیز اسٹینڈ میں کھڑا کر کے مجھے اور روزی کو ایک طرف کھڑے ہو جانے کا اشارہ کیا اور پھر بندگلی کے سیدھے ہاتھ والے آخری مکان کے دروازے کے قریب پہنچ کر ہلکے سے دستک دی۔ ساتھ ہی اس کی نظریں گلی کے سرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئیں۔ میں نے دیکھا مکان کے باہر دو تین اور بھی موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔

”یہ سالے تاش کی بازی جمار ہے ہیں شاید۔“ کالیا زیر لب بڑبڑایا۔ اس نے دوسری دستک ڈرا زور سے دی تو اس کے چند ہی سینکڑ بعد دروازہ کھلا۔

ایک ادیبیز عمری کالی اور دہلی پتلی فاقہ زدہ عورت برآمد ہوئی، اس کے ایک ہاتھ میں بیڑی دہلی ہوئی تھی۔ کالیا کو پہچان کر بولی۔

”اڑے چھو کر ایہ تو ہے، کالیا؟“

”ہاں! ماسی میں ہوں، ہٹ پرے اندر آنے دے۔“ جینکو اندر ہی سے ناں؟“ کالیانے کہتے ہوئے ہمیں بھی آنے کا اشارہ کیا۔ وہ سو گئی سڑی عورت ایک تیزی نظر روزی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد ایک طرف ہوتے ہوئے جواباً کالیا سے بولی۔

”ہاں! وہ اندر ہی ہے۔ آ جاؤ۔“

عورت صاف اردو بول رہی تھی مگر اس کا لب لہجہ سندھی اور بلوچی کا امتزاج محسوس ہوتا تھا۔ کالیا کے ساتھ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

سامنے مختصر سامن تھا۔ سامنے چھرا سا برآمدہ اور اس

کے ساتھ ساتھ دو کوٹھڑی نما کمرے تھے۔ دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے جبکہ ایک میں اندھیرا اور دوسرے میں روشنی تھی۔ سامنے سے ہی اندر فرشی نشست بچھائے چارہ پانچ افراد بیٹھے تاش کھیلنے میں لگے تھے۔ اندر سرگیت کا دھواں گردش کر رہا تھا۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا تھا، پھر ایک شخص جلدی سے ان کی محفل سے اٹھ کر کوٹھڑی سے باہر نکلا۔

”اڑے کالا! تو؟ خیریت.....!“ وہ خاصا دراز قامت اور دبلا پتلا مگر جنگجو سا دکھائی دیتا تھا۔ یہی شاید جینکو تھا۔ ”خیریت، ہوتی تو اس وقت تیرے پاس کیوں آتے؟“ کالیانے اس سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے کہا اور جینکو نے ایک نظر روزی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد ہمیں ساتھ والی کوٹھڑی میں آنے کا اشارہ کیا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ جینکو نے اندھیرے میں ہی کوئی سوچ ٹھولے بغیر ہی فوراً آن کر دیا اور بلب کی روشنی میں مجھے سائینڈ میں ایک چار پائی بھیجی نظر آئی۔ دوپچھی سی کرسیاں اور ایک بیچ نماسوفے سے مشابہہ کوئی بےشمی رکھی تھی۔

کالیانے روزی اور مجھے دو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود جینکو کے ساتھ اسی بیچ نماسوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ شاید پرانی سی کوئی ”سیٹی“ تھی۔

”ہاں!“ جینکو نے آواز لگائی۔ تموڑی دیر میں وہی ادھیر عمر موٹی عورت بیڑی کے کس لگائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ ”دوستوں کے لیے چائے تیار کر ٹاف اور پاؤں پلٹ بھی لے آنا۔“

وہ یہ سن کر دروازے سے ہی پلٹ گئی۔ ”یار، جینکو! یہ میرا دوست ہے نومی۔“ کالیانے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے میری طرف تعارفی اشارہ کیا۔ ”اس کی بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے، ہم اس کا سراغ لگاتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں، وہ مکان جہاں اس کی بہن کو زنجیر بنا کر رکھا ہوا ہے، وہ اس سے تین گلیاں چھوڑ کر چوٹی گلی میں واقع ہے۔ میں چاہتا تو وہاں اپنے بل بوتے پر بھی کارروائی کر سکتا تھا مگر تو جانتا ہے کہ اس علاقے کا معاملہ اور ہے، پرانی فلم گلے پڑتے دیر نہیں لگتی، اسی لیے سوچا پہلے تیرے سے مشورہ کر لیا جائے۔ بول، کیا کہتا ہے؟“

جینکو بڑے غور سے اس کی بات سنتا رہا تھا پھر ایک نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد کالیانے بولا۔ ”یہ جن ڈاڈا کا پاڑہ ہے، بد قسمتی سے یہ ہمارا حلیف ہے، بد قسمتی اس لیے کہ اسے دوست کے پاڑے میں اس طرح کی کلاروائی سے تعلقات خراب

ہونے کا خدشہ ہوتا ہے..... اور.....“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کالیا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”پھر تو رہنے پڑے یار! میں خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔“

”اڑے بابا! بیٹھ تو سہی، اتنا غصہ کیوں کرتا ہے۔ میں نے کوئی انکار تو نہیں کیا ہے۔ اپنا ہی پاڑہ ہے ناں، میں بات بنالوں گا۔ لے چائے آگئی۔“ اس نے آخر میں اس ادھیر عمر عورت کو ایک بڑی سی تھالی میں چار چائے کے کپ رکھے ہوئے تھا، اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

کالیا سر جھٹک کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ ہم سب نے چائے کا ایک ایک کپ اٹھا لیا اور خاموشی سے اس کی چسکیاں لینے لگے۔

”یار جینکو! جو کرنا ہے، صبح کی پہلی کرن پھیلنے سے پہلے ہی کرنا ہے، اس کی مجبوری بتانے کی مجھے ضرورت نہیں ہے، نہ ہی وقت ہے۔“

کالیانے چائے کی جلدی جلدی چند بڑی چسکیاں لینے کے بعد اس سے کہا تو جینکو نے کوئی جواب دیے بغیر اپنی میس کی پہلو والی جیب سے سل فون نکالا اور کسی کے نمبر شیج کرنے لگا۔

رابطہ ہوتے ہی وہ بلوچی میں کسی سے کچھ پوچھنے لگا۔ یہ گفتگو بے مشکل پانچ، چھ منٹوں تک جاری رہی اس کے بعد وہ ایک نظر میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد بولا۔

”یہ مکان بھوکا ہے۔ ڈاڈا کا خاص آڈی ہے اور جو لوگ لڑکی لے کر وہاں آتے ہیں۔ وہ دو افراد ہیں، پرویز اور لالی۔ یہ دونوں بھوکے دوست ہیں۔ مجھ کو اس وقت وہاں نہیں ہیں اور ان دونوں میں سے بھی صرف ایک ہی وہاں موجود ہے، یعنی لالی۔ موقع اچھا ہے اگر ہم خفیہ کارروائی کریں تو یہ معاملہ رازداری سے ہی ختم جائے گا۔“

”تب پھر، میں تیرے ساتھ ہوں۔“ کالیا اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کالیا مجھ سے بولا۔

”تو ادھر ہی ٹھہر جگڑی! زخمی ہے تو۔“ ”نہیں میں بھی چلوں گا، ٹھیک ہوں میں۔“ میں نے حتی لہجہ میں کہا۔

جینکو کھڑا ہو گیا۔ کالیانے اس سے روزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ روزی ہے، ہماری ساتھی سمجھ لو۔ یہ ادھر ہی بیٹھے گی اگر ہمیں قہقہہ ہوگی تو اس کے گھر بھوانے کا بندوبست کر لیتا۔“

”اس کی فکر نہ کر، سمجھو یہ باخیریت پہنچ گئی اپنے گھر۔“
جینکو روزی کی طرف دیکھ کر بولا۔ پھر کالیا نے ابھی روزی سے
مخاطب ہو کر کہا۔

”ہمیں نہیں معلوم کہ اس کام میں ہمیں کتنا وقت لگ
جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں آئے بغیر ہم آگے نکل
جائیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، صبح ہوتے
ہی یہ تمہیں، تمہارے گھر تک پہنچا دیں گے۔“

روزی نے ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی
تھی۔ میں نے احتیاطاً روزی کا کونٹیکٹ نمبر لے لیا تھا اور اسے
اپنا دے دیا تھا۔

اس کے بعد ہم تینوں صحن میں آ گئے۔ جینکو دوسری
کوٹھڑی میں گیا جہاں اس کے دوست تاش کھینے میں مصروف
تھے۔ جب دوبارہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک لمبا ترنگا سا لڑکا
تھا۔ دونوں سب تھے۔ یعنی جینکو کے ہاتھ میں بھی اب ایک
پستول نظر آ رہا تھا جسے وہ اپنی کھلے گھیر والی قمیض کو اٹھا کر نینے
میں اڑوس رہا تھا۔
مجھے اب اپنے بازو کے زخم میں تکلیف کم ہی محسوس
ہو رہی تھی۔

ہم چاروں مکان سے باہر آ گئے۔ مکان سے باہر
کھڑی دو مین چائنا کی یونیک موٹر سائیکل کھڑی تھیں۔ ان
میں سے ایک پر وہ دونوں سوار ہو گئے اور اپنی بائیک کالیا
نے سنبھال لی۔

لیاری کا علاقہ تنگ اور بھل بھلیوں پر مشتمل ہے۔
دو گلیوں کے بعد بقول جینکو کے، ان کے حلیف کا علاقہ شروع
ہو چکا تھا مگر جینکو ہمیں ایسے راستے سے لے کر نکلا تھا جہاں ہم
میں سے کوئی بھی ان کے کسی جاسوس کی نظروں میں نہ آ سکیں۔
بالآخر ایک گلی میں داخل ہوئے تو اس کے سرے پر ہی
ایک مکان کے سامنے ہم نے اپنی بائیکیں روک لیں اور نیچے
اتر آئے۔

گلی سنان اور تاریک تھی۔ کالیا نے ہی نہیں بلکہ اس
کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق جینکو بھی اس مکان کو پہچان
چکا تھا جو کسی مجنونا کی ملکیت تھا۔

جینکو نے اپنے آدمی اور مجھے ادھر ہی کھڑے رہنے کا کہا
اور اپنے چہرہ پر تھاب چڑھانے لگے تو میں نے فوراً کہا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ اندر چلوں گا۔“ کالیا تو
خاموش رہا مگر جینکو مجھے سمجھاتے ہوئے لہجے میں
بولا۔ ”دوست! تمہیں یہاں کی خطرناکی کا اندازہ نہیں ہے، ذرا

سی بھی گڑبڑ سے یہاں گینگ وار چمڑکتی ہے۔ پورا علاقہ
میدان جنگ بن جائے گا۔ ہم الگ مارے جائیں گے۔ یہ
کراچی کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف علاقہ ہے اور پھر ہم
اپنے ہی ایک حلیف پاڑے میں موجود ہیں۔ اصولاً یہی ہوتا
ہے کہ اس نازک معاملے کے لیے پہلے ڈاڈا سے بات کرنی
چاہیے ہمیں مگر اس میں رسک ہے کہ کام ہوتا ہے نہیں، اسی
لیے یہ خطرہ بھی میں نے محض دوستی سے مجبور ہو کر صرف کالیا کی
خاطر مول لیا ہے، ڈاڈا کو اگر معلوم ہو گیا کہ اس کے علاقے
میں یہ کارروائی میں نے کی تو ہماری یہ دوستی دشمنی میں بدل
جائے گی۔“

اس کی بات پر کالیا نے بھی مجھے سمجھایا اور میں خاموش
ہو گیا۔ اس کے بعد جینکو نے کالیا سے کچھ کہا اور اپنے چہرے
پر آنکھوں کے نیچے رومال باندھ لیا۔ کالیا نے بھی یہی کیا اور
پھر وہ اس مکان کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔
میری اپنی دھڑکتی نظر میں اس منحوس مکان کے بند
دروازے پر جم کر رہ گئی تھیں، جس کے اندر مبینہ طور پر عاصمہ
یرغمال بنا کر رکھی گئی تھی، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی آگے
بڑھ کر اس مکان کو آگ لگا دوں۔

بڑی عجیب و غریب ذہنی کیفیات سے میرا دل و دماغ دو
چار تھا۔ یہ سوچ سوچ کر ہی مجھے ہول سے آرہے تھے کہ اس
غیبیت مردود نے میری مصحوم، بہن کو کیسے خطرناک علاقے میں
پہنچا دیا تھا۔ اب جانے وہ بے چاری اندر کس حال میں ہوگی۔
میں اس کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ سکتا تھا اور کالیا بھی
شکر گزار ہو رہا تھا کہ اس کی مدد سے بالآخر ہم اب عاصمہ کو اس
جہنم سے باہر نکالنے ہی والے تھے۔

میں، جینکو کے ساتھی کے ساتھ ہی کھڑا تھا اور دروازے
سے زیادہ دور نہیں تھے۔

جینکو کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں نے بھی اپنے
چہرے رومال سے ڈھانپ لیے تھے۔

میں نے دیکھا کہ جینکو نے دروازے پر دستک دی تھی
اور اس کے تھوڑی دیر بعد اندر سے شاید کسی کی آواز ابھری تھی
جس کے الفاظ تو میں نہیں سمجھ پایا تھا مگر آہنگ سے اندازہ لگایا
تھا کسی نے کچھ پوچھا تھا جس کے جواب میں جینکو نے اپنی
آواز بدل کر بچو کے حوالے سے کچھ کہا تھا، اس کے بعد دروازہ
جیسے ہی کھلا میں نے جینکو اور کالیا کو بیک وقت پستولیں نکال کر
اندر گھستے دیکھا اور عقب میں دروازہ بند کر لیا گیا۔

میرا دل تو زور زور سے دھڑک رہا تھا اور توقع طور پر اپنی

وہ کیمین کی آڑ سے نکلا اور میں بھی۔ ہم نے اپنی اپنی ساتھیوں کی ہانگیں سنبھالیں اور ہینڈل سے تھامے ایسے ہی گلی سے باہر کھینچے ہوئے چل پڑے۔

میں بری طرح تشویش کا شکار ہو گیا تھا۔ اندر میرے ساتھیوں کی بی نہیں بلکہ میری مصہوم بہن عاصمہ کی زندگی بھی داؤ پر لگ چکی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت کوئی گھمسان کارن پڑنے والا تھا۔ دونوں ہانگیں گلی سے باہر لے جا کر ذیلی سڑک کے کنارے کھڑی کرنے کے بعد ہم دوبارہ گلی میں پلٹے تو اس نے اپنا پتہ تول نکال کر مجھ سے پوچھا۔

”تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”تم پھر ادھر ہی ٹھہرو۔“ اس نے مجھے گلی کے کنارے پر کھڑے رہنے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی، میں بھی اس کے پیچھے دوبارہ اندر گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا، اس کا رخ مکان کی طرف تھا۔

اسی وقت گولی چلی۔ میں بری طرح ٹھنک گیا۔ مکان کی طرف دیکھا تو اس کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ میرا ساتھی بہت دھیرے دھیرے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسی وقت تلے اوپر دو تین اور فائر ہوئے۔ میری تشویش و پریشانی فزوں تر ہونے لگی۔ میں بھی دھڑکنے دل کے ساتھ گلی کی دیوار سے لگا مکان کی طرف سرکتا چلا گیا۔ میں بالکل نہتا تھا۔ اندر میری بہن اور کالیا کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

اسی وقت مجھے ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی اور میں نے پھر ساری احتیاط اور خوف بھلا کر مکان کی طرف دوڑ لگا دی۔ ابھی دروازے کے قریب یہ پہنچا تھا کہ کوئی مجھ سے ٹکرا کر گر گیا۔ وہ زخمی اور خون میں لت پت تھا۔ میری پھلکی ہوئی آنکھیں اس پر جم گئیں، وہ مخالف پارٹی کا کوئی شخص تھا۔

ابھی میں اس کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اندر سے مزید دو افراد فائرنگ کرتے ہوئے نکلے میں کیمین کی طرف بھاگا اور اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔

وہ متوقع طور پر مجھ اور اس کا کوئی ساتھی دونوں مکان کے اندر کی طرف فائرنگ کرتے ہوئے باہر نکلے اور دائیں بائیں پوزیشنیں سنبھال لیں۔

اب انہوں نے اندر کالیا وغیرہ کو گویا محبوس رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہیں پتا تھا کہ مکان کے اندر کتنی لاشیں گر چکی

ہیں کو جلد بازیاب کرانے کی اس کوشش پر میں خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔ تاہم دل کو تا معلوم اور اندیشناک خطرات کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا۔

دو دونوں اندر داخل ہو چکے تھے اور میں جینکو کے ساتھی کے ساتھ گلی کے اندر ہی ذرا سرے پر ہو کر کھڑے تھے۔ البتہ ان کے جاتے وقت جینکو نے اپنے ساتھی کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ ذرا سی بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو ہمیں سیل پر اطلاع کر کے خود اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور کھڑے ہو جانا۔

ایک ایک لمحہ بھاری سیل کی طرح گزرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی کچھ گڑبڑ ہونے والی ہو۔

کالیا اور جینکو کو اندر گئے ہوئے ابھی چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ دفعتاً ہی ہمیں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں، میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ساتھ کھڑے جینکو کے ساتھی کی طرف دیکھا، وہ بھی روشنی کو دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا اور جلدی سے قریب ایک پان سگریٹ کے کیمین کی طرف سرک گیا، جو بند پڑا تھا، میں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی اور ہم دونوں اس کی آڑ میں جا کھڑے ہوئے۔ روشنی قریب آتی گئی اور خیال تھا کہ وہ کسی بھی گاڑی کی ہوگی تو وہ آگے نکل جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا، وہ پرانے ماڈل کی کار تھی اور اندر ہی اسی گلی کی طرف مڑ رہی تھی اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی، میں دھک سے رہ گیا اور ساتھی کی طرف دیکھنے لگا، وہ خود پریشان نظر آ رہا تھا جبکہ اس نے کار کے اندر گلی میں مڑتے ہی اپنا سیل نکال لیا تھا، وہ شاید اندر کالیا کے ساتھ موجود اپنے ساتھی جینکو کو خبردار کرنا چاہتا تھا۔

رابطہ ہوتے ہی اس نے سرگوشیاں سے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے ہیں، باہر کار میں موجود ہیں، اس میں تین افراد اور نظر آرہے ہیں۔ ایک تو مجھ ہی لگتا ہے، دوسرا اس کا ساتھی بنو باا ہے۔ تیسرا انجینی ہے کوئی، وہ شاید مکان کے اندر کے موجود لالی نام کے آدمی کا ساتھی پرویز ہی لگتا ہے، او..... ہوشیار دبا شد! یہ تینوں کار سے اتر کر مکان کے دروازے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ایک دھمپنا نظر آرہے ہیں لگتا ہے، انہیں کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے، انہوں نے اب پتہ توں بھی نکال لی ہیں۔ کیا؟ اچھا..... ٹھیک ہے۔“

یہ سب بتانے اور دوسری جانب سے کچھ نہ کر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم اپنے ساتھی کی ہانگیں سنبھالو مگر اشارت کیے بغیر اسے گلی سے باہر لے چلو، جلدی۔“ یہ کہتے ہی

ہوں گی جبکہ میں عاصمہ اور کالیا کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ رہا تھا۔

مجھ اور اس کا ساتھی لب کھلی کے باہر سے فائزنگ کر رہے تھے۔ یہی دھڑکا مجھے بھی لگا ہوا تھا کہ ہمیں ان کی جھ پر نظر نہ پڑ جائے، مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ بوجا پتی جیب سے خون نکال کر کسی سے باتیں کرنے لگا، وہ شاید مدد کے لیے اپنے ساتھیوں سے رابطے کی کوشش میں تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی فائزنگ کرتا رہا اور ساتھ ہی وہ اسی جانب سرک آیا جدھر میں اندھیرے میں دبکا ہوا کھڑا تھا۔

مجھ سے اب ہاتھ پر ہاتھ باندھ کھڑا نہیں ہوا جا سکا وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اور یہی وہ وقت تھا جب میں اس پر حملہ کرنے کا کوئی حربہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ وہ میری جانب گھوما اور اسی وقت میری ایک لات حرکت میں آئی، وہ میرے بالکل قریب آچکا تھا، یہی سبب تھا کہ میری لات ٹھیک اس کے پیٹ پر اس زور کی پڑی تھی کہ وہ لڑکھڑاکر گئی کی دیوار سے ٹکرا کر گرنا تو اس کا پتول چھوٹ گیا۔

میں اس کے پتول پر چھپنا، اس نے لات لات کر دی، جس سے الجھ کر میں اس کے بالکل قریب گر۔ وہ کوئی زیادہ گھڑا نہیں تھا، تاہم بیدار مغز اور پھر تیزا ضرور تھا۔ اس نے زمین پر لیٹنے لپٹے، یہی تڑپ کر مجھ پر چھپنا مارنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے دوسری لات اس کے چہرے پر رسید کر دی اور اسی وقت میرا ہاتھ زمین پر گرے پتول سے ٹکرایا، جو میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اٹھایا اور اس کی ٹال کا رخ اس کی جانب کرتے ہوئے ٹرائیگروں پر ڈال دیا۔

بلاشبہ یہ میرا اپنے تحفظ کے لیے ایک غیر ارادی رد عمل تھا۔ ٹھانیں کی آواز سے گولی چلی جو اس کے پہلو میں لگی، وہ کریمہ انگیز جج کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حوصلہ پاتے ہی میں پتول ہاتھ میں لیے اٹھا تو مجھ کو اسی طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔ میں نے اس پر بھی گولی چلا دی۔

وہ جج مار کر لڑکھڑاکر گرنا اور پتول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پے تاریکی میں جا کر۔ مجموعی کم ہوشیار تھا، وہ اٹھ کر پھر دوڑا مگر اس بار وہ لٹکڑا کر دوڑ رہا تھا اور بار بار گرون موڑ کر میری جانب بھی دیکھتا جاتا تھا، میں نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کی ہدایت کے مطابق چہرے پر دو مال کا نقاب باندھ رکھا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا مگر سامنے آنے سے پہلے

میں نے کالیا کو آواز دی تھی، تاکہ وہ کسی شے کی بناء پر مجھ پر ہونے والی گولی نہ چلا دیں۔

اندھ سے کالیا نے بھی مجھے آواز دی اور پھر میں اندر داخل ہو گیا۔ سامنے مچن میں ہی دولاشیں پڑی نظر آئیں، تیسرا کوئی زخمی حالت میں بے ہوش تھا۔ جینکو نے اپنے ایک زخمی ساتھی کو سنبھال رہا تھا جبکہ کالیا نے عاصمہ کو تھام رکھا تھا، وہ بری طرح خوف زدہ اور ڈری کبھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ”بھائی جان“ کہہ کر میری جانب لپکی۔

”جلدی نکل چلو، اس سے پہلے کہ ان کے ساتھی یہاں پہنچ جائیں۔“ جینکو نے کہا۔

میں نے عاصمہ کو اپنے ساتھ لگا لیا اور پھر ہم باہر آ گئے۔ بائیک پر کالیا اور میں سوار ہو گئے، عاصمہ کو میں نے اپنے پیچھے بیٹھا لیا تھا جبکہ جینکو اپنے زخمی ساتھی کو جو ہوش میں ہی تھا، بائیک پر بیٹھا کر فوراً روانہ ہوا تو کالیا نے بھی اپنی بائیک بھگائی۔

تھوڑی دیر بعد ہم اس کے مکان میں تھے۔

اب مسئلہ روزی کا تھا۔ جینکو نے اپنی ایک اضافی بائیک ہمیں دے دی جو کالیا نے سنبھال لی۔

جینکو نے ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکل جانے کی ہدایت کی تھی، کالیا کی بائیک میں نے سنبھال لی تھی اور عاصمہ کو پیچھے بیٹھا لیا تھا۔ جینکو نے کالیا کو یہاں سے نکلنے کا ایک سیدھا اور محفوظ راستہ بتا دیا تھا۔

ہم اسی راستے پر روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر کالیا گلستان جوہر کی طرف مڑ گیا اور میں نے لپیر کا راستہ پکڑا۔ کالیا نے مجھ سے جدا ہوتے وقت کہا تھا کہ وہ روزی کو چھوڑ کر سیدھا وہیں پہنچے گا۔

سڑکیں سناں تھیں اور میں کالیا کی طاقتور بائیک دوڑاتا ہوا لپیر پہنچا اور اپنے گھر کے دروازے پر ہی بائیک لے جا کر دم لیا۔ زخمی بازو کے باوجود مجھے بائیک چلانے میں کوئی خاص مشکل درپیش نہیں آئی تھی۔

میں نے جلدی سے عاصمہ کو اترنے کا کہا اور پھر خود اتر کر بائیک کو سائیڈ اسٹینڈ پر لگایا اور پھر اسے لاک کر کے عاصمہ کو سنبھالے گھر کے دروازے پر لگے تالے کو کھولا پھر دروازہ دھکیل کر عاصمہ کو اندر کیا اور اس کے بعد خود بھی جلدی سے اندر آ گیا۔ دروازہ عقب میں بند کر کے ہم کمرے میں آ گئے اور پھر عاصمہ بے اختیار دفور جذبات تلے میرے سینے میں اپنا سر رکھنے زار و قطار رو دی۔

نے لٹڑے بنالیے تھے اور روٹیاں بھی اتاری تھیں، بریڈ بھی تھی اور رات کا بچا ہوا سالن بھی تھا۔

ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد کالیا نے جانے کی اجازت چاہی۔ عاصمہ نے ہی نہیں بلکہ میں نے بھی کالیا کا ساتھ دینے پر شکر یہ ادا کیا تو وہ اپنا سر جھٹک کر سکرارتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جگری! دوستوں میں اس طرح کی شکرے شکایتیں والی مرد میں نہیں چلتیں، بس ایک دوسرے کے کام آتے رہنا ہوتا ہے۔ اور پھر دیکھا جائے تو عین آخر میں جب کام بگڑنے لگا تھا، تم نے ہی اسے سنبھالا تھا اگر تم مجھ کو بروقت زخمی کر کے بھاگنے پر مجبور نہیں کرتے تو صورت حال شاید اس سے مختلف ہوتی۔ خیر! اسی طرح مل جل کر کام چلتا ہے جگری! چلتا ہوں، ہل ملوں گا اور بہت سی باتیں کرنا ہیں، میں بھی ذرا جا کر آرام کروں۔“

وہ چلا گیا۔ میں اور عاصمہ کمرے میں آگئے۔ میں نے چائے بنالی تھی، غسل کرنے اور کچھ کھانی کر اس کی حالت بھی کافی سنبھل گئی تھی مگر جھکن اور پیش آمد حالات نامساعد کے باعث اس پر بری صحن اور بے آرامی کے آثار کا غلبہ نظر آ رہا تھا، خود میں بھی تھکا ہوا تھا، اب صبح بھی ہونے والی تھی۔ اس لیے میں نے عاصمہ کو آرام کرنے کا کہا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی، عاصمہ جاگ گئی تھی۔ وہ میرے لیے ناشائنا کر لے آئی۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر رست و اج میں وقت دیکھانے کے بارہن رہے تھے۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے پہلے ایک دو فون کیے اور کالیا سے بھی رابطہ کیا اس نے مجھ سے کہا کہ وہ میری (اس کی) بائیک لاری اڈے پر ہی لے آئے جبکہ جینگو کی بائیک وہ خود جا کر اسے دے آیا تھا۔

ناشتے سے فراغت کے بعد میں نے عاصمہ سے کہا۔

”عاصمہ! یہ سب کچھ بہت اچانک ہی ہوا تھا کہ مجھے کافی دیر تک تو یقین ہی نہیں آیا کہ تم اس طرح یک دم گھر سے غائب ہو گئی ہو، مجھے یقین تو تھا کہ کسی نے بڑی پلاننگ کے ساتھ تمہیں اغوا کیا ہے مگر۔۔۔۔“

”مگر کیا بھائی جان؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”مگر میرے سمجھانے کے باوجود، فہم کو اس کا یقین نہیں آیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں بھائی جان کہ وہ کیا سمجھ رہا ہوگا مگر اصل حقیقت وہی ہے جس کا آپ کو ادراک ہوا تھا۔“ عاصمہ

میں اس کا سر پیار و شفقت سے تھپکتا ہوا ہنڈ پر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھا دیا۔ خود میری اپنی آنکھیں میٹکی ہوئی تھیں اور ہم دونوں بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے سے لگے، غلوں اور دکھوں کے خار و خس آنسوؤں میں بہا کر نکلتے رہے، جب دل و دماغ کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو میں نے اسے سہارتے ہوئے دھیرے سے الگ کیا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا جو چند ہی روز میں کھلا کر رہ گیا تھا۔

بہن کا سنا ہوا چہرہ، بکھرے ہوئے کچھڑی سے بال اور اس کی اجڑی اجڑی سی آنکھوں کے میں آباد دم شدہ سے ویران مسکن کو دیکھ کر میں کچھ سوچ کر اندر سے دہل بھی گیا اور اسی وقت میں نے قسم اٹھائی کہ اگر میری معصوم اور پاکیزہ بہن کی عصمت پر ذرا بھی کسی نے شب خون مارا ہے تو میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے تڑپا تڑپا کر ہلاک کروں گا۔

”بھئی جان! آپ زخمی ہیں؟“ معافی اس کی نگاہ میرے دائیں شانے کے زخم پر بندھی پئی پر پڑی تو میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

”معمولی زخم ہے، پٹی کر لی ہے۔ کافی افاقہ ہے۔ فکر نہ کرو۔“

”بھئی جان! وہ۔۔۔۔۔ نف۔۔۔۔۔ فہم بھائی نظر نہیں آرہے ہیں؟“ وہ پھر متلاشی نگاہوں سے اطراف میں دیکھتے ہوئے ہولے سے مستفسر ہوئی تو میں نے اس سے کہا۔

”عاصمہ! وہ مجھ سے ناراض ہو کر نہیں چلا گیا ہے۔

فون بھی نہیں رسیو کر رہا ہے، شاید اپنے کسی دوست کے ہاں گیا ہوا ہے، تم فکر نہ کرو میں کسی دن جا کر اسے لے آؤں گا۔ تم بتاؤ بہن! تم ٹھیک تو ہوتی؟“

”میں ٹھیک ہوں بھائی جان!“ وہ دھیرے سے اپنا سر جھکا کر بولی تو میں نے کچھ سوچ کر دوبارہ پیار بھرے لہجے میں کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم بے خیریت گھر پہنچ گئیں۔ تم اب پہلے غسل وغیرہ کر کے کپڑے بدل لو، میں تب تک تمہارے لیے کھانا لگاتا ہوں۔“

میں نے ابھی اپنا ہاتھ منہ دھو کر لباس بدلا، کیونکہ میری قمیص میں خون لگا ہوا تھا۔ پٹی اب نئی قمیص کے اندر چسپ گئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد کالیا بھی آگیا۔ اس کے پاس جینگو کی دی ہوئی بائیک تھی۔

گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود ہی رہتا تھا۔ میں

نے دکھی دکھی سے لہجے میں اپنا سر جھکا کر کہا تو میں نے اسے ازراہ تشفی کہا۔

”تم پریشان نہ ہو، اب تو فہیم کو یقین آ جانا چاہیے۔“
پھر..... ذرا ایک توقف کے بعد اس سے مستفسر ہوا۔ ”یہ بتاؤ آخر یہ سب ہوا کیسے تھا؟ مجھے تو حیرت ہے کہ ہمارے گھر میں اس طرح چھپ چھپاتے کس طرح انگو کاروں نے نقب لگائی تھی کہ ہم تینوں میں سے کسی کو اس کی کانوں کان تک خبر نہ ہو سکی؟“

میں نے عاصمہ کو بتا دیا تھا کہ اس کے انگو کے پیچھے کس شخص کا ہاتھ تھا اور نیز یہ بھی کہ میں نے کس طرح اپنے دوست کالیا کی مدد سے یہ مہم سہی گئی، وغیرہ۔

عاصمہ نے اپنے تئیں کچھ صراحت بتانے سے پہلے دکھی سے لہجے میں کہا۔ ”بھائی جان! مجھے آپ پر تو یقین تھا کہ آپ وہی سمجھیں گے جو حقیقت تھی مگر فہیم بھائی کی سوچ کا مجھے پہلے ہی ادراک تھا۔ کیونکہ وہ بہت پہلے ہی میری طرف سے اسی غلط فہمی کا شکار رہ چکے تھے، بالآخر انہوں نے یہی سمجھا جو ان کی سوچ تھی جبکہ ایسا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، اب میں آپ کو حقیقت بتاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا توقف کیا اور آگے بولی۔ ”یہ اتفاق ہی تھا کہ اسی روز کاشف بھی مجھ سے ملنے آیا تھا مگر یہ کوئی باقاعدہ ملاقات نہ تھی۔ بس! وہ دروازے پر ہی آیا تھا اور یہ خوش خبری دینے کے لیے کہ اس کے والدین اگلے دن شام ہمارے ہاں آنے والے تھے۔ میں خوش تھی۔ اس کے جاتے ہی، ایک اور شخص دروازے پر آیا میں یہی سمجھی کہ شاید کاشف کوئی بات بھول گیا تھا اور دوبارہ کچھ بتانے آیا تھا، اسی لیے میں ہی دروازے پر گئی تھی، وہ ابھی ہی تھا اور مجھ کے کسی کا پتا لو جھا، میں اسے نہیں بتا سکی وہ چلا گیا، اس کے بعد رات کو سونے کے لیے میں اپنے کمرے میں آئی، آپ اور بھائی سوچے تھے جبکہ میں اپنے کمرے میں رات دیر تک جاگتی رہی، مجھے جانے کیوں اس رات نیند ہی نہیں آرہی تھی اور دل بھی نجانے کیوں عجب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ خوشی کا بھی عنصر تھا کہ کل کاشف اپنے والدین بھیجنے والا تھا اور میں اس غمخیز تھی کہ پتا نہیں ان کی بات آپ اور بھائی فہیم قبول کرتے بھی ہیں کہ نہیں، تاہم مجھے امید تو تھی کہ کم از کم آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔

رات کا شاید وہ آخری پہر تھا جب کسی کھٹکے پر میں چوکی تھی، آواز سن سے ہی آئی تھی، پہلے تو میں یہی سمجھی کہ کوئی بی

صحن میں گئی تو دو انسانی سائے بیک وقت مجھ پر پڑے، میں نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نے کسی دوا میں ہینگا وا رو مال میری ناک سے لگا دیا، پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ بس، بھائی جان! اس کے بعد تب سے اب تک میرا وقت خوف و دہشت میں بیتا رہا۔ کتنے ہی عذابوں سے میں گزری لیکن بھائی جان! خدا گواہ ہے میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا، اگر ایسا ہوتا تو، میں خود کی کر سکتی۔“

اتنا بتا کر وہ سسکنے لگی، میں نے پیار اور حوصلہ آمیز انداز میں اس کا سر اپنے شانے سے لگایا۔

”بھائی جان! فہیم کون تو کریں، انہیں بتا دیں کہ میں گھر آ چکی ہوں اور میرے ساتھ ہوا کیا تھا؟“ عاصمہ نے آخر میں ذرا سنبھلتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں بولا۔ ”میں کئی بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا ہوں، میں اب صرف صبح کر رہا ہوں اسے کہ تم گھر آ چکی ہو۔“

”ٹھیک ہے بھائی جان! جیسا آپ بہتر سمجھیں۔“ عاصمہ نے اترے اترے چہرے سے کہا، میں جب فہیم کو اہل ایم ایس کر چکا تو عاصمہ مغموم سے لہجے میں بولی۔ ”بھائی جان! یہ فہیم بھائی آخر اتنا بدل کیوں ہو گئے ہیں؟ پہلے تو ایسے نہیں تھے وہ؟“

میں نے بھی ایک آزدہ سی ہکاری بھر کر کہا۔ ”ہاں! لیکن اس میں بد قسمتی سے تصور کچھ ہمارے حالات کا بھی ہے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ انہی دنوں محلے میں منے میاں (خورشید خاں) کی بیٹی ثوبہ کا بھی اسی طرح کا چکر اور پھر انہو ہوا تھا، بعد میں وہ ماری گئی یا اس نے خودکشی کر لی۔

واقعہ بہر حال لرزہ خیز ہی تھا، فہیم کا خیال یہی تھا کہ یہ منے میاں کی بیٹی کے ساتھ سوچی سمجھی انکسیم کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا اور یہ آوارہ اور ادبائش لڑکوں کا کوئی ٹولہ ہے، جن کا کام ہی یہی ہے، ابھی اس واقعے کو ایک ادھ دن ہی گزرا تھا کہ تمہارا لاشوا کھڑا ہوا تو فہیم بری طرح خائف ہو گیا۔“

عاصمہ بولی۔ ”آپ کی بات صحیح بھی لگتی ہے بھائی جان کہ فہیم کا اسی لیے مجھ سے اس قدر دل خراب ہوا۔“

”تم سے ہی نہیں مجھ سے بھی ہوا تھا اور اس قدر کہ اس نے..... اس نے، اس روز صبح جب تم گھر سے اچانک غائب کر دی گئی تھی، اس نے میرے چہرے پر ایک پتھر بھی رسید کر دیا تھا۔“ میں نے کہتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ بتاتے ہوئے میرا لہجہ بھرا گیا تھا۔ فہیم میرا چھوٹا بھائی تھا، باپ کی چھائی کے بعد میں نے ہی عاصمہ اور فہیم کو سنبھالا دیا تھا

اور انہیں ایسا کچھ، کبھی بھی محسوس ہونے نہیں دیا تھا کہ انہیں باپ کے نہ ہوتے ہوئے کسی قسم کا عدم تحفظ محسوس کرتے۔

میں نے ہر طرح سے اپنے ان دونوں چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی کوشش کی تھی اور کر رہا تھا۔

”کک..... کیا..... سی سی..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟“ دقتاً عاصمہ جیسے ایک دم تڑپ کر بولی۔ ”نہیم بھائی نے آپ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا؟ کیا آپ صبح کہہ رہے ہیں؟ اپنے بڑے بھائی کے منہ پر اس نے تھپڑ مارا؟“

عاصمہ کو جیسے اس بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونک سا گیا، وہ دکھ اور غصے کے ملے جلے تاثرات تلے سرخ ہو رہا تھا۔

”آپ نے وہ تھپڑ سہ لیا ہوگا میری خاطر بھائی جان!“ عاصمہ میری طرف دیکھ کر بولی تو میں نے کہا۔

”ہاں! میں اگر لڑتا تو شور چار دیواری سے باہر جاتا، وہ بھائیوں کے درمیان لڑائی پر راز کھول دیتی جس کے بعد ہم سب کی عزت داؤ پر لگ جاتی۔“ قہیم غصے میں تھا اور میں نے اس وقت یہی، بہتر سمجھا کہ غصہ ہی لیا جائے۔“

”بھائی جان، مجھے نہیم بھائی سے اس بات کی توقع ہرگز نہ تھی، میری ذات سے متعلق انہوں نے جو شک کیا وہ میں بھی سہہ گئی تھی مگر اس نے آپ کو تھپڑ مار کر خود کو اب ساری زندگی کے لیے میری نظروں سے گرایا ہے۔“

”نہیں بہنا! ایسا نہیں کہتے۔“ میں نے پیار سے اسے سمجھایا۔ ”کوئی بات نہیں، وہ غلط ہی کا شکار...“

”نہیں بھائی جان! بھائی ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے کسی پر بلا جواز شک کرے اور اپنے سے بڑے بھائی کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دے۔“ عاصمہ نے میری بات کاٹی۔ ”وہ خود غرض ہے، اسے سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ ایک ہی خاندان کا معاملہ ہے تو اسے بھی اس نازک وقت میں آپ کا ساتھ دینا چاہیے تھا، اصل میں وہ کم ہمت اور بزدل تھا، یہ آپ ہی تو ہیں جنہوں نے مجھے اپنی جان پر کھیل کر بچایا۔ خود قہیم تو شخص اپنا غصہ دیکھا کر اور ایک طرح سے اپنی جان چھڑا کر بچانے کہاں غائب ہو گیا ہے اگر بہن کی اسے اتنی فکر ہوتی تو وہ بھی آپ کی طرح اپنی جان داؤ پر لگاتا، مجھے تو بھائی جان! اب نہیم بھائی کو بھائی کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے، میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ کہتے کہتے وہ سہہ پڑی۔ میں اسے تسلی دینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

اس کے بعد میں نے عاصمہ کو کاشف کے بارے میں بھی

بتایا۔

”کک..... کاشف آیا تھا یہاں؟“ عاصمہ نے چونک کر کہا۔

”ہاں! وہ بہت پریشان تھا، تم سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اس کا اور پھر یہاں گھر پہنچی تالا لگا رہتا تھا تو بہت فکر مند ہوا اور بالآخر وہ مجبور ہو کر ایک رات یہاں آ گیا، کیونکہ میں صبح کا گیارات کو ہی گھر آتا تھا، مجھ سے ملا تو میں نے اسے ساری حقیقت بتا دی۔ لگتا ہے تمہاری اس سے اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے، وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے وہ ایک اچھا اور شریف لڑکا محسوس ہوا تھا۔“

”جی بھائی جان!“ عاصمہ اپنا سر جھکا کر ہولے سے بولی۔ ”وہ ایک اچھا لڑکا ہے۔“

”میرا خیال ہے اب تم اسے بتا ہی دو کہ تم بالکل خیریت کے ساتھ گھر آ چکی ہو۔“ میں نے آخر میں اس سے کہا۔

”بھائی جان! میں بتا دوں گی۔ ممکن ہے وہ آپ سے بھی کوئی بات کرنا چاہے۔“ میں اس کا اشارہ سمجھ کر بدوبہاری سے بولا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں، وہ بے شک مجھ سے بات کر سکتا ہے، یوں بھی وہ مجھ سے مل چکا ہے۔“

”جی بھائی جان!“

میں نے رست واپس میں وقت دیکھا، مجھے اور بھی کا نمٹنا تھا۔ ایڈوکیٹ زہیرہ کی خیریت پوچھنے جانا تھا اور لاری اوڑے کے بھی معاملات وغیرہ دیکھنا تھے۔ کالیا نے بھی وہاں آنا تھا مگر اس واقعے کے بعد میرا اب عاصمہ کو اس طرح گھر پر اکیلا چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، نہیم ہوتا تو اور بات تھی، اسے عاصمہ بہن کی یہ خیریت واپسی کا نتیجہ کرنے کے بعد مجھے پوری اُمید تھی کہ وہ نتیجہ ملتے ہی گھر پہنچ جائے یا مجھ سے رابطہ کرے مگر اب تک ایسا نہیں ہوا تھا۔

عاصمہ میری فکر بھانپتے ہوئے بولی۔ ”بھائی جان! آپ شاید کہیں جانا چاہ رہے ہیں؟ آپ جانیے فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اب محتاط ہوں۔“

میں اب اسے کیا بتاتا کہ ہمارے دشمن کس قدر ذریعہ اور طاقت ور ہیں، جو گھر میں گھس کر ایک بار نقب لگا سکتے ہیں وہ دوبارہ بھی یہی حرکت کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”ایسے نازک وقت میں نہیم کی ضرورت بہت محسوس ہو رہی ہے۔ کاش! وہ اب اپنی ناراضگی بھلا کر ہی واپس لوٹ

آئے۔“

”بھائی جان! اس بے حس انسان کو تو ابھی تک اس بات کا ہی احساس نہ ہو سکا کہ اس نے اپنے بڑے بھائی کے منہ پر تھپڑ مار کر کتنا بڑا گناہ کیا ہے، اس کے ضمیر نے اسے ملامت کی ہوئی تو وہ میرے یہ ضمیریت لوٹ آنے سے پہلے ہی گھر آکر آپ کے قدموں پر گر معافی مانگ چکا ہوتا تو اب کیا آئے گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں بھائی جان! میں اکیلی گھر پر رہ لوں گی۔ اللہ میرے ساتھ ہے۔“

”میرا خیال ہے میں حاجی صاحب سے کہہ جاؤں کہ وہ گھر کا خیال رکھیں۔“ میں نے پرسوج سے لہجے میں کہا تو عاصمہ بولی۔

”اس کی ضرورت نہیں بھائی جان! جس راز کو آپ نے ابھی تک اپنے سینے سے لگا کر ایک طویل کرب انگیز گھڑیاں گزار دیں، اسے اب راز ہی میں رہنے دیں۔“ میں نے کہا۔ ”بیگلی! میں انہیں اصل حقیقت تھوڑی بتاؤں گا، یہی کہوں گا کہ فیماں اپنے کسی کام سے کچھ دنوں کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔“

یہ سن کر عاصمہ خاموش ہو رہی، میں باہر آ گیا اور کالیا کی بائیک میں سوار ہو کر سب سے پہلے حاجی صاحب کے ہاں پہنچا وہ بیٹھک میں بیٹھے تھے، وہاں ایک دو اور افراد بھی موجود تھے۔ میں نے انہیں بیٹھک سے باہر بلا کر وہی کہہ دیا تو وہ بڑے پشیمانی لہجے میں بولے۔ ”ارے میاں! فکر کیوں کرتے ہو۔ بے فکر ہو کر جاؤ، یہ پورا محلہ میرا خاندان ہے، ان کی بہو بیٹیوں کی عزت ہماری عزت ہے۔ کسی کی کیا جرأت ہے کہ ان کی طرف کوئی نظر بھی اٹھا کر دیکھے۔ ویسے میں اسلم مو کا کو بھتیار ہوں گا۔ تم گم نہ کرو۔“

ان کی بات سن کر میں اندر ہی اندر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا کہ اب میں حاجی صاحب کو کیا بتاتا کہ چند ہی روز پہلے ہم پر کیا قیامت گزری تھی۔

بہر کیف..... میں حاجی صاحب کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہو گیا اور اسپتال پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایڈووکیٹ زنیہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

میں وہاں سے سیدھا اس کی رہائش گاہ پر پہنچا تو خالہ نجو سے ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ زنیہ کی حالت اب کافی بہتر تھی اور وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں اس کے کمرے میں پہنچا۔ وہ بیڈ پر لحاف اوڑھے ایک پردے سے نیچے پر نیم دراز بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں ایک نرے تھی، وہ سوپ پی رہی تھی۔

اس کے چہرے کی زردی مائل رنگت اب پوٹھ لگائی ہوئی تھی، اس کے آنکھوں کے گرد حلقے بھی مانند پڑنے لگے تھے۔ ان میں اب مردنی کی بجائے حیات بخش چمک پھوٹی محسوس ہونے لگی تھی جو ان کا خاصہ چمک تھی۔ گداز لبوں پر زناہت بھی لوٹ آئی تھی۔

”معافی چاہتا ہوں، بغیر دستک کے اندر آنے پر۔“ میں نے ہولے سے کھٹکھارتے ہوئے شستہ لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑی۔ اس کا چہرہ مجھے دیکھتے ہی پھول کی طرح گل اٹھا تھا۔

”ارے تم..... آؤ..... تمہیں بھلا اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے، آ جاؤ، پلیز!“

وہ ٹرے کو سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ”مجھے تمہارا ہی تو انتظار تھا۔“

میں مسکراتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب دھری ایک چیئر پر بیٹھ گیا۔

”کیسے ہو تم؟“ اس نے مترنم سے لہجے میں پوچھا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

”مجھے چھوڑو، پہلے تم بتاؤ، کیسی طبیعت ہے تمہاری اب؟“

”ظاہر ہے ٹھیک ہی ہوں تو اسپتال والوں نے میری جان چھوڑی!“ وہ ہنسی۔ اس کے نرم و گداز ہونٹوں کی شوخی لوٹ آئی تھی۔ اسے ہنستا اور مطمئن دیکھ کر مجھے بھی سلی ہوئی تھی۔

جاننا تھا میں کہ یہ ساری تکلیف اس نے میری خاطر ہی بھگتی تھی اور یہ بھی جانتا تھا کہ اسے اپنی فیس کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ بس، ایک اچھے دوست کی حیثیت سے وہ میری مدد کے لیے میری ذاتی جنگ میں وہ شامل تھی، یہی نہیں وہ آئندہ بھی اسی طرح پوری پامردی کے ساتھ عزم مصمم بھی کیے ہوئے تھی حالانکہ میں اسے پہلے اشاروں کنایوں میں اور بعد میں اس کی جان کو پوری خطرے میں محسوس کر کے اسے واضح لفظوں میں بھی کہہ چکا تھا کہ وہ اگر چاہے تو مجھے اپنی موکلیت سے ہٹا دے۔ مجھے سے اپنا راستہ جدا کر لے۔ مجھے اپنی یہ جنگ خود ہی لڑنے دے مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آج میں وہی بات دوبارہ اس سے کرنے والا تھا۔

”زنیہ! مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے تمہیں یوں بھلا چنگا دیکھ کر۔“

”اور مجھے تمہیں یہاں دیکھ کر!“ وہ اسی شوخی سے بولی تو

میں نے تمہارا سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔
”زیرہ! اگر تمہیں خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو میں خود کو
کبھی معاف نہ کرتا۔“

”ارے..... وہ کیوں؟“ اس کی کشادہ اور دلکش
آنکھیں شرارتی انداز میں پھیلیں، بڑا پیارا انداز تھا اس کا
پہ..... جو ایک سنجیدہ مزاج وکیل کا لگتا ہی نہ تھا مگر وہ ایسی ہی
تھی۔ ہر صورت حال میں خود کو ایڑ جھٹ کر لیتی تھی۔ کرا
عدالت میں ہوتی تو اس سے بڑا جفاور وکیل کوئی اور دکھائی
نہیں دیتا تھا اور میرے ساتھ ہوتی تو ایک شوخ اور کھلندری
ساتھی کے سوا کچھ نہیں لگتی تھی۔

”مذاق میں مت ٹالو میری بات.....“ میں نے اسے
مصنوعی غصے سے ٹوکا۔ ”میں تمہیں اپنی وکالت سے سبکدوش کر
رہا ہوں۔“ میں نے جیسے اسے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ وہ بولی۔
”ارے بابا! یہ غلطی مت کرنا مجھ غریب کے ساتھ.....
ایک ہی تو کیس ہے میرے پاس، جس سے میری دال روٹی
چل ہی رہی ہے، کیا اس سے بھی مجھے محروم کر دو گے، بھوکی
مرجاؤں گی میں۔“

میرا اندر اسے سلام کرنے کو چاہا۔ میری وجہ سے ہی وہ
موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی تھی اور اب اس کی
جی داری دیکھنے والی تھی۔

”میں نے کہا ناں زیرہ! مذاق مت کرو میرے ساتھ،
پلیز! میرے دشمنوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔“
میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھانے کی کوشش چاہی اور
آگے بولا۔

”میرے دشمن میرا تو کچھ نہیں بگاڑ پارہے ہیں مگر وہ
اب بزدلانہ حرکتوں پر اتار آئے ہیں۔“

وہ اب مجھے جھکانے اور مجھے اپنے زیر دست کرنے
کے مذموم ارادوں سے، میرے چند قریبی ساتھیوں اور مددگار
وہی خواہوں کی جانوں کے دکن بننے لگے ہیں۔ تم پر قاتلانہ
حملہ کرنے کے بعد تو وہ اب میرے گھر تک بھی پہنچ گئے ہیں۔“
یہ کہتے ہوئے میں نے اسے رازداری کی تلقین کرتے
ہوئے عاصمہ کے اغوا اور پھر اس کی برآمدگی کے بارے میں
بھی بتا دیا۔ جسے نہ کر زیرہ کی ساری شوخی ہوا ہو مگر اس کا
مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے لیے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

”کک..... کیا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وہ ہنسنی پھنسنی
سی آواز میں بولی تو میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے
کہا۔

”ہاں! زیرہ! ایسا ہو چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ دشمن
اب اس غلیظ حرکت کے بعد کوئی اور حرکت بھی کریں گے۔ اسی
لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم.....“

”نعمان!“ معافی زیرہ نے میری بات کاٹی اور میں
رک کر مستفسر انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا وہ بولی۔ ”تم اللہ
پر یقین رکھتے ہو؟“

”نعوذ باللہ..... یہ کیسا سوال کیا تم نے؟ بھلا اللہ پر
مجھے کیوں نہ یقین ہوگا، جس پاک ذات کے ہاتھوں میری
جان ہے اور جس کی مرضی کے بغیر میں دوسری سانس بھی لینے
کا حجاز نہیں۔“

”تو پھر اپنی اس حق و انصاف کی جنگ سے کیوں
ڈرتے ہو؟ تم نے حق کے لیے باطل کے خلاف علم باندھا ہے تو
اللہ کی مدد کو کیوں فراموش کر رہے ہو۔ تمہارا یہ ایمان ہونا
چاہیے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ اللہ کا ساتھ حق و راستی پر
چلنے والوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔ بے شک اس میں کڑی
آزمائشیں بھی آتی ہیں اور.....“

”مجھے انہی آزمائشوں سے ڈر لگتا ہے، زیرہ!“ میں
نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔
”میں شاید اس معاملے میں بزدل اور کمزور انسان
ہوں۔“

”وہ ہر کوئی ہوتا ہے۔“ وہ بھی ترنت بولی۔ ”حکایت
قدی کے لیے ایک ایسے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر لمحہ
رہ کریم سے اپنی ہی کوششوں کے ساتھ دعا گو بھی رہے اور ہر
ساعت اس پاک اور رحیم ذات سے مدد کا طلب گار بھی
رہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم بے حوصلہ اور بے عزیم ہو
لیکن تم ایسی باتیں کر کے خود کو بے حوصلگی کی طرف لے
جاؤ گے۔ چلو! مجھے چھوڑو، تمہارے دشمن تو اب تمہارے گھر
والوں کے پیچھے بھی پڑ چکے ہیں، جس کا تازہ ثبوت تمہیں
عاصمہ کے اغوا کی صورت مل بھی گیا، تو کیا اب تم اپنی بہن سے
یہ کہو گے کہ وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے؟“

بڑے عجیب مگر کچھ ایسے انداز میں زیرہ نے دلیل دی
تھی کہ میں لا جواب سا ہو کر رہ گیا تاہم پھر میرے منہ سے نکل
گیا۔ ”میرا اس سے ایک رشتہ ہے، جو انوٹ ہے۔“

”اور دوستی کا رشتہ تمہاری نظروں میں انوٹ نہیں
ہوتا؟“ وہ یک دم شام کی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے
ہوئے بولی۔ ”اور..... تمہارے نزدیک جسے جب جی چاہا
تو ذکر چھینک دیا جائے؟“ میں گڑبڑا سا گیا۔

”مم..... میرا مطلب یہ نہیں تھا زہیرہ!“ میں نے صفائی چیش کرنی چاہی۔ ”دوست تو میرے اور بھی ایسے ہیں جن کا میرے ساتھ رشتہ انوث ہے جیسا کہ چاچا انور شاہ اور شیراز کا لیا اور..... اور.....“ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر زہیرہ نے میرا جملہ اچک لیا۔ ”اور.....! اور..... کون؟“

”فوزیہ.....؟ کون ہے یہ خاتون؟“ اس نے اپنی نگاہیں سیکڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میرے لیے یہی بہتر موقع تھا کہ میں اسے بتا دوں فوزیہ کے بارے میں آج کیونکہ میں زہیرہ کی اس دوستی کو کسی اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ میری اور زہیرہ کی دوستی مغربی معاشرے کی دوستی نہیں تھی جہاں ”سب چلتا ہے“ جبکہ مشرقی معاشرے میں یہ سب نہیں چلتا۔ ہمارے سماج میں اس طرح کی دوستی از خود معنی تراش لیتی ہے اور مجھے بھی اب تک یہی اندازہ ہوتا رہا تھا کہ کہیں زہیرہ میری اس دوستی کے سلسلے میں از خود اس جذبہ دوستی کو کوئی ایسا سمجیدہ معنی نہ پہنا ڈالے تو آج میں یہ فوج بھی ختم کر ہی ڈالوں کہ شاید اگر اس کے دل میں بھی ایسی کوئی بات ہو بھی تو یہ سن کر خود ہی میرے راستے سے ہٹ جائے۔ لہذا بولا۔

”میں اس سے محبت کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں نے زہیرہ کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی تو مجھے ایسا ایسا کی اس کے چہرے کی گلابی رنگت میں پیچھے پن کا شائبہ سا اثر محسوس ہوا، اس کی کشادہ آنکھوں کے کنگول میں مجھے خالی پن کے کرب کی ایسی جھلک سی نظر آئی، جس میں کسی کھوٹے سکے کی ”چمک“ سی گونجی ہو۔

دیران کھنڈروں کی بازگشت دیتی اس کے چہرے کی اس کیفیت کو میں نے بس، پل کے پل ہی محسوس کیا تھا اور پھر جیسے سب کچھ نازل ہو گیا۔ وہ یک دم کھٹکھٹا کر خنس دی۔ میں بھونچکا سا ہو کر اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اس کی کھٹکتی ہنسی میں ایک خاموش دکھ کی معصوم سی ادا جھلکی محسوس ہوئی۔

”تو جناب! کسی خاتون سے عشق بھی فرما چکے ہیں۔“ وہ اسی لہجے میں بولی۔ میں نے اس بار پُر غوری نظر اس کے چہرے پر ڈالی، شوق کی تہہ میں مجھے بحرِ غم کا ایک طوفان تلاشنے میں ملوث دیر نہیں لگی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔

”اچھا ہی ہے یہ.....! اسے بھی سب بتا چل جانا چاہیے کہ شاید اسی طرح ہی یہ مجھ سے خود ہی دور ہو جائے۔“

”بہت خوشی ہوئی مجھے نومی! یہ جان کر..... خیر، تم اب

میری روزی کے پیچھے مت پڑو اور ہاں کل مرحلہ وار میری فیس کا ایک حصہ تم پر واجب الادا ہے۔ پلیز، وہ دے دینا۔“ میں جانتا تھا کہ اسے میرے کیس سے متعلق اپنی فیس سے کوئی دلچسپی کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ تاہم میں کبھی دیر سویرا اس کی فیس ادا کر دیا کرتا تھا، جسے وہ بڑی روکدلا کے بعد ہی لیا کرتی تھی۔

”تم ابھی تک میرے ساتھ مذاق کر رہی ہو۔“ میں نے بدستور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔

”ارے.....! مذاق کیسا بھئی؟ روزی کے سلسلے میں بھی کوئی مذاق کرتا ہے بھلا؟“

وہ بڑی صفائی سے ہر اس معاملے سے پہلو تہی کیے جا رہی تھی جس کی حساسیت سے میں اسے پوری شدہ کے ساتھ آگاہ کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔

”اچھا سنو تو..... کبھی ملاؤ ناں اسے، دیکھو تو آخر تمہاری پسند کیسی ہے۔“

وہ اسی طرح مسکراہٹ کے پردے میں درد کو چھپاتے ہوئے بولی۔

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ گویا اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ ”اچھا ملا دوں گا تمہیں کبھی، پہلے تم پوری طرح ٹھیک تو ہو جاؤ۔“

اس نے بھی موضوع سے گویا پہلو تہی کرتے ہوئے کہا۔ ”فرحانہ کے سلسلے میں کیا رہا؟ کوئی نئی بات یا نیا انکشاف سامنے آیا؟“

اس کے پوچھنے پر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ متحیر ہو گئی۔ فرط جوش سے بولی۔ ”پھر تو کچھ تو یہ پرانا کیس حل ہوا چاہتا ہے۔“

”ہاں! ابتداء میں مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔“ میں نے پچھلی سی مسکراہٹ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

”جس شخص کی ٹائی پن ملی ہے وہ اپنے والدین سمیت ملک سے باہر گیا ہوا ہے، یعنی جرمی!“

”مگر رانا بظہیر تو انہیں جانتا ہی ہوگا؟ اگر رفعت خانم مرڈر کیس ری اوپن ہوتا ہے تو تفتیش کے لیے ان تینوں کو انٹرپول کے ذریعے جرمی سے یہاں پاکستان بلایا جاسکتا ہے۔“

قدر بھنس گیا ہوں کہ وہ سارے سوچے گئے باریک نقطے میں فراموش کر چکا ہوں، اب ڈائریاں دوبارہ پڑھوں گا تو یاد آجائیں گے اور انہیں اس بار اپنی ایک الگ ڈائری میں رقم بھی کرتا جاؤں گا۔“

”جہنیں پہلی فرصت میں فرحانہ سے وہ دونوں ڈائریاں لے لیتی چاہیے تھیں۔“ زئیرہ بولی۔ ”بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوبارہ پڑھنے سے کئی نئے نقطے ذہن میں آ جاتے ہیں۔“

”میری تو کوشش یہ بھی ہے کہ دوسری ڈائری جو ہاتھ لگی ہے فرحانہ کے وہ ہی سب سے زیادہ اہم ہے، میں اس ڈائری کے جو الفاظ مٹے ہوئے ہیں انہیں قابل مطالعہ بنانے کی کوشش کروں گا۔“

”ایگزیکٹو! میں بھی تم سے یہی کہنے والی تھی کہ رفعت خانم مرڈر کیس کھلنے لگا ہے۔ جہنیں اس پر اب جزدقی نہیں بلکہ کل وقتی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔“ زئیرہ چمک کر بولی۔

میں نے بھی اس کی بات پر پُر سوچ انداز میں اپنا سر ہلادیا اور پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں اب ایسا ہی کرنے کی کوشش کروں گا۔ چائے کا شکر یہ، میں اب چلوں گا۔“

میں وہاں سے چلا آیا اور جب لاری اڑے پہنچا تو وہاں کالیا کو پہلے ہی سے اپنے انتظام میں موجود پایا۔ میں نے اسے زئیرہ کی تحریک وغیرہ سے آگاہ کیا اور صرف یہی بتایا کہ وہ اسپتال سے ڈسچارج کر دی گئی ہے۔

”سیٹھ ستار کی کوئی خبر؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک کوئی کوئی خبر نہیں، تاہم میں نے اس کی ریکی اور معمولات کو نظر میں رکھنے کے لیے اپنے دولے کے پیچھے لگا دیے ہیں۔ آگے تم بتاؤ، کیا نئی پلاننگ ہے؟“

میں نے اس کی بات پر دھیان دینے کے انداز میں کہا۔

”کالیا میرے اس وقت دو بڑے دشمن گروپ میدان میں آتے ہیں۔ ایک لینڈ مافیا گروپ ہے جو پہلے ہی سے میدان میں میرے خلاف اترا ہوا ہے۔ ان میں سیٹھ ستار اور حاجی میران خان ہے۔ دوسرا گروپ جس نے اب تک خود کو سات بروں میں چھپا رکھا تھا۔ اگرچہ وہ اب بھی ظاہر تو نہیں ہوا ہے مگر غائبانہ طور پر اس نے اپنا تعارف ابھی کچھ ہی روز پہلے کر دیا تھا۔ جس کا مطلب ہے میرا نا بشیر اور اس کی بیٹی فرحانہ سے ملنا جلنا اور رفعت خانم مرڈر کیس سے متعلق میری کاوشوں نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ یہ دوسرا دشمن چھپا ہوا

”بتایا تا میں نے ابھی تمہیں کہ یہ رانا بشیر کا بزنس پارٹنر ہے، تمیز الدین اور اس کی بیوی اور ان کا اکلوتا جوان بیٹا خرم!“ میں نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ رفعت خانم کے قتل میں اس نو جوان خرم کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”ابھی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا، تاہم ضروری نہیں ہے کہ یہ ثانی پن صرف خرم ہی لگا تا ہو، یا پھر یہ ثانی پن اس کے باپ یعنی رانا بشیر کے بزنس پارٹنر تمیز الدین کے بھی استعمال میں رہی ہو؟“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ پوری فیملی ہی اس مرڈر میں شریک ہو گئیں!“ زئیرہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

”لیکن کیا.....؟“

”پہلے ایک بات بتاؤ، اس سارے گھن چکر میں کیا تمہیں رانا بشیر پر بھی کوئی شبہ ہوتا ہے؟“

”بالکل ہوتا رہا ہے اور میں اس کا شاید تمہارے سامنے اظہار بھی کر چکا ہوں۔“ میں نے بلا در اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

”تب پھر میں تم سے یہ کہنے والی تھی کہ جہنیں رانا بشیر پر بھی نظر رکھنا ہوگی۔“

”اس پر تو اس کی بیٹی فرحانہ ہی نظر رکھ سکتی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر تمہیں رانا بشیر کے بیرونی معمولات سمیت اس کے دفتری روز و شب پر اور سن سے ملنا جلتا ہے کیا کرتا ہے، یہ سب نگاہ میں رکھنا ہوں گے۔“

”اب میں یہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”دیے اگر تم اس سلسلے میں فرحانہ کو اپنی بگ اڈر اسٹینڈنگ میں لے لو تو میرا خیال ہے کہ یہ کام اور بھی آسان اور حل طلب ہو جائے گا۔“ زئیرہ نے مشورہ دیا۔

اٹھائے گفتگو خالہ نچو جائے کے برتن لے آئی اور بیڈاؤ میری چتر کے درمیان میں دھری تپائی پر کھدی اور چلی گئی۔

”میں اس کوشش میں ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں فرحانہ کے ذہن کو بھی اس طرف سوچنے کا قائل کرنے والا ہوں۔ تاہم تمیز الدین کے سلسلے میں بھی میں نے کچھ اقدامات اٹھائے ہیں اور دونوں ملنے والی ڈائریوں کے مندرجات کو ایک بار پھر بڑے غور سے پڑھنا بھی ہے مگر کیا کروں، میں خود اپنے کچھ تازہ ترین نامساعد حالات میں اس

ہے۔ میں اسے ظاہر کرنا چاہتا ہوں آخر یہ ہے کون؟“
 ”اے لے..... جگری! تو تو ڈیل اوسیون کی طرح کا
 جاسوس بننا جا رہا ہے۔“ کالیا میری بات سن کر مسکراتے ہوئے
 بولا۔

”ڈیل اوسیون نہیں، ڈیل زیر وسیون.....“ جواب
 میں تھس کرتے ہوئے، میں بھی مسکرا دیا تو وہ بولا۔

”میں جیمز بانڈ کی بات نہیں کر رہا، میجر پرمود کی بات کر
 رہا ہوں، جیمز بانڈ تو سالا خون خرابے پھیلا کر کوئی مادرانی قوت
 ہی بن جاتا ہے مگر یہ اپنا میجر پرمود بالکل تمہاری طرح چالاک
 اور مکاری سے اپنے پیچھے ہوئے دشمنوں کے گرد پہلے چال بناتا
 ہے اور پھر جھپٹ پڑتا ہے۔“

”لگتا ہے تم آج کل اچھ اقبال اور ایس قریشی کی
 سیکرٹ سروس زیادہ پڑھنے لگے ہو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔
 ”کام تو عملی طور پر تم نے ہی سارا کیا ہے۔“

”لیکن اس کی پلاننگ اور داغ تم نے ہی لڑا تھا۔
 خیر! اب آگے کے کیا ارادے ہیں؟“ اس نے آخر میں پوچھا
 تو میں نے پُر سوچ لہجے میں اس سے کہا۔

”میں روزی اور فرحانہ کے ساتھ اپنے راہ و رسم کو
 بڑھانا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں کر دار میرے دونوں قسم کے دشمنوں
 کی شہ رگ سے تعلق رکھتے ہیں۔ روزی سیٹھ ستار کی بہت
 سے رازوں سے واقف ہوگی جبکہ فرحانہ کو میں نے ایڈووکیٹ
 زئیرہ کے مشورے کے مطابق قائل کرنا ہے کہ وہ اپنے باپ
 رانا بشیر پر بھی نگاہ رکھے۔“

”روزی والی بات تو ٹھیک ہے پر یہ فرحانہ والا معاملہ
 ایسا نہیں بھلا وہ کس طرح اپنے باپ کے خلاف کوئی کام کر سکتی
 ہے؟“

”میں بے وقوف ہوں جو اس سے ایسا کہوں گا۔“
 میں گہرے انداز میں مسکرا کر بولا۔

”تو پھر کیسے کہو گے؟“ وہ حیرانی سے میری طرف دیکھ
 کر بولا۔

”میرا کام ہے، تم صرف حرکت کرنے کے لیے تیار
 رہنا، چال میں بخون گا۔“

”اے لے جگری! اسی لیے تو تجھے میجر پرمود کہتا
 ہوں۔“ وہ ہنسا۔

اسی دوران چاچا انور شاہ آگئے، میں انہیں عاصمہ سے
 متعلق بتا کر تھا وہ گھر مندمی تھے اور خوش بھی۔

”تمہیں فوراً پولیس کو انفرم کرنا چاہیے تھا بیٹا!“ انہوں

نے مشورہ دیا۔

”تمہیں چاچا! یہ رات کی تاریکی میں ہوا تھا اور اس
 تاریکی میں یہ معاملہ ہم نے نمنا دیا۔ دشمنوں کے ساتھ اب
 انہی کے ہتھیاروں اور طریق سے ہی نمٹنا ہوگا۔“ میں نے
 گہری متانت سے کہا تو وہ بولے۔

”تو اس طرح پھر سیٹھ ستار کے گرد قانونی گھیرا کیسے
 جگ کیا جائے گا؟“

”اس کے لیے میرے پاس ابھی ایک تپ کا پتا
 موجود ہے، میں ابھی کچھ ہی دیر میں وہیں جانے والا ہوں،
 آپ مجھے ذرا احسان جمائی گڈز کے بارے میں بتائیں۔“

”یہ سپر ہائی وے پر ہے، ہنری منڈی کے پاس۔“
 انہوں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں! خیریت ہی ہے، بس ذرا وہاں جانا ہے میں
 نے۔ آپ کی احسان صاحب سے کوئی دعا سلام ہے؟“ میں
 نے ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”میری تو نہیں ہے، البتہ عطا صاحب کی ضرورت ان سے
 بات چیت ہے۔ کیوں خیریت؟“ انہوں نے آخر میں پوچھا
 اور میں نے انہیں اسپیکر کا مرنے سے ہونے والی گفتگو کے
 بارے میں بتا دیا۔

اس کے بعد میں نے اسی وقت عطا صاحب کے سیل پر
 ان سے رابطہ کیا اور انہیں صرف یہی بتایا کہ کاروباری سلسلے میں
 مجھے احسان جمائی سے ملنا ہے تو انہوں نے کہا کہ میں ان سے
 کل مل لوں وہ انہیں فون کر کے میرے بارے میں بتا دیں
 گے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کالیا کے ساتھ روانہ
 ہو گیا۔

ہم دونوں بانیٹک پر سپر ہائی وے میں واقع جمائی گڈز
 پہنچے تو وہاں ایک خاصے ٹیم جیم آڈی سے ملاقات ہوئی، جس
 کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہی احسان جمائی تھا۔ یہ ایک
 ساٹھا پاٹھ شخص تھا۔ عطا صاحب انہیں میرے بارے میں فون
 کر چکے تھے۔ اس نے بے داغ شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا
 تھا۔ سر پٹوٹی تھی۔ میں اس سے سندھی میں ہی مخاطب ہوا،
 اس سے کہا کہ ملوک کی شخصی ضمانت میں نے ہی کروائی تھی وہ
 بہت خوش ہوا اور مجھ سے ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

کی بڑی مہربانی سائیں! یہ آپ کی غذا ترسی ہے۔ آپ
 غریب اور سادہ لوح انسان پر ترس کر کھانا، مالا مال
 جابنے بھی نہیں تھے مگر آپ کی مردم شناسی لی۔ مہمہ۔

کہ آپ نے کھرے کھوٹے کی پہچان خوب کی تھی۔“
 ”جمالی صاحب! بسا اوقات اصل مجرم اسی لیے قانون کے شکنجے سے بچ جایا کرتے ہیں کہ ان کی جگہ بے گناہ اندر ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میری چشم تصور میں اپنے بے گناہ باپ کا چہرہ گردش کرنے لگا۔
 ”ایک دم سولہ آنے درست بات کی ہے بابا تم نے۔“
 احسان جمالی بولا۔ ”میں اب آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”پاسر کو آپ جانتے ہیں؟“

”نہیں۔“

”دکس نے اسے نوکری پہ یہاں رکھا تھا؟“

”یہ چھوٹے موٹے آدمیوں کو رکھنا ہمارے فشی نواز کا کام ہی ہوتا ہے۔“

”ہمیں فشی نواز سے ہی ملوادیں۔“ میں نے کہا۔

احسان جمالی نے اسی وقت ایک آدمی کے ذریعے اسے اپنے کمرے میں طلب کر دیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک چالیس پینتالیس سالہ دبلا پتلا شخص تھا، اس کی عمر کا اندازہ بھی ہو سکا تھا مجھے۔ اس نے شلوار قمیص پر عام سی واسکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع سے فشی ہی دکھائی پڑتا تھا۔ تاہم صورت سے خاصا خرافات اور اکھڑ مزاج نظر آتا تھا۔

”نواز! تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، یہاں بیٹھ جاؤ اور ان کے ساتھ پورا تعاون کرنا۔“ احسان جمالی نے اس سے کہا پھر معذرت خواہانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آپ لوگ چائے پی کر جانا، میں ابھی بھجواتا ہوں مجھے ذرا ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔“ اس پر میں نے جمالی صاحب کا شکریہ ادا کیا اور پھر نواز سے مخاطب ہوا، جواب میرے اور کالیا کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”تم فشی نواز ہو؟“

”جی سائیں؟“ اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے ابھرنے لگی تھی۔ جمالی صاحب کی وجہ سے وہ طوعا کرہا ہی سہی اپنے چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ سمونے پر مجبور ہو گیا تھا۔

”نواز! پاسر نامی شخص کو تم نے ہی یہاں نوکری پر لگایا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے سوال کیا۔
 ”جی ہاں!“

”تم کیا اسے پہلے سے جانتے تھے؟“

”جانتا تو نہیں تھا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا اور الٹا اس نے مجھ پر سوال داغ دیا۔ ”کیا آپ پولیس والے ہیں؟“

”نہیں مگر انہی کی طرف سے آئے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب تم میرے اس سوال کا جواب دو گے جو میں نے پوچھا ہے تم سے؟ تم پاسر کو جانتے تک نہیں تھے اور تم نے اسے بغیر کسی کی ضمانت پر نوکری پر رکھ لیا تھا۔“

میرے لہجے میں درشتی عود آئی تھی۔ جس نے اس کی کرخست مزاحیہ کو ہوا بھی دی تھی، تاہم وہ بھی اس بار پھر روانہ لہجے میں بولا۔ ”سائیں! یہ کوئی سرکاری ادارہ تو ہے نہیں کہ یہاں ان باتوں کا خیال رکھا جائے۔ نہ ہی کوئی بڑا عہدہ ہوتا ہے یہاں۔ وہ ایک غریب اور ضرورت مند آدمی بن کر آیا تھا اور مجھے بھی ایک چائے وغیرہ لانے کے لیے ایک نوکری ضرورت تھی سو میں نے رکھ لیا اسے۔“

”تمہیں پتا ہے اس غریب آدمی نے کتنا بڑا جرم کیا تھا بعد میں؟“ میں نے اس کی طرف آنکھیں سیڑ کر گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”معلوم ہے جی! اس میں منارا قصور ملوک کا تھا۔ اسے اپنی مصیبت پڑی ہوئی تھی، اس نے اس سے بچنے کے لیے اپنا ٹرک اس کے حوالے کیوں کیا تھا پھر؟“ فشی نواز نے جواب دیا۔ میں نے کہا۔

”ملوک نے بھی اس آدمی پر اسی لیے ہی اعتبار کیا تھا کہ اسے تم نے نوکری میں رکھا تھا۔ انسان جہاں کام کرتا ہے تو وہاں سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔“ میرے اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ ابھی وہ اس کا کوئی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک ملازم ہاتھوں میں چائے کی ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا۔ میں نے... سرسری نظر اس پر ڈالی تھی۔ ہماری طرح یہاں بھی چائے کا ادھر ہی بندوبست کیا جاتا تھا، یعنی ہوکل وغیرہ سے نہیں منگوائی پڑتی تھی۔ اس نے میز پر ٹرے رکھی اور ہمارے لیے چائے ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے دیکھا وہ فشی نواز کو بھی تنکے جا رہا تھا اور ہماری طرف بھی۔

”مگر ملوک کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ خود ایک ڈرائیور ہے اور اگر اسے اپنا ٹرک کسی مجبوری کی بناء پر کسی کے حوالے کرنا ہی تھا تو وہ اپنے جیسے کسی ڈرائیور کے ہی حوالے کرتا۔ تاکہ ایک چائے والے کے۔“

فشی نواز نے ایک جواب سوچ کر دیا تو میں نے اس

کر دے تو یہ سب راز میں رکھا جائے گا اور اصل مجرم تک پہنچنا ہمارا کام ہوگا۔ کیا کہتے ہو اب؟“
اب میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا، وہ فوراً تعاون پر رضامند ہوتے ہوئے بولا۔

”ٹھیک ہے صاحب! اگر یہ بات ہے تو میں آپ سے مکمل تعاون کروں گا۔ مگر یہاں نہیں۔“ پھر اس نے کہا ہم باہر جا کر ایک جگہ پر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کریں۔ وہ ابھی چند منٹوں میں ہم سے آئے گا۔

میں اور کالیاہاں سے نکل گئے۔ اس شخص سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس کا نام پوچھا لیا تھا جو اس نے رجم بخش بتایا تھا۔

وہ جلد ہی مطلوبہ مقام پر ہم سے ملے آگیا اور ہم کھڑے کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ یاسر کو نوکری میں رکھنے کے لیے یاسر نے نہیں بلکہ کسی اور شخص نے مٹی نواز کو رشوت کے طور پر پیسے دیئے تھے۔

رجم بخش اور اس جیسے اور بھی جمالی گڈز میں کام کرنے والے کچھ ملازم اس سے خوش نہیں تھے۔ رجم نے ہی اس کی اپنے موبائل فون پر رشوت لیتے ہوئے تصویر بنوائی تھی جو اس نے بلیو ٹو تھ کے ذریعے مجھے اسی وقت سینڈ کر دی۔ میں نے اپنے سیٹ پر جب اس شخص کی تصویر کو انٹارنٹ کر کے دیکھا تو مجھے اس شخص کا چہرہ شاسا محسوس ہوا، یہی سبب تھا کہ میں چند ٹائمنیوں کے لیے تنگ سا ہو گیا۔

وہ شخص بے داغ چٹون شرٹ میں ملیں تھا۔ اسے پہچاننے کی ایک بڑی وجہ اس کی جسمانی ساخت تھی جو مجھے نہیں بھولی تھی۔ جسم اس کا چھریا تھا مگر سر اس کی مناسبت سے غیر معمولی بڑا اور چوڑا تھا۔ بال بھی گھنے تھے اور موٹے چٹ تھیں۔ میں اپنے ذہن پر زور ہی دیتا رہ گیا تو رجم بخش نے جانے کی اجازت لی، میں نے اس کا نمبر لے لیا اور پھر کالیا کے ساتھ ایک طرف جا کھڑا ہوا۔

”اے لے..... جگر! تجھے تو خفیہ پولیس میں ہونا چاہیے تھا۔ کہاں سے کہاں بال کی کھال نکال لی تو نے۔“ کالیا نے کہا تو اسی وقت میرے سوچنے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، پھر میں معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”ابھی کہاں کالیا! بال کی کھال تو ابھی اور نکال کی۔“

میں نے مذکورہ شخص یاد آگیا تھا اسے میں نے ۱۰/۱۰/۱۰ بلڈرکینی ”بلیو مون ہائینس“ کے دفتر میں دیکھا تھا ۱۰/۱۰/۱۰

آدی کی طرف اشارہ کیا جو ہمارے لیے چائے لایا تھا۔ ”اگر اسے ٹرک چلانا آتا ہو اور تمہیں کوئی مجبوری ہو اور دوسرا ڈرائیور بھی دستیاب نہ ہو، مال پہنچانا بھی ضروری ٹھہرے تو کیا تم ٹرک اس کے حوالے نہیں کر دے، مٹی نواز؟“

”ہرگز نہیں۔“ مٹی نواز نے فوراً نفی میں اپنا سر ہلایا۔ میں نے یوں ہی کن انکھیں سے چائے والے کی طرف دیکھا جو مٹی نواز کو قطرہ نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پہ بھی کچھ ایسی ہی مسکراہٹ تھی۔

ہم چائے پینے لگے۔ مٹی نواز نے جانے کی اجازت طلب کی اور کرسی سے کھڑا بھی ہو گیا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

چائے والا نواز کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا پھر جب وہ کمرے سے نکل گیا تو وہ مجھ سے بولا۔ ”سائیں! یہ بہت لاچکی آدی ہے، اس نے پیسے لے کر یاسر کو کھا تھا۔“
میں اس کی بات پر چوہے بغیر نہیں رہ سکا۔ فوراً اس سے کہا۔

”یہاں بیٹھو۔“
”نہیں صاحب! میں بیٹھ نہیں سکتا۔“ وہ انکار کرتے ہوئے بولا تو میں نے جلدی سے اسے پوری بات بتائی تو وہ ایک بار پھر دروازے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”سائیں! ملوک میرا بہنوئی ہے، آپ نے اس کی ضمانت کروا کر بہت نیک کام کیا ہے۔ وہ بہت سادہ لوح انسان ہے۔ مجھے یاسر نامی اس آدمی پر بہت پہلے شہ تھاکہ وہ نوکری کرنے نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔“

”اسی بات کا تو ہم کونج لگنا چاہتے ہیں۔“ میں نے فوراً کہا۔ مجھے پوری آدمی کا لگا تھا مگر وہ مہرا بھی رہا تھا، صاف لگتا تھا جیسے وہ مٹی نواز سے خوف زدہ بھی ہو۔ یوں بھی جب اس نے مجھے یہ بتایا کہ ملوک اس کی بہن کا شوہر بھی تھا تو میں نے اسے مزید رام کرنے کے لیے تھوڑا سا ڈرایا۔

”دیکھو ملوک ابھی صرف ضمانت پر ہی رہا ہوا ہے اس ہائیکیڈنٹ کا کیس ختم نہیں ہوا ہے اگر اصل مجرم یعنی یاسر نہ ملا تو اس کا گناہ ملوک کے سر پر لگ جائے گا اور پولیس اسے دوبارہ گرفتار کر سکتی ہے، یعنی جب تک یہ کیس سے بری نہیں ہو جاتا پولیس کی تلواریں ملوک کے سر پر لگتی رہے گی، ضمانت منسوخ بھی ہو جایا کرتی ہے کیونکہ ہائیکیڈنٹ کسی معمولی شخصیت کا نہیں ہوا ہے بلکہ ہائی کورٹ کی ایک ایڈووکیٹ کا ہوا ہے۔ تم اگر تعاون

کاؤنٹر ٹیبیل پر بیٹھا تھا اور کسی پارٹی کو کنٹینس کرنے میں مصروف تھا۔

”گنتا ہے تیرے مفکروں والے دماغ میں کوئی کلیو آن اٹکا ہے۔“ کالیا ہنس کر بولا۔

”بھیس بدلنے کے لیے اڑے پر چلنا ہوگا۔“ اس نے کہا اور ہائیک سنجال لی۔ میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور ہم روانہ ہو گئے، راستے میں ہی میں نے سیل فون پر روزی کے نمبر شیج کیے اور رابطہ ہوتے ہی میں نے اس کی خیر خبریت پوچھی۔

اس نے بتایا کہ اس نے سیٹھ ستار کے کرائے کے گماشتوں کے خوف سے وہ علاقہ ہی چھوڑ دیا ہے، اب وہ کہاں ہے، اس کے بارے میں اس نے کہا کہ جب میں اس سے ملنے آؤں گا تو تب ہی وہ بتائے گی۔

میں نے کہا۔ ”درحقیقت میں تمہاری حفاظت کا کوئی خفیہ بندوبست کرنے کا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ رات والے واقعے کے بعد تم اب اس بلڈر مافیا کی بہت لسٹ میں شامل ہو چکی ہو۔“

وہ بولی۔ ”مجھے اس کا احساس ہے۔ اسی لیے تو میں نے وہ جگہ چھوڑ دی ہے۔ بھانڈا تو میرا بھی پھوٹ ہی چکا ہے مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں اس کیلئے سیٹھ کے بہت سے اہم رازوں سے واقف ہوں مگر میرے ہاتھ ابھی کمزور ہیں، ڈرتی ہوں کہ وقت سے پہلے ہی نہ نکاٹ دیئے جائیں۔“

”مس روزی! اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں، ہمیں سیٹھ ستار کے ان اہم رازوں سے آگاہ کریں، باقی کا کام ہم سنجال لیں گے۔“

”وہ تو ظاہر ہے کہ اب اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”تم لوگوں کی صورت میں مجھے بھی اس خونی شخص سے اپنی بہن کا انتقام لینے کا موقع مل رہا ہے تو میں اس موقع کو بھلا کیوں کر ضائع جانے دوں گی مگر احتیاط کے ساتھ۔“

”اوکے!“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ میں رات کو تم سے مل لوں۔“

”آنے سے پہلے مجھے فون کر دیجئے گا نعمان صاحب!“ وہ آخر میں بولی اور میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ہم استاد بھابھا کے اڑے پر پہنچے۔ وہاں کے لوگ اب مجھے بھی پہچاننے لگے تھے۔ کالیا مجھے اوپری منزل کے ایک کوشٹری نما کمرے میں لے آیا اور بولا۔

”یہ لے..... جگہ! یہ ہمارا ڈریسنگ روم ہے، جو چاہے ہمیں بھر لے۔“

”تو کہاں چلا؟“ میں نے اس سے کہا۔ ”تو نے بھی بھیس بدلنا ہے۔“

”میں ابھی آتا ہوں، جب تک تو اپنا کام نشتا، استاد بھابھا کو میں ڈراما سلاسل کر آؤں ذرا.....“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ چلا گیا۔

یہاں مختلف الماریوں میں بھانت بھانت کا سامان موجود تھا۔ میں نے ایک ادھڑ عمر آدمی کا بہرہ وپ بھر۔ اتنی دیر میں کالیا بھی آ گیا، میں..... اسے دیکھ کر تھوڑا چونک سا گیا۔ وہ کچھ فکر مند سا دکھائی دے رہا تھا مگر مجھے ایک ادھڑ عمر کے بھیس میں دیکھ کر اپنی تفکر چھپاتے ہوئے فوراً ہنس کر بولا۔ ”ابے لے..... جگہ! تو ایک دم فاسٹ جا رہا ہے، کیا ہمیں بھرنا ہے۔“

”کیا بات ہے کالیا؟ تو کچھ فکر مند نظر آ رہا ہے؟“ میں نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

”جتن ڈاڈا کا آدمی آیا ہوا ہے اپنے استاد بھابھا کے پاس..... خاصا گرم لگ رہا ہے۔“

”اوہ.....“ کچھ بھانپتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔ ”کیا انہیں ہم پر شبہ ہوا ہے؟“

”شبہ نہیں، یقیناً کہو۔“

”لہلہ..... لیکن کیسے؟ ہم نے تو ایسا کوئی ثبوت نہیں چھوڑا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نظر سے کہا تو وہ بولا۔

”گینگ وار سے تعلق رکھنے والے یہ لوگ کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں کے بڑے زریک دماغ لوگ ہوتے ہیں یہ ایک دوسرے کا سایہ بھی پہچان لیتے ہیں جو ان کے علاقوں کے قریب سے بھی گزر رہے۔“

”اچھا یار! تو ان کی تعریفیں کر کے مجھے ڈرانے کا کوشش مت کر۔ یہ بتا تیرے استاد بھابھا نے جتن ڈاڈا کے آدمی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی یا نہیں؟“

میں نے یہ ظاہر بیزارگی سے کالیا کی طرف دیکھ کر کہا۔ اگرچہ اندر سے میں خود بھی اس نئی صورت حال سے ڈر سا م تھا۔ کیونکہ میں بتا چکا ہوں کہ پورے کراچی میں لیاری گینگ وار کی دہشت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ یہ بہت سفاک اور

الم لوگ تھے۔ ایک بار اپنے کسی دشمن کو نشانے میں لے لیتے مرنے تک نہیں چھوڑتے تھے۔

میری بات پر کالیا بولا۔ ”ابھی تو دونوں کے درمیان موضوع پر بات چیت ہو رہی ہے مگر جن ڈاڈا کا آدمی بہت نرم ہے۔ وہ تو اسی وقت پیشی کی ضد کیے بیٹھا ہے۔ اس کے راہ جینکو بھی ہے۔ وہ اپنی صفائی پیش کر رہا ہے۔“

”تو نے اپنے استاد بھابھا کو اس کارروائی کے بارے میں بتا دیا تھا؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں جگری وہ تو میں نے کل ہی بتا دیا تھا۔“ کالیا جوابا لے۔ ”اسی لیے وہ دفاعی گفتگو کر رہا ہے۔“

”کیا ہمارا نام بیچ میں آیا ہے؟“ ”نہیں۔“

”آخر کس برتے پر انہیں یعنی جن ڈاڈا کو ہم پرشبہ ہوا ہے؟“

”ان کا آدمی بھی تو مارا گیا تھا ہماری اس کارروائی میں۔ اب یہ نہیں معلوم کہ انہیں کس وجہ سے ہم پرشبہ ہوا۔ ان کے جانے کے بعد ہی استاد بتائے گا ہمیں۔“ پھر تھوڑے وقت کے بعد وہ بولا۔ ”جگری! ہمیں ابھی شاید نیچے استاد کے پاس چنانچا جائے، اس لیے ابھی تم اپنی اصل صورت میں آ جاؤ۔“

میں نے اس کی بات پر صاؤ کرتے ہوئے ایسا ہی کیا۔ میں کھتا تھا۔ فقط ایک چھدری سی سفید داڑھی تھی اور اسی طرح لاکھنی بھونٹیں، جو میں نے اتار لیں۔ چہرے پہ کچھ مصنوعی وارنس لگائے تھے، وہ بھی اتار لیے، رنگ چہرے کا تھوڑا انولا کر رکھا تھا وہ بھی دھو کر صاف کر لیا۔

کالیا کا خیال درست ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر گزری تو ایک لڑکے نے اوپر آ کر کالیا اور میری طرف دیکھ کہا۔ ”تم دونوں کو استاد بلارہا ہے نیچے۔“ کالیا نے میری طرف دیکھ کر نشانے اچکا دیئے۔ اس کے بعد ہم نیچے آ گئے۔

استاد بھابھا کے ساتھ جینکو بھی بیٹھا تھا۔ اس کے اہرے پر پریشانی کے آثار نظر آرہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ استاد بھابھا نے ہمیں سامنے جلی کر سیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ہم خاموشی سے بیٹھ گئے تو استاد بھابھا نے خود سے پہلے کوئی بات کرنے کی بجائے جینکو سے مخاطب ہو کر گھیر سی آواز میں کہا۔ ”تم بتاؤ پہلے انہیں کیا معاملہ ہوا ہے۔“

جینکو نے ایک نظر ہم دونوں پر ڈالی پھر بتا لے لگا۔ ”کل رات والی کارروائی پر جن ڈاڈا کو ہم پرشبہ ہو چکا ہے۔ آج صبح وہ خود اپنے چند آدمیوں کے ساتھ ہمارے اڈے پر آیا تھا۔ صاف اور سیدھے لیجے میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہمارے علاقے سے جو دو تین افراد باہر سے آئے تھے (یعنی میں، کالیا اور روزی) انہیں ان کے سپرد کر دیا جائے۔ اس سے کم پر ہرگز کوئی بات نہیں ہوگی۔“

”تم نے انہیں کیا جواب دیا؟“ میں نے فوراً اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو خود پریشان ہو گیا تھا کہ انہیں آخر کیسے شبہ ہو گیا تھا ہم پر۔“ جینکو جوابا بولا۔

”حالا کہ ہم نے ہر طرح سے رازداری برتی تھی مگر ان لوگوں نے تو یہاں تک یقین سے کہہ دیا تھا کہ دوسرا اور ایک جوان عورت باہر سے علاقے میں داخل ہوئے تھے جبکہ کارروائی کرتے وقت جوان عورت (روزی) کو میرے اڈے پر ہی رکھا گیا اور باقی لوگوں نے ان دونوں نواردوں کے ساتھ مل کر اس کے آدمی جو کے مکان پر خفیہ وحدا بول کر وہاں پر فعال بنی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے۔“

”جینکو کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ آخر انہیں کیسے شبہ ہوا ہم پر؟“ کالیا نے اس سے پوچھا۔ استاد بھابھا خاموشی کے ساتھ اپنی مٹھی میں دبی خاص قسم کی بیڑی کے گہرے گہرے سوئے لگاتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

جواب میں جینکو بولا۔ ”کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے گروپ کے ماہر کھوجی کے ذریعے فوری طور پر ”ہیڑا“ (قدموں کے نشانات وغیرہ) تلاش کر لیا ہوگا۔“

”ایک وجہ اور بھی ہو سکتی ہے اس شے کی۔“ میرے ذہن میں فوری ابھرنے والے ایک خدشے نے مجھے بولنے پر اکسایا۔ ”جب میں اور کالیا اور روزی نامی وہ لڑکی لیاری میں داخل ہوئے تھے تو دو مسلح افراد نے ہمارا راستہ روکا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں سے بھی جن ڈاڈا والوں نے انفارمیشن لی ہو۔“

”یہ بھی ممکن ہے۔“ جینکو نے اثبات میں سر ہلایا تو استاد بھابھا نے اپنی مٹھی میں دبی بیڑی کی راکھ کو چٹکی بجا کر ہنڈکا اور گھیر لیجے میں جینکو سے بولا۔ ”یہ بتاؤ تم نے پھر اس مسئلے کا حل کیا نکالا ہے کہ ان کے ایک آدمی کو لیے یہاں میرے اڈے پر آ گئے۔ یعنی تم نے خود ہی ان کے شے کی تصدیق کر دی۔“

”میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا لیکن

اس کی بھی ایک وجہ تھی کہ میں انہیں مطمئن کر سکوں۔“ جینکو نے جواب دیا۔

”مجھے یہ تو اعتراف کرنا ہی پڑا تھا کہ میرے پاس واقعی تین افراد باہر (بیرونی علاقے) سے آئے تھے مگر وہ کوئی کارروائی کرنے نہیں بلکہ ہمارے ہی کہنے پر ایک طوائف کو ساتھ لائے تھے جس کے ساتھ ہم نے رات گزار دی اور صبح سویرے انہیں چلا کر دیا۔“

اس کے اس جھوٹے جواز پر میری طبیعت مضطرب ہوئے گی۔ وہ روزی کو طوائف کہہ رہا تھا اگرچہ مجبوراً سہی، تاہم اس نے اپنے تئیں جواز معقول ہی گڑھنے کی کوشش چاہی تھی۔

وہ آگے بتانے لگا۔ ”جہاں تک ججن ڈاڈا کے آدمی کو یہاں لانے کا سوال تھا تو وہ میں نے اپنی بات میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کہا تھا کہ وہ دو آدمی یہاں سے نقل و حرکت تھے۔ اب انہوں نے کہا ہے کہ ان دونوں آدمیوں کو پیش کر دو۔ ہم ان سے خود ہی پوچھ سچہ کریں گے۔ یہ آخری مطالبہ اس نے کیا اور چلا گیا یہاں سے۔ اب بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟“

ہم تینوں استاد بھابھا کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنی مٹی میں دبی بیڑی کی راہ چھڑکتے ہوئے بولا۔ ”ہم دو جلی آدمی بھیج دیں گے ان کے پاس اور ایک لڑکی کا بھی بندوبست کر دیں گے۔ ہم ان تینوں کو سکھا سچھا دیں گے کہ انہوں نے وہاں کیا کہنا ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے اب تک کی ہونے والی گفتگو کی صراحت پر تیزی سے غور کرتے ہوئے ذہن سے کہا تو وہ سب قدرے چونک کر میرا چہرہ دیکھنے لگے۔

”اب اس نازک معاملے میں زیادہ جھوٹ نہیں بھول سکتا اور حالات ہم سب کے لیے خراب ہو جائیں گے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں، تم ہی اس مسئلے کا کوئی حل بتاؤ۔“ استاد بھابھا نے کہا۔

”اب تک کے واقعات سے صاف پتا چلتا ہے کہ ججن ڈاڈا والوں کا کارکنی گروپ بڑی ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اسے ڈی آدمیوں سے نہیں بلکہ اصل آدمیوں کے ذریعے ہی دھوکا دیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں کالیا اور وہ لڑکی روزی، ہم تینوں اسی ہائیک پر وہاں جائیں گے اور جینکو ہمارے ساتھ ہوگا۔ ہم خود اس کے بیان کی تصدیق کریں گے۔“

”لیکن جگری! استاد کے کہنے کے مطابق اگر یہی کام

ڈی آدمیوں سے کروایا جائے تو کیا برائی ہے؟“

”تم نے میری بات پر غور نہیں کیا کالیا!“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ استاد بھابھا اور جینکو اپنی پُر غور نظریں بدستور میرے چہرے پر جمائے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور آگے بولا۔ ”ان کی ریکی بہت ٹھوس اور مضبوط لگتی ہے۔ ابھی اور بھی بہت سی باتوں کا ان لوگوں کو پتا ہوگا جنہیں ان لوگوں نے ابھی اپنے ذہن تک ہی محدود رکھا ہوگا۔ وہ عین وقت پر ہمارا کوئی جھوٹ بکڑنے پر ہی ظاہر کریں گے، جس کا جواب ہم ہی دے سکتے ہیں اور اس کا راستہ بھی اسی وقت باتوں کے دوران ہم ہی تلاش سکتے ہیں کہ ہمیں اپنی گلوڈ خلاصی کے لیے اور کیا بولنا ہے وہاں جبکہ ڈی آدمی اپنا دفاع نہیں کر پائیں گے، کیونکہ بہت سی ایسی باتوں کا انہیں علم نہ ہوگا اور یہ مار کھا جائیں گے۔“

”لیکن جگری!“ کالیا نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا تو اچانک استاد بھابھا بولا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس پر جینکو نے بھی تائید کی تو بالآخر میری تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جینکو مطمئن ہو کر استاد بھابھا کے ڈے سے چلا گیا۔ اس نے اب ججن ڈاڈا سے ہمارے ملنے کا وقت لے کر ہمیں بتانا تھا۔

اس کے بعد میں اور کالیا اوپر آ گئے۔ وہ الجھا ہوا تھا۔ تاہم ہم دونوں نے ہمیں بھر اور ہائیک پر نکل گئے۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ سیٹھ ستاری بلڈر کمپنی ”بلیو مون ہائیکس“ کے نام سے موسوم تھی جو بوٹیشن کے ایک بڑے مہنگان آباد کرشل علاقے میں تھی۔ یہاں کئی گلوڈری اور سپر گلوڈری اپارٹمنٹ اور ڈپلیکس بنے ہوئے تھے اور کفشن کا یہ ایک خاصا مشمول علاقہ کہلاتا تھا۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں کم و بیش ایک گھنٹا تو لگ ہی گیا تھا۔ میں نے تو ادیز عمر خاص کامیاب بھر رکھا تھا جبکہ کالیا نے اپنی ہی طرح کے ایک نو عمر لڑکے کا ہروپ بدلا ہوا تھا۔

اس عالی شان دفتر کے وسیع و عریض احاطے کے گیٹ پر ایک بارودی چوکیدار کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤز تھا۔ ہائیک کالیا ہی چلا رہا تھا۔ گاڑی نے ہمیں روک لیا۔ میں نے بڑے بوڑھوں جیسی کھٹکھاتی آواز میں اس سے کہا۔ ”میاں! ہمیں ایک بڑے پروجیکٹ کے سلسلے میں یہاں کسی سے ملنا ہے۔ تم ہی ہماری رہنمائی کر دو کہ کس سے ملیں ہم؟“ میری بات پر اس گھاگ سے دکھائی دینے والے گمن بردار گاڑی نے کچھ طنزیہ سی نظر ہماری ہائیک پر ڈالی اور پھر اسی لہجے میں

بولو۔ ”بڑا پروجیکٹ اور اس سواری میں!“

”میاں! عجیب نام معقول آدمی ہوتم۔“ میں نے خرات بڑھوں کی طرح اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے صاحب یہاں آکر بات کر چکے ہیں، اس وقت میں بھی ساتھ تھا، ان کے ہم تو بس ان کے ملازم ہیں اور عمومی نوعیت کی باتیں کرنے آئے ہیں، جو آخری مراحل میں ہیں۔ وہ کون صاحب ہیں جو اندردا میں جانب ایک کامیونیکل پر بیٹھے ہیں، بڑے سراور بڑے بالوں والے مگر دلیے پٹنے سے۔“ میں نے اسی آدمی کا حلیہ بتا دیا جو احسان جمالی گڈز کے ملازم اور ملوک کے سالے رحیم بخش نے بتایا تھا۔

”اچھا..... اچھا! آپ شاید ثاقب صاحب کی بات کر رہے ہیں۔“ گاڑڈیک دم بولا۔ ”جائیے..... جائیے، وہ موجود ہیں اپنی سیٹ پر۔“ کہتے ہوئے اس نے ہمیں راستہ دیا۔

میری چال سے نہ صرف مطلوبہ آدمی کا نام معلوم ہو گیا تھا، ہمیں بلکہ اس کی اندر موجودگی کی تسلی بھی ہو گئی تھی۔ اندر بانیک سے اترتے وقت کالیا نے میرے کان میں توصیفی سرگوشی کی تھی۔ ”اے لے..... جگر کی! تو تو ایک دم فاسٹ جا رہا ہے۔“

ہم دونوں ششے کے بڑے سے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گئے اور میری حتمی نظروں نے دائیں جانب میز پر اسی ثاقب نامی شخص کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ اکیلا بیٹھا کسی فائل پر جھکا ہوا تھا، پھر یکدم فائل بند کر کے اپنی کرسی سے اٹھنے لگا تو میں نے فوراً اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی دیکھ کر ٹھہر گیا اور چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سموئے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”فرمائیے جناب! کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی؟“

”ایک پروجیکٹ کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا تھی۔“

”جی جی! تشریف رکھیے۔“ کہتے ہوئے وہ بھی دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی اور کالیا میرے برابر والی کرسی پر ارجحان ہو گیا۔

”جی فرمائیے! کس قسم کے پروجیکٹ کے سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں آپ؟ رہائی یا کنٹرول۔“

”کنٹرول ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ دراصل ہم چند ڈاکٹرز مل کر ایک میڈیکل سینٹر قائم کرنا

چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں کم از کم دو ہزار گز پلاٹ درکار ہے۔“ میری بات پر جگڑے کی کشن کے لالچ پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

وہ اسی طرح ہاتھیں پھیلا کر بولا۔ ”بہت عمدہ، پھر تو آپ بالکل صحیح جگہ پر تشریف لائے ہیں۔“

”جی ہاں! میرے دوست نے ہی آپ کے ہاں آنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ آپ سے ایک گٹھری اپارٹمنٹ کی خریداری کے سلسلے میں کامیاب ڈیل کر چکا ہے، آپ شاید ڈاکٹر شاہد اقبال کو جانتے ہوں۔“ میں نے بھی دانستہ جھوٹ بولتے ہوئے ایک عام فہم نام لیا تو میرے اندازے کے مطابق وہ بھی اپنی تعریف پر اسی طرح ہی اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل جناب! ہم تو ایسے بہت سے لوگوں کو کامیاب سودا کروا چکے ہیں جنہوں نے ابھی تک ہمیں یاد کر رکھا ہے۔“

”تو کیا آپ ابھی کوئی ہمارا مطلوبہ پلاٹ دکھا سکتے ہیں ہمیں؟“ میں نے فوراً پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اس ایریے میں تو مشکل ہے، تھوڑا ذرا باہر کی طرف ہوتو قباحت نہیں، ویسے آپ کی ریٹنگ کتنی ہے؟“

”اٹھ سے نو کوٹھے..... ایک دو گھوکھا بڑھ بھی سکتا ہے۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھوں کی چمک مزید گہری ہو گئی۔ کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ ”کوٹھے“ کا مطلب کروڑ ہی تھا۔ لیکن ہماری فرسٹ چوٹس یہی علاقہ ہے۔ کیونکہ ایک بڑے پرائیوٹ اسپتال کے لحاظ سے یہی علاقہ قدرے بہتر ٹنگا ہے۔ ویسے آپ بھی کوئی مشورہ دے سکتے ہیں۔“

میں نے آخر میں گیند اس کے کورٹ میں پھینک دی۔ وہ مزید خوش ہو گیا۔ اسی لمحے میں بولا۔ ”ارے جناب! یہی تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو اس سے زیادہ اچھی لوکیشن میں پلاٹ دلوادوں گا۔ آپ بس مجھے ہوم ورک کے لیے صرف ایک دن حثایت کر دیں۔“

”نو پر اہلما!“ میں نے کہا۔ ”ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے لیکن ذرا جلدی ہو جائے تو اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ اس پر ہم نے اسپتال بھی تعمیر کرنا ہے اپنی مرضی سے اس کے لیے کئی کسی کنسٹرکشن کمپنی سے رجوع کرنا پڑے گا اور آرکٹیکچر سے رابطہ بھی نہیں ہو سکا ہے ابھی تک ہمارا۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

وہ جھٹ بولا۔ ”ارے جناب! اگر یہ بات ہے تو آپ اس سے بھی بے غم ہو جائیں۔ ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہے کنسٹرکشن کے لیے اور پروڈیکشن آرکٹیکچر بھی ہیں ہمارے پاس۔“

ہوئے یا سر کو کوری پر رکھواتے دیکھا تھا۔“
”گڈ!“ میں نے کہا۔ ”اب تم اپنے اس بیان پر قائم رہنا۔“

”میں قائم رہوں گا جی! آخر کو یہ میری بہن کے شوہر کی زندگی کا معاملہ ہے۔“ وہ جوش سے بولا تو میں نے مطمئن ہو کر اس کا اندھا چھتہ دیا۔

اس کے بعد ہم استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے اور اپنا حلیہ درست کر کے اصل حلیے میں آگئے اور پھر وہاں سے سیدھا طبر کے متعلقہ سیکشن پہنچے جہاں انچارج انسپکٹر کامران تھا۔

قارئین متوجہ ہوں

پرجا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات پر یہ شکایت مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاد متیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، مگرز شت

C-63 نیو ایسٹیشن روڈ، لاہور، پاکستان

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”لو بھئی! اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، پھر تو آپ نے اھر بیٹھے بیٹھائے ہمارے سارے مسائل حل کر ڈالے اور کیا چاہے ہمیں بھلا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک بار پھر میری طرف بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش خلقی سے بولا۔
”اس مائی پلے پور ٹو! ہمیں خبر ہو گا آپ جیسے معزز افراد کے کام آتے ہوئے۔“

”سوناٹس آف بول! میں پھر کل آ جاؤں گا بلکہ ہو سکتا ہے میرے ساتھی بھی آئیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
”شیور! انہیں بھی ضرور لائیں۔ مجھے خوشی ہوئی مگر یہ کیا آپ تشریف تو رکھیں کوئی ٹھنڈا وغیرہ منگواتے آپ کے لیے۔“
”آپ پر ادھار رہی، کل ہی یہ سب ہو جائے گا۔ آپ ذرا اپنا کارڈ عنایت کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔“

”شیور، شیور، واے ناٹ سرا!“ اس نے کہتے ہوئے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے تھما دیا اس کے بعد میں اور کالیا نکل آئے۔ بایک پر سوار ہونے سے پہلے میں نے دھیان رکھا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ نہ پائے۔ ورنہ اسے شہر ہو سکتا تھا کہ اتنا بڑا سودا کرنے والا ایک ڈاکٹر بایک پر یہاں آیا تھا۔ چونکہ وہ پہلے ہی اپنی کرسی سے اٹھ کر کسی اور طرف جا رہا تھا اسی لیے غلطے وقت میں نے کن آنکھیں سے اسے دوسرے کمرے کی طرف پلکتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور پھر جلدی سے بایک نکال کر میں گیٹ سے باہر آ گیا۔ کالیا پیچھے سوار ہو گیا تھا۔
”اے! مگر یہ یہ تو ہاتھ آ گیا سمجھو۔“ کالیا نے میرے پیچھے سے کان میں کہا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے تسلی تھی کہ جس کام سے آیا تھا وہ ہو چکا تھا۔ میری جیب میں اگلے ہوئے اسپائی قلم نے قاقب کے مختلف زاویوں سے تصاویر بنا ڈالی تھیں۔

ہم احسان جمالی گڈز پہنچے مگر اس سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کر میں نے بایک روک کر ریم بخش سے رابطہ کیا اور اس نے تھوڑی دیر میں پہنچنے کا کہا تو میں نے جب تک اپنے ہائی لین سے قاقب کی تصاویر نکال کر اسے اسمارٹ فون میں نقل کر لیں تاکہ اس کی اسکرین میں ریم بخش کو تصاویر آسانی سے دکھا سکوں۔

جب تک وہ ہمارے پاس پہنچا میں اپنا یہ کام بھی کر چکا تھا۔

”بالکل یہی شخص ہے صاحب!“ ریم بخش تصویر کو دیکھتے ہی بولا۔

”اسی آدمی کو ہی میں نے مٹی نواز کو رشوت دیتے

گئے۔

”چل بھر سو پر رکھ لے کاٹا۔“ کالیانے کہا اور میں نے باینک کی رفتار پر بڑھا دی۔

لیاری پہنچ کر ہم نے سیدھا پہلے جینکو کے اڈے کا رخ کیا۔ وہ وہیں موجود تھا۔ اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ جن ڈاڈا کے پاس جانے سے پہلے ایک بار بھر میں اچھی طرح سوچ لوں، میں نے اسے بھی جواب دیا جو کالیانے کو دے چکا تھا۔

جینکو نے اسی وقت جن ڈاڈا کا نمبر ملایا اور اس سے بات کی۔ اس نے فوراً ہمیں بلوالیا مگر اس شرط کے ساتھ جینکو ہمارے ساتھ نہیں ہوگا نہ ہی اس کا کوئی ساتھی۔ اس پر جینکو کو اعتراض ہوا مگر میں نے کہا کہ میں اور کالیانہ ہی جائیں گے۔

جن ڈاڈا نے ہمیں جگہ بتادی اور ہم وہاں پہنچے۔ یہ لیاری کا مشہور چورہا ”جیل چوک“ تھا، یہاں پہنچتے تو دوڑ کے ایک باینک پر ہمیں لینے آن پہنچے۔ ہم ان کے اشارے پر ان کے پیچھے باینک لگا کر روانہ ہو گئے۔

مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے، بارہا میرے دل و دماغ میں یہ خیال آتا رہا کہ کہیں میں کوئی ہمیائیک غلطی تو نہیں کر رہا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جن ڈاڈا کو مطمئن نہ کر سکیں اور اس کے اڈے پر ہی بے موت مارے جائیں۔

بلاشبہ یہ میرا بہت خطرناک فیصلہ تھا اور علاقہ بھی اس سے زیادہ خطرناک۔ کون ہمارے جھوٹ کو تسلیم کر لیتا، مجھے دماغی خرچ پر یقین بھی تھا کہ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا، کیونکہ میرا اس طرح رضامندی سے ان کے پاس آنا بھی مجھے بے قصور بناتا تھا۔

جلد ہی ہم ایک بڑے سے چوٹی گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ گیٹ فوراً بند کر دیا گیا۔

اس کے عقب میں مجھے دوسرے افراد نظر آئے تھے۔ سامنے بڑا سانا پختہ احاطہ تھا اور ایک بیٹھک سی بنی ہوئی تھی۔ اس کے آگے بڑا سا چمپر نما سائبان تھا جس تلے تین چار کرسیاں اور ایک لکڑی کی بیچ دھری ہوئی تھی، بیچ پر دو افراد براجمان تھے اور کرسی پر صرف ایک ہی شخص بیٹھا تھا۔ ہمیں بیٹھنے کا کہا گیا اور ایک ہمارے ساتھ والی کرسی پر جبکہ دوسرا اندر بیٹھک میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لمبا ترنگا بلوچ ٹائپ شخص کھلے گھر اور پانچوں والی شلوار اور اسی طرح کی قمیص میں نمودار ہوا۔ اس کے سر پر شیشوں کے کام والی زرد بلیوٹی ٹوپی تھی۔

اس سے مل کر میں نے اسے ساری بات بتادی۔ وہ حیران ہو گیا اور تو صمیمی لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”ارے واہ نعمان صاحب! آپ نے تو ہمارا کام آسان کر دیا۔ اصولاً یہ کام تو ہمیں کرنا چاہیے تھا۔“

میں نے جواب میں مسکرا کر کہا۔ ”ایک اچھے شہری کے ناطے ہمیں بھی پولیس سے پورا پورا تعاون کرنا چاہیے۔ آپ اپنی کارروائی جلد نمائیں، گواہ تیار ہے، بلکہ جہاں گڈز کے فٹنگی نوآز کو بھی بلا کر چاہی گھمائیے گا۔ ایک گواہ اور مل جائے گا آپ کو۔“

”ہم.....“ انپکٹر کا مران نے ہرکاری بھری۔ ”اسے وعدہ معاف گواہ بننے کا لالچ دیا جائے گا، تب مزید ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”لیکن انپکٹر صاحب! یاد رہے کہ اس شخص کا قب کی ضمانت بالکل نہیں ہونا چاہیے یہ بہت اہم کیس ہے اور ہائی کورٹ کی ایڈووکیٹ مس زہیرہ کے ساتھ یہ واقع ہوا ہے۔ ذہن میں رہے جس کا کیس عدالت میں چل رہا ہے۔“

”بے فکر رہیں آپ! میں ابھی پولیس پارٹی تیار کرتا ہوں، آپ نے اپنا کام کر دیا اب ہمارے کرنے کی باری ہے۔“

میں نے ثابت کا وزینگ کارڈ اور اس کی تصاویر انپکٹر کا مران کو دے دی تھیں۔ جنہیں اس نے وہیں موجود اپنے پرنٹر سے نکلوا لی تھیں۔

اس کے بعد میں اور کالیانہ اس آگئے۔

”اب کدھر کا ارادہ ہے جگہ؟“ کالیانے بولا۔

”لیاری جا رہے ہیں ہم جن ڈاڈا سے ملنے۔“

”جگہ! تو نے دیے اچھی طرح سوچ لیا ہے ناں!

کیونکہ ہم جھپٹریوں کے بھٹ میں جا رہے ہیں۔“ کالیانے کہا۔

”کالیان! میرے بارہ مسئلہ ہمارے گلے آن پڑا ہے، اس کے حل کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ ہم اسے فیس کریں، اس سے بھاگیں گے تو یہ گلے ہی پڑا رہے گا، پہلے ہی ہم اتنے مسائل کا شکار ہیں۔“

”بات تو تیری بھی صحیح ہی ہے، جگہ! پر روزی سے تو بات کر لے ناں، اسے بھی تو ساتھ لے جانا ہوگا۔“

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا ہی سچ کھل جائے (یعنی ہم دونوں ہی اصل میں وہاں تھے) تو یہی بہت ہے، ہم سے مطمئن نہیں ہوئے تو پھر روزی کو بھی لے آئیں

چہرہ لیوڑا اور رنگ گندی تھا۔ آنکھوں سے کرنٹلی اور چہرے پر کسی کو بھی خاطر میں نہ لانے والی رعونت اندلی نظر آتی تھی۔ مجھے یہی جن ڈاڈا لگا تھا۔

”سلام سائیں!“ میں نے اٹھ کر اسے سلام کیا اور کالیا نے بھی یہی کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جواب نہیں دے گا نہ ہی ہم سے ہاتھ بھی ملانے گا مگر باوجود ہمیں دیکھتے ہی اس کے چہرے کی کرنٹلی سواہوں نے کہ اس نے ہم سے ہاتھ بھی ملایا اور سلام کا جواب بھی دیا۔ مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ پھر اس نے ہمیں سامنے کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی اشارہ کر دیا اور خود بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

چند ثانیے تک یہ گینگ وار لیڈر مجھے اور کالیا کو گھورتا رہا اس کے بعد اس نے اپنے ارباب قریب کھڑے ساتھیوں میں سے ایک سے بلوچی میں کچھ کہا۔ وہ سر کو ہلکے سے خم کر کے لمبے لمبے ڈنگ بھرتا ہوا گیٹ سے باہر نکلتا چلا گیا۔

اس کے بعد جن ڈاڈا نے اپنے حلق سے ایک طویل ہکاری خارج کی اور میرے چہرے کی طرف گھور کر بولا۔ ”ہینکو کوکب سے جانتے ہو؟“

”کل رات سے۔“ میں نے پہلے سے سوچے سمجھے اس کے متوقع سوالات کے جواب میں کہا۔

”اور تم؟“ اس نے کالیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی سائیں! کل رات سے ہی۔“
”وہ چھوڑ کر کدھر ہے، جو کل رات تمہارے ساتھ تھی؟“ جن ڈاڈا نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے جواب میں ہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دھندے پر مٹی ہوئی تھی۔“
”کیا نام تھا اس کا؟“

”روزی۔“

”تمہارا کیا نام ہے؟“

”احمد نعمان۔“ میں نے دانستہ اپنا لانا نام بتایا۔

”اور تمہارا؟“

”شیرازی!“

اسی وقت وہ آدمی دوبارہ نمودار ہوا جسے جن ڈاڈا نے کہیں بھیجا تھا۔ اب اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ شخص بھی تھا۔ جن ڈاڈا نے اس بار سندھی میں اس سے جو کہا وہ میں سمجھ گیا۔ اسے ”بھرا“ لینے کو کہا گیا تھا۔ وہ سندھی بوڑھا ایک دم جھک گیا اور پھر جہاں ہم بیٹھے تھے، وہاں سے زمین کو جھک جھک کر اگھٹا ہوا گیٹ تک گیا اور اسی طرح دوبارہ لوٹا تو اس نے

دلی کے ایک ہندو پاک مشاعرے میں حنیف جالندھری اپنی ایک غزل سنا رہے تھے کہ فراق گورکھپوری نے دفعتاً بلند آواز سے کہنا شروع کیا۔ ”واہ حنیف پیارے! کیا گلایا ہے۔ یار میرا سارا کلام لے لو اور اپنی آواز مجھے دے دو۔“ حنیف فی الفور شعر ادھورا چھوڑ کر فراق سے کہنے لگے۔ ”جناب فراق صاحب! میں آپ کا نیا زمند ہوں۔ میری آواز تو کیا آپ مجھے بھی لے لیجیے۔ لیکن خدا کے لیے مجھے اپنا کلام نہ دیجیے۔“

ہماری اطراف دیکھتے ہوئے، جن ڈاڈا کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنا سراسر اثبات میں ہلا دیا۔

میں نے اندر ہی اندر سکون کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ یہاں تک ہم سچے ثابت ہوئے تھے۔ بات گہری تھی مگر نفسیاتی مار کی تھی، مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ جو لوگ اتنے زیرک و داغ تھے کہ انہیں ہمارا پتا چل گیا تھا، وہ ڈی افراد کو فوراً بھاپ لیتے اور ہمارا جھوٹ پکڑا جاتا۔ اسی سبب میرے ذہن طباح میں یہی خیال آیا تھا کہ جھوٹ کو حقیقت کے پردے سے ہی چھپانا ممکن تھا اور وہ میں کر رہا تھا۔

جن ڈاڈا نے اس بوڑھے سندھی کھوئی کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر ایک گہری سانس خارج کر کے مجھ سے بولا۔ ”دیکھو! ہم دوست اور دشمن کی بود و بد ہی سے سو گتھ لیا کرتے ہیں۔ تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ ہی ہینکو سے، ہم محض ایک غلط فہمی کی بنیاد پر اپنے تعلقات نہ خراب کرنا چاہتے ہیں نہ ہی دوستی کو دشمنی میں بدلنا ہمارا شیوار ہے۔ اس لیے میں صرف سچ ہی سنوں گا۔ کیا کل رات تم نے ہمارے آدمی مجھ کے ایک مکان پر پہلہ بولا تھا اور ایک ریغالی لڑکی کو چھڑا کر لے گئے تھے؟“

”یہ غلط ہے۔“ میں نے فوراً کہا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس گینگ وار لیڈر کی ”اپروچ“ بس ادھر ہی تک تھی۔ اس سے آگے کچھ نہیں اور جہاں تک محمی وہاں تک میں نے اسے اپنی عقل سلیم اور ذہنی فراست تلے چل ڈالا تھا لہذا پہلے سے زیادہ اعتماد سے بولنا جاری رکھا۔

”آپ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ کو بھی اتنی مردم شناسی تو ہوگی ہی کہ آپ جبجو اور عام آدمی کی پہچان کر سکیں۔ ہم ”مال“ سپلائی کرتے ہیں۔ (یہ کہتے ہوئے میں نے اشارتا اپنی ناک پر دستک دی محمی اور یہاں بھی میری

یوں بھی ہم کسی مستند ڈاکٹر کے پاس ایسا زخم دکھانے سے کترا بھی رہے تھے، کیونکہ وہ اسے دیکھتے ہی بھانپ لیتا کہ یہ زخم مگن شاٹ دوٹھ ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد میں نے روزی کا نمبر ملایا اور اس سے ملاقات کرنے کا پوچھا تو اس نے اپنا موجودہ پتہ بتا دیا جو یونیورسٹی روڈ، موسمیات کے علاقے میں تھا۔

میں اور کالیا اس کی طرف روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر ہم یونیورسٹی روڈ پہنچے اور سیدھا نکلتے چلے گئے۔ اس کے دس پندرہ منٹ بعد ہم موسمیات کے علاقے میں تھے۔ یہاں ایک بلڈنگ تھی، جس میں بہت سے فلیٹ تھے۔ یہ خاصی پرانی مگر مضبوط کنسٹرکشن تھی۔ ایسے ہی ایک ڈی نیٹ اپارٹمنٹس والے برڈجیکٹ کے سامنے ہم رکے اور گیٹ سے اندر داخل ہونے لگے تو وہاں موجود چوکیدار نے ہم سے پوچھا کس سے ملنا ہے؟ روزی نے ہمیں بتا دیا تھا کہ ہم نے کیا کہنا ہے۔ لہذا میں نے کہا۔

”مگر یہی بھائی کے فلیٹ میں جانا ہے۔“ اس نے ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔

کالیا نے بائیک اندر گھمائی۔ اندر وسیع کار پارکنگ تھی۔ ایک طرف بائیک کھڑی کرنے کی بھی خاصی کٹھاہ جگہ تھی۔ لائن سے بائیکس کھڑی تھیں۔ کالیا نے بھی اپنی بائیک اس میں گھسا کر کھڑی کر دی۔ اس کے بعد جب وہ اسے سائیڈ اسٹینڈ کر رہا تھا تو میری عقب میں گیٹ پر نظر پڑی تو ایک سفید رنگ کی کلکس کار کو چوکیدار نے روک رکھا تھا۔ اس کے ڈرائیونگ سیٹ اور اس کے برابر میں ایک شخص براجمان تھا۔ ڈرائیور تو چوکیدار سے باتیں کرنے میں مصروف تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو میں نے اپنی طرف گھورتے پایا۔ اس کی صورت خاصی کربہ تھی۔ تاک موٹی اور چہرہ بھاری تھا۔ اس کی جسمانی ساخت کا بھی میں نے کچھ اسی طرح کا ہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے دیکھا ڈرائیور کو چوکیدار نے اندر نہیں آنے دیا تھا اور وہ کار کو واپس موڑ رہا تھا۔

”آگے چل جگہ! کیا دیکھ رہا ہے؟“ اتنے میں کالیا نے میرے ساتھ کھڑے ہو کر کہا۔ میں اسی طرف ہی متوجہ تھا۔ کلکس اب گیٹ کے باہر ایک طرف کھڑی ہوئی تھی مگر اس کے اندر سے وہ دونوں برآمد ہو رہے تھے۔

چوکیدار نے انہیں کار سمیت اندر آنے کی اجازت نہ دیا، البتہ وہ دونوں اندر آ چکے تھے۔ جب تک میں اور کالیا بلڈنگ اے، ٹو کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں فرسٹ فلور پر مظہر

طبیعت منفعی سی ہوئی تھی مگر کیا کرتے مجبوری تھی اور جان پہ بھی بنی ہوئی تھی، سو خود کو غورتوں کا سپلاز رکھنا پڑا تھا! اگر یقین نہیں آتا تو آپ بھی حکم کریں اور میرا فون نمبر نوٹ کر لیں، آپ کے بھی کام آکر خوش ہوگی نہیں لیکن..... دام کھرے ہونے چاہیں۔“ میں نے آخر میں دانستہ حریصانہ لہجے میں کہا تو میرے سامنے بیٹھا جن ڈاڈا ایک دم گم صمسا ہو کر مجھے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ ہماری طرف بڑھا۔ ہم بدک سے گئے۔

”چلو، اٹھو اپنا راستہ پکڑو..... شکر کرو سائیں نے تمہیں چھوڑ دیا۔“

کالیا اور میں نے جن ڈاڈا کا شکریہ ادا کیا اور پھر ہم واپس بائیک پر بیٹھ کر جینکو کے پاس آ گئے۔ وہ آؤں تو ہمیں اتنی جلدی اور صبح سلامت دیکھ کر حیرت زدہ ہوا، اس کے بعد خوش ہو کر بولا۔ ”لگتا ہے تم لوگ جن ڈاڈا کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکے ہو۔“

”ہاں!“ کالیا نے مر جھٹک کر کہا۔ ”یہ اپنے اس جگری نعمان کا کمال ہے، بڑی زیرک دماغی سے اس نے اس جفا گرد کو چھٹا دیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے اس نے ہمیں صحیح مشورہ دیا تھا۔“ جینکو میری طرف خفیف سی مسکراہٹ سے سکتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ اس بات پر تو میں نے بھی غور کیا تھا کہ اگر تم دونوں کی بجائے ڈی آئی سیجے کو معاملہ اور بھی جڑ جاتا۔“

”ہاں! اس نے تو ہم سے کوئی بات کرنے سے پہلے اپنے اسی کھوجی کو بلوا کر ہمارا جیرا چیک کر دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

پھر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد ہم دونوں جینکو کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

”اب کدھر کا ارادہ ہے جگری؟“ کالیا نے مجھ سے پوچھا۔

”بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ بائیک وہی چلا رہا تھا۔ بولا۔ ”لیکن ابھی میں تجھے ایک ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ تیری مرہم بھی ضروری ہے۔“

وہ مجھے اپنے کسی جاننے والے ڈاکٹر کے کلینک میں لے گیا، جو اسی علاقے میں ہی تھا لیکن اس ”ڈاکٹر“ اور اس کی ”کلینک“ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ”کونکلس“ یعنی عطائی ڈاکٹر تھا۔ تاہم بعد میں کالیا نے مجھے بتایا کہ یہ خاصا تجربہ کار تھا اور اس نے میڈیکل ٹیچننگ کا کورس بھی کر رکھا تھا۔

فلٹ تھا۔

میں بیڑھیاں چڑھتے ہوئے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، نجانے کیوں میری چمچی حس نے مجھے کسی خطرے کے احساس تلے بے چین سا کر دیا تھا۔
”کیا بات ہے جگر! تو کچھ گھبرا گیا ہوا سا لگ رہا ہے۔“

”خطرہ“ میں نے ہولے سے مگر سرسراتے لہجے میں کہا تو وہ چونک پڑا اور اسی لہجے میں بولا۔
”خطرہ.....! کیسا خطرہ؟“

”چلتے رہو مگر اپنے مطلوبہ فلٹ کے سامنے ابھی مت رکتا اور اوپر نکلتے جانا۔“

ہم دونوں آگے پیچھے بیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اپنے مطلوبہ فلٹ کے فلور پر میں تھوڑا سا اور عقب میں نیچے جانے والے زینے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں افراد بھی اوپر آ رہے تھے۔ میں فرسٹ فلور چھوڑ کر سیکنڈ پر آ گیا اور دانستہ کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت وہ دونوں مشکوک افراد نمودار ہوئے۔ وہ دونوں اسی فلور پر آ کر رکے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دونوں ہمیں گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے اوپر نکل گئے۔ میں نے اپنی سانسیں جیسے سینے میں روک لی تھیں۔

”کوئی ملاقاتی ہوں گے۔ چل نیچے۔“ کالیا نے کہا۔ میں نے ایک نگاہ اوپر جاتے زینے پر ڈالی تو انہیں بدستور اوپر جاتے دیکھا اور قدرے مطمئن ہو کر پلٹا۔ اب ہم دوبارہ نیچے زینے اترتے ہوئے فرسٹ فلور والے اپنے مطلوبہ فلٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔
”کون ہے؟“ ذرا ہی دیر بعد اندر سے ایک نسوانی آواز ابھری۔

اس شناسا آواز کو میں ہی نہیں بلکہ کالیا بھی پہچان گیا۔
”دروازہ کھولیں مس روزی! ہم آگئے ہیں۔ نعمان اور کالیا۔“

یہ سنتے ہی روزی نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ روزی نے فوراً ہمارے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔ مجھے وہ کچھ ہراساں سی دکھائی دی تھی، ڈری ہوئی تو وہ پہلے ہی سے تھی۔ اس کی وجہ بھی ہمیں معلوم تھی۔ وہ سیدھا ستارے ہی خوف زدہ تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے سے خوف اس طرح جھلک رہا تھا جیسے ابھی اس کی قضاء آنے والی ہو۔

شعراء

ہندوستان کے مشہور شاعر روشن صدیقی پست قامت انسان ہیں۔ ایک روز مجاز سے کسی بات میں الجھ پڑے۔ زعم میں آ کر بولے۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں ہندوستان کا شاعر اعظم ہوں۔“ مجاز نے برجستہ جواب دیا۔ ”جی! مگر پہلے آپ قدامت تو ہو جائیے۔“

ایک بوڑھے، سفید ریش شاعر، جرأت و داغ کے رنگ میں بڑے شوخ قسم کے اشعار کہتے تھے۔ کسی کالج کے مشاعرے میں غزل سنانے کے لیے اس پر تشریف لائے۔ جو بھی مطلع کا پہلا مصرع پڑھا: ”نکلے کو تر حسرت وصل کی اے نازنین نکلی!“ طلبہ نے یک زبان ہو کر دہرایا ”نازنین نکلی!“ انہوں نے مصرع ثانی پڑھا: ”مگر جیسی نکلی چاہیے ویسی نہیں نکلی!“ کالج کے ایک ذہین اور زندہ دل طالب علم نے برجستہ کہا: ”لیکن قبلہ! اس میں نازنین کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

کسی مشاعرے کی ایک مخصوص نشست میں کوئی صاحب ذوق شعرا کے ہر اچھے شعر پر برکتی اور برجستہ داد دے رہے تھے۔ ان کے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جو اپنی سخن شناسی کی نمائش کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ صاحب ذوق کسی شعر پر یوں داد دیتے۔ ”واہ! اشعر میں لفظوں کا دروبست کیا خوب۔“ تو وہ دھرا دیتا۔ ”سبحان اللہ، کیا لفظوں کا دروبست ہے۔“

جب وہ کہتے۔ ”بہت خوب کیا معنی ہیں آفرینی ہے۔“ وہ کہتے۔ ”تشیبہ کی جدت قابل داد ہے۔“ یہ کہنے لگا۔ ”بالکل نئی تشبیہ ہے۔ لا جواب تشبیہ ہے۔“ جب شاعر نے غزل کا مقطع پڑھا تو ان صاحب کو شوخی سمجھی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”واہ کیا ایطاء جلی ہے۔“ اب اس کی باری تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاٹ دار آواز میں داد دی۔ ”اے سبحان اللہ! کیا خوب ایطاء جلی ہے۔“ (واضح ہو کہ ایطاء جلی اصطلاح میں قافیے کے ایک نمایاں عیب کو کہتے ہیں)

یہ دو پندرہ اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل فلیٹ تھا۔ چھوٹا سا لاؤنج تھا۔ ہم صوفے پر براجمان ہو گئے جو ایک ٹوبیئر اور دو کرسیوں پر مشتمل تھا، سامنے ہی چار کرسیوں والا ڈائنینگ ٹیبل تھا۔ کچن بھی اسی سے ہی ملحقہ تھا۔

”خیریت تو ہے سس روزی! آپ کچھ زیادہ ہی پریشان اور گھبرائی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں؟“ میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہمارے سامنے والی ایک کرسی منہ جاتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

”مجھے سیٹھ ستار کے کسی کتے کا دمکی آمیز فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں یہ شہر چھوڑ جاؤں۔“

”تو پھر آپ نے کیا سوچا سس روزی؟“ مجھ سے پہلے کالیانہ اس کا عندیہ جاننے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ جواب اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔

”میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور رابطہ ہی منقطع کر دیا تھا۔“

”یہ تم نے ٹھیک کیا۔“ میں نے کہا اور اس کے سراپہ سے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے مستغرق ہوا۔ ”آپ کیا چاہتی ہیں؟ میرا مطلب ہے اگر آپ سیٹھ ستار سے خوف زدہ ہیں تو ہم آپ کو بحفاظت اور انتہائی رازداری کے ساتھ کسی دوسرے شہر بھجوانے کا بندوبست کر سکتے ہیں؟“ میری بات پر روزی کو تو نہیں البتہ کالیانہ کو ضرور حیرت ہوئی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہا تھا کہ میں تپ کے اس پتے سے کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے اسے ”چلتا“ کیوں کرنا چاہ رہا تھا مگر میں دراصل یہ بات کہہ کر روزی کی اپنی مرضی جاننا چاہتا تھا۔ وہ اگر جان کے خوف سے یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی تو کم از کم ہم ضرور آگاہ ہو سکیں، کیونکہ ایک تو اگر وہ خود سے یوں فرار ہونے کی کوشش کرتی تو ممکن تھا، سیٹھ ستار کے گھر سے اسے جان سے مار ڈالتے، ہم اگر اسے روانہ کرتے تو اس سے کسی نہ کسی طرح رابطے میں ضرور رہتے اور یوں یہ تپ کا پتا ہمارے ہی ہاتھ میں رہتا اور اس کی جان بھی محفوظ رہتی۔

”میں ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی۔“ چند سیکنڈوں بعد اس نے جواب دیا۔ ”میں بس یہ چاہتی ہوں کہ بے موت نہ ماروی جاؤں، مروں تو کم از کم سیٹھ ستار کو کوئی بھاری نقصان پہنچا کر ہی مروں۔“

مجھے اس کا جواب بے حد پسند آیا تھا، جو میرے لیے حوصلہ افزاء بھی تھا، لہذا میں نے اس سے تو صمیمی لہجے میں کہا۔ ”تم نے بہت اچھی بات کہی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے تم

ایک بہادر، باہمت اور پر عزم لڑکی ہو لیکن انتہائی اور کھنا کر زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب کبھی ہوگی وہ اس وقت آکر رہے گی۔ چاہے انسان دنیا کے کسی بھی کونے میں نکل جائے، سیٹھ ستار جیسے جلا دوں کی رسی اللہ نے دراز ضرور کی ہوئی ہے مگر وہ جلد اپنے انجام کو پہنچ کر رہے ہیں۔ ضرورت بس پامردی کی ہوئی ہے۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے، سیٹھ ستار جیسے ایک بوے بلڈز رافنا اور محرم ذہیت رکھنے والے کے سامنے میری کیا حیثیت ہے؟ لیکن مجھے اپنے خدا پر یقین ہے کہ وہ نیک راہ پر چلنے والوں کی ضرورت دے رہا ہے، بس ایسی میرا ایمان ہے اور میں نے سیٹھ ستار جیسے مگر مجھ سے میرے رکھا ہے۔ تم فکر نہ کرو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“

تھوڑے توقف کے بعد میں نے اس سے دوبارہ کہا۔ ”تم بھینا اس آدمی کے کئی اہم رازوں سے واقف ہو۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی ہے جس میں کاتب تقدیر کا دخل تھا کہ ہماری اس رات اچانک یوں ملاقات ہوئی، اس طرح تمہیں ہماری صورت میں اور ہمیں تمہاری صورت میں ایسا راستہ بھجائی دیا کہ ہم مل کر سیٹھ ستار جیسے سماجی ناموروں کا خاتمہ کر سکیں۔“

میں نے دیکھا میری باتوں سے روزی کا تھوڑی دیر پہلے ہراس سے ستا ہوا چہرہ کچھ طمانیت اور ایک عزمِ صمیم کی جھلک پیش کرنے لگا تھا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ ”میں تو خود بھی یہی چاہتی تھی نعمان صاحب کہ مجھے آپ جیسے باہمت انسان کا سہارا ملے تو میں سیٹھ ستار جیسے مگر مجھ کی قبر کھود سکوں جس نے میری باجی کی زندگی بربادی اور میری نجائے نکستی معصوم لڑکیوں کی زندگی اس شیطان نے تباہ کی ہوں گی۔“

وہ ذرا ٹھہری پھر آگے بولنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

ہم سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ میں نے مستغرقانہ نظروں سے روزی کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔

”یہ میری ایک سہیلی کا فلیٹ ہے۔ شاید وہی آئی ہو، آپ پریشان نہ ہوں۔“

وہ یہ کہہ کر دروازہ کھولنے کے لیے بڑھی۔ نجائے کیوں میرا دل بے چینی سی محسوس کرنے لگا، جیسے کچھ ہونے والا ہو..... پھر چپکا مجھ سے بھی بیٹھا نہ گیا، میں کسی بھی احتیاط کے پیش نظر اس کے پیچھے دروازے کی طرف لگا تو کالیانہ نے بھی میرے خطاط انداز کو بھانپتے ہوئے اپنا پستول نکال لیا۔

(جاری ہے)

(نیلو فر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ارتضیٰ ملک..... لاہور

مشاہد کے قلم سے لکھا گیا ہے مجھے
میں ایسا لفظ ہوں جس کو کوئی مٹا نہ سکے
مٹی عزیز منے..... لڈن

میں اسے مانگ تو لوں رب سے جا کر
پتا نہیں فیصلے قدرت کے کیا ہوں گے

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

مرزا جہان بیگ..... حیدر آباد

روفتی شہر کی خاطر یوں جنوں زار نہ بن
میں اس شہر کے پہلو میں ہوا گرد و غبار
عندلیب مظہر..... ملتان

رسم دنیا ہے کسی طرح بھاتے رہے
دل نہ ملتا ہے مگر ہاتھ ملاتے رہے
(نایب منصور کوئٹہ کا جواب)

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس

یہ عذر استخوان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
(نزاہت افشار فتح جنگ کا جواب)

اختر شاہ عارف..... جہلم

میں اب جیت بھی جاؤں تو دل خوش نہیں ہوتا
جس شخص کو ہارا ہے وہ اموں بہت تھا
سدرہ بانو ناگوری..... کراچی

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوار کوئے جانان
وہ ہمیں سے لوٹ جائیں جنہیں زندگی ہے پیاری
(نجمہ توفیق کراچی کا جواب)

نزاہت افشار..... فتح جنگ

ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد کرے
ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد رہے

سعید احمد چاند..... کراچی

قفس قفس میں رونق یہ چمن ہے اجڑا اجڑا
غم دوست یہ بتا دے کہاں تو نے ہم کو چھوڑا
(ماہ نور تبسم ملتان کا جواب)

رفیق احمد تازہ..... ڈی جی خان

ایسا بنگھرا ہوں کہ اب سٹ سٹا نہیں
کرچیاں وجود سے لپٹ کر رہ گئیں
(ماہین فاطمہ شاہین لیہ کا جواب)

عبدالباقی رودی انصاری..... لاہور

اک حسن زندگی ہی تو شہکار ہے
قدرت کی مصوری میں عجب طلاطم کے ساتھ
شہناز فرحت..... لاہور

آپ کے اس التفات بدلا کا شکریہ
یہ گزارش ہے مگر دیکھیں نہ یوں دل کی طرف
نیاز احمد..... کراچی

آمد فصل بہاراں کا نظارہ تو بہ
کھینچتا ہے کوئی دامن تو گریبان کوئی
(زاہد رفیق لاڑکانہ کا جواب)

سید امتیاز حسین بخاری..... سرگودھا

وہ کون ہے جو تمہارا نہیں تنہائی
ہر ایک دل میں چھپا داغ آرزو دیکھا
(ملک فیصل لاہور کا جواب)

شبیر شاہ..... کشمور

یہ تیری جدائی کی یادگار ہے ورنہ
اک زخم کو بھرنے میں حقیقی دیر لگتی ہے
(رفیق احمد تازہ ڈی جی خان کا جواب)

فیروز احمد..... ڈی جی خان

یہ ندی پار کرو گے تو نظر آئے گا
اک چتا اور سلتی ہے مرے تن کی طرف

تکلفتہ یا سبک.....کراچی

یقین نہ آئے تو اک بات پوچھ کر دیکھو
جو جس رہا ہے وہ رخصتوں سے چور نکلے گا
بے تکلفتہ.....جہلم

یاد ماضی کے وہ افسانے بھلا ڈالوں گی
تیری تصویر ترے خط کو جلا ڈالوں گی
الیاس حسن.....روہڑی

یہ آن بان لے پڑی سرمایہ حیات
انسان کھو گیا اسی رو بدل کے بیچ
عبدالسلام.....جدہ سعودی عرب

یوں تو دنیا ہی ایک جنت ہے
دوست یہ سے کدہ غنیمت ہے
(عبدالحکیم شمر کراچی کا جواب)

اشفاق احمد.....کراچی

نظر آتی ہے جس میں زندگی کی مؤنی صورت
کسی قیمت پر ہم اے دوست وہ درپن نہ بنیں گے
(ناصر احمد دینہ کا جواب)

نیلوفر شاہین.....اسلام آباد

مل جائے تجھے کوئی جب وفا شعار
لے کر اٹھا رہے ہیں تیرے آستان سے ہم
(ہادیہ ایمان، ماما ایمان فورٹ عباس کا جواب)

ناہید فروغ.....کراچی

اُدھر تو تیرے دل پہ کھا رہی ہوں میں
اُدھر خبر بھی نہیں کس پہ ہے یہ عشق عتاب
(عبدالستار ساہیوال کا جواب)

نسیم اختر.....حیدر آباد

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
(مرزا اہجان بیگ لطیف آباد کا جواب)

انس فاروقی.....لیہ

یہ اور بات کی دل کی اجازت بستی میں
ترا خیال گل تر دکھائی دیتا ہے
(سدرہ بانو ناگوری کراچی کا جواب)

احمد علی.....ساگمڑ

یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انسان جاناں

(وحید جہاں کراچی کا جواب)

رضا احمد اعوان.....دریا خان

ہم نہ ہوں گے تو بھلا کون منائے گا تمہیں
یہ بری بات ہے ہر بات پہ روٹا نہ کرو
(قمر جہاں کراچی کا جواب)

مریم بنت کاشف.....حیدر آباد

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذال سے پیدا
اظہر الدین.....کراچی

اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں
جن پہ مسند بچائے بیٹھے ہو
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

اکبر حیات.....لاہور

یہ سوچ کر پلکوں میں چھپا لیتا ہوں آنسو
گر کر یہ میری آنکھوں سے بے گھر نہ ہو جائیں

(مریم بنت کاشف حیدر آباد کا جواب)

احمد علی.....پشاور

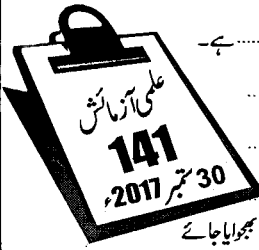
یہ ریت سی مرے ہونٹوں پہ جم گئی کیسی
مجھے کہاں تھا کہ دریا ہوں میں تو پیاسی ہے تو
(اختر علی لاہور کا جواب)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی.....ملتان

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
ناعمہ تحریم.....کراچی

کہاں سے سیکھ لی تم نے یہ بے رخی کی ادا
کبھی تو ہم سے ملو تم بھی دوستوں کی طرح

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین
اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف
کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر
ارسال کریں۔



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوا یا جائے کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 ستمبر 2017ء تک علمی آزمائش 141 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شرعباس 0301-2454188

سرکولیشن مینجر ۱۸۸02552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر ۱۱ ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میل (ایم ایل) لاہور

فون: 35895313 فیکس ۱۸۸02881

مقالہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“ شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم! محترمہ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے) 102

مقالہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش - 141

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرہ انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرہ سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہانہ ماہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جامسو سی ڈائجسٹ اور ماہانہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک علمی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرہ انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور بھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ادا کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

24 نومبر 1952ء میں پیدا ہوئی۔ اسلامیہ کیمبرج اسکول پھر رابرٹس سن اسکول سے اکتساب کیا اور رضویہ گریڈ اسکول سے میٹرک۔ سرید کا کالج سے جامعہ کراچی پی ایچ۔ سرکاری ملازمت حاصل کی۔ شعر و شاعری میں نام پیدا کیا

علمی آزمائش 139 کا جواب

انتیاز احمد 5 جنوری 1928ء میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے اندرون بھائی ٹیٹ میں بچپن گزرا۔ عبدالحفیظ کاردار کے پڑوسی تھے۔ مشتاق احمد اور افتخار احمد کے بھائی تھے۔ دنیا سے کرکٹ میں بہت نام کمایا۔

انعام یافتگان

- 1- حسن کاظمی، حیدر آباد
- 2- ندین محمد، سیالکوٹ
- 3- ناصر عباس، بہاولنگر
- 4- ظفر میگل، اسلام آباد
- 5- عبدالحق، لاہور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نامہ تحریم، خادم حسین، نوید سراج، محمد فرحان، شاہد اقبال شاہد، امبر مظاہر، نبیل اختر، عنایت سحر، فرحت عباس نقوی، عنایت مسیح، سبطین سید، الیاس محمد خارج، غلام حسن، طفیل احمد، باسط فاروقی، نذر حسین، انعام گل، صابحت مرزا، محمد احمد، یاسین خان، منظر حسن، قیام الدین انصاری، وردہ جول، اکبر علی ریہانی، ارشد علی، عنبرین اختر، اسرار احمد، مولیٰ بخش بٹ، جنوریہ حسین، ہارون محمد، فتح یاب خان اچکزئی، انیس بھٹو، فہیم بٹ، سعید الدین مروت، صوفی تبسم، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نواز سلیم کوکھر، مہوش علی خان، فرحین بشیر، فیروز رحمانی، اسلام آباد سے فریدہ افتخار، جمیل احمد، انور یوسف زئی، فرمان حسن، محمد ڈیشان، خالد عثمانی، نشاط بانو، ماہ چین فاطمہ، نعیم اختر، عزیز الحسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، توصیف حسین، بلارق ظفر، مسعود اطہر، معین انور، افتخار حسن خان،

کاظم زیدی، حضور خان، عتیق الرحمن خان، برہمیں مرزا، ذکی سید، تقی عباس نقی، قادری قادری، نوید حسن خان، کاظم جعفری، مہدی علی خان، صابر علی، محمد اسلام الدین انصاری۔ لڈن و ہاڑی سے ششی محمد عزیز نے۔ کشمور گڈ ویراج سے شبیر شان۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، محمد فیض، عتیق احمد، ذیشان مرزا۔ ملتان سے محمد معین چشتی، محمد یحییٰ معین، محمد اختر، فرحین گل، احمد یار خان، قیام الدین گروہی، رخسانہ یاسمین، خالد حسن توصیفی، نسیم احمد، نصیر احمد، فوزیہ اختر، نسیم الطاف گوہر، ذکیہ احسن کمال، نفیسہ جمال انصاری، گل باز خان، خالد حسن، ارشد آفاق، بمنون احسن، پیام احسن، مظہر قادری۔ لاہور سے نیاز چوہان، کائنات مرزا، فہد علی خان، عباس رضا سید، اقبال اصغر، عبدالخالق، احمد علی بیٹ، توصیف باری، آل بختن نقوی، اصغر علی اصغر، نواز کبیر، یاسمین فرحت، مصباح الرضا، کاظم حسین رضوی، نوید احسن، نسیم عباس، علی نواز کارگلی، صابر علی خان، سلمان احمد، تاثیر احسن، سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمیٰ اکملی، ثناء علی، عتیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، نسیم اللہ نصیر جوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابھام اشرف شہیدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، دعا زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس جی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پور)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ مظفر آباد کے کئی لے ڈو الفکار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان اور نیس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق تھدی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر بگٹزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان بگٹزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی بگٹزی، نگار، صالح شیر، نصرت بگٹزی۔ رحیم یار خان سے عتیق الرحمن، اسرار احمد، نسیم الدین، بخش حسین، شام مرزا، ملک یاسین، حبیب علی، ذکی حسن، ابراہیم ڈرائیور، ارباز حسن زئی۔ ساہیوال سے صوفی مقبول احمد نقشبندی، مفتی مبارک علی نقشبندی، حکیم اللہ، کاظم علی، مختار قاضی، نسیم عباس، نعمت اللہ۔ کوہاٹ سے ابراہیم بگٹزی، فدا حسین طوری، نصیر عباسی، فتح محمد، ارشد کوہاٹی۔ شیخوپورہ سے پروفیسر عبدالوہید خان، ثریا فاطمہ، قتیل احمد، معیبت، ناصر حسن، عرفان قاسمی۔ پشاور سے خاقان خان، قیام احمد، مہناز عرفان، نسیم الدین، نجم شاہ، اصغر شاہ، زاہد حسین طوری، بخش، فدا حسین زیدی، ارباب خان۔ جہلم سے کینز کبریٰ، فہد علی خان، حکیم صدر الدین، ناصر کوکب خان۔ بہاولپور سے سرت اسلم ملک، مہوش خان، فطرت عباس، نور علی، اقبال احمد، تقی حسن، جاوید تقی عثمان، اکرام ملک، نواز کھوکھر، امتیاز حسن، محمد نسیم، نوشین ملک، مفتی اللہ خان۔ بہاولنگر سے صفی بیگم، انتخاب احسن، افضل احمد، ذکیہ امتیاز، ملک امتیاز، فصاحت اللہ، ظہیر شاہ، آفتاب احمد، عثمان مظفر، یاد علی سید۔ مظفر ٹرہہ سے ارباب رضا، نعمان ملک، چودھری فیض اللہ، ساجد علی، عنایت فاطمہ، نیاز حسین، فاروق نیازی، ارباز خانزادہ، فصیح الدین، جاوید حسن خان، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ جامشورو سے راشد منغل، حیدر علی بھٹو، مدحت لاشاری، ایاز سومرو۔ حیدر آباد سے محمد یاسین اندوری، عباس علی، ماہ رخ، امجد بیٹ، محمد جی الدین خان، احمد لون، فیصل شیخ۔ سکھر سے شیخ یاسر، نجم الدین ثاقب، بیاس گل، اقبال انصاری۔ جیکب آباد سے امین عباسی، ذوالفقار خان، فہد خان، کائنات یاسمین۔ میرپور خاص سے سدرہ ناصر علی، پروفیسر طارق حبیب، سلطان جوکیو، نصیر بابائی۔ میرپور ماٹیلو سے فہد سومرو، عباس حسن، سلیم شانی۔ میرپور آزاد کشمیر سے جمیل اختر، یوسف خان، اطہر عباس، نیما بیٹ۔ خیرپور سے احمد علی زیدی، عباس نامی۔ کجرات سے انیس طاہر نامی۔ شادی پور سے لطیف الرحمن۔ خانیوال سے ناہید عباسی۔ ڈی آئی خان سے سید نسیم، مفتی اجمہر شاہ خان، خالد یوسف۔ ڈی جی خان سے رفیق احمد ناز، یوسف شاہ، کنول، ظاہر خان۔ جھنگ سے عطاء المصطفیٰ، ناصر قاضی، التماس عباس، ظاہر شاہ، ضیاء احسن، طلحہ الدین۔ شجاع آباد سے غلام جیلانی، وزیر محمد، غلام الحقین، خالد یاسر۔ چنویٹ سے سبیل آفندی، خورشید رضوی۔ سما۔ مگک سے شاہ زیب، وصی الحق۔ سرگودھا سے سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، ہارون محمد، انیس احمد، فیض محمد، سلطانہ، رشید تبسم، گلپ آفاق، فرخندہ یاسمین، آذر لودھی۔ راجن پور سے علی احمد، ملک محمد ظفر اللہ۔ بیرون پاکستان سے عزیزین عظمیٰ، اشرف زیدی (شارجہ)۔ آصف علی (عمان سعودیہ)۔ ثار حسن، انوار ملک (العین)۔ محمد جمید انصاری ہندی، صادق خان (دعنی)۔ امتیاز علی (فرینکلرٹ)۔ ایاز سومرو (بیڈ فور)۔

ٹھکرائی ہوئی لڑکی

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

میں نے اپنی حالات زندگی لکھ تولی ہے اب پتا نہیں یہ سرگزشت کے معیار کی ہے یا نہیں لیکن ایک بات بتا دوں کہ اس سچ بیانی کو ہر ایک پسند کرے گا۔ اس لیے کہ میری حالات زندگی سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس سے بہتوں کو سبق حاصل ہو گا، بلکہ یہ سمجھ لیں کہ ہر ایک کے لیے یہ سبق ہے۔

سیما

(فیصل آباد)

مجھے بابا کی حالت دکھ کر بہت دکھ ہوتا۔ وہ ابھی پچاس کے بھی نہیں ہوئے تھے لیکن دیکھنے میں ستر سے زیادہ کے لگتے تھے۔ بیماری اور پریشانیوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ ان کے کندھے ڈھلک گئے تھے اور سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ وہ کئی کئی دن شیونہ بناتے جس کی وجہ سے چہرے پر ویرانی برتی رہتی تھی۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے رنگ ساز تھے اور یہ فن انہیں اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا۔ امی بتاتی ہیں کہ کئی زمانہ میں ان کے نام کی بڑی دھوم تھی۔ لوگ دور دور سے رحمت علی کا پتا پوچھتے ہوئے آتے اور انہیں اپنے ساتھ کام کے لیے لے جاتے گو کہ اس وقت بھی ہمارے گھر میں بہت زیادہ خوش حالی نہیں تھی لیکن پھر بھی بابا مہینے میں پندرہ بیس دن مصروف رہتے تھے۔ ان کے کام میں بڑی نفاست تھی۔ ایک بار جو ان سے کام کرواتا وہ دوبارہ بھی انہیں ہی بلایا کرتا تھا بلکہ اپنے جاننے والوں کو بھی ان سے کام کروانے کے لیے کہا کرتا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بابا کا کام رفتہ رفتہ کم ہوتا چلا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو ان کی بیماری تھی اور دوسرے بھتیجی ہوئی مرگئی۔ انہیں سانس کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ ماسک لگا کر کام کیا کریں کیونکہ ڈمپٹر اور پیٹ کی بو ان کے لیے نقصان دہ ہے لیکن انہوں نے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ وہ کہتے تھے کہ ماسک لگا کر ان سے کام نہیں ہوتا اور ان کی رفتار سست ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بیماری بھتیجی کی۔ وہ دودن کام پر جاتے اور چار دن گھر میں بڑے رہتے۔ اس کے علاوہ انہوں نے باقاعدگی سے علاج بھی نہیں کروایا۔ جب تکلیف زیادہ بھتیجی تو ڈاکٹر

اس روز بابا گھر واپس آئے تو ان کا اتر اہوا چہرہ اور مری ہوئی چال دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ وہ خالی ہاتھ آئے ہیں۔ آج بھی انہیں کام نہیں ملا۔ انہوں نے ایک نظری پر ڈالی اور کچھ کہے بغیر کمرے میں چلے گئے۔ میں اس وقت برآمدہ میں بیٹھی چھوٹے بھائیوں کو بڑھا رہی تھی۔ امی نے پہلے بابا اور پھر مجھے دیکھا اور بولیں۔ ”بہٹی چائے کا پانی رکھ دو۔ میں یہ ترپانی مکمل کر لوں پھر روٹی ڈالتی ہوں۔ نہ جانے انہوں نے دن میں کچھ کھایا بھی ہے یا بونہی بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔

مجھے امی کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ جب کام ہی نہیں ملا تو کھانا کہاں سے کھائے؟ آج کل دال روٹی بھی ساتھ سترے کم میں نہیں آتی۔ حالانکہ امی کئی بار بابا سے کہہ چکی تھیں کہ وہ صبح کھانا ساتھ لے جایا کریں۔ بازار کا کھانا مہنگا ہوتا ہے اور صحت کے لیے بھی ٹھیک نہیں لیکن بابا ہمیشہ یہ کہہ کر نال دیتے کہ ان کا اپنا کوئی ٹھکانا نہیں۔ دن میں کئی بار جگہ بدلنا پڑتی ہے۔ وہ کھانے کی پوٹی لیے کہاں پھریں گے۔ ویسے بھی عملاً یہ ممکن نہیں تھا۔ ہمارے گھر میں ایک وقت کھانا پکنا جس سے دونوں وقت بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ بابا کے لیے کہاں سے پچتا۔ اتنی مچائش نہیں تھی کہ انہیں روٹی کے ساتھ انڈوں کا آلیٹ یا سینڈوچ بنا کر دیے جاتے۔ اس لیے وہ ایک چائے کی پیالی پی کر گھر سے چلے جاتے اور دن بھر بھوکے پیاسے رہ کر شام کو خالی ہاتھ واپس آ جاتے۔ اگر بھی چھوٹا موٹا کام مل جاتا تو ہمارے گھر دو چار دن چولہا جل جاتا ورنہ مہینے کے باقی ایام جس طرح گزرتے تھے۔ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔



سے بابا کو کمیشن ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اس کے قائل تھے۔ وہ ہمیشہ گاہک کا فائدہ دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دکان داروں نے انہیں منہ لگانا چھوڑ دیا۔ کچھ رنگ سازوں نے مکان بنانے والے ٹھیکے داروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ ان لوگوں کی اپنی ٹیم ہوتی ہے جس میں مین، پلیر، الیکٹریشن، ٹائل فکسر اور رنگ ساز وغیرہ شامل ہیں۔ ٹھیکے دار انہی لوگوں سے کام لیتا ہے اور ان سے اپنا کمیشن وصول کر لیتا ہے۔ ای نے بابا کو بھی مشورہ دیا کہ وہ کسی ٹھیکے دار کے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ کسی کو اپنی حق حلال کی کمائی میں سے حصہ نہیں دے سکتے۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لیے انہیں اپنا معاوضہ بڑھانا پڑے گا جو گاہک کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

بہت سے کاریگر اپنے کام کو وسعت دینے کے لیے دور جدید کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان میں

کے پاس چلے جاتے ورنہ گھریلو ٹوکوں سے ہی بیماری بھگانے کی کوشش کرتے۔

اس بیماری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی جگہ دوسرے کاریگروں نے لے لی جو ان کے مقابلے میں کم تجربہ کار تھے لیکن انہیں کام پکڑنے کا ہنر آتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر نے رنگ کی دکان والوں سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ صبح سیدھے دکان پر آ کر بیٹھ جاتے اور اگر کوئی گاہک رنگ ساز کی تلاش میں دکان پر آتا تو دکان دار انہی میں سے کسی ایک کو آگے کر دیتا۔ اس میں دونوں کا فائدہ ہوتا۔ دکان دار گھٹیا کوالٹی کا رنگ فروخت کر کے اپنا منافع کھ اکر لیتا اور اس میں سے رنگ ساز کو بھی کمیشن دیتا۔ بابا کے بھی کئی دکان داروں سے تعلقات تھے لیکن وہ بھی اس ٹھیکل کا حصہ نہیں بنے۔ وہ ہمیشہ گاہک کو اس دکان پر لے کر جاتے جہاں اچھی کوالٹی کا مال ملتا پھر وہ دکاندار سے بھاد تاؤ کر کے قیمت بھی کم کرواتے۔ اس طرح اس کا منافع کم ہو جاتا۔ اس میں

زیادہ تر کے پاس اپنی موٹر سائیکل اور موبائل فون ہے۔ انہوں نے اپنے وزینگ کارڈ چھوڑ رکھے ہیں وہ روزانہ شام کو زیر تعمیر مکانوں کا چکر لگاتے ہیں اور مالک یا ٹھیکے دار سے مل کر کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بابا ان سب تکلفات سے بے نیاز ہیں۔ وہ ابھی تک اسی دھم میں ہیں کہ لوگ رحمت علی کو ڈھونڈتے ہوئے آئیں گے اور انہیں اپنے ساتھ کام کروانے لے جائیں گے۔

برصغیر ہوئی مہنگائی بھی بابا کے کام پر بری طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ پہلے لوگ سال دو سال بعد اپنے مکان پر رنگ و روغن کروا لیا کرتے تھے لیکن اب پانچ دس سال تک کوئی نام نہیں لیتا۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اور لوگوں کی قوت خرید دن بد دن کم ہوتی جا رہی ہے۔ بمشکل تمام گھر کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ رنگ کروانے کی عیاشی کون کرے۔ یہی وجہ ہے کہ بابا دن بھر مصروف چوراہوں اور فٹ پاتھوں پر بیٹھنے کے بعد شام کو منہ لٹکائے خالی ہاتھ گھر آ جاتے۔

اس صورت حال میں بھی ای نے ہمت نہ ہاری اور سلاکی کی مشین لے کر بیٹھ گئیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے جی سنجال لیا تاکہ امی یکسوئی سے اپنا کام کر سکیں حالانکہ میری بڑی خواہش تھی کہ آگے پڑھوں لیکن گھر کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لہذا میں نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ موقع ملا تو انٹر کا امتحان پرائیویٹ دے دوں گی۔ ابتداء میں تو امی کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی اور لڑکائی کا عود تیس ہی ان کے پاس کپڑے سلوانے کے لیے آئیں کیونکہ آج کل درزی سے کپڑے سلوانے کا رواج بڑھ گیا ہے اور معمولی گھرانوں کی لڑکیاں بھی نیلر کو بی ترنج دیتی ہیں۔ ہمارے محلے میں زیادہ تر غریب لوگ رہتے تھے اور ان کی استطاعت نہیں تھی کہ وہ درزی سے کپڑے سلوائیں۔ لہذا بڑی عمر کی خواتین اور انتہائی غریب لڑکیاں امی کے پاس کپڑے سلوانے کے لیے آئے لگیں۔ اس طرح ہمارے حالات کچھ بہتر ہو گئے۔

میں چائے لے کر کمرے میں گئی تو بابا اوندھے منہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گئے ان کا چہرہ بیگناہ ہوا تھا۔ شاید وہ رورہے تھے۔ میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولی۔ ”بابا! آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے حالات جلد بہتر ہو جائیں

گے۔“

”کب آئے گا وہ وقت؟“ وہ جھنجھلاتے ہوئے بولے۔

”بہت جلد۔“ میں نے کہا۔ ”بس آپ حوصلہ کریں۔“

اپنے اوپر مایوسی طاری نہ ہونے دیں۔ ”یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“ انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو جب میں شام کو گھر خالی ہاتھ لوٹا ہوں تو دل چاہتا ہے کہ کسی بس کے نیچے آ جاؤں یا سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی زندگی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔“

”نہیں بیٹی، اس ناکارہ وجود کے ساتھ یہ زندگی ایک بوجھ لگنے لگی ہے۔“

”کس نے کہہ دیا کہ آپ کا وجود ناکارہ ہے۔“ میں نے انہیں چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”آپ آج بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں سے بہتر ہیں۔ زندگی میں اونچ نیچ تو آتی رہتی ہے۔ آج ہمارے حالات خراب ہیں تو کل بہتر بھی ہو سکتے ہیں۔“

”تم جھوٹی تسلی دے رہی ہو۔ مجھے تو بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔“

”اس میں تھوڑا سا قصور آپ کا بھی ہے۔ آپ اپنی صحت پر توجہ نہیں دیتے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ سب سے پہلے تو آپ اپنا علاج کروائیں۔ صحت ٹھیک ہوگی تو کام بھی کر سکیں گے۔ دوسری بات یہ کہ آپ بھی زمانے کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ نا تجربہ کار اور اناڑی کارمگر آپ سے زیادہ کم رہے ہیں۔ فٹ پاتھوں اور چوراہوں پر بیٹھنے کی بجائے کسی ٹھیکے دار کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اگر وہ کمیشن مانگتا ہے تو دے دیں۔ کچھ نہ کچھ تو ہاتھ آئے گا۔“

وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”شاید یہی کرنا پڑے گا۔“

میں خوش ہو گئی۔ کم از کم میری باتوں سے ان میں اتنی ہمت تو آئی۔ چنانچہ میں نے ایک قدم آگے بڑھنے کا سوچا اور ڈرتے ڈرتے بولی۔ ”بابا اگر آپ برآمدہ مانیں تو ایک بات کہوں۔“

”کہوں، میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

”بات یہ ہے کہ میرے امتحانات ختم ہو گئے ہیں۔“

سارا دن فارغ رہتی ہوں۔ بہت بوریت ہوتی ہے اگر آپ اجازت دیں تو میں کوئی جاب کر لوں۔“

ان کے جبرے کا رنگ بدل گیا۔ جیسے انہیں میری بات سے شدید دکھ پہنچا ہو۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ میرے جیتے جی یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تمہاری پڑھائی باقی ہے۔ کالج میں داخلہ لینے کی تیاری کرو۔“

”بابا کیا ملے گا آگے پڑھ کر۔ میں چاہے ڈاکٹر انجینئر بن جاؤں، ماسٹرز کروں۔ شادی کے بعد تو چلنا ہی جھونکنا ہے پھر میں اپنا وقت اور آپ کا پیسا کیوں ضائع کروں۔ ویسے بھی ہمارے حالات ایسے نہیں کہ کالج کی پڑھائی کا خرچ برداشت کر سکیں۔“

”یہ سوچنا میرا کام ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تیز لہجے میں بولے۔

میں نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”بابا آپ جذباتی نہ ہوں۔ یہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ میں بچی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں۔ اولاد ماں باپ کا سہارا ہوتی ہے۔ آپ نے ساری عمر ہمارے لیے کام کیا۔ اب ہماری باری ہے۔ آپ مجھے کام کرنے سے نہ روکیں۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جیسے ہی حالات بہتر ہوں میں پڑھائی دوبارہ شروع کر دوں گی۔“

وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔ ”لیکن تم نے ابھی صرف میٹرک کیا ہے۔ تمہیں کہاں نوکری ملے گی۔“

”آپ مجھے کوشش تو کرنے دیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔“

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولے۔ میں دوسرے دن سو دالینے کے بہانے قریبی پانی سی او پر گئی اور طاہر کو فون کر کے کہا کہ وہ فوری طور پر مجھ سے ملے۔ وہ میرا چچا زاد بھائی تھا اور نیکی نیکل کالج سے ڈپلوما کرنے کے بعد لائڈھی کی کسی فیکٹری میں سپروائزر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ چچا کے مالی حالات بھی کچھ اچھے نہ تھے لیکن وہ ہمارے مقابلے میں بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی ایک چھوٹی سی کریانہ کی دکان تھی لیکن بچی اپنے آپ کو سنبھالتی سمجھتی تھیں اور طاہر کی ملازمت کے بعد تو ان کا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا تھا۔ وہ بے حد فضول خرچ تھیں اور چچا کی آمدنی کے علاوہ طاہر انہیں جو کچھ دیتا اسے بھی وہ بے دردی سے اڑا دیتیں۔ طاہر کے

علاوہ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ چچا نے بچپن میں ہی مجھ، طاہر کے لیے مانگ لیا تھا۔ اس لیے میں بھی اسے اپنا سب پلمہ سمجھنے لگی تھی اور اپنے ہر کام کے لیے اسی کی طرف دیکھتی۔

وہ شام کو چھٹی کے بعد میرے پاس آگیا۔ میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ابھی تم اٹھارہ سال کی نہیں ہوئیں۔ تمہیں ملازمت نہیں مل سکتی۔“

میں نے جل کر کہا۔ ”اور یہ جو درکشاپوں اور گیراجوں میں بارہ بارہ سال کے لڑکے کام کرتے ہیں۔ ان پر کوئی قانون لا کر نہیں ہوتا۔“

”بالکل ہوتا ہے لیکن یہ درکشاپ اور گیراج لیبر ڈیپارٹمنٹ میں رجسٹرڈ نہیں ہوتے۔“

”تم مجھے کسی غیر رجسٹرڈ ادارے کا پتا بتا دو۔ میں وہاں چلی جاتی ہوں۔“

”بچوں جیسی باتیں مت کرو سہا۔“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم صرف میٹرک پاس ہو۔ تمہیں کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل سکتی۔ اگر پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتیں تو کوئی کورس کرلو۔“

”مثلاً؟“

”آج کل کمپیوٹر کی بہت مانگ ہے اگر تم نے چھ مہینے کا بھی کورس کر لیا تو چانس بن سکتا ہے۔“

”لیکن میں نے سنا ہے کہ اس کی فیس بہت زیادہ ہوتی ہے۔“

”اب ایسا بھی نہیں ہے۔ یہاں فینیس بھی علاقوں کے حساب سے مقرر ہیں۔ اگر ڈیفنس میں یہ فیس دس ہزار ہے تو طبر میں زیادہ سے زیادہ تین ہزار ہوگی۔ میرے ایک دوست کا انٹرنیٹ ٹیوٹ ہے اس سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ کچھ رعایت کر دے۔“

اس کے جانے کے بعد میں سوچنے لگی کہ اگر اس کے دوست نے رعایت کر بھی دی تو میں وہ فیس کہاں سے دوں گی۔ میرے پاس تو سو روپے بھی نہیں تھے۔ بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی۔ دوسرے دن میں اس اسکول میں گئی جہاں میں نے میٹرک تک پڑھا تھا۔ وہاں سب نمبرز مجھے جانتی تھیں بلکہ ہیڈ ماسٹر نے ہی تو میں جیتی تھی۔ میں نے انہیں مختصر اپنے حالات بتائے اور کہا کہ میں کوئی کام کرنا چاہتی ہوں۔

انہیں یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہنے لگیں۔ ”تم جیسی ذہین اور باصلاحیت لڑکی کی تعلیم ختم ہونا ایک المیہ ہے۔“

۱۔ لیمو میں اسکول کے مالک سے بات کر کے تمہارے لیے کوئی جگہ نکالتی ہوں۔ تم دو دن بعد آنا۔“

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مجھے مددگار ٹیچر کی جاب دے دی۔ تنخواہ تو کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے بہتر تھا اور میں کم از کم کمپیوٹر کورس کی فیس با آسانی دے سکتی تھی۔ میرے ذمہ مختلف نوعیت کے کام تھے۔ مثلاً طالب علموں سے فیس وصول کرنا، اہم کاغذات کی فائلیں بنانا اور کسی ٹیچر کی غیر موجودگی میں اس کی کلاس لینا۔ میں صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اسکول میں رہتی اور شام کو کمپیوٹر انسٹی ٹیوٹ چلی جاتی۔ اسکول کے دفتر میں بھی کمپیوٹر تھا اور میں فارغ وقت میں اس پر پریکٹس کرتی رہتی۔

پہلی تنخواہ ملنے پر میں بابا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور ان کا مکمل چیک اپ کروایا۔ اس نے باقاعدگی سے دوا استعمال کرنے کی ہدایت کی اور ماسک لگا کر کام کرنے کے لیے کہا۔ میں نے بابا سے ان دونوں باتوں پر عمل کرنے کا وعدہ لیا۔ میرے نزدیک ان کا صحت مند ہونا زیادہ اہم تھا۔ کیونکہ اسی صورت میں وہ کام کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ میرا کمپیوٹر کورس مکمل ہو گیا تو میں نے مختلف کمپنیوں میں ملازمت کے لیے درخواستیں دینا شروع کر دیں۔ ظاہر کا خیال تھا کہ مجھے ایڈوانسز کورس بھی کر لینا چاہیے۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اس کے ساتھ ہی فرسٹ ایئر کے امتحان کی تیاری بھی شروع کر دی۔ میں ہر اتوار کو اخبار میں اشتہار دیکھ کر دو چار جگہ ملازمت کے لیے درخواست بھیجتی لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ آتا۔ البتہ میڈم میرے کام سے بہت خوش تھیں۔ انہوں نے دفتر کا سارا کام مجھے سونپ دیا۔ میری تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور اب میں نسبتاً پرسکون زندگی بسر کر رہی تھی۔

اس روز ظاہر آیا تو اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ اس نے بھڑائی ہوئی آواز میں بتایا کہ اسے دہی میں ملازمت مل گئی ہے اور وہ ایک ہفتہ بعد جا رہا ہے۔

یہ سن کر میں صدمے کی کیفیت میں آگئی اور بولی۔ ”یہاں بھی تو اچھی خاصی ملازمت تھی۔ پھر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کیوں جا رہے ہو؟“

”یہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”جو کماتا ہوں۔ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں کچھ نہیں ہے۔ ہر مہینے پوری تنخواہ نکال لیتا ہوں اور کچھ نہیں

بچتا۔ مجھ پر بہت ذمے داریاں ہیں۔ بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے اور امی ابو کو حج کروانا ہے۔ تم ہی بتاؤ یہاں رہ کر میں یہ سب کر سکتا ہوں؟“

اس کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں اس پلان میں کہیں نہیں تھی۔ جی چاہا کہ پوچھوں میرے بارے میں کیا سوچا ہے لیکن خود داری آڑے آگئی۔ اسے صرف اپنے گھر والوں کی فکر تھی۔ میرا کوئی خیال نہیں تھا۔ لہذا منہ پھیر کر بولی۔ ”جاؤ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔“

ظاہر کے جانے کے بعد زندگی بے کیف لگنے لگی۔ گو کہ وہ کئی کئی دن بعد آیا کرتا تھا لیکن اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک اتر آتی تھی۔ میں اسے جتنا بھلانے کی کوشش کرتی اتنا ہی وہ یاد آنے لگتا۔ میں نے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ صبح اسکول جاتی۔ شام کونسلٹی ٹیوٹ اور رات کو پڑھائی کرتی۔ اسی طرح دو سال گزر گئے۔ میں نے انٹر کامرس کے ساتھ کمپیوٹر کا ایڈوائس کورس کر لیا اور شدت سے بہتر ملازمت تلاش کرنے لگی۔

ظاہر اس دوران ایک دفعہ چھٹیوں پر گھر آیا تو اس نے کچھ دیر کے لیے ہمارے یہاں آنے کی ذمیت بھی ادا کر لی۔ اس نے رسما بابا کی خیریت دریافت کی۔ امی سے کچھ باتیں کیں اور پھر میرے پاس چلا آیا۔ وہ خاصا کمزور اور دلا لگ رہا تھا۔ اس نے کھیانے انداز میں کہا۔ ”کیسی ہو سیما؟“

”میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔ لگتا ہے بہت زیادہ کام کر رہے ہو یا کھانے پینے کا خیال نہیں رکھتے۔“

”دونوں ہی باتیں ہیں۔“ وہ ہنسی مسکرا ہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ کھانے کے لیے زیادہ محنت کرتا ہوں ہے اور وہاں کون ہے جو میرے کھانے پینے کا خیال رکھے۔ بس جوں جوں جائے کھا لیتا ہوں۔“

”پھر بھی تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔ صحت سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ اس نے کہا اور کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن وہ کچھ مضطرب لگ رہا تھا جسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو لیکن ہمت نہ پڑ رہی ہو۔

کچھ دنوں بعد اس کی بے چینی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ وہ ایک ہینارہ کردیتی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے ایک ہفتہ بعد چچی اور چچی ہمارے گھر آئے۔ چچی نے بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور گلے میں لاکٹ جگر کا رہا تھا۔ ان کی جگہ دیکھ کر لگ رہا تھا جیسے بیوی پارلر سے تیار ہو کر آئی ہیں۔ وہ اپنی عمر سے دس برس چھوٹی لگ رہی تھیں۔ چچا نے بھی بہت مہنگا کر یہ شلوار کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور بابا ان کے سامنے کم حقیقت لگ رہے تھے۔ مجھے چچی اپنی چھوڑی طبیعت کی وجہ سے بھی اچھی نہیں لگیں۔ اس لیے میں چائے دے کر وہاں سے ہٹ گئی البتہ یہ جانتی تھی کہ ان کی آمد بے مقصد نہیں۔ اس لیے دروازہ کی اوٹ سے ان کی باتیں سننے لگیں۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چچی اپنے مطلب کی بات پر آ گئیں اور گلا صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ”بھائی صاحب! میں تو چاہ رہی تھی کہ اس بار کوئی رسم ادا کر دیتی لیکن آج کل کے لڑکے ہماری کہاں سنتے ہیں۔ اس نے ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ بابا بولے۔ ”اگلی بار آیا تو دیکھ لیں گے۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔“

”مجھے تو اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔“

چچی بولیں۔ ”جب میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو وہ بولا کہ وہ فی الحال اپنی شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہا۔ ابھی اس پر بہت ڈسے داریاں ہیں بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔“

”الحق ہے وہ۔“ چچا غصے سے بولے۔ ”یہ تو دس سال کا پروگرام لگتا ہے۔ کیا اتنا عرصہ سیراس کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔“

”نہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہے تو ہمیں یہ رشتہ ختم کر دینا چاہیے۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا ہے اور وہ کیا چاہ رہا ہے۔“

میرے اندر کوئی چیز چمن سے ٹوٹ گئی۔ یوں لگا جیسے مجھ پر آسمان آن گرا ہو۔ مجھے یقین تھا کہ طاہر نے ایسا کچھ نہیں کہا ہوگا۔ یہ سب چچی اپنی طرف سے کہہ رہی تھیں۔ دراصل پیسا آنے کے بعد ان کی نگاہیں بدل گئی تھیں اور وہ ہم لوگوں کو بہت حقیر و کتر سمجھنے لگی تھیں۔ لالچ نے ان کی آنکھوں پر پٹی ڈال دی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میری اور طاہر

کی شادی سراسر گھائے کا سودا ہے۔ جس گھر میں ۱۰۰۰ روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہوں وہاں سے ہماری ہر مل جہیز کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔“

اب امی کے بولنے کی باری تھی۔ انہوں نے چچی کو کڑی نظروں سے دیکھا اور بولیں۔ ”کتنی آسانی سے تم نے کہہ دیا کہ رشتہ ختم کر دو۔ پورے خاندان کو معلوم ہے کہ سیراس اور طاہر ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ انہیں کیا وجہ بتائی جائے گی؟“

”کچھ بھی کہہ دیتا۔“ چچی بے نیازی سے بولیں۔ ”کتنی کئی سال پرانی منگنیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہاں تو صرف بات ہی طے ہوئی تھی۔“

بابا نے پرامید نظروں سے چچی کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ”سیراس مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ بلا وجہ ہی انتظار کی سولی پر لٹکتی رہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر اس کی شادی کر دو۔“

”تمہارے مشورے کا شکریہ۔“ بابا نے تسلی سے کہا۔ ”میں اپنی بیٹی کا برا بھلا خود سمجھ سکتا ہوں۔“

اس دن مجھے معلوم ہوا کہ پیسے کے سامنے خونی رشتے بھی بیچ ہیں۔ چچا کے گھر میں چار پیسے کیا آئے کہ انہوں نے مجھے بھائی کے اربانوں کا بھی خون کر دیا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک ہو گیا کہ آج کے دور میں پیسا ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور لوگ پیسے والوں کی چوکھٹ پر ہی جمدہ کرتے ہیں۔ میں نے طاہر کا نام اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک دیا اور فیصلہ کر لیا کہ پیسے کو ہی اپنی طاقت بناؤں گی تاکہ کل کوئی اور نو دو لتیا میرے گھر آکر مجھے یا میرے باپ کو ذلیل نہ کر سکے۔

پیسہ کمانے کے دو ہی طریقے ہیں۔ جائز اور ناجائز۔ میری رگوں میں شریف باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس لیے ناجائز کمانی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جائز طریقے سے پیسے حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے پاس تعلیم یا کوئی ہنر ہو بہت سونے کے باوجود یہ کچھ میں نہیں آیا کہ وہ کون سا ہنر ہے جس کے ذریعے میں زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکوں۔ چنانچہ میں نے اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں دوسری ملازمت کا خیال دل سے نکال دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور اسکول کی جاب پر اکتفا کرتے ہوئے بی کام میں داخلہ لے لیا۔

میں کھر کے قریب واقع ایک کوچنگ سینٹر میں گئی۔ انہوں نے مجھے نوٹس اور دوسری جماعت کی کلاسیں دے دیں۔ اس طرح مجھے وہاں سے بھی آمدنی ہونے لگی۔

بابا کے حالات دیکھے ہی تھے۔ بھی کام مل جاتا اور کبھی خالی ہاتھ واپس آ جاتے۔ پھر بھی امی کی سلائی اور میری ملازمت سے کچھ سہارا ہو گیا تھا۔ اب میں پوری لگن اور محنت کے ساتھ بی کام کی تیاری کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ گریجویشن کرنے کے بعد مجھے کسی بینک یا پرائیویٹ فرم میں اچھی جاب مل جائے گی۔ پھر اچانک ہی بابا کی رومی ہوئی قسمت ان پر مہر پان ہو گئی۔ اس روز بھی وہ معمول کے مطابق مغفورا چوری پر انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کار ان کے پاس آ کر رکی اور اس میں سے ایک خوش پوش آدمی اتر کر ان کے پاس آیا۔ بابا اسے دیکھ کر احتراماً کھڑے ہو گئے۔

اس آدمی نے کہا۔ ”رنگ کا کام کرتے ہو؟“
”جی جنتاب۔“ بابا نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

”آؤ میرے ساتھ۔“
اس آدمی نے انہیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور اپنے ساتھ گلستان جوہر کے ایک بنگلے پر لے گیا۔ وہ چار سو گز پر دو منزلہ بنا ہوا تھا اور ابھی اس کی فنشنگ باقی تھی۔ اس نے بابا کو وہ بنگلا دکھانے کے بعد کہا۔ ”کب سے یہ کام کر رہے ہو؟“

”صاحب! تیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔ میرے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے۔“
”عجب ہے۔ اتنے تجربہ کار ہونے کے باوجود تم فنٹ پاتھ پر بیٹھے گا کہ کا انتظار کر رہے تھے۔ تمہارے پاس تو کام کی کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔“
”بس جی قسمت کی بات ہے۔“ بابا نے کہا۔
”دراصل مجھے وہ بنگلہ خدے نہیں آتے جو کام چلنے کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں اور نہ ہی میں دکان داروں اور ٹھیکے دار کو کمیشن دیتا ہوں۔“

”تم مجھے ایمان دار اور کھرے آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”دراصل میرے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ میرا ٹھیکے دار اور کارکن گریڈ کی چھٹیوں میں پھنس گئے تھے لیکن ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی جس کی وجہ سے کام رک گیا ہے۔ یہ مکان اپنے ایک دوست کے لیے بنا

رہا ہوں اگر وقت پر اسے قبضہ نہ دے سکا تو میری بات خراب ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم رنگ و روغن کا کام شروع کر دو۔“

”جو حکم آپ کا۔“ بابا دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولے۔

”دوے تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے کام میں صفائی اور نفاست ہوگی لیکن اپنے اطمینان کے لیے میں پہلے تم سے ایک کمرہ کرواؤں گا۔ اگر مالک کو پسند آ گیا تو پھر پورے بنگلے کا کام تم ہی کو کرنا ہوگا۔ تم کل صبح سے ہی کام شروع کر دو۔ رنگ کے ڈبے میں نے منگوا لیے ہیں۔ بانی جو سامان چاہیے وہ تم میرے پروانز کو بتا دینا وہ بھی آجائے گا۔“

اس وقت غالباً دو بج رہے ہوں گے جب بابا کمر آئے۔ میں اور امی انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں کیونکہ وہ شام سے پہلے کھر نہیں آتے تھے۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کہیں ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوئی لیکن بابا کا چہرہ خوشی سے ستھرا ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے ایک گلاس پانی مانگا اور پھر پورا قہہ سنا دیا۔ ہاشمی صاحب شہر کے بہت بڑے بلڈر تھے۔ ان کے کئی پروڈکٹ مکمل ہو چکے تھے اور اس وقت بھی ان کا ایک پلازہ زیر تعمیر تھا۔ اگر انہیں کام پسند آ جاتا تو بابا کی پریشانی دور ہو جاتی کیونکہ ہاشمی صاحب کوئی نہ کوئی پروڈکٹ چلتا رہتا تھا۔

دوسرے دن بابا نے اپنے ایک پرانے شاگرد کو ساتھ لیا اور بنگلے پر پہنچ گئے۔ انہوں نے پروانز کو سامان کھلوایا اور کام شروع کر دیا۔ شام تک کمرہ تیار ہو گیا۔ ہاشمی صاحب شام کو مالک کے ساتھ آئے اور دونوں کو کام پسند آ گیا۔ ہاشمی صاحب نے بابا سے معاوضہ کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ وہ جو معاوضہ دوسرے کارکنوں کو دیتے ہیں وہی دے دیں۔ انہوں نے جو معاوضہ بتایا۔ وہ بابا کی توقع سے زیادہ تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ ٹھیکے دار بیچ میں اچھا خاصہ کمیشن بنا رہا تھا۔ غرض یہ کہ بابا سے معاملات طے ہو گئے اور بابا نے دوسرے دن سے کام شروع کر دیا۔

ہاشمی صاحب کی خواہش تھی کہ رنگ و روغن کا کام جلد از جلد مکمل ہو جائے تاکہ وہ اپنے دوست کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ اس لیے بابا نے اپنے ساتھ ایک کی بجائے دو شاگرد لگائے تاکہ کام جلدی منٹ جائے۔ اتفاق سے تیسرے روز ٹھیکے دار اور اس کی پارٹی بھی واپس آ گئی لیکن

ہاشمی صاحب نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ ان کے پاس آدمیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کی سائٹ پر درجنوں لوگ کام کر رہے ہوتے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت ان کے پاس کوئی دوسرا رنگ ساز نہیں تھا۔ اس طرح بابا کا کام بن گیا۔

بابا نے اپنا کام وقت پر مکمل کیا تو ہاشمی صاحب بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے معاوضہ کے علاوہ بابا کو ایک موبائل فون بھی تحفے میں دیا تھا اور وعدہ کیا کہ جیسے ہی ان کے زیر تعمیر فلیٹوں میں رنگ کا مرحلہ آئے گا وہ انہیں بلا لیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ اس دوران اگر ان کے کسی جاننے والے کو رنگ سازی کی ضرورت پیش آئی تو وہ بابا کا نام ہی تجویز کریں گے۔ اس کام میں انہیں اتنے پیسے مل گئے کہ وہ دو مہینے تک گھر بیٹھ کر کھا سکتے تھے لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا اور اگلے کام کی تلاش میں لگ گئے۔ میرے کہنے پر انہوں نے اپنے وزینٹنگ کارڈ چھپوائے اور مارکیٹ میں تمام رنگ کی دکانوں پر دے دیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے دونوں شاگردوں کی بھی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ جہاں کہیں کوئی زیر تعمیر عمارت دیکھیں، اس کے چوکیدار کو ان کا کارڈ دے دیں۔

ایک ہفتہ بعد ہی ہاشمی صاحب کا فون آگیا۔ اس بار انہیں اپنے ایک دوست کے لیے رنگ سازی کی ضرورت تھی جس کی ایک ہزار گز کی کوشی ڈیفنس میں زیر تعمیر تھی۔ ہاشمی صاحب نے بابا کے کام کی اتنی تعریف کی کہ وہ دوست انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے پر تیار ہو گیا۔ یہ بھی بہت بڑا کام تھا اور اس میں بابا کو اچھی خاصی آمدنی ہوئی۔ اس کے بعد ہاشمی صاحب نے بابا سے کہا کہ وہ گھر پر آرام کریں کیونکہ چند روز بعد ان کی فلیٹ سمیٹ پر کام شروع ہونے والا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ اس وقت وہ کسی دوسری جگہ پھنسے ہوئے ہوں۔

بابا کی تو لائری نکل آئی۔ اس پروجیکٹ میں سو سے زیادہ فلیٹ تھے۔ اگر بابا چار آدمیوں کے ساتھ کام کرتے تب بھی تین چار مہینے لگ جاتے۔ یہ سب اوپر والے کا کرم تھا۔ بابا اب پوری طرح قائم میں آچکے تھے۔ ان کی صحت بھی بحال ہو چکی تھی۔ ہاشمی صاحب کا ساتھ انہیں خوب راس آیا تھا۔ ان کا ایک کام ختم نہ ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا۔ درمیان میں ان کے دوستوں اور جاننے والوں کے کام بھی نکلے رہتے تھے۔ اب انہوں نے ایک موٹر سائیکل بھی لے

لی تھی اور کار میگر کی بجائے ٹھیکے دار بن گئے۔

میرا بی کام مکمل ہوا تو مجھے ایک بینک میں ملازمت لروں گی۔ بابا نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ ملازمت لروں۔ ان کا خیال تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی لیکن میری نظر اچانک مستقبل پر پڑی۔ بی کام کی ڈگری میری منزل نہیں تھی چنانچہ میں نے بابا کو مجبور کیا کہ وہ مجھے ملازمت کرنے سے نہ روکیں۔ میری ضد کرنے پر وہ راضی ہو گئے لیکن یہ شرط عائد کر دی کہ میں اپنی تنخواہ کا ایک پیسہ بھی گھر پر خرچ نہیں کروں گی بلکہ اپنے اخراجات کے بعد جو بچے گا وہ سب میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا رہے گا۔ میں نے ان کی شرط مان لی اور بینک جانا شروع کر دیا۔

کچھ دن بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آگے بڑھنے کے لیے بی کام کی ڈگری کافی نہیں۔ برانچ میں بڑی پوسٹوں پر سب بی بی اے یا ایم بی اے تھے چنانچہ میں نے بھی اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کے بارے میں سوچا اور ایگزیکٹو بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اس کی کلاس صرف اتوار کو ہوتی تھی۔ باقی پڑھائی میں گھر پر ہی کرتی۔

طاہر کو دینی گئے چار سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک اس کی کسی بہن کی شادی ہوئی، مکان بنا اور نہ ہی گاڑی آئی۔ سب کچھ ویسے ہی تھا۔ وہ جو کچھ کماتا۔ سب اس کے گھر والے اللوں تللوں میں اڑا دیتے۔ اس کے برعکس ہمارے گھر کے حالات کافی بہتر ہو گئے تھے۔ بابا نے نئے سرے سے گھر کی تزئین و آرائش کروائی۔ نیا فرنیچر، پردے، کراکری، فرنیچر، بی وی، واشنگ مشین، اودن غرض ضرورت کی ہر چیز ہمارے گھر میں تھی۔ میں نے ضد کر کے ان کے کمرے میں اے سی بھی لگوا دیا تھا۔ میرے دونوں بھائی کالج میں پچھلے چکے تھے اور میری خواہش تھی کہ وہ بھی ایم بی اے لے لیں۔

ایک دن غیر متوقع طور پر چچا چچی لگے۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی اور اس کی شادی کا بلاوا دینے آئے تھے۔ وہ ہماری کاپالٹ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ عین اسی وقت میں بھی گھر میں داخل ہوئی۔ انہیں جب علم ہوا کہ میں بینک میں ملازمت کر رہی ہوں تو ان پر ہر گز پھاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو دھو کر دوسرے سے کچھ کہا اور پھر چاکا ہی چچی کی محبت ہو کر آگئی۔ انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے لگایا اور ہمہ اما لہا ہوئے بولیں۔ ”شاباش بیٹی۔ تم نے خاندان کو

”یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”تم تو خوش ہونا؟“ ”ہاں بہت۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جینا سیکھ لیا ہے۔“

ایک دن میں نے اخبار میں ہاشمی صاحب کے نئے پروجیکٹ کا اشتہار دیکھا اور بابا کے سر ہو گئی کہ وہ مجھے ہاشمی صاحب کے پاس لے جائیں۔ میں ایک اپارٹمنٹ بک کروانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح مخالفت کی۔ ان کا خیال تھا کہ میں اتنے مہنگے فلیٹ کی قطعی نہیں دے پاؤں گی لیکن میں نے پہلے ہی حساب لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے بابا کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ اس بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ ضرورت پڑی تو میں بینک سے بھی لون لے سکتی ہوں۔ میرے بے حد اصرار پر وہ مان گئے۔

ہاشمی صاحب کا دفتر ایک شاندار عمارت میں واقع تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں ان کے نئے پروجیکٹ میں اپارٹمنٹ بک کرانا چاہتی ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے میرے سامنے تین پلان رکھے کہ ان میں سے جو منتخب کروں گی وہ اسی کا پے منٹ شیڈول بنوادیں گے۔ میں نے درمیانے سائز کا فلیٹ منتخب کیا۔ اس میں تین بیڈ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ، ٹی وی لاونج، امریکن کچن اور دیگر تمام سہولیات تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ویسٹ اوپن اور کارنر فلیٹ کی بھی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ راحت علی کی بیٹی میرے پاس سے خالی ہاتھ واپس جائے۔ میں تمہیں قیمت میں تین لاکھ کی رعایت دے رہا ہوں۔ اس کے علاوہ مہینہ شیڈول بھی تم اپنی مرضی سے بناؤ گی۔ تمہیں یہ قیمت تین سال میں ادا کرنی ہے۔ اس کے بعد یہ فلیٹ تمہارا فی الحال تم کچھ پیسے ٹوکن منی کے طور پر جمع کروا دو تا کہ تمہاری فائل بن جائے۔“

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک لاکھ کا چیک کاٹ کر ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے منیجر کو بلا کر وہ چیک اسے دے دیا اور میری فائل بنانے کی ہدایت کی۔ اس نے چند منٹ بعد فائل میرے حوالے کر دی اور اس طرح وہ فلیٹ میرے نام ہو گیا۔ بابا حیرت سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنے پیسے ہو سکتے ہیں۔ میں انہیں کیا بتاتی کہ جس دن مجھے اسکول سے پہلی

کردیا۔ ایک ہماری بیٹیاں ہیں۔ انہیں بننے سنور نے سے ہی فرمت نہیں۔ بھائی کے پیسے پر عیش کر رہی ہیں۔“

امی نے مجھے اشارہ کیا اور میں ان کی خاطر تواضع کا بندوبست کرنے کچن میں چلی گئی لیکن میرے کان وہ ہیں گئے ہوئے تھے۔ چچی نے راز دارانہ انداز میں امی سے پوچھا۔ ”اس کی کہیں بات چلی؟“

”نہیں ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے۔“ امی نے جواب دیا۔

”اے سے اور کتنا پڑھے گی۔ بس ایک ڈگری کافی ہے۔ ویسے بھی لڑکیوں کی شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”تم بھی کیسی باتیں کر رہی ہو۔“ امی نے تنک کر کہا۔ ”ابھی تو وہ پوئیں کی ہے۔ اچھا ہے اپنی پڑھائی مکمل کر لے شادی دو چار سال بعد بھی ہو سکتی ہے۔ تم بتاؤ طاہر کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھی؟“

میں اسی وقت میں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئی۔ انہوں نے حسرت سے مجھے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔ ”وہ شادی کے لیے تیار تو ہو، اس نے تو ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ ذمے داریوں سے فارغ ہونے کے بعد شادی کرے گا۔ دیکھو اس مرتبہ آئے گا تو اسے پھر سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔“

طاہر بہن کی شادی میں آیا تو وہ پہلے سے بھی کمزور اور دبلا لگ رہا تھا۔ گال چپکے ہوئے، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور چہرہ پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ شادی کے ہنگاموں میں تو اس سے بات کرنے کا موقع نہ ملا لیکن جب وہ جانے سے پہلے بابا سے ملنے آیا تو میں کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے طاہر؟“

”تم تو جانتی ہو سیما کہ پیسے درختوں پر نہیں لگے ہوتے کہ ہاتھ بڑھا کر توڑ لو۔ اس کے لیے عمت کرنا پڑتی ہے۔ میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں لیکن کسی طرح پورا نہیں پڑتا اگر میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح نارمل ڈیوٹی کرتا تو شاید میرا یہ حال نہ ہوتا لیکن مجھے تو اور ٹائم کے لیے سپر انڈر کرکری خوشاہیں کرنا پڑتی ہیں۔“

”دیکھو طاہر پیسا صحت سے بڑھ کر نہیں ہوتا، تم اتنا ہی کام کرو جتنا کر سکتے ہو۔ تمہارے گھروالوں کو بھی اپنے اخراجات کم کرنا چاہئیں۔“

تخوہ ملی۔ تب سے ہی کچھ نہ کچھ بس انداز کر رہی تھی۔
گھر آ کر بھی بابا بوڑھاتے رہے۔ انہیں بھی فکر
ستائے جا رہی تھی کہ اگر میں تین سال میں قطعی ادا نہ کر سکی
تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اول تو
ایسا ہو گا نہیں چھ مہینے بعد میری پروموشن ہونے والی تھی۔ اس
کے بعد تخوہ بھی بڑھ جاتی اور اگر بالفرض محال میں قطعی ادا
نہ کر سکی تب بھی کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ یہی ہاشمی صاحب
مارکیٹ ریٹ پر میرا فلیٹ لے لیں گے اور مجھے کچھ فائدہ ہی
ہو جائے گا۔

میرا کوئی خاص خرچ تو تھا نہیں سوائے ٹرانسپورٹ
کے، کپڑے بنانے کا بھی شوق نہیں تھا۔ اس لیے تقریباً پوری
تخوہ ہی بچ جاتی۔ البتہ یونیورسٹی کی سمسٹر فیس دینا پڑتی
تھی۔ میں نے بی بی اے کیا تو مجھے آفیسر گریڈ نو بنا دیا گیا۔
تخوہ میں خاصا معقول اضافہ ہوا اور مجھے بینک سے گاڑی
بھی مل گئی۔ میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم مکمل ہو گئی تھی اور
وہ دونوں برسر روزگار تھے۔ اب مجھے گھر کی طرف سے کوئی
فکر نہیں تھی اور میری پوری توجہ ایم بی اے پر تھی۔

ظاہر کی دوسری بہن کی بھی شادی ہوئی۔ ایک بار پھر
اس سے میرا سامنا ہوا۔ جب میں مہندی کی تقریب میں
شرکت کرنے گاڑی چلاتی ہوئی اس کے گھر پہنچی تو سب کی
آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ
جس میٹرک پاس لڑکی کو انہوں نے غریب ہونے کی وجہ سے
ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اس مقام تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ چچی کا تو بس
نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے سر پر بٹھالیں۔ سب
مہمانوں سے فخر یہ انداز میں میرا تعارف کرواتے ہوئے
کہہ رہی تھیں۔ ”یہ میری بیٹی ہے۔ بینک میں افسر کی ہوئی
ہے۔ ماشاء اللہ بہت ترقی کی ہے اس نے۔“

چچا بھی بھولے بھولے پھر رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے
مجھے اس مقام تک پہنچانے میں انہی کا ہاتھ ہو۔ مجھے ان
لوگوں کی منافقت پر غصے کے ساتھ ساتھ کسی بھی آری تھی۔
جب ہم کچھ نہیں تھے تو یہ ہمیں ٹھکرا کر چلے آئے اور اب یہ
ہمارے کلوے چائے پر تیار نظر آ رہے تھے۔ یہ میسے کا جادو تھا
جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ واقعی یہ دنیا چڑھتے سورج کی
پجاری ہے۔ رونے والے کے ساتھ کوئی نہیں روتا۔ ہنسنے
والے کا ساتھ سب دیتے ہیں لیکن ابھی میرا سفر ختم نہیں ہوا
تھا۔ مجھے اور بھی منزلیں سر کرنا تھیں۔ میں ان لوگوں کو دکھانا
چاہ رہی تھی کہ ایک بے بس اور مجبور لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے۔

ظاہر پہلے سے بھی زیادہ کمزور اور بیمار نظر آ رہا تھا
مجھے لگا کہ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ وہ بیمار
شادی اور اس کے گھر والوں کے شاہانہ اخراجات نے اسے
نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے بھی کسی مسکراہٹ سے کہا۔
”کامیابی کا سفر مبارک ہو سیما۔ ماشاء اللہ خوب ترقی کی
ہے۔“

جی میں آیا کہہ دوں کہ اس کامیابی کا کریڈٹ بھی
تمہیں ہی جاتا ہے۔ اگر تم مجھے نہ ٹھکراتے تو میں بھی آگے
بڑھنے کے بارے میں نہ سوچتی لیکن وہ موقع ایسی باتوں کا
نہیں تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولی۔ ”لگتا ہے کہ
تم نے میرے مشورے پر دھیان نہ دیا۔ اس لیے پہلے سے
زیادہ کمزور نظر آ رہے ہو؟“

”میں کیا کروں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے
ہوئے کہا۔ ”انتا کام کرنے کے باوجود بھی پورا نہیں پڑتا۔
ابھی بہنوں کی شادی سے فارغ ہوا ہوں تو مزید ڈیماٹ
سامنے آگئی ہے۔“

”وہ کیا؟“
”تم تو جانتی ہو کہ امی میں حرص کا مادہ بہت ہے۔
تہناری گاڑی دیکھ کر ان کے دل میں بھی یہ خواہش جاگ اٹتی
ہے۔ اس کے ساتھ انہیں اپنے ذاتی مکان میں رہنے کی بھی
آرزو ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ گاڑی مجھے بینک سے
ملی ہے۔“ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”خواہشیں انسان
کے دل میں خود رو پودوں کی طرح اُتی ہیں۔ ایک کے بعد
دوسری پھر تیسری اور یہ سلسلہ بھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر تم انہیں
پورا کرتے رہے تو ساری عمر کلوے کی طرح چکر کھاتے
رہو گے۔“

”پھر کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے بولا۔
”اُسے کان بند اور ہاتھ روک لو۔ صرف اتنے پیسے
بھیجو جن سے گھر کا خرچ چلتا رہے۔ میرے خیال میں گاڑی
سے پہلے مکان کا بندوبست ہونا چاہیے۔ جب تم اگلی بار آؤ
گے تو اس کا حل بھی بتاؤ گی۔“

میں یہ سب باتیں اس کی ہمدردی میں کر رہی تھی۔
بہر حال وہ میرا کزن اور بچپن کا دوست تھا۔ اس نے یا ان
کے گھر والوں نے جو کچھ کیا وہ ان کا فعل تھا لیکن میرے دل
میں اس کے لیے کوئی بغض نہیں تھا۔ ہر انسان کی اپنی
مجبوریاں اور مصیبتیں ہوتی ہیں۔ اس لیے مجھے ان سے کوئی

دکانت نہیں تھی بلکہ میں تو ایک طرح سے ان کی احسان مند تھی۔ اس ایک ٹھوکر نے مجھے کرکریٹھنے اور آگے بڑھنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔

دو سال ملک جھپکتے گزر گئے۔ میں نے ایم بی اے کر لیا تو مجھے براچ مینجر کے عہدے پر ترقی مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی بینک نے مجھے زید میٹر ہنڈا اسی بھی دے دی۔ میں نے پرانی گاڑی بک ویلیو پر بینک سے خرید لی اور ایک ڈرائیور رکھ لیا تاکہ بابا کو کہیں آنے جانے کا مسئلہ نہ ہو۔ میں چاہ رہی تھی کہ وہ اب آرام کریں لیکن بابا اس پر تیار نہ ہوئے انہیں روزانہ گھر سے نکلنے اور کام پر جانے کی عادت تھی۔ البتہ اب وہ صرف رنگ کا ٹھیکہ لیتے تھے اور اپنی عمرانی میں کارنگروں سے کام کرواتے۔ ہاشمی صاحب نے انہیں اجازت دے رکھی تھی کہ وہ فارغ وقت میں دوسری کمپنیوں کے لیے بھی کام کر سکتے ہیں۔

میں باقاعدگی سے اپارٹمنٹ کی قطعیں ادا کر رہی تھی اور بالآخر ایک دن مجھے اس کا قبضہ مل گیا۔ وہ ایک یادگار دن تھا۔ مجھے بینک سے ہاؤس فریڈنڈ الاؤنس ملتا تھا۔ اس سے میں نے فلیٹ کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کروائی۔ امریکن بکن ہاشمی صاحب نے بخوا کر دیا تھا۔ میں نے نئے فرنیچر، قیمتی پردوں اور دیگر آرائشی اشیاء سے اسے آراستہ کیا اور گھر والوں کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی۔ اس دن میں بہت خوش تھی میں نے چھبیس سال کی عمر میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس کی لوگ برسوں تنہا کرتے ہیں۔

چچا اور چچی مبارک باد دینے آئے تو اپارٹمنٹ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ چچی ایک ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ سب کچھ صرف دس سال کے عرصہ میں کر لیا ہے۔ یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا تھا لیکن یہ مالک کا کرم تھا جس نے مجھے اتنی ہمت اور حوصلہ دیا۔ اس وقت مجھے ظاہر کا خیال آیا۔ اسے بھی دینی گئے ہوئے اتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا لیکن وہ زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ چچی بار بار ہر امید نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ شاید ان کے دل میں پرانا رشتہ جوڑنے کی خواہش سر اٹھ رہی تھی جسے وہ دس سال پہلے بڑے نخوت سے ٹھکرا چکی تھیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر انہوں نے ایسی کوئی بات منہ سے نکالی تو وہ جواب دوں گی کہ ساری عمر یاد رکھیں گی۔

اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی امی اور بابا میری طرف

سے غیر مطمئن تھے۔ اب انہیں میری شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔ میں ستائیس کی ہونے والی تھی اور امی کا خیال تھا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیے، میں خود بھی گھر بسانا چاہ رہی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ خاندان برادری میں کوئی لڑکا میرے ہم پل نہ تھا۔ سب ہی تعلیم یافتہ، ہنرمند اور چھوٹی موٹی ملازمتیں کر رہے تھے اگر کسی کو میرا خیال آیا بھی ہو تو میری تعلیم اور اسٹیشن دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا ہو۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ ایک کلائٹ مجھ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ بہت ہنڈم اور ڈشنگ بندہ تھا اور امپورٹ ایکسپورٹ کے کاروبار سے وابستہ تھا۔ وہ اکثر اپنے کاموں کے سلسلے میں بینک آتا تو کچھ دیر میرے پاس بھی ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ ایک بڑی آسانی تھا اور براچ مینجر کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ اس کی ہر ممکن مدد کروں۔ ایک دو معاملات میں، میں نے اسے فوراً بھی دیا جس کے بعد وہ میرے اور قریب آ گیا۔

عورت کو قدرت نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مرد کی نظروں کا مفہوم سمجھ لیتی ہے۔ شارق نے بھی زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میں اس کی نگاہوں کا پیغام پڑھ چکی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ اس کی شوخی بڑھتی گئی۔ کبھی تو وہ کھٹوں بیٹھا رہ جاتا لیکن منہ سے کچھ نہ کہتا لیکن اس دن وہ مطلب کی بات پر آ ہی گیا۔ اس دن وہ کسی کام کے سلسلے میں بینک آیا تھا۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ بولا۔

”آپ کی شام میں کیا مصروفیت ہوئی ہے؟“

”کچھ نہیں، یہاں سے سیدھی گھر جاتی ہوں اور فیملی کے ساتھ وقت گزارتی ہوں۔“

”کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دن آپ میرے ساتھ ڈنر پر چلیں؟“

”سوری، اس کے لیے مجھے اپنے گھر والوں سے اجازت لینا ہوگی۔ ان سے کیا کہوں گی۔“

”کچھ بھی کہہ دیں، کسی سبکی کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے یا بینک والوں نے پارٹی دی ہے۔“

”میں جھوٹ نہیں بولتی۔ کم از کم گھر والوں سے تو بالکل نہیں۔“

”اودہ تو یہ بات ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گیا پھر بولا۔ ”یہ تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی والدہ کو آپ کے گھر بھیجوں۔“ اس نے دھماکا سا کیا۔

میں چونک گئی۔ شرم سے پلکیں جھک گئیں۔ میں نے

سرگوشی کے اعزاز میں کہا۔ ”آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

”یہی کہ آپ ایک پڑھی لکھی اور ویل اسٹیبلشمنٹ خاتون ہیں۔“

”لیکن آپ میرے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“

”وہ بھی بتا دیں۔“

”کیا میں امید کروں کہ جو کچھ بتانے جا رہی ہوں۔ وہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گا؟“

”بالکل آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔“

”تو سنیے شارق صاحب۔“ میں نے جی کڑا کر کے

کہا۔ ”میرے والد ایک رنگ ساز ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”رنگ ساز

ہی ہیں چور ڈاکو تو نہیں۔ وہ مزدوری کر کے حق حلال کی

روزی کماتے ہیں۔“

”پھر بھی رشتہ طے کرتے وقت یہ سب باتیں دیکھی

جاتی ہیں۔“

”اس طرح تو میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ

میرے دادا پر دانا کیا کام کرتے تھے۔ میری نظر میں ان

باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔“

”پھر بھی آپ اپنی والدہ کو یہ بات بتا دیں۔ یہ

جاننے کے بعد بھی وہ میرے گھر آنا چاہیں تو موسٹ ویلکم۔“

”اگر انہیں میری خوشی عزیز ہے تو وہ ضرور آئیں

گی۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا اور چلا گیا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ خود آیا اور نہ ہی اس نے فون

کیا۔ آٹھویں دن آیا تو اس کے چہرے پر شرمندگی کی

چھاپ واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ہمیشہ کی

طرح اس کے لیے چائے منگوائی تو وہ آہستہ سے بولا۔

”مس سیم! آپ کا اندیشہ درست نکلا۔ اسی کی طرح راضی

نہیں ہو رہی ہیں اور میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم

نہیں اٹھا سکتا۔“

”نو پراBLEM۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”ایک

سعادت مند بیٹے کو یہی کرنا چاہیے۔“

”یقین چاہے سیم! آپ سے بہت شرمندہ

ہوں۔“

”آپ کو شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم لڑکیوں کو

ٹھکرائے جانے کی عادت ہوتی ہے۔ بہر حال آپ فکر نہ

کریں۔ ہمارے کاروباری تعلقات ہمارے لیے ہمارے لیے

نہیں پڑے گا۔ میں آئندہ بھی ہر تعاون کے لیے تیار ہوں۔“

اس واقعے کے بعد میں بھی اپنے مستقبل کے بارے

میں فکر مند ہو گئی۔ یہ تعلیم اور اسٹیٹس میرے راستے کی

رکاوٹ بن گیا تھا۔ خاندان برادری کے لوگ میرے قریب

آنے سے ڈرتے تھے اور غیروں کو ایک محنت کش کی بیٹی سے

رشتہ جوڑنا گوارہ نہیں تھا۔ میں نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔

اس سے تو اچھا تھا کہ میں میٹرک کے بعد ہی گھر بیٹھ جاتی اور

سال دو سال بعد اپنے ہم پلہ کسی لڑکے سے بیاہ دی جاتی اور

میرے بھی نصف درجن بچے گلیوں میں آوارہ گردی کر رہے

ہوتے لیکن یہ خود غرضانہ سوچ تھی۔ اگر میں شادی کر لیتی تو

میرے پیار اور بے روزگار باپ کا سہارا کون بنتا میں نے

صرف اپنا مستقبل ہی نہیں سنوارا بلکہ انہیں بھی ایک

پُر آسائش زندگی دی۔ شادی کا کیا ہے وہ بھی ہو جائے گی۔

اتنی بڑی دنیا میں کوئی نہ کوئی بندہ تو ہو گا جو مجھے میرے بیک

گراؤنڈ کے ساتھ قبول کر سکے۔

اگلی بار طاہر چینیوں میں آیا تو اس کی محنت پہلے کے

مقابلے میں بہتر لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے

اپنا ہاتھ روک لیا ہے اور بے جا فرمائش پوری کرنے کی

بجائے صرف گھر کے اخراجات کے لیے پیسے بھیجتا ہے۔ اس

طرح وہ کچھ رقم پس انداز کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے بلکہ

اب اسے اور ٹائم بھی نہیں کرنا پڑتا۔ وہ میرا پارٹنرٹ ویکم

کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ ”سیما تم دس سال میں کہاں سے

کہاں پہنچ گئیں اور میں ابھی تک وہیں ہوں۔“

”اس میں کچھ قصور تمہارا بھی ہے۔ تم نے کبھی یہ نہیں

سوچا کہ جس برتن کے پینڈے میں سوراخ ہو، وہ بھی نہیں بھر

سکتا۔ میں نے زیرو سے اپنا سفر شروع کیا تھا لیکن پیسے کو

دانتوں سے پکڑ کر یہاں تک پہنچی ہوں۔ تم بھی اگر شروع

سے کچھ پس انداز کرتے تو تمہارا بھی ایسا ہی ایک فلیٹ

ہوتا۔“

وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا ہو سکتا

ہے؟“

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم

ایڈوائس دینے کی پوزیشن میں ہو تو آج ہی تمہارے لیے

فلیٹ بک کر دیتی ہوں۔“

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”اتنا تو کر سکتا ہوں لیکن

اس کی بجائے میرے گھر والوں کو نہ پڑے۔ اسی کو گا دی

خریدنے کی دھن سوار ہے۔“

”تم اپنے کان بند کر لو اور وہی کرو جو تمہارا دل کہتا ہے۔“

میں نے دوسرے دن ہاشمی صاحب کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا ان کے کسی پروجیکٹ میں فلیٹ بک ہونے کی گنجائش ہے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ یہ فلیٹ مجھے اپنے چچا زاد بھائی کے لیے چاہیے۔ انہوں نے مجھے دوسرے دن کا وقت دیا اور کہا کہ میں اپنے کزن کو ساتھ لے کر آؤں۔

ہاشمی صاحب کا خیابار وینکٹ شروع ہو چکا تھا لیکن اس میں چند فلیٹ باقی تھے۔ ہاشمی صاحب سے معاملات طے کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ البتہ ایڈوانس کچھ زیادہ تھا۔ کیونکہ فلیٹوں کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور دوسرے الاٹیز نے کچھ فسطیں ادا بھی کر دی تھیں۔ میں نے طاہر سے کہا کہ وہ پیسوں کی فکر نہ کرے اگر ضرورت پڑی تو میں دے دوں گی۔ وہ بعد میں مجھے اپنی سہولت کے مطابق واپس کر دے۔

فلیٹ بک ہو جانے پر وہ بہت خوش تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ شیڈول کے مطابق ادا کیلی کرتا رہے تاکہ وقت پر قبضہ مل جائے۔

”تم فکر ہی نہ کرو۔“ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔
”میں پوری کوشش کروں گا۔ چاہے اس کے لیے اور ٹائم ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔“

میں نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں سچا اور سچی کو بھی بتا دینا چاہیے۔ وہ خوش ہو جائیں گے اور جب انہیں معلوم ہو گا کہ تمہیں اس کی فسطیں ادا کرنی ہیں تو پھر وہ کسی اور چیز کی فرمائش نہیں کریں گے۔“

”تم کہتی ہو تو بتا دیتا ہوں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

طاہر کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ جب اس نے گھر والوں کو بتایا تو سچی بولیں۔ ”اس وقت ہمیں گاڑی کی زیادہ ضرورت ہے۔ فلیٹ کا کیا ہے وہ تو بعد میں بھی ہو جاتا۔“

”یہ کام زیادہ ضروری تھا۔“ طاہر نے جواب دیا۔
”پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔ پر اپنی کئی مہینیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں دو چار سال بعد تو یہ ہماری پہلی سے دور ہو

جائیں گی۔“

دینی واپس جانے سے پہلے وہ مجھ سے ملنے آیا۔ انی اور بابا کہیں گئے ہوئے تھے اور اتفاق سے میں گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی اور ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ اچانک ہی اس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”یسا! تم نے اپنا فرض پورا کر دیا اور میں بھی ڈتے دار یوں کے بوجھ سے آزاد ہو چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب ہماری شادی ہو جانی چاہیے۔“

میرے ہاتھ میں چائے کا کپ لرز کر رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ سکے گا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی اور بولی۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”کیوں؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”بھئی میں اپنی اور تمہاری شادی کی بات کر رہا ہوں۔“

میں نے غصے سے کہا۔ ”کیا تم نے مجھے کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ جب چاہا کھیل لیا جب چاہا پھینک دیا۔“
وہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

”طاہر شاید تمہیں یاد نہیں رہا لیکن میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جب تمہارے جانے کے بعد چچی جان نے یہ کہہ کر رشہ ختم کر دیا تھا کہ تم شادی کے لیے تیار نہیں ہو کیونکہ تمہیں بہنوں کی شادیاں کرنی ہیں۔ مکان بنانا ہے۔ گاڑی خریدنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے بابا کو مشورہ دیا کہ یہ ایک لمبا روگرام ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ میری شادی نہیں اور مردیں۔ میں سمجھ گئی کہ امیر اور غریب کے فرق سے وہ رشہ ختم کر رہی ہیں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ اس فرق کو ختم کر کے ہی دم لوں گی۔ آج میرے پاس تعلیم، دولت اور مرتبہ ہے تو تمہیں بھی شادی کا خیال آ گیا۔ بھول گئے کہ میں وہی ٹھکرانی ہوئی لڑکی ہوں۔“

وہ ہلکلا کر صوفے سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔
”خدا کی قسم میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ دینی جاتے وقت ہی امی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ پہلے مجھے اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ہیں، اس کے بعد میں اپنی شادی کے بارے میں سوچوں۔ میرا خیال تھا کہ پانچ چھ سال میں

ان ذمے داریوں سے فارغ ہو جاؤں گا لیکن یہ عرصہ طویل ہوتا گیا۔ اس دوران جب بھی میری شادی کا تذکرہ ہوا۔ امی مجھے ذمے داریاں یاد دلانی رہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ وہ میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلا چکی ہیں اور انہوں نے یہ کہہ کر رشتہ ختم کرو یا ہے کہ میں شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ چچی کی چال تھی۔ انہیں اپنے کماؤ بیٹے کے لیے کسی امیر لڑکی کی ضرورت تھی جو ان کا گھر جینر سے بھر دے۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ میری شادی ہو جائے تو وہ ہم لوگوں پر کوئی جھوٹا سچا الزام لگا کر طاہر کی شادی کسی امیر لڑکی سے کر دیں گی۔ لیکن ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہوا۔ ذمے داریاں پوری کرنے کے چکر میں بیٹا مٹھن چکر بن گیا۔ دوسری طرف میں ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے ایسے مقام تک پہنچ گئی کہ چچی کے دل میں ایک بار پھر مجھے بہو بنانے کی خواہش جنم لینے لگی لیکن وہ اس کا اظہار کرتے ہوئے ڈر رہی تھیں کیونکہ میں ہر لحاظ سے طاہر کو بہت پیچھے چھوڑ چکی تھی۔

حقیقت کا علم ہونے کے بعد میرا دل طاہر کی طرف سے صاف ہو گیا۔ وہ بے قصور تھا۔ ساری آگ چچی نے لگا رکھی تھی۔ میں انہیں بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے جو خیم لگایا تھا۔ دس سال گزرنے کے بعد بھی اس کی کک باقی تھی۔ یہ احساس میرے رگ دے میں سرایت کر چکا تھا کہ میں ایک ٹھکرائی ہوئی لڑکی ہوں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں بھی وہی سلوک کروں جو وہ میرے ساتھ کر چکی تھیں۔ میں بھی طاہر کو یہ کہہ کر ٹھکرادوں کہ وہ میرے ہم پلہ نہیں لیکن کیا میں ایسا کر سکتی ہوں۔ یہ سوچنے کے لیے مجھے مہلت درکار تھی۔

”میرا خیال ہے کہ حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد تمہیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ طاہر پُر امید لہجے میں بولا۔

”مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”کتنا وقت، میں تو کل چلا جاؤں گا۔“

”میں کل صبح تمہیں فون کر کے بتا دوں گی۔“

”فون پر نہیں میں خود آ جاؤں گا۔“

میں نے اسے کہہ دیا کہ وہ دوپہر میں بینک

آجائے۔ ہم لنچ ایک ساتھ کریں گے۔ اس نے ہائے کے بعد میں بستر پر لیٹ گئی۔ دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے اور میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے پوری تنہیدگی سے صورت حال پر غور کیا تو بہت کچھ واضح ہوتا چلا گیا۔ میری عمر ستائیس سال ہو چکی تھی اور ابھی تک میرا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔ امی بابا کب تک میرا ساتھ دیتے۔ ایک نہ ایک دن انہیں بھی اس دنیا سے چلے جانا تھا۔ دونوں بھائی باہر جانے کے لیے پرتول رہے تھے۔ اس کے بعد میں بالکل تنہا ہو جاتی۔ میرے پاس سب کچھ تھا لیکن اس کے باوجود محسوس ہوتا تھا کہ میں تنہا ہوں۔ اس کے لیے مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہاں سے لاؤں۔ ایسے میں مجھے طاہر کا دم غنیمت معلوم ہوا۔ میری نظر میں اس کی پوزیشن صاف ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔

سارا مسئلہ چچی کا تھا۔ میں انہیں کسی صورت بھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اچانک میرے دماغ نے پلٹا کھایا اور میں نے دوسرے انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔ دس سال پہلے انہوں نے یہ رشتہ ختم کر کے مجھے پیپے کی اہمیت کا احساس دلایا اور میں نے تنہید کر لیا کہ پیپے کو اپنی طاقت بناؤں گی۔ اسی جذبے کے تحت میں نے سولہ سال کی عمر میں عملی زندگی کا آغاز کیا اور تین ہزار روپے مہینہ پر اسکول میں ملازمت کر لی جہاں میں دیگر متفرق کاموں کے علاوہ ہیڈ ماسٹر میں اور اسکول کی ٹیچر کے لیے جائے بھی بنایا کرتی تھی۔ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں چچی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگر وہ مجھے نہ ٹھکراتیں تو میں بھی غربت کی گود میں پڑی سبک رہی ہوتی۔ اس لحاظ سے وہ میری محسن تھیں۔ بہت بڑی محسن انھی کی وجہ سے میں اس مقام تک پہنچی۔ جھینک یو چچی۔

میں نے بھی بھول جانے اور معاف کر دینے کی تعلیم دی ہے۔ لہذا میں نے ماضی کو بھلا کر چچی کو صدق دل سے معاف کر دیا۔ دوسرے دن طاہر بینک آیا تو میں اسے لے کر قریبی ریسٹوران میں لنچ کے لیے چلی گئی۔ پیرا کھانے کا آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے پوچھا۔ ”تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تیار ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”تم پاکستان آ جاؤ۔ میں اپنی جاب چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“

”تمہیں وہاں اس سے اچھی جاب مل سکتی ہے۔“
”نہیں میں اپنے ماں باپ سے دور نہیں جاسکتی۔ اس عمر میں انہیں میری ضرورت ہے۔“

”ان کی دیکھ بھال کے لیے عدنان اور عثمان بھی تو ہیں۔“

”وہ دونوں باہر جانے کے لیے پرتول رہے ہیں۔ بس تم واپس آ جاؤ۔“

”یہاں آ کر کیا کروں گا؟“
”تمہیں کوئی نہ کوئی ملازمت مل ہی جائے گی۔ بے شک پیسے وہاں سے کم ملیں گے لیکن تم بھوکے نہیں مرو گے اور نہ کوئی کاروبار کر لینا۔“

”مجھے کم از کم دو سال تو وہاں رہنا ہوگا۔ جب تک فلیٹ کی قسطیں ادا نہیں ہو جاتیں۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ میں دے دوں گی۔“
”نہیں میں تم پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”وہ میری ذمہ داری ہے۔“

”پھر شادی بھی دو سال بعد ہی ہوگی۔“ میں نے شوخ لہجے میں جواب دیا۔

”ہمیں جلد شادی کر لینی چاہیے ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔“

”یہ تو وہی بات ہوگئی ہم یہاں تم وہاں۔“
”میں آتا جاتا رہوں گا تم بھی سچ میں ایک دو پکڑ لیا۔ دو سال تو یوں پک جھکتے میں گزر جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

اس کے جانے کے دو مہینے بعد ایک دن چچی اور چچا ہمارے گھر آئے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں دوبارہ یہ بات زبان پر لانے میں تھوڑی بہت ہچکچاہٹ محسوس ہوگی لیکن وہ تو بہت ہی ڈھمکتے تھے۔ انہوں نے مجھے گلے لگا کر ماتھا چوما اور امی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اللہ نے میری سن لی۔ طاہر شادی کے لیے تیار ہے۔ بس تم جلدی سے شادی کی تاریخ دے دو۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتی۔“

امی نے حیرت سے بابا کو دیکھا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے تو رشتہ

ختم کر دیا تھا۔ اب کس منہ سے سوال کر رہی ہو؟“

چچی شیشا کھیں اور انہوں نے بات بتانے کی کوشش کی۔ ”خدا گواہ ہے کہ میری ایسی کوئی نیت نہیں تھی۔ میں نے تو صرف یہی کہا تھا کہ طاہر شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہا۔ لڑکی کب تک اس کے انتظار میں بیٹھی رہے گی۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس کی شادی کہیں اور کر دو۔“

”سچ تو یہ ہے کہ امی اور بابا دونوں ہی میری وجہ سے پریشان تھے لیکن انہوں نے چچی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بولے۔“ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکا۔ یسا سے پوچھ کر جواب دوں گا۔“

”ہاں ہاں ضرور پوچھو۔“ چچی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ”اس کا حق تو مذہب نے بھی دیا ہے۔ وہ بڑی لکھی سمجھ دار لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرے گی۔“

ان کے جانے کے بعد بابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر میری مرضی جاننا چاہی تو میں نے اس پر رضا مندی ظاہر کر دی، وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی ہوئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ چچی کے گزشتہ رویے کے پیش نظر میں انکار کر دوں گی اور خوشی اس بات کی تھی کہ میں اپنے گھر کی ہو جاؤں گی۔ پھر سب کچھ میرے اور طاہر کے پلان کے مطابق ہوا۔ ایک سال بعد وہ چھٹیوں میں پاکستان آیا تو ہماری شادی ہوگئی۔ وہ ایک مہینا میرے پاس رہا پھر میں تین مہینے کی چھٹی لے کر دہلی چلی گئی۔

طاہر کو جیسے ہی فلیٹ کا قبضہ ملا وہ ملازمت چھوڑ کر پاکستان آ گیا۔ پہلے تو اس نے جاب کرنے کی کوشش کی لیکن پیسے بہت کم مل رہے تھے چنانچہ اس نے آٹو پارٹس کی دکان کھول لی۔ چند ہی مہینوں میں کاروبار چل نکلا اور وہ دہلی سے زیادہ کمائے لگا۔ دونوں بھائی ملک سے باہر جا چکے ہیں لیکن میں نے امی اور بابا کی خبر گیری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ روزانہ شام کو ان سے ملنے جاتی اور چھٹی کا پورا دن ان کے ساتھ گزارتی ہوں۔ میں نے طاہر سے کہہ دیا ہے کہ تم اپنے والدین کا خیال رکھو اور مجھے اپنے ماں باپ کی خبر گیری کرنے دو۔ طاہر میرے کسی معاملے میں نہیں بولتا بلکہ احسان مند ہے کہ میری وجہ سے اسے دہلی کی مشقت سے نجات مل گئی اور وہ ایک پُر سکون زندگی گزار رہا ہے۔

☆☆☆

فرشتہ انگل

مکرمی ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں کبھی بدنام زمانہ چور تھا۔ رہنمی، ڈکیتی وغیرہ میرے آمدنی کے ذرائع تھے لیکن ایک چھوٹے سے بچے نے مجھے اس راستے پر آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس نے میرے اندر ایک انقلابی تبدیلی لادی اور آج میں ایک دین دار شخصیت کے طور پر پہچانا جا رہا ہوں۔ اس بچے نے کس طرح مجھے ایک شریف آدمی کی طرح زندگی گزارنے پر اکسایا، یہی میں بتانا چاہ رہا ہوں۔ یہ واقعہ میں ایک فرضی نام سے لکھ رہا ہوں۔ اُمید ہے قارئین کو بھی یہ واقعہ پسند آئے گا۔

شرجیل

(پشاور)



”میں نے پوری معلومات کر لی ہیں۔ بہت مال ہے اور اسے
میں۔ اور سوائے ایک بچے کے اور کوئی نہیں رہتا۔“
”کیا مطلب؟ صرف ایک بچہ؟“
”ہاں یار۔ یہی تو مرے کی ہاست ہے۔“

”نہ جانے کیوں میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس مکان
میں کارروائی کی جائے۔ لیکن میرے ساتھی بالوں نے مجھے
مجبور کر دیا تھا۔“
”اے ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔“ اس نے کہا۔

کہا۔ ”صرف ایک بچہ۔ میں ایک مہینا تک جھک مارتا رہا ہوں تب جا کر پتا چلا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر میں صرف ایک ہی بچہ رہتا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یار سمجھا کر۔“ اس نے براسا منہ بنایا۔ ”اس کا ایک باپ بھی ہے، وہ صبح آفس جاتا ہے۔ اس دوران بچہ قریب کے اسکول چلا جاتا ہے۔ بہت ہی سمجھدار بچہ ہے۔ دوپہر میں اسکول سے واپس آ کر بچہ اس وقت تک اکیلا رہتا ہے جب تک باپ کی واپسی نہ ہو۔“

”اور اس بچے کے کھانے پینے کا انتظام کیسے ہوتا ہے؟“ مجھے اس بچے سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اس کا باپ کھانا فریج میں رکھ کر جاتا ہوگا۔“ بالو نے کہا۔ ”خود ہی نکال کر کھا لیتا ہوگا۔ شام کے وقت دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ ان کا یہی معمول ہے۔ بچے کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے۔ مگر میں اور کوئی نہیں ہے۔“

”اگر ایسا ہے پھر تو اوروں نے بھی ٹرائی کی ہوگی کہ اس گھر میں کس گھس جائے۔“

”نہی تو پراہم ہے کہ اس گھر میں کس نہیں سکتے۔“ بالو نے کہا۔ ”دروازہ اندر سے لاک ہوتا ہے۔ اور لاک ششم بھی بہت پے چیدہ ہے۔ آسانی سے کھل نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ بچہ اندر سے آنے والوں کو دیکھتا بھی رہتا ہے۔ اسی لیے گھر میں گھسنا مشکل ہے۔ لیکن اتنا تباہی دوں کہ مال بہت ہے اس گھر میں۔ بس کسی طرح ایک بار اندر داخل ہو جائیں۔ اس کے بعد عیش ہوں گے۔“

”دیکھ لے یار۔ اپنا تودل نہیں چاہ رہا کہ کسی بچے کو لوٹا جائے۔“ میں نے کہا۔

”کیا پاگل پن ہے۔ ہم بچے کو کہاں لوٹ رہے ہیں، اس کے باپ کو لوٹ رہے ہیں۔“

”کچھ دیر بحث کے بعد میں نے بھی ہامی بھری۔ ویسے بھی ان دنوں ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا بے کار پھر رہے تھے۔“

ہم نے اس کام کی ابتدا دو سال پہلے کی تھی۔ اس سلسلے میں ہم نے ایک اصول بنا رکھا تھا۔ جس پر سختی سے کاربند تھے۔ وہ اصول یہ تھا کہ سال میں بس ایک دو وارداتوں سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے بعد آرام کیا جائے۔ یا دوسرے کام کئے جائیں۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو سکے کہ ہم

ایسے کام بھی کر سکتے ہیں۔ بالو اور میں، بس ہمارا یہی گروپ تھا۔ ہم نے بہت کھون لگایا تھا کہ آخر یہ ڈاکو پکڑے کیوں جاتے ہیں۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اپنا بھید کسی پر ظاہر کر دینا، خاص طور پر کسی عورت کو بتا دینا یا کسی عورت کو اپنے کام میں شامل کر لینا۔

ہم ان دو اصولوں پر سختی سے عمل کرتے رہے تھے۔ ہاں، ایک اور بات بھی تھی۔ ہمارے پاس اسلحہ تو ہوتا تھا لیکن ہم ان کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ صرف دو بار ہمیں استعمال کرنا پڑا تھا۔ ایک یار بالو کو اور دوسری بار مجھے اور دونوں سے دو جاہیں چلی گئی تھیں۔ ہم نے خود کو بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔ بہت مجبور ہو کر گولیاں چلائی پڑی تھیں۔ تب جا کر ہم خود کو بچا سکے تھے۔ اس کے بعد بہت دنوں تک ہم نے پھر کوئی واردات نہیں کی تھی۔ ہر دم پکڑے جانے کا ڈر لگا رہتا تھا۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم صاف بچ نکلے تھے۔ پولیس نامعلوم کوڈ صوفٹ پی روٹ گئی تھی۔

وہ علاقہ بھی ایسا تھا کہ اس پاس والوں کو ادھر ادھر کی کوئی خبر نہیں تھی۔

ہم نے اس مکان کا جائزہ لیا۔ بالو کی بات درست تھی۔ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ اندر داخل ہونا ہی مشکل تھا۔ دروازہ بہت مطلوبی سے بند تھا۔ دیوار بھی ایسی نہیں تھی کہ کود کر اندر جایا جاسکے۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ کسی طرح اس بچے کو اس بات پر آمادہ کیا جاسکے کہ وہ خود ہی دروازہ کھول دے۔

بالو نے دروازے کی کھنٹی بجا دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے بچے کی آواز آئی۔ ”کون؟“

”بیٹا ہم سروے کرنے آئے ہیں۔“ بالو نے کہا۔

”گورنمنٹ کی طرف سے۔ مکان کا جائزہ لیتا ہے۔“

”سوری انکل۔ میں دروازہ نہیں کھول سکتا۔ ڈیڈی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آجائیں تو پھر آئیے گا۔“

اس کے بعد میں نے بھی وہی بات کی۔ لیکن اس بچے نے دروازہ نہیں کھولا۔ اسے بہت اچھی طرح سکھا دیا گیا تھا کہ کسی بھی حال میں دروازہ نہیں کھولے گا۔ یہ ترکیب ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ پھر بالو ہی کے ذہن میں ایک بات آگئی۔ ہم وہاں سے ہٹ کر ایک طرف آ گئے تھے۔

”یار۔ اس گھر میں کوئی کام دالی تو آتی ہوگی۔ کوئی تو

ایسی ہوگی جو آکر گھر کا کام کر جاتی ہو۔“

”تو پھر؟“

”پھر یہ کہ کیا ہم اس کو یہ خیال بنا کر دروازہ نہیں کھولا سکتے؟“ میں نے کہا۔ ”پھر اس کی آواز سن کر دروازہ ضرور کھول دیتا ہوگا۔“

آہٹ یا اچھا تھا۔ ہم ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ چپے کسی کے انتظار میں ہیں۔

ہم بہت دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن کوئی نہیں آئی۔ اور نہ ہی دروازہ کھلا۔ پھر بہت دیر بعد ایک عورت دروازے کی طرف جاتی دکھائی دی۔

وہ کام کرنے والی ہی معلوم ہوتی تھی۔ وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ہم دونوں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

بالو نے ٹی ٹی نکال کر اس کی کمر سے لگا دی۔ وہ ان معاملات میں مجھ سے زیادہ تیز تھا۔ اس نے ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ بے چاری عورت بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

”کون کون ہو؟“

”چل دروازہ کھولا۔“ میں نے کہا۔ ”کون ہے اندر آواز دے اس کو۔“

”اندر صاحب ہیں۔ ان کے دو بھائی ہیں اور.....“

”بکواس مت کر۔“ بالو غرایا۔ ”ہم جانتے ہیں اندر صرف ایک بچہ ہے۔ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کر ورنہ.....“

بالو نے اس کی کمر پر پتول کا دباؤ بڑھا دیا۔ وہ بہم گئی تھی۔ اس نے دروازے کی گھنٹی بجادی۔ ہم دونوں دائیں بائیں ہو گئے۔ تاکہ اگر وہ بچہ اندر سے شیشے کے ذریعے دیکھے بھی تو ہم دکھائی نہ دیں۔

وہی ہوا۔ دروازہ کھول دیا گیا۔ ہم اس عورت کے ساتھ ہی اندر چلے گئے۔ وہ بچہ ہم کر ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ ”آپ لوگ کون ہیں اگل؟“

”خبردار۔“ بالو غرایا۔ ”شور مت کر ایک طرف بیٹھ جا۔“ پھر اس نے اس عورت کی طرف دیکھا۔ ”تو بھی چپ کر کے بیٹھ۔ اور یہ بتا کہ تیرا صاحب اپنا مال کہاں رکھتا ہے۔“

میں اتنی دیر میں گھر کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس گھر کی حالت کوئی خاص نہیں تھی۔ بہت عام سا فرنیچر تھا۔ ایک ٹی وی پڑا ہوا تھا۔ وہ بھی پرانا سا تھا۔ نہ جانے بالو کیا سوچ کر اس گھر میں داخل ہوا تھا اور مجھے بھی لے آیا تھا۔

مگر دنیا کے کئی ممالک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو ایک صدی سے بھی زیادہ زندگی جیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے، بائیس میں تو انسان کی زندگی ایک ہزار برس تک بھی ہوتی تھی، مگر آج کل کے زمانے میں اوسط زندگی کم ہو کر 60 سے 80 سال تک محدود ہو گئی ہے لیکن چند ممالک ایسے بھی ہیں، جہاں لوگوں کی زندگی 115 برس تک بھی جاتی ہے۔ اور ماہرین صحت یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ اگر کسی شخص میں جینیاتی طور پر زیادہ عمر کے جینز موجود ہوں اور وہ شفاف ماحول کے حامل ملک میں رہائش پذیر ہو تو اس کی زندگی 115 برس تک بھی جاسکتی ہے مگر حال ہی میں ماہرین صحت کی جانب کیے جانے والے طبی سروے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس بات کی کوئی طبی ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہو سکتی ہے؟ پہلے کی جانے والی تحقیق کے مطابق انسان 115 سال تک جی سکتا ہے۔ کینیڈا کی مک گیل یونیورسٹی آف مونٹریال کے ماہرین کی جانب سے ’انٹرنیشنل ڈیٹا بیس آف لائونگی‘ اور دنیا کے ماحولیاتی آلودگی کے ڈیٹا کا جائزہ لیا گیا۔ سائنس جرنل نیچر میں شائع رپورٹ کے مطابق ڈیٹا کے جائزے کے بعد ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ آج کے جدید دور میں اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ کس شخص کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے ماہرین صحت نے بہتر شفاف ماحول کی وجہ سے طویل اوسط عمر کا درجہ رکھنے والے ممالک کے شہریوں کے لیے کہا تھا کہ وہ 115 برس کی عمر تک جاسکتے ہیں۔ تاہم مونٹریال کی مک گیل یونیورسٹی کے ماہرین نے ان دعوؤں کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی زندگی کتنی طویل ہو سکتی ہے۔ ماہرین نے اپنی رپورٹ میں بہتر شفاف ماحول رکھنے والے ممالک کے شہریوں کی کم سے کم زیادہ سے زیادہ زندگی کا تعین بھی نہیں کیا، جس وجہ سے ان کی رپورٹ کو ناقص قرار دیا جا رہا ہے۔ مک گیل یونیورسٹی کے ماہرین کے مطابق انسان کی طویل زندگی کا 25 فیصد تعلق ان کی جینز سے ہوتا ہے، جو اسے خاندان سے ورثے میں ملتی ہے، جب کہ لمبی عمر کا 75 فیصد تعلق موسمی ماحول، صحت اور دیگر عوامل سے ہوتا ہے۔ ماہرین نے بتایا کہ تاہم اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اچھے موسمی ماحول کے حامل ممالک اور بہتر صحت رکھنے والے افراد کی زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہوگی؟

مرسلہ: محمد خان

بالونے سوال دہرایا۔ اس عورت نے گھبرا کر جواب دیا۔ ”کچھ نہیں معلوم جی۔ میں تو گھر میں کام کرنے والی ہوں۔ مجھے کون بتاتا ہے۔“

”تیرا صاحب کیا کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”چائیں جی۔ کسی دفتر میں کام کرتا ہے۔“

”گھر میں الماریاں تو ہوں گی؟“ بالونے پوچھا۔

”صرف ایک الماری ہے جی۔ وہ اس کمرے میں

ہے۔“ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس گھر میں شاید تین ہی کمرے تھے۔ ایک تو وہی

ڈرائنگ روم جس میں ہم دونوں گھسے تھے۔ اس کے علاوہ دو

کمرے اور تھے۔ اگر کوئی مال ہوگا تو وہ الماری ہی میں ہو

سکتا تھا۔

”چلو۔ کمرے میں چلو۔“ بالونے اشارہ کیا۔

”انکل آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟“ اس بچے نے

پوچھا۔

”ہو شیار مت بن۔“ بالونے گھر کی دی۔

بچے کا چہرہ بن گیا تھا۔ خوف نے اس کے اعصاب

باختہ کر دیے تھے۔ اس عورت کا بھی اب یہی حال ہو رہا

تھا۔ ہم ان دونوں کو لے کر اس دوسرے کمرے میں آگئے

جہاں ایک الماری تھی۔ ایک مسہری تھی جس پر بستر پڑا ہوا

تھا۔

اس کمرے کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ یہ کہا جاسکے

کہ اس گھر میں دولت نام کو کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ خود بالو بھی کچھ مایوس نظر آ رہا تھا۔

شاید الماری میں کچھ ہو۔

”اس الماری میں کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”انکل اس میں میرے کھلونے ہیں۔“ بچے نے کہا

”میں دکھاؤں آپ کو۔ بہت اچھے ہیں۔“

”جپ رہ۔“ بالونے اس کو جھڑک دیا۔ یہ بتا تیرے

باپ نے پیسے کہاں رکھے ہیں؟

”مجھے نہیں معلوم انکل۔“ بچے نے رونا شروع کر دیا

تھا۔ بہت کوفت سی ہو رہی تھی۔ ہم کیا سوچ کر اس گھر میں

داخل ہوئے تھے۔ اور ابھی تک کچھ نہیں ملا تھا۔

بالونے اتنی دیر میں الماری کی تلاشی لینی شروع کر دی

تھی۔ اس نے کپڑے نکال نکال کر ایک طرف پھینکنے شروع

کر دیے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی خاص چیز نہیں ملی تھی۔ وہ

بخت جھلایا ہوا تھا۔ گالیاں دیتا جا رہا تھا۔

کچھ دیر کی تلاش کے بعد ایک چھوٹا سا کبس مل گیا۔

”ہاں۔ یہ بات ہوئی نا۔“ بالو خوش ہو گیا تھا۔ ”اس

میں کچھ ہو سکتا ہے۔“

”نہیں۔ اس کو مت دیکھیں۔“ بچا اچانک چیخ اٹھا۔

”اس میں میری امی ہیں۔“

”ارے واہ۔ اس میں تیری امی کیسے بند ہو گئیں؟“

بالونس پڑا تھا۔

”میں بتاؤں جی۔“ ملازمہ نے کہا۔ ”اس میں مالکن

کی تصویریں ہیں۔“

”اور خود مالکن کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کا تو پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا جی۔“ ملازمہ

نے بتایا۔

بالونے بھی یہی اطلاع دی تھی۔ اس دوران بچے نے

رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ ”نہیں۔

نہیں۔ میری امی کو کچھ مت کہو۔“

وہ کبس بھی کھلا ہوا تھا۔ بالونے تلاشی لینی شروع کر

دی۔ اس میں واقعی تصویریں تھیں۔ بالونے ایک ایک تصویر

کو باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ میں نے ایک تصویر اٹھالی۔ عام

سی گھریلو تصویریں تھیں۔ اس بچے کی تھیں۔ اس کے ساتھ

اس کے باپ کی تھیں اور ماں کی تھیں۔ جو ایک خوبصورت

عورت تھی۔

وہ بچہ سسک رہا تھا۔ اب وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا

تھا۔ ملازمہ اس کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا دل

بے جا جارہا تھا جبکہ بالو سخت جھلایا ہوا تھا۔ ”لعنت ہے اس گھر

میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ اتنے بڑے بڑے فرنیچر ہیں۔

ان کو تو اٹھانے سے رہے۔“

اسی دوران دروازے کی کھٹکی بج اٹھی۔ ہم سب

چوکنے ہو گئے تھے۔ ”کون آیا ہوگا؟“ بالونے ملازمہ سے

پوچھا۔

”صاحب آئے ہوں گے۔“ ملازمہ نے بتایا۔

”آج ان کو جلدی آتا تھا۔ نوی کوڈ اکثر کے پاس لے جاتا تھا۔“

”نوی کون؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ۔“ ملازمہ نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ”ان کا

نام نوی ہے۔“

”ہاں آئے ہیں۔“ بچا اچانک ایکٹو ہو گیا تھا۔

”کھٹکی دوبارہ بجی۔ اس بار کچھ دیر تک بجتی رہی تھی۔“

پڑا۔ ”میرے بابا کو کچھ مت کہو۔ میں پیسے لا کر دیتا ہوں۔“
 بالو کے ہونٹوں پہ ایک بے رحمانہ میسرکراہٹ نمودار
 ہو گئی۔ ”یہ بات ہوئی نا۔ جا جلدی سے لے کر آ۔ ورنہ
 تیرے بابا کو گولی مار دوں گا۔“

اس کا باپ بھی یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ اس نے
 پوچھا۔ ”بیٹے تمہارے پاس پیسے کہاں سے آئے؟“
 ”ہیں بابا۔“ بچے نے کہا۔ ”میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“
 کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ میرے پاس
 رک گیا۔ ”انکل اگر میں پیسے لا کر دوں تو میرے بابا کو چھوڑ
 دیں گے نا؟“

اس بچے کا دلہانہ پن اور اس کی معصومیت دیکھ کر
 میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں اس
 سے کچھ کہتا۔ وہ بچہ دوڑتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔
 کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک بڑا سا
 گلک تھا۔

وہ گلک لے کر میرے پاس آ گیا تھا۔ ”یہ لیں انکل۔
 اس میں بہت سے پیسے ہیں۔ سب میں نے جمع کیے ہیں۔
 سب لے لیں۔ لیکن میرے بابا کو کچھ نہ کہیں۔“
 میں نے دیکھا کہ اس کے باپ کی آنکھوں میں بھی
 آنسو تھے اور وہ ملازمہ بھی رورہی تھی۔ حدیہ کہ بالو نے بھی
 پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔

”بیٹے یہ بتاؤ۔ تم نے کتنے پیسے جمع کئے ہیں؟ میں
 نے پوچھا۔ اس وقت میری آواز پھرائی ہوئی تھی۔
 ”پورے تین سو ہیں انکل۔“ اس نے بتایا۔
 ”میں نے پرسوں ہی گنے تھے۔“

”بالو۔ اب کیا خیال ہے تیرا؟“ میں نے پوچھا۔
 ”کچھ نہیں یار۔“ بالو نے ایک گہری سانس لی۔
 ”چل یہاں سے چلتے ہیں۔ اس بچے نے تو لا دیا ہے۔“
 جب ہم وہاں سے جانے لگے تو اس بچے نے
 ہمارے پاس آ کر کہا۔ ”ایک بات بتاؤں انکل۔ آپ
 دونوں فرشتے انکل ہیں۔“
 میں نے اس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور ہم وہاں
 سے نکل آئے۔

اس دن کی واردات کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے
 اب یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ شاید خدا ہم پر مہربان ہو گیا ہے۔
 مجھے اور بالو دونوں کو ابھی جا بل گئی ہے۔

”جاؤ۔ دروازہ کھولو۔“ بالو نے ملازمہ سے کہا۔
 ”میں تمہارے پیچھے ہوں گا۔ اور کوئی اشارہ وغیرہ کرنے کی
 کوشش مت کرنا۔ ورنہ سب کو اڑا دوں گا۔“
 ”اچھا جی۔“ سہمی ہوئی ملازمہ نے گردن ہلا دی۔

دونوں دروازے پر گئے۔ بالو ایک سائیڈ میں ہو گیا
 تھا۔ ملازمہ نے دروازہ کھول دیا۔ گھر کا مالک اندر داخل
 ہوا۔ ”کیا بات ہے دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگا
 دی؟“ اس نے پوچھا۔

”اس کو میں نے کہا تھا۔“ بالو اچانک سامنے آ گیا تھا۔
 ”ک۔ کون ہوتا؟“ وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا۔
 ”اوہ۔ ابھی بھی نہیں سمجھ سکے کہ میں کون ہوں۔“

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ پھر اپنے بیٹے
 کی طرف دیکھا۔ اس دوران وہ بچہ دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا
 تھا۔ ”ابو۔ یہ لوگ گھر میں آ گئے تھے۔“

”کون ہو تم لوگ۔ کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پریشان
 ہو کر پوچھا۔ اس کا بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹا ہوا تھا۔
 ملازمہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی حالت
 بری ہو رہی تھی۔

”واہ میرے بھولے بابو۔“ بالو ہنسا۔ ”ابھی تک
 نہیں سمجھ سکے کہ ہم کون ہیں۔ اور کیا چاہتے ہیں؟“

وہ خاموش رہا۔ لیکن اس کی حالت بھی غیر ہو رہی
 تھی۔ شاید اس کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہو گا۔ اس نے
 اپنے بچے کو سنبھال رکھا تھا۔ اسے دلاس دے رہا تھا۔
 ”چلو جلدی کرو۔“ بالو نے کہا۔ ”ہمارے پاس اتنا
 وقت نہیں ہوتا کہ باپ بیٹے کی محبت دیکھتے رہیں۔“

”دیکھو۔ میں پھر کھ رہا ہوں کہ میں ایک غریب
 آدمی ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں باپ
 بیٹے کس طرح زندگی گزار رہے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں۔
 تمہوڑے بہت پیسے گھر میں رکھے ہیں۔ اگر وہ چاہیے تو لے
 جاؤ۔ بچے کی فیس کے پیسے ہیں۔ اس کے علاوہ تمہوڑا بہت
 فرنیچر ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔ اگر اس کی ضرورت ہو تو یہ بھی
 لے جاؤ۔“

”زیادہ ہوشیار مت بن۔“ بالو جھٹکا گیا تھا۔ ”پیسے
 چھپا کر رکھے ہوں گے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین کرو۔“
 بالو نے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔
 شاید وہ گولی چلا دیں۔ لیکن اسی وقت وہ بچہ پول

سیلانی

مکرمی مدیر سرگزشت

سلام مسنون

یہ کہانی میری نہیں، میرے ایک دوست کی ہے جس نے عشق کیا اور عشق نبھایا بھی۔ اُمید ہے پسند بھی آئے گی۔

سید محمود حسین
(کراچی)

ہائی وے پر چلتے چلتے بس بند ہوئی تھی۔ رات کے وقت کسی دیرانے میں بس بند ہو جائے تو خوفزدہ ہونا ضروری ہے۔ تقریباً تمام مسافر سہم گئے تھے کہ کنڈیکٹر نے کہا۔ ”آپ لوگ فکر مند نہ ہوں۔ وہ سامنے جو روشنی دیکھ رہے ہیں وہاں سیلانی کا ہوٹل ہے۔ سیلانی سائیں، بہت اچھا بندہ ہے۔ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

ہم سب اس ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ ہوٹل ابھی دور تھا کہ مرزا غالب کی غزل سنائی دی۔ کوئی بڑی ذربھری آواز میں گارہا تھا۔ میں نے قدم تیز کر دیے کیونکہ مجھے یونیورسٹی کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ یونیورسٹی کا زمانہ اس لیے بھی یادگار ہے کہ اس دوران اچھے اچھے دوست ملے، جن کے ساتھ گزارے گئے حسین لمحات آج تک روح کو تازگی بخشتے ہیں، وہ شاعری کی مجلسیں، وہ کیفے ٹیریا میں چائے کی ٹیبل پر گرم مہمانوں کی مجلسیں، وہ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے مستقبل بنانے عملی زندگی میں قدم رکھ چکے تھے۔

لیکن میں خاص طور پر فیروز کو نہیں بھول سکتا جو کہ شاعری کا شوقین تھا، خصوصاً مرزا غالب کی تو شاعری کا بے حد دیوانہ تھا، غالب کی ہر غزل اسے یاد آتی اور پھر اس کی جادو بھری آواز، جس میں جب بھی وہ کوئی غزل گاتا، تو سبھی مدھوش ہو کر سنا کرتے تھے۔
دل ناواں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٹی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی واہ وا، ماحول کو اور بھی گرا رہی تھی، اور فیروز غزل اپنی دل کو بھائی آواز میں گارہا تھا۔ میں بھی انہی اسٹوڈنٹس کی طرح اس کا مداح تھا لیکن اس کا دوست بھی تھا اور میری اس سے دوستی کی وجہ اس کی سادہ طبیعت تھی، اس میں کسی قسم کی چالاکی اور آج کل کے لوگوں کی طرح مبالغہ پرستی نہیں تھی۔

اسی طرح موسم کے حوالے سے مرزا غالب کی پوری غزلیں فیروز کو یاد آئیں، اور ہر موسم اور موقع کی مناسبت سے وہ غزل سنایا کرتا تھا۔

آج بھی موسم خوشگوار تھا، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی ہموار پڑ رہی تھی، اور فیروز یونیورسٹی کے پارک میں گھاس پر بیٹھا، مرزا غالب کی غزل گارہا تھا، اسٹوڈنٹس اس کے ارد گرد بیٹھے تھے، واہ وا، کیا آواز پائی ہے، تمام طلباء ہی اس کی غزل مرانی کو پسند کر رہے تھے۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب،
تماشاے اہل کرم دیکھتے ہیں
جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں



تھا، البتہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی غزل سرائی کی صلاحیت اور دلوں کو چھو لینے والی آواز تھی۔ مرزا غالب کی شاعری سے تو جیسے اسے عشق تھا۔

یہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے جو کہ مفاد پرستوں اور موقع پرستوں سے بھری ہوئی ہے، لوگ دوٹھٹھے بیٹھے بول، بول کر اپنا کام نکالتے ہیں، اور آگے بڑھ جاتے ہیں، میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ کہتا کہ یار تو تو فلاسفر ہے، میرا ذہن تیرے جیسا کہاں۔ یہ دنیا صرف پیسے کی ہے۔

اور میں اسے اکثر سمجھاتا کہ یہ لڑکی مجھے بے وفالگتی ہے، اس کی بھوری آنکھیں بتاتی ہیں کہ یہ تمہارے ساتھ بے وفائی کرے گی۔ لیکن وہ کہتا ابے پاگل، انسان کو خود سوچ ہونا چاہیے، سب اچھے ہوتے ہیں، مگر میں اس کی یہ منطق تسلیم نہیں کرتا۔ پروہ میری باتوں پر ہنس دیتا۔

”کل میری برتھ ڈے ہے، آپ مجھے کیا گفٹ دیں گے، مجھے تو ڈائمنڈ کی انگوٹھی پسند ہے۔“ منل نے کہا۔

فیروز نے اپنی ہانگی کار بیچ کر سستی کار خرید لی اور اسے ڈائمنڈ کی انگوٹھی گفٹ کر دی۔

فیروز آہستہ آہستہ اپنی دولت لٹاتا گیا، لکھال ہوتا گیا۔

میں بنیادی طور پر شاعر تو نہیں، البتہ یہ غزل، مجھے ذاتی طور پر بڑی پسند تھی، اور شاید اسی لیے مجھے یاد بھی ہے، اور میں بھی اکثر اس غزل کو گنگنااتا رہتا ہوں۔ اس دن میں بھی اس غزل کے حسن میں گم ہو گیا تھا لیکن فیروز عرف غالب تو تھا ہی جیسے مرزا غالب کا دیوانہ اور اسے شاعری سے بڑا لگاؤ تھا، اور اس پر اس کی جادو بھری آواز۔

شاعری کا دیوانہ کسی نہ کسی سے متاثر تو ہوتا ہی ہے، ایسا ہی کچھ فیروز کے ساتھ ہوا، منل بھی ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی، فیروز اس کا دیوانہ تھا، وہ اس سے پتا نہیں میرے لیے صرف دل لگی اور ٹائم پاس کا ذریعہ سمجھتی تھی اس کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ منل کو میں ذاتی طور پر بیچ نہیں سمجھتا تھا، کیوں کہ وہ بھی کسی کے ساتھ نظر آتی اور بھی کسی کے ساتھ، خاص طور پر شہزاد نامی ایک وجیہہ نو جوان کے ساتھ بھی دیکھی جاتی تھی۔

میں چونکہ فیروز کا بہت گہرا دوست تھا، اس لیے وہ اپنی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپاتا تھا۔ منل بھی شاید یہ بات جانتی تھی، اس لیے میں بھی منل کو بھی تمہارا ان کے ساتھ بیٹھ جاتا تھا، اگرچہ فیروز کوئی خوش شکل یا گوری رنگت والا نو جوان تو نہیں

لیکن اس معاشرے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی تو ضروری ہے، اس لیے سب کے سامنے وہ یہی ظاہر کرتا کہ ایک امیر کبیر گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ اس کو جو کچھ ورثہ میں اپنے باپ سے ملا تھا، وہ اب آہستہ آہستہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی اس کے والدین اب حیات تو تھے نہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا جو کہ اس کی تعلیم کے اخراجات اٹھاتے تھے اور اسے محدود جب خرچ دیا کرتے تھے۔

اور پھر ایک دن ایسا ہی ہوا، وہ آئی اور فیروز کی زندگی کو طوفان میں مبتلا کر کے چلی گئی۔

”میری Engagement ہے، شارق کے ساتھ اور ایک مہینے بعد ہم شادی کر رہے ہیں اور آسٹریلیا جا رہے ہیں، اس کا برنس وہیں ہے۔ مجھے اس نے میرے گھر والوں سے مانگ لیا ہے۔“ مکمل نے دو ٹوک اسٹائل میں کہا۔ فیروز پر جیسے بجلی کی گرجی ہو، وہ سن ہو کر رہ گیا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

”لیکن تم نے تو میرے ساتھ، جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی ہیں، وعدہ کیا ہے۔“ فیروز نے ہنسنے لگا۔

”لیکن میں اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“ مکمل نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ اسے ایک خوش شکل، پینڈنٹ آدمی جوں کا توں تھا۔ پھر وہ اس کا لے شدی کو اپنی زندگی کا حصہ کیوں بناتی، یہی تو زندگی ہے اور یونیورسٹی لائف ہے، لوگ ملتے ہی رہتے ہیں، فیروز ایک اچھا دوست ضرور ہے، پر چون سا سگھی نہیں ہو سکتا۔ میرا، ہم سبھی میری ہی طرح حسین و جمیل ہونا چاہیے، مکمل کی فیروز کو اپنا چوں سا سگھی نہ بنانے کی وجہ مجھ تک نہیں کسی نہ کسی طرح پہنچ رہی تھی۔ ظاہر ہے یونیورسٹی میں سب کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا اور کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

فیروز جیسے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا، اس کی شاعری اور غزلیں، سب خاموش ہو گئیں وہ ہر وقت کم بزم بٹھا رہتا، ہم سب اسے سمجھاتے لیکن اس کو کسی بل چین نہ آتا تھا۔ پھر ہمارے فائل ٹرم بھی ہو گئے، جیسے تیسے فیروز نے بھی اکٹنا کس میں ماسٹری کی ڈگری حاصل کر لی۔ اس کے گھر والے چاہتے تھے کہ اب وہ جاب کرے، اس مہنگائی کے دور میں ان کا زور بازو دینے۔

اسے اس کے بھائیوں کی کوشش سے ایک جاب تو مل گئی، لیکن جاب میں بھی اس کا دل نہ لگا، یہاں تک کہ اس سے اپنے دیے گئے assignment میں غلطیاں ہونے

لگیں، اور پھر ایک دن اسے کمپنی کے ڈائریکٹر نے اپنے کمرے میں طلب کیا اور سخت لہجے میں کہا، مسٹر فیروز، بہت ہو گیا، ہم آپ کو ایک لیے عرصے سے برداشت کر رہے ہیں، آپ کی غلطیوں کی وجہ سے ہماری کمپنی کو نقصان پہنچ رہا ہے مجھے لگتا ہے کہ آپ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے ذہنی اور جسمانی طور پر فٹ ہوں اور اس کے بعد کوئی جاب کریں، اس لیے ہم آپ کو اس جاب سے Terminate کرتے ہیں۔

فیروز نے اپنی صفائی پیش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن سب بے سود رہی اور اسے کمپنی سے نکال دیا گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے گھر آ گیا، گھر والوں نے اس کا کوئی خاص خیر مقدم نہیں کیا، اور اسے اپنے اوپر بوجھ سمجھنا شروع کر دیا، ایک تو پہلے ہی اس کے دل پر مکمل کی بے وفائی کا غم تھا، اس پر اسے اس کی نوکری چلی گئی تھی اور پھر اس کے گھر والوں کی جلی گئی باتیں، اس نے ایک رات ایک بیک میں کچھ اپنا ضروری سامان رکھا، اور گھر کو اوداع کہہ کر باہر نکل گیا۔

میں نے اس کے فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا فون بند ملا، جب اس کے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے، گھر والوں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کہیں بھی نہیں ملا۔ صرف ایک پرچہ رکھا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ دل تو میرا اب ٹوٹ گیا ہے، رشتوں پر سے اور صحبتوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ اس لیے میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

وہ کبھی بستی قریہ قریہ گھومتا رہا، کبھی اس شہر، کبھی اس شہر، کبھی یہاں، کبھی وہاں، شاید اس اُمید پر کہ اسے کہیں سے خلوص محبت اور رجا پیار مل جائے، لیکن اُسے تو ہر ایک بے وفا ہی نظر آیا۔ سب مفاد پرست ہیں، برے وقتوں کے لیے اس نے اپنے اکاؤنٹ میں کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی، اسے لی ایم کارڈ اس کے پاس موجود تھا، وہ اپنے پیٹ بھر کے کا سامان اس کے ذریعے تو بکری لیتا تھا۔

کسی نے اسے فقیر سمجھا تو کسی نے کچھ کہیں وہ مزدوروں کے ساتھ کام کرتا، تو بھی سبزی منڈی میں مزدوری کرتا۔

وہ سرواڑا میں بھرتا اپنی کم گشتی محبت کو یاد کرتا جنوں ٹائپ ہو گیا تھا، وہ سلائی کے نام سے مشہور ہو گیا، اس کی آواز اور مرزا غالب کی غزل اس کی پہچان تھی، اور وہ اسے اکثر گاتا رہتا تھا اور جہاں جگہ ملتی سو جاتا، کسی نے کچھ دے دیا تو کھا

کمال احمد رضوی ایک ایسے لکھاری ہیں جو 45 سال سے قلمی زندگی بسر رہے ہیں۔ یہ پاکستانی قلمی زندگی کے ابتدائی لوگوں میں شامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرتی رویوں کا عکس جھلکتا ہے۔ ان کے لکھے ہوئے کردار معاشرے کے عام آدمی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پی ٹی وی سے نشر ہونے والا مشہور ڈراما ”الف لون“ آج بھی لوگوں کے ذہن میں نقش ہے۔ کمال احمد رضوی نے انتقال سے کچھ پہلے کہا تھا کہ اب وہ لوگ نہیں رہے جو اس کام کی سمجھ رکھتے تھے۔ اس لیے میں نے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں کچھ تحریریں نہیں کر رہا، میں نے کچھ نئے ڈرامے لکھے ہیں، مستقبل میں کام آئیں گے۔ ان کے خیال میں معاشرہ مادیت پرستی کا شکار ہے۔ کمال احمد رضوی کا کہنا ہے کہ ”مزدور پیشہ ادیب، لکھاری یا اداکار جو بھی کچھ ہوں، اپنی محنت سے بنا ہوں جب کہ بیوروکریسی فنکاروں کو ایسے مواقع چاہئیں۔ بھونکے دور میں طائفے بیرون ممالک بھیجنے کے لیے کئی فنکاروں کو رکھا گیا، اسی طرح پھر جزل مشرف کے دور میں بھی کئی لوگ منتخب کیے گئے جو نون لطفیہ سے متعلق شعبہ جات کی نمائندگی کر سکیں اور جس پر ان کی نظر پڑ جائے اس کی تو دنیا بن گئی، چاہے شجاعت حسین ہوں یا پرویز الہی یا ضیاء الحق الدین ہوں۔ یہ لوگ میری طرح محنت نہیں کر سکتے، میں نے محنت کر کے ایک پروگرام پیش کیا سا لہذا سال وہ پروگرام ٹی وی پر چلتا رہا، اس پروگرام نے دوسروں کے لیے کامیابی کے دروازے کھول دیے۔ وہ اس وقت ٹی وی کی ضرورت تھی لہذا میں نے ”الف لون“ جیسا پروگرام کیا اگر میں نہ کرتا تو کوئی دوسرا نہ کرتا کیونکہ وہ وقت کی ضرورت تھی۔

اقتباس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے
از: خرم سہیل

یہ سندھ کا بانی دے پرواق ایک ہوٹل تھا جہاں پر میری بس خراب ہو گئی تھی۔ ہمیں رات اس ہوٹل میں گزارنا تھی۔ میں بس سے اتر کر اس ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ کئڈیکسٹر چیج چیج کر کہہ رہا تھا۔ بابا ساسی لونگو، بس میں کوئی بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے، ابھی ایک بس پیچھے آ رہی ہے، اس میں ٹیلی والے افراد کو سوار کرادوں گا، بانی جو افراد ہیں، سٹنگل ہیں، انہیں رات ہمیں گزرانا ہوگی، صبح سات بجے سے پہلے کوئی گاڑی نہیں آئے گی۔“

ہم سب ڈرائیور اور کوچ سروس والوں کو برا بھلا کہتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ شہیاری کے قریب فیشل ہائی وے پر موجود اس ہوٹل میں ہم رات گزارنے پر مجبور تھے۔

ہوٹل کا مالک ایک صوفی ٹائپ آدمی لگ رہا تھا، بڑے بڑے بال، دائرہی کھنڈی ٹائپ، سر پر ٹوپی، ہاتھ میں گٹار، پھر اس نے گانا شروع کیا۔ بہت سے لوگ چار پائیوں پر اس کے ارد گرد بیٹھے تھے، واہ سائیں واہ، کیا آواز پائی ہے، اور کیا شاعری ہے، لوگ لہک لہک کر داد دے رہے تھے۔ میں بھی ایک چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اور غزل سننے لگا، اور یہ آواز مجھے کچھ شناسائی تھی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یا رہوتا
اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا
یہ آواز تو میں نے خاصی میں کہیں سنی ہے، پھر مجھے فیروز
تھا، اس کی غزل سرائی یاد آگئی، یہ تو فیروز کی آواز ہے، خیر میں
نے پوری غزل سنی ، اور دوسری غزلیں بھی۔ پھر میں اس کے
قریب پہنچ کر بولا۔ ”تم فیروز ہوتا؟“
اس نے اپنے چہرے کو اوپر اٹھایا۔ ”ہاں ہاں، لیکن تم
کون ہو..... نہیں۔“ وہ اچانک چونک کر بولا۔ ”میں فیروز نہیں
ہوں۔“

”یار چھاؤنیوں، میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ یہ تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے۔“

پھر اس نے شہنشاہی سانس لے کر کہا۔ ”یار حسن، تم۔۔۔“

”میرے جگری دوست ہو، آؤ مگر میں چلیں، وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا، اور نیل بجا کر ویز کچا کے آؤر دیا۔“

”تمہیں کتنا ڈھونڈنا مگر تم مل کر نہ دیئے۔ میرا دل نکلنے لگا۔ ایسا تو کہ میں پاگل سا ہو گیا تھا کسی کام میں دل نہ لگا۔“

”میری بھی نکال دیا مگر۔۔۔ درود دھکے کھاتا رہا، سلاٹوں کی

مدد کرنے لگا۔

حفیظ بھائی میری شاعری اور غزل سرائی کے دلدادہ تھے، وہ مرزا غالب کی غزلیں ضرور سنتے اور یہ غزل تو میں روز ان کی فرمائش پر گایا کرتا تھا۔ میری غزل سرائی سن کر بھی لوگ یہاں آتے ہیں۔

ایک سال بعد سردی کے موسم میں ان پر فاق کا حملہ ہوا اور وہ مفلوج ہو کر رہ گئے، میں نے ان کی بہت خدمت کی، ان کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتا، ہاتھ منہ دھلاتا، اور مرزا غالب کی غزلیں سناتا، انہوں نے ایک دن وکیل کو بلوا کر وصیت نامہ تیار کروایا اور اپنا سب کچھ میرے نام کر گئے، جو ہوٹل جس میں ہم بیٹھے ہیں ان ہی کا دیوا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کا انتقال ہوا ہے، مجھے ایسا لگا کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا، میں ایک مرتبہ پھر اکیلا ہو گیا لیکن پیٹ کا جتھم بھرنے کے لیے تو روز گار کی فکر ضروری ہے نہ میرے دوست؟“ اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”اس لیے میں نے یہ ہوٹل مکمل طور پر سنبھال لیا ہے لیکن غزل سرائی میری فطرت سے منہ گئی اور آج بھی روزانہ رات کو غزل سرائی کرتا ہوں۔ اور لوگ بھی شاید اسی لئے یہاں آتے ہیں۔“

”سندھ کے گاؤں، اور دیہاتوں میں آج بھی لوگ شام کو کچہری کرتے ہیں، یعنی ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، اپنے دکھ دردوں کو share کرتے ہیں، اس لیے مجھے یہ ماحول بہت پسند ہے، میں بھی لوگوں کی باتیں اور ان کے واقعات سنتا ہوں، اور رات گئے یہ لوگ مجھ سے غزل سرائی کی فرمائش کرتے ہیں، جو کہ میں پوری کرتا ہوں۔ میرے ہوٹل پر اسی لیے زیادہ تعداد میں لوگ آتے ہیں، میں سیلانی کے نام سے یہاں پر مشہور ہوں۔ اب یہی میری زندگی ہے۔“

”تم نے شادی نہیں کی؟“

”ہاں یار میں نے گاؤں کی ہی ایک سادہ اور اچھے گھرانے کی عورت سے شادی کر لی ہے، جس سے میرے ۱۱ بچے بھی ہیں۔ میں اپنی فیملی کے ساتھ اس ماحول میں اپنے آپ کو نہایت پرسکون محسوس کرتا ہوں۔“

میں فیروز کی داستان سن کر بہت خوش تھا کہ وہ زندہ ہے اور ایک خوشحال اور مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔

طرح شہر شہر قریہ کھومتا رہا۔ میری ماں تو تھی ہی نہیں، بچپن میں ہی مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی، باپ بھی کچھ عرصہ پہلے انتقال کر چکا تھا صرف بھائی تھے انہوں نے مجھے کہا کہ میاں کچھ کرو گے تو ہمارے ساتھ رہ سکو گے، ان عاشقی معشوقی کے چکر سے نکلو اور کچھ کام کاج کرو، ہم ویسے بھی ایک اونچی سوسائٹی کے فرد ہیں۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا اور جب روز بروز گھر میں تنخیاں بڑھنے لگیں تو ایک رات گھر سے کچھ پیسے لیے جو کہ میں نے بڑے وقتوں کے لیے جمع کر رکھے تھے۔ ایک بیگ لیا اور گھر سے نکل پڑا۔ قریہ قریہ بستی بستی، سیلانی کی طرح کھومتا رہا۔

پھر ایک دن میرا اکاؤنٹ بھی خالی ہو گیا، میرا بھوک کے مارے برا حال تھا، میں نے خودکشی کرنے کی ٹھانی، وہیں قریب دریا نظر آیا تو سوچا کہ اپنی جان اس پانی کے حوالے کر دوں، دنیا کے دکھوں سے دور چلا جاؤں، اس مقصد کے لیے میں نے دریا کے سندھ کے پل پر پہنچا اور آدو یکھانہ تاؤ، سیدھا دریا میں چھلانگ لگا دی۔

لیکن میری قسمت میں تو شاید کچھ اور ہی لکھا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک کمرے میں لیٹا ہوا تھا، یہ حفیظ بھائی کا گھر تھا۔ حفیظ بھائی ایک انسان دوست آدمی تھے۔ وہاں ایک کشتی میں حفیظ بھائی جن کی دیوار پر تصویر دیکھ رہے ہو، بیٹھے ہوئے تھے، وہ پچھلی کے شکار کے شوقین تھے اور ایک ماہر تیراک بھی تھے، انہوں نے مجھے دریا میں گرتے ہوئے دیکھ لیا اور شور مچا دیا، خود بھی دریا میں چھلانگ لگا دی اور میری جان بچائی۔

پھر کسی نہ کسی طرح مجھے کشتی میں ڈال لیا اور پیٹ کو دبایا تو مجھے ابکا نیاں آئیں اور تھوڑی ہی دیر میں میری طبیعت بحال ہو گئی مجھے ہوش آ گیا۔

”او بھائی زندگی اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے، کیوں اسے ضائع کر رہے تھے۔“ حفیظ بھائی نے کہا۔

”میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ہر ایک نے میرے ساتھ بے وفا کی، اور گھر والے بھی مٹلی نکلے۔“

”تم تو یار مجھے اپنی طرح کے آزاد منش لگتے ہو، چلو میرے ساتھ، میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ اکیلا ہوں، ہائی وے کے کنارے ایک ہوٹل ہے، وہ چلاتا ہوں اور آرام سے زندگی گزارتا ہوں۔“

پھر میں حفیظ بھائی کے ساتھ رہنے لگا اور ہوٹل پر ان کی

محترم معراج رسول
السلام علیکم

اس سچ بیانی میں سب کچھ سچ ہے صرف نام اور مقام بدلا ہوا ہے۔
امید ہے کہ یہ سچ بیانی آپ کے معیار پر پوری اترے گی اس یقین کی
وجہ میرے ساتھ پیش آئے واقعات ہیں جو ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

ذوالفقار
(لاہور)

طوبی میری اکلوتی بیٹی ہے اور میں اس سے بے پناہ
محبت کرتا ہوں۔ ویسے یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے۔ سچی
والدین اپنی اولاد سے اسی طرح محبت کرتے ہیں اگر ان کے
دس بچے ہوں تب بھی ان کے دل میں ہر ایک کے لیے ایک
جیسے جذبات ہوتے ہیں۔ وہ ان کی ہر خوشی میں خوش اور ہر
تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن طوبی سے میری محبت ان کے
مقابلے بالکل منفرد اور مختلف ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ
ہماری اکلوتی اولاد ہے اور دوسرے یہ کہ شادی کے دس سال



بعد ہمارے گھر آئی۔ اسی لیے وہ میری آنکھوں کی خندک اور دل کا چین ہے۔ اس کے آنے سے میرے آنکھن کا سونا پن دور ہو گیا۔ ورنہ ہم دونوں میاں بیوی ساری زندگی اولاد کے لیے ترستے رہتے۔

فوزیہ میری بچپن کی محبت تھی۔ وہ میری چچا زاد تھی اور شرور سے ہی ہمارے درمیان ایک خاص حلق قائم ہو گیا تھا۔ ابو اور چچا جان میں بہت محبت تھی۔ اس لیے دونوں گھروں میں آنا جانا لگا رہتا۔ ایک اتوار ہم لوگ ان کے گھر آتے اور ایک اتوار چچا کی فیملی ہمارے گھر آ جاتی۔ خوب رونق رہتی۔ اچھے اچھے کھانے کیتے وی سی آر فرمیں دیکھی جاتیں یا پھر کیرم اور لوڈ کی محفل جیتی۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا اسی لیے میں پہلے ہی ویڈیو شاپ سے فلمیں لے آتا لیکن فوزیہ کو فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسے رسالے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں جب بھی وی سی آر فرم لگاتا، وہ جھلا کر کہتی۔ ”سیچ! ہم یہاں فلمیں دیکھنے نہیں آتے۔ اگر تمہیں فلم دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو مجھے کوئی رسالہ دے دو۔ میں دوسرے کمرے میں جا کر پڑھ لوں گی۔“

میں اسے ناراض نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی وی سی آر بند کر دیتا۔ پھر میں نے فلمیں لانا بند کر دیں۔ وہ مجھ سے رسالے مانگ کر لے جاتی اور پڑھنے کے بعد واپس کر دیتی۔ اس طرح ہمارے درمیان ادنی گفتگو ہونے لگی۔ مجھے فلموں کے علاوہ کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہم دونوں ہی کرکٹ کے شوقین تھے۔ جب ٹیلی وژن پر بیچ آ رہا ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر بیچ دیکھتے اور اس پر تبصرہ بھی کرتے جاتے۔ بچپن سے نکل کر جوانی کی حدود میں داخل ہوئے جب بھی ویسی ہی انسیت اور بے تکلفی برقرار رہی۔ حالانکہ اس کے دوسرے کزن بھی تھے۔ ماموں زاد، خالہ زاد لیکن وہ کسی کو مزہ نہیں لگاتی اور پڑھائی کا بہانہ کر کے کمرے میں محسوس رہتی۔ وہ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی۔ اس کے پاس موضوعات کی کمی نہیں تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات کر سکتی تھی۔ ادب، فلم، ٹیلی وژن، کھیل اور سیاست جب کہ مجھے کھونٹے پھرنے اور کھیلنے کو دینے کے علاوہ کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے میں اس کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ بحث یا اختلاف کی محو کاش نہیں تھی کیونکہ میرے پاس اتنا علم ہی نہیں تھا کہ اسے قائل کرتا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔

وہ اپنی ہر بات مجھ پر مسلط کرتی اور مجھے مجبور کرتی کہ

میں من و عن اسے تسلیم کر لوں۔ بعض اوقات دل چاہتا کہ صاف انکار کر دوں لیکن پھر اس کی ناراضی کے ڈر سے سر تسلیم خم کر لیتا۔ میری تعلیم ملل ہونے والی تھی کہ چانک میں اسے پسند کرنے لگا اور میرے دل میں اسے اپنانے کی خواہش جاگ اٹھی لیکن اس کا اظہار کرنا آسان نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر اسے منانا بہت مشکل ہو جائے گا۔ وہ کبھی اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرے گی۔ چنانچہ میں نے دوسرے طریقے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچا۔

اتفاق سے انہی دنوں میری بڑی بہن نہت کی شادی ہوئی تو اسی کو گھر میں ایک فرد کی محسوس ہونے لگی۔ ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بولیں۔ ”نو کری لگ جائے تو سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں۔ نہت کے جانے سے گھر بہت سونا سونا لگ رہا ہے۔“

”ارے ای، یہ تو میرے کھیلنے کو دینے کے دن ہیں۔ ابھی سے آپ پر میری شادی کی فکر کیوں سوار ہو گئی؟“

”فضول باتیں مت کرو۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اچھا ہے۔ جلدی شادی ہو جائے گی تو بچوں کے فرائض سے بھی جلد ہی سبکدوش ہو جاؤ گے اور بڑھاپا آرام سے گزرے گا۔“

”میری نو کری تو لگ جانے دیں۔“ میں نے مصنوعی احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی لگ جائے گی۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔

”اور ابھی کون سا شادی کر رہی ہوں۔ پہلے بات تو یہی ہو جائے۔ پھر سال دو سال بعد شادی بھی ہو جائے گی اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو۔“

میں نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ ”میں..... میں..... میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے کیا پتا؟“

”دیکھو بیٹا میری نظر میں یوں تو کسی لڑکیاں ہیں لیکن میں تم پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے تم سے پوچھ رہی ہوں کہ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتا دو۔ اس میں شرمنا ہے یا سمجھنے والی کوئی بات نہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”آپ چچا کے گھر چلی جائیں۔“

”کیا؟“ وہ چوہکتے ہوئے بولیں۔ ”تم فوزیہ کی بات کر رہے ہو؟“

”میرا خیال ہے کہ ان کی ایک ہی لڑکی ہے فوزیہ۔ میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔“

”یا اللہ تبارک و تعالیٰ“ وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولیں۔
”سچ پوچھو تو میری بھی یہی خواہش تھی۔ تم نے میرا کام آسان کر دیا۔“

مجھے یقین تھا کہ چچا کو یہ رشتہ قبول کرنے میں کوئی جھجک نہ ہوگی اور فوزیہ بھی والدین کی مرضی کے سامنے سر جھکا دے گی۔ اس کے پاس بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی لیکن اگر میں اس سے براہ راست بات کرتا تو اس سے کوئی بعید نہیں تھا اور وہ اپنی عادت کے مطابق فلسفہ جھانسنے بیٹھ جاتی۔ مثلاً یہی کہ ہم اچھے دوست ہیں اور میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا وغیرہ وغیرہ لیکن اگر اسی رشتہ لے کر جاتیں تو وہ ایسی باتیں نہیں کر سکتی تھی۔

نتیجہ میری توقع کے عین مطابق آیا اور چچا جان نے میرا رشتہ قبول کر لیا۔ فوزیہ خالصتاً مشرئی لڑکی تھی۔ اس نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا اور والدین کے فیصلے پر راضی ہو گئی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر سچ و تاب کھا رہی ہوگی۔ رات کو اس کا فون آیا تو وہ خامسے غصے میں لگ رہی تھی۔
”آپ کو اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے کم از کم مجھ سے تو بات کرنی چاہیے تھی۔“

وہ ایک دم ہی تم سے آپ پر آگئی تھی۔ اس پر مجھے تھوڑی سی حیرت اور خوشی بھی ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے مجھے اپنے منگیتر اور ہونے والے مجازی خدا کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”در اصل سب کچھ اتنی جلدی میں ہوا کہ تم سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔“
”ایسی کیا جلدی تھی۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔“

”در اصل بات یہ ہے کہ امی کو اچانک ہی میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ میں نے انہیں ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ یہی کہتی رہیں کہ زہرہ کے جانے کے بعد گھر سوتا سوتا لگ رہا ہے۔ اس لیے وہ میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ تمہیں اپنی بہو مانا چاہ رہی ہیں۔“

”انہوں نے آپ کی مرضی معلوم نہیں کی؟“
”نہیں بس رسا پوچھا کہ مجھے کوئی اعتراض تو نہیں۔ اس پر میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ اعتراض تو اس وقت کرتا جب تم کسی کوئی غامض ہوتی۔“

”گو یا اب اس رشتے پر اس لیے تیار ہو گئے کہ مجھ میں کوئی غامض نہیں ہے۔“ وہ حسب عادت بحث پر اتر آئی۔

”ورنہ آپ کے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔“
”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے لوگوں کی پریم کہانی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔“
”یعنی آپ شادی کے بعد مجھ سے محبت کریں گے۔“
”ایسا ہی سمجھ لو۔“

”اور اس وقت تک میں کیا کروں گی؟“
”اس محبت کا انتظار۔“ میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔
”باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔“ وہ کلکھلا کر ہنس دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”اچھا ہوا کہ آپ نے تانگی جان والا روٹ استعمال کیا اگر براہ راست مجھے پر پوز کرتے تو شاید میں انکار کر دیتی۔“

میں اس کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کتنی جلدی وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی تھی لیکن اس کے بعد اس نے جو کچھ کہا وہ میرے لیے پریشان کن تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا تم مجھے پسند نہیں کرتیں؟“
”نہیں یہ بات نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ میں اپنے ماں باپ کے بعد سب سے زیادہ آپ کو ہی پسند کرتی ہوں۔ آپ ایک اچھے دوست اور کزن ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنا بھائی سمجھا اور کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔“

”اوہ“ میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے ممکنہ انکار کی کوئی ایسی وجہ نہیں تھی جو میں پریشان ہو جاتا۔ میں نے کہا۔ ”جس کام کی اجازت مذہب اور معاشرہ دیتا ہے۔ اس پر ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ویسے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ شادی کے بعد بھی دوست اور کزن کا کردار نبھاتا رہوں گا۔“

”اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔“ وہ ایک بار پھر آپ سے تم پر آگئی۔ ”اگر شوہر بن کر حکم چلانے کی کوشش کی تو نقصان میں رہو گے۔ میں کسی کے رعب میں آنے والی نہیں ہوں۔“

فوزیہ سے رشتہ ہو جانے کے بعد میں نے چچا کے گھر جانا کم کر دیا تھا۔ ویسے بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ پہلے کی طرح میرے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں نہیں کرتی تھی۔ بس لمحہ بھر کے لیے میرے سامنے آتی اور سلام کر کے چلی جاتی۔ امی بھی اشاروں اشاروں میں کہہ چکی تھیں کہ اب میرا چچا کے گھر زیادہ جانا ٹھیک نہیں۔ اس کا کل ہم نے یہ نکالا کہ رات کو فون پر باتیں کرنے لگے۔ وہ انتہائی غیر رومانی لڑکی

ہوئی مہنگائی کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ ابھی تو ہم دو ہیں۔ مگر بھی اپنا ہے۔ کل کو بیچے ہوں گے تو اخراجات بھی بڑھیں گے پھر اس محدود تنخواہ میں گزارہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔“

”بات تو ٹھیک ہے لیکن کاروبار کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟“

”ضروری نہیں کہ آپ کوئی لمبا چوڑا کاروبار کریں۔ کم سرمایہ سے بھی کام شروع کیا جاسکتا ہے۔“

”پھر بھی چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے لاکھوں چاہئیں۔“

”سب ہو جائے گا۔ آپ ایک بار ہائی تو بھریں۔“

”کیسے ہو جائے گا۔“ میں نے سمجھلاتے ہوئے کہا۔

”میرے اکاؤنٹ میں تو دو چار لاکھ ہی ہوں گے۔“

”چلیں اچھا ہوا کہ آپ نے بتا دیا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ میرا پلان بھی سن لیں۔ میرے پاس جو زیور ہے۔ اس کی مالیت کم از کم دس لاکھ تو ہوگی۔ وہ ہم بینک میں گروی رکھ دیں گے۔ اس کے بعد بھی اگر ضرورت ہوئی تو میں ابوسے مانگ لوں گی۔ آخر ان کی دولت میں میرا بھی تو حصہ ہے۔“

میں قرض ادھار کے سخت خلاف ہوں لیکن فوزیہ کی بات بھی صحیح تھی۔ چند سالوں بعد تنخواہ میں گزارہ مشکل ہو جاتا۔ اس لیے میں نے اس کے منصوبے سے اتفاق کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا کام شروع کیا جائے۔ فوزیہ نے گارمنٹس کا کاروبار تجویز کیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کام سارا سال چلتا ہے اور عید پر تعمیر پر تو ان لوگوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ مجھے کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کام کی ابتداء کیسے کی جائے۔ فوزیہ نے بتایا کہ اس کی ایک سہیلی کا شوہر یہ کام کرتا ہے۔ ہم اس سے ملتے ہیں۔ وہی ہمیں گائیڈ کرے گا۔

سہیل بہت قلعس اور تعاون کرنے والا شخص تھا۔ اس نے کہا کہ کسی مناسب جگہ پر ایک دکان کا بندوبست کر لوں۔ وہ اپنے کارخانہ میں تیار کردہ ملبوسات وہاں رکھوا دے گا اور اگر میں اپنے طور پر ملبوسات بنواتا چاہوں تو وہ تین مہینے کے کریڈٹ پر ٹھوک مار کیٹ سے پکڑا دلوا سکتا ہے اور ٹھیکے پر سلائی کا کام کرنے والے کارمکروں کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں خود اپنے ملبوسات بنوا کر بیچوں تو زیادہ فائدہ ہوگا اور اگر ایک سپورٹ کی طرف آ جاؤں تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ میں اتنے لمبے چوڑے بھیلے

تھی اور فون پر بھی کوئی بحث چھیڑ کر بیٹھ جاتی جب کہ میں چاہتا تھا کہ وہ میری پیار بھری باتوں پر شرمائے۔ بجائے، غرے دکھائے وغیرہ لیکن لگتا تھا کہ رومانوئیت اس کے قریب سے ہو کر نہیں گزری۔ بعض اوقات تو میرا بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی جب آپ کسی کو اپنا بناتے ہیں تو اسے اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا ہوتا ہے۔

تھوڑی سی تنگ دود کے بعد مجھے ملازمت مل گئی اور اسی نے زور و شور سے شادی کی تیاری شروع کر دی اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب فوزیہ دہن بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ پہلی رات ہی اس نے انکشاف کیا کہ وہ ہمیشہ سے ہی مجھے چاہتی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ زندگی کا سفر ہم مل کر طے کریں۔ میں یہ بات سن کر حیران رہ گیا اور یولا نے ”پھر تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ مجھے صرف ایک دوست اور کرزن سمجھتی ہو۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔“

”وہ تو میں نے آپ کو چھیڑنے کے لیے کہا تھا اگر فوراً اقرار کر لیتی تو آپ پھول کر کہا ہو جاتے۔“

میں جواب میں کچھ کہتا تو ایک لمبی بحث شروع ہو جاتی اور میں اس یادگار رات کو اس کی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ”آج سے ہم اپنی محبت کی انک شروع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ صبح کے اختتام پر دونوں ہی ناٹ آؤٹ واپس جائیں گے۔“

”بشرطیکہ کوئی فاول پلے نہ ہو۔“ وہ میرے سینے پر اپنا سر رکھتے ہوئے بولی۔

فوزیہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے زندگی کا ہر سکھ دیا۔ شادی کے فوراً بعد اس نے پورا گھر سنبھال لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب گھر والے اپنے ہر کام کے لیے اس کے محتاج ہو گئے۔ وہ نہ صرف گھر کا پورا کام کرنی بلکہ باہر کے مسئلے بھی نمنائی۔ بلوں کی ادائیگی، مینے کا سودا سلف لانا، گوشت سبزی اور ناشتے کا سامان لانا اور گھر کے کاموں کے لیے پبلر ایکسٹرین کے پیچھے بھاگنا۔ یہ سارے کام اس نے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ وہ ایک سکھ بیوی ہی نہیں بلکہ ہوشیار منتظم اور میری مشیر بھی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں اس نے مشورہ دیا کہ مجھے ملازمت چھوڑ کر کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے۔ میں اس کا منہ دیکھنے لگا تو وہ بولی۔ ”دیکھیں نا، ملازمت میں تو لگی ہندی تنخواہ ملتی ہے اور اگر سال بعد تنخواہ بہت اضافہ ہوا تو وہ بڑھتی

آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے۔ ”برادر! اس میدان میں نئے ہو اور تمہیں کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ میرا... فرض بنتا ہے کہ تمہیں دوچار بنیادی باتیں سمجھا دوں۔“

”جی فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔“

”دیکھو میاں یہ جو تم نے سستے داموں مال بیچنے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے وقتی طور پر تو تمہاری تھوڑی بہت سیل بڑھ جائے گی لیکن آگے چل کر یہ چیز تمہارے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

”میرا خیال ہے کہ دکان کے اخراجات پر تمہاری نظر نہیں ہے۔ تم صرف یہ دیکھ رہے ہو کہ کتنے میں مال خریدا اور کتنے میں بیچا۔ دیگر اخراجات کا تم نے کوئی حساب نہیں لگایا جن میں دکان کا کرایہ، بجلی اور ٹیلی فون کے بل، انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، ایسوسی ایشن کا چندہ، ٹرانسپورٹ کے اخراجات وغیرہ شامل ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہاری وجہ سے ہماری مارکیٹ خراب ہو رہی ہے۔“

”تو آپ بھی اپنی چیزوں کی قیمتیں کم کر دیں۔“ میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا۔

”اس میں دو مسئلے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم یہ افورڈ نہیں کر سکتے۔ میری دکان پر دس سیلز مین ہیں۔ قیمتیں کم ہیں تو انہیں تنخواہ کہاں سے دوں گا۔ اس کے علاوہ اور بھی اخراجات ہیں۔ وہ سب دکان کی آمدنی سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ گا ہک کی نفسیات کو نہیں سمجھتے۔ وہ سستی چیز کو غیر معیاری اور مہنگی چیز خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہے اور وہ فخریہ انداز میں اپنے ملنے جلنے والوں کو اس کی قیمت بتاتے ہیں آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”جی بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”پہلی کہ آپ یہ لوٹ سیل بند کریں اور قیمتوں کو مناسب سطح پر لے کر آئیں تاکہ دوسرے دکانداروں کا کاروبار متاثر نہ ہو۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟“ میں نے جیسے لہجے میں کہا۔

”تو اس کے نتائج بہت سنگین ہوں گے۔ پہلے مر طے

میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا کہ فی الحال وہ اپنے کارخانے کا تیار کردہ مال ہمیں دیتا رہے۔ پانی کام بعد میں دیکھ جائیں گے۔

تھوڑی سی تک دود کے بعد ہمیں حیدری کے علاقے میں ایک مناسب دکان مل گئی۔ اس کے ایڈوانس اور ترکین و آرائش پر کافی پیسے لگے گئے لیکن سکیل کے تعاون کی وجہ سے ہمیں سامان کی خریداری پر کچھ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ اس نے کافی مقدار میں شلوار قمیص کے سوٹ، مردانہ قمیص، چٹونیں اور جینز وغیرہ میری دکان میں رکھوا دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر میں کسی دوسرے کارخانے کا مال بھی اپنی دکان پر رکھنا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سوچنے لگا کہ فی الحال یہی مال نکل جائے تو بہت ہے کیونکہ اس علاقے میں پہلے سے ہی مردانہ گارمنٹس کی کئی چھوٹی بڑی دکانیں موجود تھیں۔ جہاں گا ہکوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان کے مقابلے میں میری دکان بہت چھوٹی اور گلی کے اندر تھی جہاں کوئی بھولا بھلا گا ہک ہی آ سکتا تھا۔ پہلے تین دن کوئی نہیں آیا تو میرا دل ڈرنے لگا اور مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں سیلز مینوں کو تنخواہ بھی اپنے پاس سے نہ دینی پڑ جائے۔ میں نے فوراً یہ کو یہ پریشانی بتائی تو وہ بولی۔

”کاروبار میں صبر اور انتظار کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ مارکیٹ میں بیٹھے ہیں کسی جنگل میں نہیں۔ گا ہک آئیں گے اور اسنے آئیں گے کہ آپ سے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔“

اس کی بات درست نکلی۔ اگلے روز دس سوٹ فروخت ہوئے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور آہستہ آہستہ گا ہکوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں نے سیل بڑھانے کے لیے قیمتیں کم کر دیں اور معمولی منافع پر مال بیچنے لگا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کا کچھ اور بھی نتیجہ نکلے گا۔ دکان شروع ہوئے ابھی چندہ میں دن ہی ہوئے تھے کہ ایک باریش صاحب میرے پاس آئے۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام حاجی منظور ہے اور میں روڈ پر چوٹی گارمنٹس میری ہی ہے۔“

میں نے وہ دکان دیکھ رکھی تھی۔ وہ بہت بڑی تھی اور وہاں آٹھ دس سیلز مین کام کرتے تھے۔ میں حاجی صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں انہیں دکان کے عقبی حصے میں لے گیا جہاں بیٹھ کر میں حساب کتاب کیا کرتا تھا۔ میں نے ان کے لیے کولڈ ڈرنک منگوائی اور پوچھا۔ ”فرمائیے میں

میں آپ کا سوشل بائیکاٹ کیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ آپ
سے دکان بھی خالی کر دالی جائے۔“
ان کی دھمکی سن کر میں سہم گیا اور آہستہ سے بولا۔
”ٹھیک ہے حاجی صاحب کو شش کروں گا کہ آپ کی توقعات
پوری کر سکوں۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے سہیل کو فون کر کے
ساری بات بتائی تو وہ بولا۔ ”وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
”کیا مطلب؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولا۔

”ان کی دونوں باتیں صحیح ہیں۔ اس لوٹ سیل کی وجہ
سے تمہارے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اپنے
باس سے کچھ دینا پڑ جائے اور وہ یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ
گاہک سستی چیزوں کو غیر معیاری سمجھتے ہیں۔ اگر تم اسی طرح
کم منافع پر چیزیں بیچتے رہے تو گاہک تمہاری دکان پر آنا
چھوڑ دیں گے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”اسی قیمت پر مال فروخت کرو جس پر دوسرے
دکاندار بیچ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دو چار گاہک
لوٹ جائیں لیکن مجموعی طور پر تم فائدہ میں رہو گے۔ ویسے بھی
دریا میں رہ کر مگر مجھ سے بھر رکھنا کوئی عقل مندی نہیں۔“
”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”حاجی صاحب مارکیٹ یونین کے صدر بھی ہیں۔ ان
کی مخالفت مول لینا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ان
کے مشورہ پر عمل کرو۔“

میں نے وہی کیا جو حاجی صاحب چاہتے تھے۔ میرا
خیال تھا کہ اس سے میری سیل متاثر ہوگی لیکن کچھ بھی نہیں
ہوا۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ پہلے لوگ چیزیں خریدتے وقت بھاؤ
تاؤ کیا کرتے تھے لیکن اب وہ منہ مافی قیمت دے کر اپنی پسند
کی چیز لے جاتے۔ میری دکان دن بدن ترقی کر رہی تھی۔
ایک سال بعد میں نے سہیل کے مشورہ پر اپنا مال تیار کروانا
شروع کر دیا۔ اب میں اس پوزیشن میں آچکا تھا کہ مجھے
مارکیٹ سے ادھار پٹنرا خریدنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سہیل
نے چند کاریگروں کا انتظام کر دیا تھا جو ٹھیکے پر سلائی کا کام
کرتے تھے۔ میں نے ایک پروڈازر رکھ لیا تھا جو مارکیٹ
سے کپڑا اٹھا کر کاریگروں کے اڈے تک پہنچاتا اور وہاں سے
تیار مال لے کر دکان پر آ جاتا۔ اس کام میں مجھے بہت فائدہ
ہوا اور صرف پانچ سال کے عرصے میں ایک چھوٹی سی
گارمنٹ فیکٹری کا مالک بن گیا۔

اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود زندگی میں ایک کی
شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ ہماری شادی کو کچھ سال سے
زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے
محروم تھے۔ امی ابو پوتے کو کھلانے کی حسرت لیے اس دنیا
سے رخصت ہو گئے۔ فوزیہ کے میکے میں بھی کوئی نہیں رہا۔ چچا
چچی کا انتقال ہو چکا تھا اور بہن بھائی اپنی دنیا میں مگن تھے۔
شروع کے دو تین سال تو ہم نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن پھر
آہستہ آہستہ یہ احساس شدت اختیار کرنا گیا۔ ہم دونوں نے
اپنا طبی معائنے کروایا لیکن کسی میں کوئی نقص نہیں تھا اور ہم اولاد
پیدا کرنے کے قابل تھے بس اوپر سے ہی دیر ہو رہی تھی۔

میں تو اپنی قسمت پر صابر شاکر تھا لیکن فوزیہ سے یہ کی
برداشت نہیں ہو رہی تھی اور بھی کبھی تو اس کا یہ احساس جنون
کی حد کو چھونے لگتا۔ وہ بات بات پر مجھ سے لڑتی اور کہتی۔
”مجھے بچہ چاہیے، ہر قیمت پر۔ کہیں سے بھی لے کر آؤ۔ میں
کچھ نہیں جانتی۔ مجھے بچہ چاہیے۔“ اس کا انداز ایسا تھا جیسے
بچے بازار میں ملتے ہیں اور میں نجوی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
بچہ لانے سے گریز کر رہا ہوں۔

میں جب بھی اسے کوئی نیا آرڈر ملنے کی خبر سناتا یا مجھے
کسی سودے میں منافع ہوتا تو وہ خوش ہونے کی بجائے مجھے
طعنے دینے لگتی۔ ”کس کے لیے جمع کر رہے ہو۔ اپنی دولت
تمہارا کون سا وارث بیٹھا ہوا ہے۔ سب ٹرسٹ کو چلا جائے
گا۔“ اس کی یہ باتیں سن کر میں بھی سوچنے لگ جاتا کہ واقعی
میں یہ سب کس کے لیے کر رہا ہوں۔ محنت میں کروں اور
میرے بعد دوسرے لوگ عیش کریں۔ کبھی کبھی دل ہٹا کہ
سارا کاروبار بند کر کے گھر بیٹھ جاؤں۔ بینک سے ملنے والا
منافع اتنا ہوتا کہ ہم دونوں کا آرام سے گزارہ ہو سکتا تھا لیکن
میری نظر میں چلتے ہوئے کاروبار کو بند کرنا کفران نعمت تھا۔
میں نے ابھی تک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔
مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر ہماری ضرورتی جائے گی۔

جب فوزیہ کا جنون حد سے بڑھ گیا تو میں نے تجویز
پیش کی کہ ہم یتیم خانہ سے کوئی بچہ گوڈ لے لیتے ہیں لیکن وہ
اس پر بھی راضی نہیں ہوئی اور کہنے لگی۔ ”پرایا بچہ کبھی اپنا نہیں
ہو سکتا۔ میں کبھی اسے سگی اولاد جیسی محبت نہیں دے سکوں گی
اور ہر وقت یہی سوچتی رہوں گی کہ کسی غیر کے بچے کو پال رہی
ہوں۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ آپ اسے اپنا نام دے
سکیں گے نہ جایدا میں سے کوئی حصہ۔ پھر ہم کیوں بلاوجہ
اپنے گلے میں ڈھول ڈالیں۔“

پھر ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں دوسری شادی کر لوں شاید اس دوسری عورت کے بطن سے ہمارے گھر میں بہارا آجائے۔ میں نے کہا۔ ”اگر اس سے بھی اولاد نہ ہوئی تو کیا تم مجھے تیسری شادی کا مشورہ دو گی؟“

وہ بولی۔ ”میرا دل کہتا ہے کہ دوسری شادی کر کے آپ ضرور صاحب اولاد ہو جائیں گے۔ ایسی کئی مثالیں ہیں کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوئی لیکن دوسری بیوی سے بچوں کی لائن لگ گئی۔“

”کیا تم اپنے سہاگ میں شراکت برداشت کر لو گی؟“

”ہے تو بہت مشکل لیکن آپ کی خوشی کی خاطر یہ بھی کر لوں گی۔“

”میری خوشی اسی میں ہے کہ آئندہ تم یہ بات نہ کرنا۔ میں واقعی طور پر دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

اس کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ منہ پھیر کر لیٹ گئی لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ فوزیہ نے دوسری شادی کی بات کیوں کی۔ کہیں اسے اصل حقیقت تو معلوم نہیں ہوگئی۔ وہ بات جو میں نے اس سے اب تک چھپائی ہوئی تھی۔ یعنی یہ کہ وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم تھی لیکن میں نے لیڈی ڈاکٹر کی منت ساجت کر کے اسے راضی کر لیا تھا کہ وہ فوزیہ کو یہ خوفناک حقیقت نہ بتائے۔ میں جانتا تھا کہ وہ بے پرواہ عورت ہے اور کبھی رپورٹ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گی بلکہ میرے بتائے ہوئے پر یقین کر لے گی اور ایسا ہی ہوا جب میں رپورٹیں لے کر گھر آیا تو اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”دونوں رپورٹیں ٹھیک ہیں۔“

وہ مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگ گئی۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً وہ رپورٹیں ایسی جگہ چھپا دیں جہاں اس کی نظر نہ پڑے۔ بالقرض خیال اگر وہ رپورٹ دیکھ بھی لیتی تو اس کے لیے کچھ نہ پڑتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس حقیقت کا علم ہو۔ وہ پہلے ہی اولاد نہ ہونے کے غم میں پاگل ہو رہی تھی۔ یہ خبر سن کر بالکل ہی ٹوٹ جانی اور کچھ بعید نہیں کہ جذبات میں آکر کوئی انتہائی قدم اٹھاتی اسی لیے اس خبر کو اس سے چھپانا بہت ضروری تھا۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے وہ

رپورٹیں کہاں رکھ دی تھیں۔

فوزیہ نے دوسری شادی کا ذکر پھیلے لہجے میں کھینچ کر کشش سے دوچار کر دیا۔ اس سے تو میں نے کہہ دیا۔ اہالی طور پر دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کافی دنوں سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے شدت سے اولاد کی آرزو تھی جو میری دولت اور جائیداد کی وارث بن سکے لیکن یہ خواہش فوزیہ پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے دوسری شادی کرنا ضروری تھا۔ میں کسی غریب اور بے سہارا لڑکی سے شادی کرنا چاہ رہا تھا جو کبھی فوزیہ کے مقابلے پر نہ آئے اور ہمیشہ اس سے دب کر رہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ادھر میں نے دوسری شادی کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور ادھر وہ لڑکی مجھے مل گئی۔

زیرینہ میری فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ ویسے تو وہاں اور بھی کئی عورتیں تھیں جن میں سے زیادہ تر کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا۔ ان کا واسطہ اپنے سپروائزر یا فیکٹری مینیجر سے پڑتا تھا لیکن زیرینہ سے میری ملاقات بڑے ہی عجیب انداز میں ہوئی۔ میں اپنے دفتر میں کام کر رہا تھا کہ سیکریٹری نے انٹر کام پر کہا۔ ”سرایک در کر آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“ میں چونک گیا۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی ورکر براہ راست مجھ سے ملنے آئی ہو۔ وہ اپنے معاملات کے سلسلے میں سپروائزر یا مینیجر سے رجوع کرتی تھیں۔ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوگی۔ میں نے سیکریٹری سے کہا کہ وہ اسے اندر بیج دے۔

چند سیکنڈ بعد وہ لڑکی میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی خوب صورت لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ جمیل جیسی گہری آنکھیں۔ ستواں ناک، رسلے ہونٹ، سیاہ کھنکھے بال اور بھرا بھرا جسم لیکن غربت نے اس کی خوب صورتی کو گہنا دیا تھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور اس نے پورے جسم کو ایک چادر سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ سمجھتی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ پھر پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی زیرینہ، زیرینہ ذوالفقار۔“

”کیا مسئلہ ہے؟“

”جی میں لون کے سلسلے میں حاضر ہوئی تھی۔“

”اس کے لیے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت

ہر وقت میرے مرحوم والدین کو کوسنے اور بددعائیں دیتی رہتی ہیں۔ یقیناً جاہے سرکہ اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اب تک اپنی جان دے چکی ہوتی۔“

”تمہارا کوئی اور عزیز یا رشتے دار ایسا نہیں جس کے پاس تم چلی جاؤ۔“

”جی نہیں، اگر ہوں گے تو بھی میں نہیں جانتی۔ ہم سوات کے رہنے والے ہیں۔ میں بہت چھوٹی تھی جب ابا ہمیں لے کر مزدوری کی تلاش میں کراچی آئے تھے۔ اس کے بعد یہیں کے ہو کر رہ گئے۔“

”تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ شکل و صورت کی اچھی ہو۔ تم سے شادی کرنے کے لیے تو بہت لوگ تیار ہو جائیں گے۔“

اس نے ایک سر آدھ بھرتے ہوئے کہا۔ ”ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ میری شادی کے بارے میں سوچتے۔ ماموں ممانی کو میری کیا فکر، انہیں تو ایک مفت کی نوکرائی ملی ہوئی ہے۔“

”اچھا، اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال تم کیشیر سے دس ہزار روپے لے لو۔ میں مینیجر سے کہہ دیتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا اور اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو مجھے فوراً بتا دینا۔ تم کسی بھی وقت میرے پاس آ سکتی ہو۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ کا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ آپ نے مجھے رسوا ہونے سے بچالیا۔ میرا ماموں اتنا ذلیل انسان ہے کہ دس ہزار کی خاطر مجھے کسی کا ہاتھ بچ بھی سکتا ہے۔“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے ہی تمہارا کوئی بندوبست کر دوں گا۔“

اس پہلی ملاقات کے بعد ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہی لڑکی میرے لیے بہترین انتخاب ہو سکتی ہے۔ وہ ہر اعتبار سے میری دوسری بیوی بننے کے لائق تھی۔ وہ لاوارث اور غریب تھی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ دب کر رہتی اور کسی اونچ نیچ کی صورت میں مجھے اس کے رشتے داروں کا سامنا کرنے کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ جن حالات میں زندگی بسر کر رہی تھی اس کے پیش نظر اسے میری پیشکش قبول کرنے میں کوئی تاثر نہ ہوتا۔ جب میں اسے ایک محفوظ پناہ گاہ اور ایک پراساس زندگی فراہم کرنے کا وعدہ کرتا تو وہ میری ہر شرط ماننے پر تیار ہو جاتی۔

”تم مینیجر سے کہتیں۔“

”جی کہا تھا بلکہ درخواست بھی دی تھی لیکن انہوں نے منع کر دیا۔“

”کیوں منع کر دیا۔ کوئی وجہ تو بتائی ہوگی۔“

”جی وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کی پالیسی نہیں ہے۔“

مجھے لڑکی کی بات سن کر بہت غصہ آیا۔ جی میں آیا کہ اسی وقت مینیجر کو بلا کر پوچھوں کہ یہ پالیسی کب بنی۔ کس نے بنائی اور یہ میرے علم میں کیوں نہیں لیکن اس معاملہ کو میں نے کسی اور وقت کے لیے رکھ دیا۔ پہلے اس لڑکی کا مسئلہ حل کرنا ضروری تھا۔ ”کتنے پیسے چاہئیں۔“

”جی دس ہزار۔“

”کیا کرو گی؟“

”سنئے ہی وہ لڑکی بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔ اسے رو دیکھ کر میں پریشان ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیسے چپ کراؤں پھر میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”دیکھو بی بی تم میرا وقت ضائع کر رہی ہو اس طرح رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ تاکہ میں کچھ سوچ سکوں۔“

”سربا بات یہ ہے۔“ وہ چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”ابھی چند ماہ قبل میری ماں کا انتقال ہوا ہے۔ اب میں ماموں کے پاس رہ رہی ہوں۔ یہ پیسے انہی کو دینا ہیں۔“

”کیا مطلب؟ کیا تمہارے ماموں کی اتنی استطاعت بھی نہیں کہ وہ تمہیں دو وقت کی روٹی کھلا سکے۔“

”وہ تو میں ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے دیتی ہوں۔ یہ وہ پیسے ہیں جو انہوں نے میری ماں کی تجھیز و تکھیز پر خرچ کیے تھے۔ اس وقت تو انہوں نے دنیا کو دکھانے کے لیے یہ خرچا کر دیا۔ اب مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔“

”بڑی عجیب بات ہے۔ کیا تمہاری ماں ان کی سگی بہن نہیں تھیں؟“

”جی نہیں وہ میرے سوتیلے ماموں ہیں۔“

”ادھ آئی سی، اب میں سمجھا۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تو وہ تمہیں تنگ نہیں کرتے۔“

”سر کیا بتاؤں۔ ماموں اور ممانی نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ یہاں سے جانے کے بعد گھر کا سارا کام کرنی ہوں۔ چھٹی والے دن پورے گھر کے کپڑے دھوئی ہوں۔ اس کے باوجود ممانی کی زبان پیچی کی طرح چلتی رہتی ہے۔“

کراچی
سرگزشت
ماہنامہ

مرگِ ناگہاں نمبر

بے وقت موت نمبر نئے عنوان
اور نئی تحریروں کے ساتھ

وہ جو بے وقت موت کا شکار ہوئے، جوانی میں
ملکِ عدم کے راہی بنے۔ نامور لوگوں کی روداد اور
کہانیاں، جو اپنی مختصر سی زندگی میں یادگار کام کر گئے۔

وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

نا قابلِ فراموش خاص نمبر جسے مجلد کرا کر آپ رکھیں گے۔

بہت جلد قارئین کی خدمت میں

اصل مسئلہ تو مجھے اپنے گھر میں تھا۔ گو کہ فوزیہ نے دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر سوکن کو قبول نہیں کرے گی۔ اس نے محض وقتی جوش میں آکر ایسا کہہ دیا تھا۔ جو عورت عام گفتگو میں اپنی بات اور رکھنا چاہتی ہو وہ اپنے سپہاگ میں شراکت کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ لہذا میں نے سوچ لیا کہ فی الحال اس شادی کو خفیہ رکھنا ہی بہتر ہوگا اگر دوسری بیوی سے بچہ ہو گیا تو میں کسی مناسب موقع پر اسے بتا دوں گا۔ اس وقت وہ دفائی پوزیشن میں ہوگی اور بچے کی خاطر اسے سوکن کو قبول کرنا پڑے گا۔

زریںہ نے جو کچھ مجھے اپنے ماموں کے بارے میں بتایا اس کے پیش نظر مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ بد طبیعت انسان پیسوں کی خاطر اپنی بھانجی کا سودا نہ کر دے، اگر وہ کسی ہوس زدہ بوڑھے یا پردہ فروش کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ اس لیے اسے جلد از جلد ماموں کے چنگل سے آزاد کرانا ضروری تھا۔ میں اس سے اس سلسلے میں بات کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی مجھ سے ملنے چلی آئی۔ سیکریٹری نے اسٹرکام پر اس کے آنے کی اطلاع دی تو میں نے فوراً ہی اسے بلا لیا۔ وہ خاموشی سے میرے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

میں اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا اور بولا۔ ”کیا ہوا زریںہ پھر کوئی بات ہوگئی؟“

اس نے جواب دینے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے بڑی مشکوک سے اسے چپ کرایا تو وہ بولی۔ ”اب میں اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ خبیث ماموں میرا سودا کر رہا ہے۔ اگلے جمعہ کو ایک تتر سالہ بوڑھے سے میرا نکاح ہے۔ آپ مجھے دارالامان یا کسی ہوشل میں جگہ دلوا دیں۔ ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔“

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی میرے خدشات حقیقت بن کر سامنے آجائیں گے۔ میں نے زریںہ کو تسلی دی اور کہا۔ ”ہر مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے اور میں نے بھی حل یہ سوچ لیا ہے۔ بشرطیکہ تم راضی ہو جاؤ۔“

”میں آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے میرے لیے کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا۔“

”میں نے جو کچھ سوچا ہے اس میں میری غرض بھی شامل ہے۔“ پھر میں نے اسے مختصراً اپنے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں اگر وہ چاہے تو میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔ اس طرح ہم دونوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن یہ شادی خفیہ رہے گی جب تک میں جاؤں گا۔ میں اسے ایک الگ گھر میں رکھوں گا اور اسے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کر دوں گا۔“

اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ”میں تیار ہوں۔ میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے اور جانتی ہوں کہ آپ سے شادی کر کے کم از کم مجھے اس جہنم سے نجات مل جائے گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے دو دن کا وقت دو تا کہ میں تمہارے رہنے کے لیے گھر کا بندوبست کر سکوں۔ فی الحال تمہیں اپنے آپ کو سب سے چھپا کر رکھنا ہوگا۔ کیونکہ ماموں تمہاری تلاش میں شہر کا کونا کونا جھان مارے گا۔ تم یہ ملازمت چھوڑ دو گی اور نقاب کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔ اگر تم نے اپنے آپ یا اس شادی کو خفیہ نہ رکھا تو میں تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں گا۔“

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔ آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔“

اس کے بعد سب کچھ اسی طرح ہوا جیسا میں نے سوچا تھا۔ میں نے اس کے لیے شہر کے دور دراز علاقے میں ایک فلیٹ کا بندوبست کیا۔ اسے ضروری ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ جمعرات کے دن میں نے فوزیہ سے کہا کہ دو تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے زیادہ دن لگ جائیں۔ اس نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا کیونکہ میں کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر بلکہ بیرون ملک بھی جاتا رہتا تھا۔

چچ کے وقفے میں، میں نے زریںہ کو بلایا اور کہا کہ وہ سپر اوٹزر سے چھٹی لے کر چلی جائے اور اگلے چوک پر میرا انتظار کرے۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی فیکٹری سے باہر آ گیا۔ وہ مقررہ جگہ پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اسے لے کر بازار گیا۔ اس کے لیے کپڑے، جوتے، جلیوری اور میک اپ کا سامان خریدا پھر اسے لے کر اسی فلیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے پہلے ہی ایک ادھیر عورت کا بندوبست کر لیا تھا جو چوہیں کھٹنے اس کے ساتھ رہتی۔ پھر میں نے ایک دوست کو فون کر کے قاضی اور گواہوں کا انتظام کرنے کے

لیے کہا اور عصر کے بعد ہمارا نکاح ہو گیا۔

میں تین دن اس کے پاس گزارنے کے بعد گھر واپس آ گیا۔ میں نے ملازمہ کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور یہ بھی سمجھا دیا کہ پڑوسیوں پا محلے کے لوگوں سے زیادہ میل جول بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی پھر بھی میں اسے دن میں دو تین مرتبہ ضرور فون کرتا اور شام میں اس سے ملنے بھی جاتا۔ کبھی کبھی اسے شاپنگ کرانے یا کھانا کھلانے بھی لے جاتا۔

دو ماہ بعد ہی اس نے مجھے وہ خوش خبری سنائی جس کا میں عرصہ دراز سے منتظر تھا۔ یہ خبر سننے ہی میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ جی چاہا کہ سڑک پر نکل جاؤں اور چلا کر کہوں۔ ”لوگوں میں باپ بننے والا ہوں۔ میں باپ بننے والا ہوں، اس وقت میرے دل میں شدت سے خواہش ابھری کہ اس خوشی میں فوزیہ کو بھی شریک کر لوں لیکن یہ قبل از وقت ہوتا۔ میں نے سوچا کہ بچہ خیریت سے اس دنیا میں آجائے تو اسے بھی بتا دوں گا۔

اس کے بعد زریہ میرے لیے اور اہم ہو گئی۔ اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا۔ باقاعدگی سے اسے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس کی دواؤں اور غذا پر بہت زیادہ توجہ دیتا کیونکہ ڈاکٹر نے بہت زیادہ احتیاط کرنے کے لیے کہا تھا۔ ڈراسی بے احتیاطی سے اس کی پانچ کی جان کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی پانکٹی سے لگ کر بیٹھ جاتا لیکن ایسا عملاً ممکن نہیں تھا۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔ زریہ کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میں نے فوزیہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ فیکٹری میں کام زیادہ ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ مجھے گھر آنے میں دیر ہو جائے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ معمول کی بات تھی۔ زریہ کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ نارٹل ڈیلیوری کیس نہیں ہے۔ اس کے لیے آپریشن کرنا ہو گا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذات پر دستخط کر دیے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

ایک طویل صبر آزماتا انتظار کے بعد آپریشن روم کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر کا چہرہ دیکھتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔ ”مبارک ہو بیٹی پیدا ہوئی ہے۔“

”تھیک یو ڈاکٹر۔“ میں نے خوشی سے مہم سنے ہوئے کہا۔ ”زریہ تو تھیک ہے؟“

”سوری سر۔ ہم آپ کی سز کو نہیں بچا سکے۔“ مجھے یوں لگا جیسے آسمان میرے سر پر آن کر اہو۔ لمحہ بھر پہلے ملنے والی خوشی غم کی دیز تہہ میں چھپ گئی۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرے تو وہ دم و گمان میں نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ زریہ تو چلی گئی۔ اب اس بچی کو کس کے حوالے کر دوں۔ اگر گھر لے کر جاتا ہوں تو فوزیہ کو کیا بتاؤں گا۔ کیا وہ اس بچی کو قبول کر لے گی یا اسے یتیم خانے میں داخل کرادوں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا میرے جیتے جی یہ بچی یتیم خانے میں نہیں جائے گی۔ میں اسے ہر قیمت پر گھر لے کر جاؤں گا۔ فوزیہ سے کچھ بھی کہہ دوں گا۔ اگر وہ مان گئی تو تھیک ورنہ اس کے لیے ایک آپا رکھ لوں گا۔ بہر حال اس بچی کی پرورش میری ذمہ داری تھی۔

میں بچی کو لے کر گھر پہنچا تو فوزیہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ ”بالا آخر آپ نے اپنی خواہش پوری کر لی۔ اگر کوئی بچہ کو لینا تھا تو لڑکا لے کر آتے جو بڑھا پے میں ہمارا سہارا بنتا۔“

”جو تم سمجھ رہی ہو ایسا نہیں ہے۔“ میں نے فائل میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ جس میں اسپتال کے کاغذات اور بچی کا برتھ شٹلٹ تھا۔ ”اسے میں اسپتال سے لایا ہوں۔ یہ میری ایک ورکر کی بیٹی ہے۔ فیکٹری میں ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی تھی چنانچہ ہم نے اسے اسپتال بھیج دیا۔ اس کا شوہر اسے چھوڑ چکا ہے اور ہمارے پاس اس کے کسی قریبی عزیز یا رشتے دار کا پتا نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسپتال سے سپروائزر نے فون کر کے بتایا کہ اس عورت کا آپریشن ہو گا چنانچہ میں اسپتال چلا گیا۔ اس عورت کا آپریشن ہوا اور وہ اس بچی کو جنم دے کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب یہ بچی لاوارث ہے۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم اس کی پرورش کریں گے۔ اللہ میاں نے اس سچی پری کی صورت میں ہمیں تحفہ دیا ہے لیکن اگر تم نہیں چاہتے تو میں اسے منج یتیم خانے میں داخل کرادوں گا۔“

فوزیہ نے غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھا جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ اس کہانی میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ پھر بچی کو گود میں لیتے ہوئے بولی۔ ”اے اللہ کتنی پیاری ہے۔ یہ یتیم خانہ نہیں جائے گی۔ میں اسے پالوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے بچی کو سینے سے لگالیا۔ اس کی سالی

”لیکن یہ جھوٹ ہے۔ دنیا میں تو آپ نے جھوٹ بول لیا لیکن نکاح نامہ ایک شرعی دستاویز ہے۔ اس میں جھوٹ نہیں چلے گا۔“

”یہ سچ ہے۔“ میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

”کیا مطلب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں فوزیہ یہی سچ ہے۔ میں ہی طوبی کا باپ ہوں۔“

پھر میں نے اسے الف سے لے کر ی تک پوری کہانی سنا دی۔ وہ دم سادھے سنی رہی پھر بولی۔ ”اور آپ نے اتنے برسوں تک یہ بات مجھ سے چھپائے رکھی۔“

”ہاں فوزیہ مجھے ڈر تھا کہ تم اس تلخ حقیقت کو قبول نہیں کرو گی۔“

”اس حقیقت کو تو میں نے اسی وقت قبول کر لیا تھا جب آپ اسے لے کر گھر آئے تھے۔ میں جان گئی تھی کہ یہ آپ ہی کی اولاد ہے۔ اس کا پتا مجھے اس فائل سے چلا جو آپ بے دھیانی میں پیر پڑھو کر بازار چلے گئے تھے۔

اسپتال کے کاغذات اور برتھ شیفٹ سے مجھے حقیقت کا پتا چل گیا تھا اور اسی لیے میں نے اس بیٹی کو آپ کی اولاد سمجھ کر قبول کر لیا اور اسے سگی بیٹی کی طرح پالنے لگی لیکن میں آپ کی زبان سے سنا چاہتی تھی اور آپ نے اس حقیقت کو بتانے میں اتنے برس لگا دیئے۔“

”مجھے تمہاری ناراضی کا خوف تھا۔“

”کیوں؟ میں نے تو خود آپ کو دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا۔“

”کہنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہے فوزیہ۔ میں جانتا تھا کہ تم سو کن کا وجود برداشت نہیں کر سکو گی۔“

”مجھے اسی بات کا افسوس ہے کہ آپ نے میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کیا۔ آپ یہ کیوں بھول گئے کہ عورت کا دل ایک سمندر کی مانند ہوتا ہے اور وہ بہت کچھ برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر میں کم طرف ہوتی تو کبھی طوبی کو سگی بیٹی کی طرح نہ چاہتی۔ قانون بھی یہی کہتا ہے کہ

طوبی کو سگی بیٹی کی جاداد، اٹائے سب مشترکہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اس لیے طوبی صرف آپ ہی کی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔ کیا ہوا، اگر میں نے اسے اپنی کوکھ سے جنم نہیں دیا۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی عورت کا دل واقعی سمندر کی مانند ہوتا ہے جسے سمجھنے میں مجھے اتنے برس لگ گئے۔

ہوئی مستی جاگ گئی تھی۔ وہ بچی کو دیوانہ دار چوم رہی تھی پھر اس نے بچی کے لیے دودھ کا انتظام کیا اور بولی۔ ”آپ کو بازار جانا ہوگا۔ اس کے لیے کچھ چیزیں لانی ہیں۔“

پھر اس نے ایک فہرست بنائی اور مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہ سامان لے کر آئیں۔ میں اس کے لیے کسی آیا کا بندوبست کرتی ہوں۔“

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا۔ فوزیہ نے نہ صرف اس بچی کو قبول کر لیا تھا بلکہ جی جان سے اس کی دیکھ بھال میں لگ گئی جیسے وہ اسی کی بیٹی ہو۔ میں نے باہر آ کر سپرد اوزر کو فون کیا کہ وہ زریہ کی ڈیڈ باڈی ایڈی ہوم میں رکھوا دے۔ صبح اس کی تدفین کر دی جائے گی۔

ہم نے اس بچی کا نام طوبی رکھا۔ میرا تو خیر وہ خون تھی لیکن فوزیہ بھی اسے سگی اولاد کی طرح چاہتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح۔ جب وہ بڑی ہوئی تو میں نے ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھوا دیا۔ فوزیہ نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”مجھے اس کے باپ کا نام معلوم نہیں۔ اس خانے میں کسی نہ کسی کا نام تو لکھنا ہوگا۔“

”آپ جانتے ہیں کہ یہ غیر شرعی اور غیر قانونی ہے۔“

”مجبوری میں سب جائز ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔

طوبی بہت ذہین تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے تعلیمی مدارج طے کیے اور یونیورسٹی میں پہنچ گئی۔ سب لوگ اسے ہماری سگی اولاد ہی سمجھتے تھے لیکن جب اس کے لیے ایک رشتہ آیا تو فوزیہ نے مجھ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ لڑکے والوں کو بتا دیں کہ طوبی ہماری سگی بیٹی نہیں ہے بلکہ ہم نے اسے پالا ہے۔“

”اگر انہیں یہ بات بتادی گئی تو وہ پلٹ کر نہیں آئیں گے اور یہ جاننے کے بعد شاید طوبی کو کوئی بھی قبول نہ کرے۔“

”ان سے چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا اگر بعد میں انہیں یہ بات معلوم ہو گئی تو طوبی کے لیے پریشانیاں پیدا ہو سکتی ہیں اور نکاح نامہ میں آپ کیا لکھوا میں گئے؟“

”وہی جو ہر جگہ لکھوایا ہے۔ ب فارم، شناختی کارڈ، اسکول کے رجسٹر میں ہر جگہ ولدیت کے خانے میں میرا نام ہی لکھا ہے۔“



جذبہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت

ہم جنت نظیر ملک میں آزادی سے رہ رہے ہیں، اس لیے ہمیں آزادی کی قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ اس بارے میں غلامی کی زنجیروں سے جکڑے مقبوضہ کشمیر کے کسی فرد سے پوچھیے۔ جب مجھے زبانی کے بارے میں بتایا گیا تو میں سکتے میں رہ گیا۔ یہ سچ بیانی اسی زبانی کی ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔

افتخار حسین اعوان
(مظفر آباد آزاد کشمیر)

سکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ٹھانٹیں مارتے دریا کے آر پار مرد، عورتوں، جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کا ایک بہت وسیع اجتماع ہوتا تھا۔ لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ دریا کے ایک طرف مقام اور ابلے چہرے اپنی چوب دکھلاتے تھے تو دوسری طرف

یہ مہینے کی آخری جمعرات تھی۔ ہر دوسری اور آخری جمعرات کو یہاں میلے جیسا ساں ہوتا تھا۔ جی ہاں!! لوگ اسے میلہ ہی کہتے ہیں۔ اور میلہ کی قسم کی خرید و فروخت یا مروج مستی کا نہیں ہوتا تھا اس میلے میں صرف آپس اور

پریشانی سے اٹے، مرجھائے ہوئے غمگین چہرے نظر آتے تھے۔ ہاں البتہ ایک قدر دونوں طرف مشترک تھی کہ سبھی آہ و زاری کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سبھی روتے بلکتے ایک دوسرے کو کھدائیں دیتے بلکان ہوتے تھے۔

یہ آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کا کراسنگ پوائنٹ تھا۔ جس کے آ پار ہر دوسری اور چوتھی جماعت جمع ہونے والے لوگ اپنے رشتہ داروں کو دور سے دیکھتے ہوئے تیر بہاتے تھے۔ شاہ زیب عرف زبھی بھی اپنے والدین اور بہن کے ساتھ اس پار کے رشتہ داروں کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔

جب برصغیر کی جغرافیائی حدود کے بٹوارے کا اعلان ہوا تو کشمیر پر اس وقت ڈگر راجا کی حکومت تھی۔ ہندوؤں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنے انگریزوں نے کشمیر کے عوام کو حق خود ارادیت کا اختیار دینے کا اعلان تو کر دیا لیکن ابھی بہت سی تباہی پر وہ غیب سے نمودار ہوئی تھی۔ کشمیر کی 80 فیصد مسلم آبادی کا فیصلہ یقینی طور پر پاکستان کے حق میں ہوتا۔ ہندو بیٹے کو یہ بات قطعی گوارا نہ تھی۔ راجا وگرہ نے بھارتی فوج کو کشمیر میں داخل کر دیا۔ پاکستانی فوج کی جوبلی کاروائی اب لازم تھی۔ لیکن اس سے پہلے ہی غیور پاکستانی عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ سرحد (کے پی کے) سے قبائلی معمولی ہتھیار لے کر اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کو اپنے اور سری نگر تک جا پہنچے۔

ہندو قوم فطری طور پر بزدل اور سازشی واقع ہوتی ہے جب بازی ملتے دیکھی تو مظلومیت کا لبادہ اوڑھے عالمی امن کے ٹھیکیدار اقوام متحدہ کے در پر جا بیٹھے۔ جہاں ایک متفقہ قرارداد کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر میں ریفرنڈم کروایا جائے گا۔ اقوام متحدہ نے فوری جنگ بندی کروانے ہوئے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں حد بندی کر دی۔ یہ اجابک ہونے والا فیصلہ دونوں اطراف کے عوام کے لیے ناگہانی آفت ثابت ہوا۔ اور خاندان ورشتے حد بندی کی نایدہ تلواریں نے دو حصوں میں تقسیم کر دیئے۔ جو جہاں تھا، واپس اپنوں سے جا کر نہ مل سکا۔ شوہر ایک طرف تو اس کی یاد میں تڑپتے پیوی بچے دوسری طرف رہ گئے۔ بلکتے والدین اور دیگر بہن بھائی کشمیر کے ایک حصے میں تو ان کا جگر گوشہ، دوسری طرف غرض جو چدر تھا وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔ حد بندی کی اس لائن کو ”لائن آف کنٹرول“ کا نام دیا گیا۔

زبھی کے دادا بھی یونہی آزاد ہونے والے خطے میں رہ گئے تھے جبکہ ان کا تمام تر خاندان مقبوضہ کشمیر میں تھا۔ تب وہ

جوان تھے۔ انھوں نے وہیں شادی کر لی اور ان کے ہاں دو بیٹوں کی ولادت ہوئی۔ زبھی کے والد اور اس کے تایا۔ تایا نے شادی نہیں کی تھی۔ انھوں نے نوعری میں ہی قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی سرزمین کو آزاد کرادیں گے اسی لیے وہ بچپن ہی میں ایک جہادی تنظیم سے منسلک ہو گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے کئی ایسے معرکے سر کیے کہ تنظیم کی کمانڈ انچیف دے دی گئی۔ کمانڈر بن کر انھوں نے بھارتیوں کو خوب ناکوں پٹنے چبوائے اور بالآخر جام شہادت نوش کر گئے۔

☆☆☆

یہ ایک بڑا سا ہال نما کمر تھا۔ دیوار کے ساتھ بڑی سی میز کی چھ کرسیاں صورت ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ یہ انڈین آرمی کا کرنل مہتا تھا۔ اس کے سامنے کرسی پر براجمان شخص قدرے جوان سال تھا۔ اس کے چہرے مہرے پہ بھی خیاثت ثبت تھی۔ آنکھوں میں شاطرانہ چمک لیے مجسم خبیث وہ شخص کرنل کے سامنے بہت ادب سے بیٹھا تھا۔ میجر راون نامی اس خون آشام بلا کی تعیناتی آج ہی پرموشن کے بعد مقبوضہ کشمیر میں ہوئی تھی۔ راون کا سابقہ ریکارڈ اس کی بد خصلتی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ اپنے شکار کو بھگا بھگا کر اور تڑپا تڑپا کر مارنے کا عادی تھا۔ اس کا خمیر جبر، نیکی اور ظلم سے گندھا تھا۔ جوان لڑکیاں اس کی مرغوب غذا کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس کے انھی اوصاف کے پیش نظر اس کی تعیناتی مقبوضہ کشمیر میں کی گئی تھی۔

اس وقت میجر راون اپنے سینئر کرنل مہتا سے بریفنگ لے رہا تھا۔

☆☆☆

اس رات زبھی سوئیں سکا تھا۔ کراسنگ پوائنٹ پر اس کی آنکھوں نے جو مناظر دیکھے تھے، وہ اس کے اندر حد درجہ بے چینی جگا کر اس کی شیند عائب کر چکے تھے۔ وہ رہ کر اس کے پردہ بصارت پر وہی مناظر گردش کر رہے تھے۔ رونا دھونا تو دریا کے شور میں دب گیا تھا لیکن ایک بچے کے گک بھگ چند بھارتی فوجی جانے کہاں سے وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہایک کر پیچھے دھکیلا شروع کر دیا تھا۔ مردوں پر لاشیاں برساتی آئیں تو عورتوں اور بچوں کو بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹا جانے لگا۔ زبھی ان لوگوں کی بے بسی پر تڑپ کر رہ گیا۔ اس پار کے لوگوں کی آنکھوں میں لہراتے حسرت، غلامی اور بے بسی کے مہیب سائے وہ بھول نہیں پارہا تھا۔ ان سب میں اس کا اپنا خاندان بھی تو موجود تھا۔

آریاؤں کی آمد

1750ء اور 1200ء قبل مسیح کے درمیان

عرصے میں آریائی وادی سندھ میں نقل مکانی کر کے آئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس خطے کی اعلیٰ تہذیب یافتہ شہری ثقافتیں ختم ہو چکی تھیں کیونکہ انہیں آریاؤں نے بہ آسانی فتح کر کے اپنی ثقافت میں جذب کر لیا تھا۔ ابتدائی آریاؤں کے بارے میں بہت کم علم ہے۔ ویدی ادب میں بھرے ہوئے حوالہ جات اشارہ کرتے ہیں کہ وہ بنیادی طور پر آوارہ خانہ بدوش تھے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے ریوڑ کے پیچھے جاتے تھے۔ بظاہر ان کی کوئی مستقل بنیادیں یا شہر نہیں تھے۔ اس عرصے کے آریا قبیلوں کی صورت میں رہتے جن کی سربراہی سردار کرتے تھے جنہیں راجا کہا جاتا تھا۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا لیس مور
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

وید

ہندومت کا بنیادی مقدس صحیفہ وید ہیں۔ یہ کتابیں ہندو نظریہ کائنات کے سمجھنے کا ذریعہ ہیں۔ وید بنیادی طور پر چار ہیں۔ پہلا اور سب سے اہم رگ وید ہے (وید لفظ کا اصل مطلب ”علم“ ہے) یہ آریائی دیوتاؤں کے لیے ایک ہزار سے زائد مناجاتی گیتوں کا مجموعہ ہے اور اس میں کئی دوسرے مواد بھی موجود ہیں۔ یہ دیوتاؤں کی بنیادی اساطیر پر مشتمل ہے۔ دوسری ویدی سب سے زیادہ تر اسی مواد پر مشتمل ہیں جو اصل میں رگ وید میں موجود ہے۔ دوسری کتاب یج وید (رسومات کا علم) ہے۔ یہ دیوتاؤں کے حضور قربانی کے دوران گائے جانے والے مواد کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب سام وید بنیادی مناجاتی گیتوں میں سے اشعار کا مجموعہ ہے جو پروہتوں کی طرف سے قربانی پر پڑھے جاتے تھے۔ چوتھی کتاب جورگ وید کے بعد دوسری اہم کتاب ہے۔ اتھرو وید ہے (رشی اتھرو کی طرف سے دیا جانے والا علم) یہ دیوتاؤں کے لیے کی جانے والی مقبول عبادتوں میں استعمال کی جانے والی رسومات پر مشتمل ہے اس کے ساتھ ہی برائی کو بھگانے کے لیے سحر اور جادو کا طریقہ کار بھی ہے۔

اقتباس: مذہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا لیس مور
مرسلہ: حبیب اختر۔ فیصل آباد

بے چینی اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اپنی سوچوں سے نبرد آزما اس کے ذہن میں بارہا ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا کہ جانے کب تک وہ سب اس غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں گے۔ آزادی کا خواب آنکھوں میں سچائے جانے کب تک وہ اس ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے۔ بھی زہمی کے دل میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند لپکا۔ اس نے اپنے تپا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مجاہد بننے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی طرح وہ کشمیری بھائیوں کے مصائب ختم کرنے میں کوئی کردار ادا کر سکتا تھا۔ اس سوچ اور فیصلے نے اس کے رگ و پے میں سکون اور طمانیت کی لہریں دوڑا دیں اور دھیرے دھیرے نیند نے اسے اپنی مہربان آغوش میں بھر لیا۔

☆☆☆

میجر راون اسم باسکی ثابت ہوا تھا۔ مسلمانوں سے نفرت اس کی شخصیت میں شامل تھی۔ چارج سنبھالتے ہی اس نے اپنی خیانت دکھانی شروع کر دی تھی۔ آغاز اس نے اسکولوں سے کیا۔ وہ بغیر کسی اطلاع کے کسی بھی اسکول میں جا گھستا اور ننھے ننھے معصوم بچوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیتا۔ بچوں کی ہراساں، وحشت زدہ نظریں اس کے حیوانی جذبے کو تسکین دیتی تھیں، آسودہ کرتی تھیں۔ کالجز میں جا کر مسلمان طالبات کو علیحدہ کر لیتا اور ان سے بے سرو پا سوالات کرتا بھانے بھانے سے اس کے ناپاک ہاتھ جسارت کرتے۔ اس نے وادی کے کئی مسلم گھرانوں میں پوچھ تاچھ کے بھانے جا کر کئی خواتین کی آبروریزی کی تھی۔ اس کے شکاویں بعد ازاں اس کے ہر کارے بھی اپنا حصہ ڈالتے۔ قانون اندھا بھی تھا اور بھرا بھی قانون کے لمبے ہاتھ میجر راون جیسے لوگوں کی حمایت کرتے تھے کئی دہائیاں پہلے ہی رہن رکھوا چکے تھے۔ اجتماعی آبروریزی کے بعد کئی خواتین کو گاؤں سے غائب کر دیا گیا تھا۔ ان کے گھروں میں موجود معمولی مالیت کے سامان سے لے کر ان کے ڈھور ڈگر تک لوٹ لیے تھے۔ مسلم عوام کا جینا دو بھر ہو چکا تھا۔ میجر راون ایک عذاب کی مانند ان پر مسلط تھا۔ اس کے شکار سے خدا کا واسطہ دیتے گرم مانگتے تو وہ زہر لیے انداز میں کہتا ”تم مسلمانوں کا خدا بھی تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکتا۔ ایک ایک کو روند کے رکھ دوں گا۔ ابھی تو تمہاری مسجدوں میں مجھے کرواؤں گا تم لوگوں سے۔“

عوام کے پاس صرف ایک اللہ کا ہی آسرا تھا جس کے

آگے وہ گڑگڑا کر اپنی عافیت کی بھیک مانگ سکتے تھے۔ مظلوم کی آپس ہمیشہ عرش ہلا دیا کرتی ہیں۔ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کیا جاتا ہے۔ راون کو مجسم کرنے کا فیصلہ لوح تقدیر پر لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

”اباجی! میں مجاہد بننا چاہتا ہوں۔“

یہ الفاظ ایٹم بم کی طرح زہی کے والد کی سماعت پر گرے تھے۔ وہ ایک درد مند دل رکھنے والے انسان تھے۔ لیکن ان کی پدرانہ شفقت ان پر حاوی ہو کر ان کے ملی جذبے کو کمزور کر دیتی تھی۔ زہی ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس کی بھاپر ان کی آنے والی نسل منحصر تھی۔ بیٹی تو پرایا دھن تھی اور اکلوتا بھائی پہلے ہی جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ ان کے بشری تقاضے ان کو اپنے بیٹے کی بھاپر اکسارے تھے۔ ”میں تمہارے جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں زہی! لیکن تمہیں اس فیصلہ کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”لیکن کیوں اباجی! میرا وطن بولہبان ہے۔ اس کی بیکار مجھے بے چین رکھتی ہے۔ میں اس پاک دھرتی پر دشمنوں کے ناپاک قدموں کا قلعہ قمع کرنا چاہتا ہوں۔“

”وطن کا حق اپنی جگہ مسلم! لیکن بوڑھے والدین کے بھی تو کچھ حقوق ہیں ناں۔“

ان کی جڑا پر ماتنوں واسطوں اور جذباتی استحصال کے باعث زہی نے وقتی خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن اس کا جذبہ جہاد کسی اتنی چٹان کی طرح اب بھی قائم و دائم تھا۔ اس کے اندر ایک طوفان برپا تھا جو ہر ظلم کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس کا جذبہ صادق ہے تو اسے ضرور کوئی نہ کوئی وسیلہ مل جائے گا۔ بالآخر اس کی دعا ٹیس رگ لائیں۔

کالج کی سالانہ تقریب انعامات میں اسے تقریر کرنے کا موقع ملا۔ اس تقریب میں کشمیر کی جہادی تنظیم کے کئی مجاہدین بھی شامل تھے۔ اس کی تقریر کا موضوع بھی آزاد کشمیر تھا۔ جب وہ اسٹیج پر آیا تو اس کا جنون سرچڑھ کر بولنے لگا۔

”اے میرے پیارے کشمیر!! میں کہاں سے شروع کروں جو یہ بتا سکوں کہ تو نے کتنے سیاہ باب دیکھے۔ 700 سے شروع کروں جب یہاں مسلم حکومت تھی یا اس وقت کا نوحہ پڑھوں جب ڈوگردن نے تجھ پہ تسلط جمایا اور اس پاک دھرتی پہ اپنے ناپاک قدم رکھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ میرے

کشمیر جنت نظیر نے بہت ظلم سے ہیں۔ سولہ سو عیسوی سے لے کر اگلی اڑھائی صدیوں تک ظلم کا وہ کون سا پہاڑ تھا جو میری دھرتی پر توڑا نہ گیا۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے ستر لاکھ میں تجھے فروخت کیا۔ کیا تیرا مول بس اتنا تھا؟ ہزارے کے بعد یہاں کے عوام کو حق خود ارادیت کا ڈھکوسلا دیا گیا۔ تیری سہانی فضاؤں میں بارودی ذرات اڑائے گئے۔ بھارتی حکمرانوں نے اپنی افواج یہاں بھیج کر تیرا تقدس باطل کیا۔ ہر طرح کا گھناؤنا جرم سرزد ہوا یہاں۔ باپردہ خواتین کو گلیوں میں برہنہ کھینٹا گیا۔ ہزاروں نوجوان جیلوں میں قید ہیں نہتے افراد پر گولیاں چلائی گئیں۔ میں کس کس المیہ کا نوحہ پڑھوں۔ 84000 مربع میل میں سے صرف 4000 مربع میل پاکستان کے حصے میں آیا۔ کشمیر کے اس ٹکڑے میں ہونے والے مظالم بیان کرنے لگوں تو دل پھٹ جائے گا۔ مگر میرے لہورنگ کشمیر کے آزاراں کہے رہیں گے۔ اس دھرتی پر ایک لاکھ سے زائد افراد کا لبو بہایا جا چکا ہے۔ اگر مزید قربانیاں درکار ہیں تو ہم بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ جسم کے آخری قطرہ خون تک تیری حرمت کے بچاؤ کے لیے لڑیں گے۔“

زہی کے جذبے نے تنظیم کے اراکین کو بہت متاثر کیا۔ تقریب کے بعد کالج کے خفیہ خانے میں انہوں نے زہی سے ملاقات کی۔ ایک سرکردہ لیڈر کے سامنے اسے پیش کیا گیا۔

زہی بڑے اعتماد سے ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لیڈر کا رعب چہرہ اور اتنی عزم کی آئینہ دار آنکھیں زہی کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ انہوں نے چند ثانیے بعد سوال کیا۔ ”جہاد کا عزم رکھتے ہو؟“

زہی مضبوط لہجے میں بولا۔ ”جی ہاں۔“

”یہ راہ بہت پرخطر ہے اور تم ابھی نوجوان ہو۔“

”جہاد میرا جنون ہے۔ اور بھارتیوں کو نیست و نابود کرنا میرا مقصد۔ یعنی ابھی دشواریاں آئیں سہ لوں گا۔ زندگی کی بھی پروا نہیں۔“

”جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔“

لیڈر کے چہرے پر پہلی مرتبہ ہلکا سا تبسم نظر آیا اور انہوں نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

زہی کے والد سے تنظیم کے افراد نے خود رابطہ کیا اور انہیں واضح کر دیا کہ زہی اب بہت دور نکل چکا ہے۔ لہذا

اسے بخوشی اس کا زخمی کی اجازت دے دیں۔

اس کے والد نے غم آنکھوں سے ڈھیروں دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کر دیا۔ پہلے چند ماہ زہبی کو اسلحہ چلانے کے ساتھ ساتھ سخت جسمانی تربیت بھی دی گئی، کئی بار وہ مشقت سے چور ہو کر گرتا لیکن ایک الوبی جذبہ پھر سے دامن گیر ہو کر اسے ایک نئی توانائی عطا کر دیتا تھا۔

ٹریننگ کے بعد زہبی اور اس جیسے دیگر ٹیم ممبران کو خاموشی سے بارڈر پار کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو جس گاؤں میں پہنچایا گیا یہ وہی گاؤں تھا جہاں میجر راون نے انت چارگی رکھی تھی۔

☆☆☆

زہبی کے دل و دماغ میں ایک آگ روشن تھی۔

اس کے سامنے دو ہی منزلیں تھیں۔ غازی یا شہید۔ پہلا دن ایک جنگل میں روپوش رہ کر گذارا جہاں سے ایک گاڑی انہیں اپنے گھر مہمان بنا کر لے گیا۔ اسی گاڑی نے انہیں میجر راون کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا۔ زہبی سے ظلم کی یہ داستان برداشت کرنی محال تھی اس نے فوری فیصلہ کیا کہ ان کا پہلا ٹارگٹ راون ہی ہوگا۔

اس نے اپنے مشن کے تمام تر پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے ایک پلان مرتب کیا۔ اگلے چند دن وہ میجر کی رہی کرواتے رہے تاکہ اس پر مکمل ہاتھ ڈالا جاسکے۔ تجربے سے انہیں معلوم ہوا کہ راون جتنے میں انڈین آری کے چنیدہ افسران نے عیش سرور کی ایک محفل بنانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔ شراب کباب کا دور دورہ ہوگا اور کئی مسلمان گھرانوں کی مغوی لڑکیاں وہاں لائی جائیں گی۔

زہبی کے خون میں جیسے انکارے بھر گئے تھے۔ اس نے اپنی ٹیم ممبرز کے ساتھ ایک مکمل منصوبہ بنایا اور اسی دن آری چوکی پر حملہ کر دیا۔ چند سہائی باہر موجود تھے لیکن وہ بھی مکمل طور پر اہل رات نہ تھے زہبی کے ساتھیوں نے پوری قوت سے ان پر حملہ کیا اور انہیں ہتھیلے کا موقع نہ مل سکا۔ انہیں جہنم واصل کر کے اگے کی یونیفارم میں وہ آری چیپ میں کچھ آگے واقع ہیڈ کوارٹر کی طرف آندھی طوفان کی طرح روانہ ہوئے۔

زہبی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اندر چلا گیا جبکہ باقی دو کو باہر رکھنے کا حکم دیا گیا۔ آری یونیفارم کی وجہ سے انہیں کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اندر عیش و نشاط کا ماحول تھا۔ افسران بدست ہاتھیوں کی طرح بھی ہوئی لڑکیوں پر

ٹوٹے پڑے تھے۔

زہبی نے اپنی رائفل سیدھی کر کے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر برست کھول دیا۔ آن کی آن میں وہاں خون کا ایک تالاب سا بن گیا۔

فائرنگ کی آواز سن کر باہر سے چند افسران نے اندر آنا چاہا لیکن زہبی کے دونوں ساتھیوں نے ایسا کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

میجر راون کا یوم حساب آچکا تھا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن زہبی نے اس کی دونوں ٹانگیں چھلنی کر دیں۔ اس کے اندر غصہ و غضب کا ایک آتش فشاں دھک رہا تھا۔ اپنے ساتھ موجود مجاہد کو اس نے لڑکیوں کو لے کر کھینچ سائڈ سے بھاگنے کا حکم دیا اور خود میجر راون کے سر پر بندوق تان کر کھڑا ہو گیا۔ یعنی موت سامنے دیکھ کر راون بکری کی طرح منتنارہا تھا۔ ”مجھے چھوڑ دو مورکھ! میں تمہیں مالا مال کر دوں گا۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پر راون! میرا جذبہ ہی میرے لیے سب سے بڑی متاع ہے۔“ زہبی نے پھنکار کر کہا۔

”تم مسئلے کبھی کامیاب نہیں ہو پاؤ گے۔ ہماری طاقت تمہیں مسل کر رکھ دے گی۔“ راون ہڈیاں پکنے لگا۔

”یہ خواب تم اور تمہاری غاصب قوم جانے کب سے دیکھ رہی ہے۔ مسک قوم ایک چٹان ہے راون! ہمارا جذبہ بہتی ہوا ہے جسے بھی قید نہیں کیا جاسکتا۔“ زہبی نے بلند آواز سے نعرہ بکیرا دیا کرتے ہوئے میجر کو زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد وہ باہر چھپے اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور جیب میں سوار ہو رہا تھا ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور زہبی کے گلے کو چھاؤں کر نکل گئی۔ کوئی بد بخت شاید زندہ بچ گیا تھا اور موقع پا کر چھت سے اس نے وار کر دیا۔ گولی چلنے کے فوری بعد دہشتی بم جیب پر گرا اور باقی دو مجاہدین کے بھی پرچے اڑ گئے۔

زہبی کے جذبہ صادق نے اس کی دلی تمنا پوری کر دی۔ اسے شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز کر دیا اور گاؤں والوں کو شیطان ابن شیطان بھجر راون کے جنگل سے بھی آزادی دلوا دی تھی۔

آج بھی آزاد کشمیر کے اس گاؤں میں لوگ زہبی کے قصے بچوں کو سناتے ہیں۔

گناہ گار

مکرمی

السلام علیکم

ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی اریشہ کی ہے۔ اریشہ جو ایک عام سی گھریلو عورت ہے۔ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس کے فیصلے کو سراہنا ضروری ہے۔

عاطر شاہین

(ملتان)

کال بیل کی آواز سن کر بچن میں کرسی پر بیٹھی آلو کاٹتی اریشہ نے چھری میز پر رکھی اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بچے اسکول سے آئے ہوں گے کیونکہ اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا اور اس کے بچے ایک بجے ہی اسکول سے آتے تھے۔ اریشہ نے دروازہ کھولا تو باہر اس کے بچے نہیں بلکہ اس کا چھوٹا بھائی ارسلان کھڑا تھا۔ ارسلان کو غیر متوقع طور پر دیکھ کر اریشہ بے اختیار چونک پڑی کیونکہ ارسلان خالی ہاتھ تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بیگ تھا اور نہ ہی کوئی سوٹ کیس۔ وہ کافی عرصے کے بعد اس کے گھر آیا تھا۔

”السلام علیکم باجی۔“ ارسلان نے سلام کرتے ہوئے

کہا۔



”وعلیک السلام۔“ اریشہ نے خوشگوار حیرت سے جواب دیا۔

ارسلان اندر آ گیا تو اریشہ نے دروازہ بند کر دیا اور پھر اسے لیے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ ارسلان، اریشہ سے چار سال چھوٹا تھا اور بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ اریشہ کی شادی گواٹھ سال ہو گئے تھے۔ اس کا شوہر ریلوے میں جاب کرتا تھا اس لیے جب اس کا ملتان سے لاہور تبادلہ ہوا تو اریشہ اپنے شوہر کے ساتھ لاہور شفٹ ہو گئی۔ اب وہ چار کمروں پر مشتمل چھ مہرے کے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ اریشہ کے دو بچے تھے چھ سالہ منیب اور چار سالہ مہک۔ اریشہ کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن بھائیوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا جبکہ ارسلان چوتھے نمبر پر تھا۔ ان کا بڑا بھائی شادی شدہ اور علیحدہ رہتا تھا جبکہ اس کے والد رینارڈ سڑکاری ملازم تھے۔ اریشہ سے چھوٹا بھائی حسام پرائیویٹ ملٹی ٹیکسٹائل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جبکہ ارسلان، اس سے چھوٹی بہن بلوشہ اور سب سے چھوٹا بھائی حبیب ابھی پڑھ رہے تھے۔

ارسلان کی اچانک آمد پر وہ حیران ہوئی تھی کیونکہ ارسلان جب بھی لاہور آتا تھا تو اریشہ کو کال کر کے اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کر دیتا تھا اور وہ اس کے لیے ایک کمرہ صاف کر دیتی تھی۔ آج سے دو دن قبل ہی ارسلان لاہور آیا تھا تو وہ ان کے ہاں ایک ہفتہ رہا تھا۔

”بیٹھو۔“ ڈرائنگ میں بیٹھنے کے بعد اریشہ نے کہا تو ارسلان طویل سانس لیتے ہوئے یوں صوفے پر بیٹھ گیا جیسے بے حد تھکا ہوا ہو۔

”بابی۔“ بچے نہیں آئے؟“ ارسلان نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ آنے والے ہیں۔“ اریشہ نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج کیسے چاک آگئے۔“

”بس بابی، میں نے سوچا آج آپ کو سر برانز دوں گا۔“ ارسلان نے کہا۔ ”میں کچھ دن یہاں رہنے آیا ہوں۔ دراصل میرا دوست عامر بھی میرے ساتھ آیا ہے۔ وہ اپنی خالہ کی بیٹی کی شادی میں آیا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے آیا ہے۔“

”تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟“

”میرا بیگ ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔ شکر ہے اس میں کچھ سامان نہیں تھا۔“

اریشہ نے ارسلان کے لہجے سے محسوس کیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے تاہم اس نے کوئی بات نہ کی۔ اسی لمحے کال بیل

ایک بار پھر بج اٹھی تو اریشہ سمجھ گئی کہ اب منیب اور مہک آگئے ہوں گے۔ چنانچہ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو منیب اور مہک تھے۔ انہوں نے امی کو سلام کیا اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آگئے۔ انہوں نے جب اپنے ماموں ارسلان کو دیکھا تو بے حد خوش ہوئے۔ پھر ارسلان ان کے ساتھ کھل مل گیا۔ شام کو اریشہ کے شوہر رحمان گھر آئے تو وہ بھی ارسلان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اریشہ نے ارسلان کے لیے ایک کمرہ صاف کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسری صبح اریشہ کے شوہر جاب پر اور بچے اسکول چلے گئے تو وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی جبکہ ارسلان ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ تقریباً صبح کے نو بج رہے تھے کہ اس کی امی کی کال آئی۔ سلام دعا کے بعد امی نے پوچھا۔

”اریشہ! کیا ارسلان تمہارے گھر ہے؟“

”ہاں۔“ اریشہ نے جواب دیا۔ ”کیا وہ آپ کو بتا کر نہیں آیا؟“

”نہیں۔“ امی کی آواز سنائی دی۔ ”ہم نے اس کے بارے میں کہاں کہاں معلوم نہیں کیا۔ ساری رات ہم پریشان رہے۔ اس کے دوست بھی غائب ہیں۔ پھر مجھے تمہارا خیال آیا تو فون کر دیا۔“

”وہ آپ کو بتا کر کیوں نہیں آیا؟“

”پتا نہیں بیٹی۔“ اریشہ کی امی نے کہا۔ ”اب وہ کہاں ہے؟ میری بات کرنا اس سے۔“

”وہ سو رہا ہے۔“

”اس نے تمہیں کیا بتایا ہے کہ وہ لاہور کیوں آیا ہے؟“

”امی! ارسلان بتا رہا تھا کہ وہ اپنے دوست عامر کے ساتھ لاہور آیا ہے۔ لاہور میں عامر کی خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ ارسلان کا بیک بھی ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔“ اریشہ نے بتایا۔

”اس کا بیک تو گھر میں ہے۔“

”کیا۔“ اریشہ ہنسی۔ ”پھر اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔“

”پتا نہیں۔“ امی کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ”اچھا وہ جاگ جائے تو اس سے میری بات کر دیتا۔“

”ٹھیک ہے امی۔“

رابطہ منقطع ہو گیا تو اریشہ نے اپنا سیل فون میز پر رکھ دیا

اور سوچنے لگی کہ ارسلان نے اس سے جھوٹ کیوں بولا، جب ارسلان جاگے گا تو وہ اس سے پوچھے گی۔ پھر وہ گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ دن کے گیارہ بجے ارسلان جاگا تھا۔ اس نے جب اریشہ سے ناشتے کا پوچھا تو اس نے کہا۔ ”تم منہ ہاتھ دھولو میں ناشتا بنادیتی ہوں۔“ ارسلان منہ ہاتھ دھو کر کچن میں ہی آگیا تھا۔ اریشہ اسے ناشتا دینے کے بعد اس کے پاس بیٹھ گئی۔

”ارسلان۔ امی کا فون آیا تھا۔“

اریشہ کی بات سن کر ارسلان ناشتا کرتے کرتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر یلغٹ پریشانی کے تاثرات ابھرا آئے تھے۔

”کیا کہہ رہی تھیں امی؟“

”تم آئیں بتا کر کیوں نہیں آئے تھے۔“ اریشہ نے کہا۔

”باجی! جب میں لاہور آنے کی تیاری کر رہا تھا تو امی گھر پر موجود نہیں تھیں اس لیے میں انہیں بتائے بغیر ہی آ گیا۔“ ارسلان نے جواب دیا۔

”امی تو یہ بھی بتا رہی تھیں کہ تمہارا بیک گھر پر ہے جبکہ تم نے کہا کہ تمہارا بیک ٹرین میں چوری ہو گیا ہے۔“ اریشہ نے اپنی بات جاری رکھی جیسے وہ تفتیش کر رہی ہو۔ اس کی بات سن کر ارسلان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گزر گئے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کہا:

”باجی۔ میں یہ بتانا بھول گیا تھا کہ جو بیک ٹرین میں چوری ہوا ہے وہ عامر کا تھا اور اسی میں میرے اور عامر کے کپڑے تھے۔“

اریشہ کو لگا کہ ارسلان اب بھی اس سے جھوٹ بول رہا ہے۔ کوئی کڑبڑ ہے جس کے بارے میں اس کی امی بھی لاعلم ہیں۔

”ناشتا کر کے امی سے بات کرلو۔“

”جی اچھا۔“

اریشہ وہاں سے اٹھ گئی تو ارسلان ناشتا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات بدستور موجود تھے۔

☆.....☆.....☆

دوپہر کو اریشہ کے بچے اسکول سے گھر آئے تو ارسلان ان میں گھل مل گیا جبکہ اریشہ دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف ہوگئی۔ اس کا سیل فون کچن میں ہی پڑا ہوا تھا کہ اس کی امی کی پھر کال آگئی۔ جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی تو اس کی امی کی

گھبراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اریشہ!“

”کیا ہوا امی؟“ اریشہ چونکی۔

”ارسلان کہاں ہے؟“

”ڈرائنگ روم میں بچوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ کیوں کیا ہو گیا ہے۔“

”پولیس اس کی تلاش میں ہے؟“

”کیوں؟“ اریشہ حیران رہ گئی۔ ”کیا کیا ہے اس نے؟“

اس کی امی جواب دینے کی بجائے ہچکچائیں لینے لگیں۔

”ناں کی ہچکچائیں سن کر اریشہ بے چین ہوگئی۔ ”امی! آپ کیوں رو رہی ہیں۔“

”روؤں نہ تو اور کیا کروں۔“

”آخر ہوا کیا ہے امی۔“

”اس پر الزام ہے کہ اس نے.....“ اریشہ کی امی اتنا ہی کہہ سکیں۔ وہ ایک بار پھر روٹنے لگیں۔

”بتائیے امی۔“

”ارسلان نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر ایک لڑکی کی عزت پامال کی ہے۔“

”کیا؟“ اریشہ کو اپنے بہنوں کے نیچے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”اسی لیے وہ لاہور تمہارے پاس آیا ہے۔ اس کا دوست بھی روپوش ہے۔“ اریشہ کو امی کی آواز سنائی دی۔

”پولیس ان کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ تم ارسلان کو نہیں چھپا دو تا کہ اگر پولیس تمہارے گھر آئے تو وہ ارسلان کو نہ پکڑ سکے۔“

”امی! آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ اریشہ نے جلدی سے کہا۔ ”ارسلان نے اگر جرم کیا ہے تو اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ امی نے کہا۔ ”لیکن جانتی ہو ہماری کتنی بدنامی ہوگی۔“

”امی۔ جس لڑکی کی زندگی ارسلان اور اس کے دوستوں نے برباد کی ہے۔ اس کا کیا قصور ہے۔ کیا اس کی بدنامی نہیں ہوگی۔“ اریشہ نے کہا۔

”ہم اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیں گے۔“ امی نے کہا۔ ”فی الحال تم دبی کرو جو میں نے کہا ہے۔“

امی نے اتنا کہہ کر کال منقطع کر دی تو اریشہ نے فیسے سے سیل فون میز پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ماری

بات واضح ہو گئی تھی کہ ارسلان اچانک اس کے گھر کیوں آیا تھا۔ وہ پولیس سے بچنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے بچن سے نکل کر ارسلان کو آواز دی۔ ”ارسلان۔ ارسلان۔“
 ”جی ہاں۔“ ارسلان نے دروازہ کھول کر جواب دیا۔
 ”ادھر آؤ۔“

ارسلان بچن میں آگیا۔ اریشہ اپنے بچوں کے سامنے اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اسے بچن میں بلایا تھا۔
 ”مجھے امی نے بتا دیا ہے کہ تم کیا کارنامہ انجام دے کر آئے ہو۔“ اریشہ کا لہجہ سخت تھا۔ ارسلان یوں چونک پڑا جیسے اس کے سر پر بم بھاڑ دیا گیا ہو۔

”جی۔ جی۔“ ارسلان کا لہجہ کھوکھلا ہو رہا تھا۔
 ”تمہیں شرم نہیں آتی تھی کسی لڑکی کی زندگی برباد کرتے ہوئے۔“

ارسلان کا شرم سے سر جبک گیا۔
 ”غلطی ہو گئی ہے ہاں۔“
 ”غلطی۔“ اریشہ نے اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کرتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا۔ ”ایک لڑکی کی زندگی برباد ہو گئی اور تم اسے غلطی کہتے ہو۔“

ارسلان اپنے زخماں پر ہاتھ رکھے نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اریشہ نے اپنی بات جاری رکھی۔
 ”سوچو۔ اگر کوئی تمہاری بہن کی زندگی برباد کر دے تو تم کیسا محسوس کرو گے۔ کیا تم ہر اٹھا کر معاشرے میں جی سکو گے؟ جس لڑکی کی تم نے زندگی برباد کی ہے اس پر کیا گزر رہی ہوگی۔“

ارسلان کے پاس کوئی جواب ہوتا تو وہ دیتا۔ اسی لمحے کال بیل بجی تو اریشہ کا دھیان بیل کی طرف چلا گیا۔ وہ بچن سے نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو باہر چار نوجوان موجود تھے۔

”جی فرمائیے۔“ اریشہ نے دروازے کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کہا۔

”بی بی۔ کیا آپ کا نام اریشہ ہے؟“ ایک نوجوان نے پوچھا۔

”جی۔“
 ”ہم پولیس والے ہیں۔“ اسی نوجوان نے کہا۔
 ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کا بھائی ارسلان آپ کے گھر میں موجود ہے۔ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں۔“
 پولیس کا سن کر اریشہ نے ہونٹ سمجھ لیے۔ اس نے مڑ

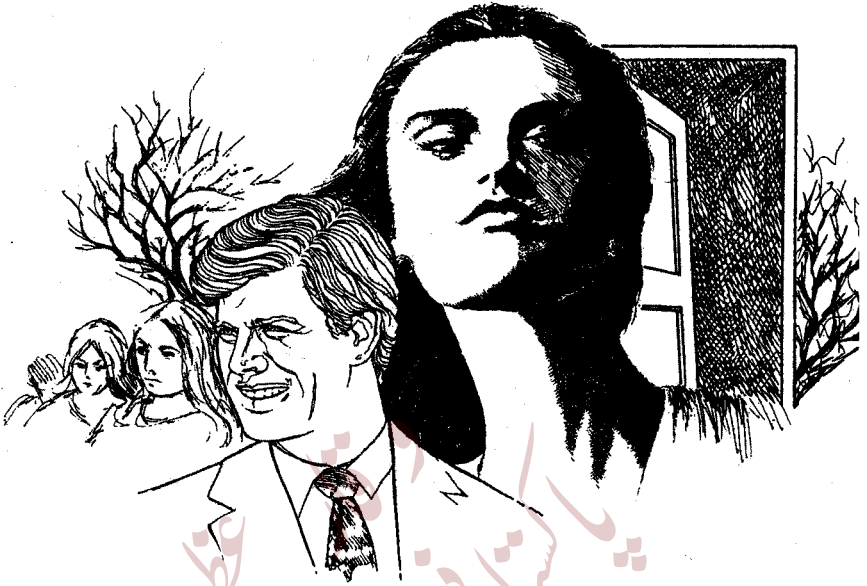
کر بچن کے دروازے پر کھڑے ارسلان کی طرف دیکھا جس کا چہرہ خوف سے زرد پڑا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے بہن سے کہا کہ وہ انکار کر دے کہ ارسلان یہاں نہیں ہے۔ لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ ایسا فیصلہ جس سے اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھائی نے اگر گناہ کیا ہے تو اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ گواہی مالاں کی بات بھی یاد تھی کہ اگر پولیس وہاں آئے تو وہ ارسلان کی موجودگی سے صاف انکار کر دے۔ اریشہ چاہتی تو بھائی کو گھر کے پچھلے دروازے سے بھی بھاگ سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

”بی بی۔ میں نے کچھ پوچھا ہے۔“ اسی لمحے پولیس والے نے دوبارہ پوچھا۔

”جی۔ میرا بھائی یہیں ہے۔ آپ اسے گرفتار کر لیں۔“ اریشہ نے دھیمے لہجے میں کہا اور دروازہ کھل دیا پولیس نے گھر میں داخل ہو کر ارسلان کو گرفتار کر لیا۔ ارسلان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بہن اسے گرفتار کر دے گی۔ پولیس اس کے دوست عامر کو پہلے ہی گرفتار کر چکی تھی اور اسی کی نشاندہی پر پولیس نے ارسلان کو اریشہ کے گھر سے گرفتار کیا تھا۔ پولیس ارسلان کو لے کر ملتان روانہ ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

عدالت میں کیس چلا تو ارسلان اور اس کے دوست عامر پر ... الزام ثابت ہو گیا ان دونوں کو سزا ہو گئی۔ متاثرہ لڑکی، جس کا نام راشدہ تھا کا تعلق متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ کالج میں پڑھتی تھی اور قرضہ ڈائیر کی طالبہ تھی۔ عامر اسے پسند کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن راشدہ اسے پسند نہیں کرتی تھی اس لیے اس نے عامر کو صاف انکار کر دیا تھا۔ پھر عامر نے ارسلان سے مل کر راشدہ کو اغوا کرنے کا پروگرام بنایا۔ ارسلان پہلے تو راضی نہیں ہوا مگر بعد میں مان گیا اور یوں دونوں نے راشدہ کو اغوا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنایا لیکن انہیں اپنی ہوس کا صلہ قید کی صورت میں ملا۔ ارسلان بہت پچھتا رہا تھا کہ کاش وہ عامر کا ساتھ نہ دیتا تو آج وہ جیل میں نہ ہوتا لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چک گئیں کمیت کے مصداق پچھتائے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اریشہ کے فیصلے سے اس کی امی تو ناراض ہو گئی تھیں کہ اس نے خون کا رشہ پس پشت ڈال دیا تھا لیکن اس کے والد مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اریشہ نے ارسلان کو گرفتار کر کر اچھا اقدام کیا ہے تاکہ اسے اس کے گناہ کی سزا ملنی چاہیے۔



تجربہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں سرگزشت کا پرانا قاری ہوں لیکن اب تک کوئی تخلیق بھیجی نہیں، پہلی بار ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ کہانی میرے دوست کی ہے۔ مجھے اتنی سبق آموز لگی کہ اسے شائع کرانا ضروری سمجھا تاکہ دوسرے لوگ بھی سبق حاصل کر سکیں۔

خورشید شاہ

(کراچی)

یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کو پڑھنے اور سمجھ لینے کے بعد بہت سوں کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ بگڑتے ہوئے گھر پھر سے اپنی بنیاد پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔
یہ کہانی میرے ایک کزن سلیم اور اس کی بیوی اسماء کی ہے۔ سیدھے سادے لوگ تھے۔ میرے سامنے شادی ہوئی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا جس طرح نارمل گھروں میں ہوا کرتا ہے۔
سلیم اور ان کی بیوی دونوں ایک ہی جیسے تھے۔

میرا مطلب ہے کہ دونوں عام سی صورت کے تھے۔
دونوں کے رنگ بہت زیادہ دبے ہوئے تھے۔ یعنی کالے ہی
تھے۔

سلیم کے ابو یعنی میرے خالو خود بھی اسی قسم کے تھے۔
اس لیے سلیم بھی ایسا ہی ہوا تھا اور دوسری طرف اس کا گھرانہ
بھی ایسا ہی تھا۔

میں اس کے تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو دیکھ
چکا تھا۔ وہ بھی سب کی سب معمولی شکل و صورت کی تھیں۔
شاید اس قسم کا گڈمڈ جنس میں ہوا کرتا ہے یا اس قسم کی
کوئی اور بات ہوگی۔

سلیم میرا کزن بھی تھا اور دوست بھی۔ ہم تقریباً ہم عمر
تھے۔ اس لیے ہمارے درمیان خاصی بے تکلفی تھی۔ ہم
دونوں اپنے مسائل ایک دوسرے سے شیئر کیا کرتے تھے۔

ایک دن وہ میرے پاس بہت الجھا ہوا آیا۔ اس کی
الجھن اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

”خیر تو ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کچھ پریشان
دکھائی دے رہے ہو۔“

”یار خورشید! تم کو تو معلوم ہے کہ میں اس سے کتنی
محبت کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”ہاں جانتا ہوں میں لیکن بات کیا ہے۔“

”بات ایسی ہے کہ میں کسی اور سے اس کا ذکر بھی نہیں
کر سکتا۔“ اس نے کہا۔ ”سوائے تمہارے کیونکہ کسی اور سے
بات کی تو ہنگامہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو تو موقع چاہیے۔“

”بتاؤ تو سہی کیا مسئلہ ہے۔“

”اس شرط پر کہ تم کسی سے نہیں کہو گے کیونکہ یہ میری
عزت کا معاملہ ہے۔“

”چلو اب بتا بھی دو۔“

”یار اس کی حرکتیں مشکوک ہو گئی ہیں۔“ اس نے
بتایا۔

”میں سمجھا نہیں کیسی مشکوک حرکتیں۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہی
ہے۔“ اس نے بالآخر بتا ہی دیا۔ ”اس کے تعلقات کسی اور
سے بھی ہیں۔“

”خدا کا خوف کرو۔ تم بھابی پر اتنا بڑا الزام لگا رہے
ہو۔“

”بہت مجبور اور پریشان ہو کر کہہ رہا ہوں۔ ورنہ تم
اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔

ہر حال میں گزارا کرنا جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ کیا
بتاؤں۔“

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کیسی بات
کر دی تھی۔ میں اسما کو بھی جانتا تھا۔ بہت مہذب اور خوش
اخلاق عورت تھی۔

لیکن سلیم نے جو الزام لگایا تھا وہ تو بہت حیرت انگیز
تھا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ تم سے بے وفائی کر رہی
ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اس کو کسی کے ساتھ دیکھ لیا
ہے۔“

”نہیں کسی کے ساتھ نہیں دیکھا لیکن اس کی حرکتیں
ایسی ہیں۔“

”خدا کے بندے یہی تو پوچھ رہا ہوں۔ کیسی
حرکتیں؟“

”اس کے پاس کسی کا فون آیا کرتا ہے۔“ اس نے
بتایا۔ ”مجھ سے چھپ چھپ کر باتیں کرتی ہے۔ میری یہ
عادت نہیں ہے کہ میں اس کے موبائل پر آنے والی کال کا نمبر
چیک کروں۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ کس کا نمبر ہے،
کون ہے؟“

”چلو یہ تو ایک بات ہو گئی۔ اس کے علاوہ۔“

”اس کے علاوہ یہ کہ وہ اکثر کسی سے ملنے جایا کرتی
ہے۔“ سلیم نے بتایا۔ ”یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس کے پاس اور
کہاں گئی ہے۔ جب پوچھتا ہوں تو ادھر ادھر کا بہانہ کر دیتی
ہے۔ خاص طور پر اپنی ایک سہیلی نمبرہ کا نام لے دیتی ہے کہ
نمبرہ کے پاس جا رہی ہوں۔ نمبرہ کو میں بھی جانتا ہوں۔ اچھی
لڑکی ہے۔ سوشل کاموں میں مصروف رہتی ہے تو اسما بھی یہی
کہتی ہے کہ وہ نمبرہ کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔“

”تو کیا ایسا نہیں ہوتا؟“

”پہلے سنو تو پچھلے ہفتے یہ ایک دن نمبرہ کے پاس گئی۔
اس کے جانے کے کچھ ہی بعد میری بہن اور بہنوئی آ گئے۔ وہ
چونکہ بہت دنوں کے بعد آئے تھے اس لیے میں نے یہی
مناسب سمجھا کہ اس کو بلا لوں۔ اس کے موبائل پر فون کیا تو
اس کا موبائل بند ملا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود نمبرہ
کے گھر جا کر اس کو لے آؤں۔ نمبرہ کے گھر پہنچا تو نمبرہ نے بتایا
کہ میں تو پچھلے ایک مہینے سے اس سے نہیں ملی۔ وہ اس کے
پاس آئی ہی نہیں ہے اب بتاؤ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔“

”ہاں یہ ذرا نشوونما کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم

نے اسماء سے پوچھا نہیں۔

”پوچھا تھا۔ لیکن اس نے بڑی ڈھٹائی سے نمبرہ ہی کا نام لیا۔ میں نے اسے جھوٹا کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ خواہ وہ اس کی عزت نفس بھروسہ ہو جاتی۔“

”یار سلیم۔“ میں اب پھٹ پڑا۔ ”تم کس مزاج کے آدمی ہو۔ کتنی توت برداشت ہے تم میں۔“

”کیا کروں یار۔“ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”اور خود سوچ سوچ کر نفسیاتی مریض بن جاؤ گے۔“

”میں لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے ساتھ خوش نہیں ہے تو میں اسے

زبردستی اپنی بیوی بنائے رکھوں لیکن میں پورے ثبوت کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی تک ثبوت تو کوئی نہیں ملا ہے۔ صرف اندازے ہیں۔“

”پاگل ہو تم۔“ مجھے اس پر افسوس ہونے لگا تھا۔ ”اب اور کیا ثبوت چاہیے۔“

”یار! کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے گا تو پھر کوئی اسٹیپ اٹھالوں۔“

”اور یہ ٹھوس ثبوت کہاں سے آئے گا۔“

”یار اس لیے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تم یہ کام کر سکتے ہو۔“

”کیا مطلب ہے۔ میں کہاں سے ثبوت لاؤں گا۔“

”دیکھو وہ تم پر بہت بھروسہ کرتی ہے تمہاری ہر بات مان لیتی ہے۔ تم کو اپنا دوست سمجھتی ہے۔ تم کھلے دل سے اس سے بات کرو۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم سے کچھ نہیں چھپائے گی

اور تم کو سب کچھ بتا دے گی۔“

”فرض کرو، اگر ایسی کوئی بات ہے تو پھر تم کیا کرو گے۔“

”کرنا کیا ہے یار۔ میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ اگر اس نے اپنے دل میں کسی اور کو بسا رکھا ہے تو خوش دلی کے ساتھ الگ ہو جائیں گے۔“

”یہ تو تم نے بہت بڑی بات کہہ دی۔“

”ہاں یار! اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔“

”اوکے! میں اس سے بات کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”بلکہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جب وہ گھر سے نمبرہ کے پاس جانے کا کہہ کر نکلے تو تم مجھے فون کرو۔“

”اس سے کیا ہوگا۔“

”میں فوراً پہنچ کر اس کا تعاقب کروں گا۔“ میں نے بتایا۔ ”دیکھو تو سہی۔ وہ کہاں جاتی ہے۔ پھر جب اسی ویسی کوئی بات ہوئی تو اس سے کل کر بات کر لوں گا ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی چھپ جائے۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ میں نہیں بتا دوں گا۔“

یہ بالکل ایک نئے انداز کا کیس سامنے آیا تھا۔ میرے خاندان میں ابھی تک ایسی کوئی کہانی نہیں ہوئی تھی اور ہوئی بھی تو بے چارے سلیم کے ساتھ۔ جو ایک سیدھا سادا آدمی تھا

اور اپنے انداز کی زندگی گزار رہا تھا۔

”کئی دنوں کے بعد سلیم کا فون آگیا۔“ خورشید آدھ کھٹے کے اندر اندر وہ نمبرہ کے یہاں جانے والی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ارے یہ نمبرہ رہتی کہاں ہے؟“

”پاپوش مگر میں۔“ اس نے بتایا۔ ”تم آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔“

”میں تمہارے گھر نہیں آؤں گا۔ بلکہ بائیک پر تمہارے گھر کے سامنے چھپ کر کھڑا رہوں گا اور جب اسماء نکلے گی تو اس کا تعقب شروع کر دوں گا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔ بس تم آ جاؤ۔“

میں چندر منٹ کے اندر اندر بائیک لے کر سلیم کے مکان کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اسماء گھر سے نکلتی ہوئی دکھائی دی۔

اس نے خود کو ایک چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر آ کر اس نے رکشا کر لیا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ بائیک کی وجہ سے ایسے کاموں میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔

سلیم نے بتایا تھا کہ نمبرہ پاپوش مگر میں رہتی ہے جب کہ رکشے کا رخ بالکل مخالف سمت میں تھا۔ یعنی نیوکراچی کی طرف۔ رکشا چلتا رہا اور میری بائیک اس کے ساتھ گری رہی۔

نیوکراچی سے آگے سر جانی ٹاؤن ہے۔ وہ رکشا سر جانی ٹاؤن کے بھی آخری سرے پر جا کر رکھا تھا۔ اسماء نے رکشے کا کرایہ ادا کیا اور ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئی۔

یہ ایک خستہ حال سامکان تھا۔ دو کمروں کا۔ سلیم کے اندیشے صحیح ہو رہے تھے۔ وہ اپنے شوہر سے جھوٹ بول کر کہیں اور آتی تھی۔ کسی اور کے پاس۔

مجھے اس سے ایسی اُمید نہیں تھی۔ وہ ایسی عورت تو نہیں

جبل الطارق Gibraltar

اسپین کے جنوب میں بحیرہ روم کے ساحل پر ایک چھوٹی سی برطانوی نو آبادی اور اہم بحری اور ہوائی اڈا۔ رقبہ 205 مربع میل یا 505 مربع کلومیٹر، آبادی 2000ء میں 35000 سطح سمندر پر بڑھی ہوئی ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ ڈیڑھ میل لمبا ریگستانی قطعہ پہاڑی کو اسپین سے ملاتا ہے۔ اس کے قریب ہی آبائے جبل الطارق ہے، جو یورپ کو افریقہ سے جدا کرتی ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ برطانوی حکومت کا ملازم ہے۔ مقامی ضروریات کے لیے چند صنعتیں بھی ہیں۔ زراعت نہ ہونے کے برابر ہے تقریباً تمام غذائی اشیاء درآمد کی جاتی ہیں۔ زمانہ قدیم سے یہ پہاڑی اسپین کا حصہ رہی ہے اس لیے اسپین اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ 711ء میں شمالی افریقہ کے عرب مسلمانوں نے طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین پر حملہ کیا تو سب سے پہلے یہی پہاڑی ان کے قبضے میں آئی اور طارق کے نام پر اس کا نام جبل الطارق رکھا گیا۔ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد اس پر اسپین نے قبضہ کر لیا لیکن 1333ء میں یہ پھر شاہ مراکش کے زیر نگیں آگئی اور 1462ء تک سلطنت مراکش کا حصہ رہی بعد ازاں اس پر پھر اسپین کا قبضہ ہو گیا اور اس دفعہ

اسماء نے چند لمحے سوچنے کے بعد گردن ہلا دی۔
میں اسے اپنی بائیک پر نیوکراچی سے آگے ایک فیملی ہوٹل میں لے آیا۔ دیکھا اور سننا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کہتی ہے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر میں نے کوئلڈ ریک کا آرڈر دے دیا۔
”ہاں تو اب بتائیں یہ کیا سلسلہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”سلسلہ یہ ہے کہ میں اپنے آئیڈیل اپنے محبوب کے پاس آیا کرتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔
”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تو بے چارے سلیم کے ساتھ آپ بے وفا لی کر رہی ہیں۔“
”ہرگز نہیں۔ میں ایک وفادار بیوی ہوں۔ سلیم میرے شوہر ہیں۔ میں ان سے بے وفا لی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

”تو پھر محبوب اور آئیڈیل میں کیا فرق ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”خوشید! کیا تم نے کبھی محمود شیرانی کا نام سنا ہے؟“
”کیون نہیں اس ملک کا ہر بڑھا لکھا آدمی محمود شیرانی کے نام سے واقف ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ہر حال میں حق کا پرچار کیا۔ حکمرانوں کے تعاقب میں رہا۔ اپنی شاعری سے آگ لگا دی تھی۔ وہ ایسا شخص ہے جو ہزاروں لاکھوں کا محبوب اور آئیڈیل رہا ہے۔ لیکن آپ کے کس سے محمود شیرانی کا کیا تعلق ہے۔“
”وہی میرے محبوب اور آئیڈیل ہیں۔“ اسماء نے

تھی لیکن انسان کا کیا بھروسہ ہوتا ہے لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ وہ سلیم جیسے آدمی کو دھوکا دے رہی تھی۔

میں اس کو اترے کچھ فاصلے پر بائیک کھڑی کر کے اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اس کو باہر آنے کے بعد پکڑنا چاہتا تھا کیونکہ اب ایک مکمل ثبوت میرے پاس آ گیا تھا۔
کم از کم اس سے بات کر کے میں اسے شرمندہ تو کر ہی سکتا تھا۔ یا کچھ نہیں تو احساس دلا سکتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ کن راہوں پر چل پڑی ہے۔

وہ اس گھر سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد باہر آئی تھی۔ وہ رکشے کے انتظار میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ میں اپنی بائیک لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

”بیٹھ جاؤ اسماء بھابی۔ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ پکڑی گئی تھی۔
”خوشید تم!“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں آ گئے۔“

”میں آپ کی تلاش میں۔ سلیم آپ کی سبیلی نمروہ کے یہاں گیا تھا۔ وہاں سے پتا چلا کہ آپ یہاں آئی ہیں۔ تو میں یہاں آ گیا۔“

”ٹھیک ہے۔ جب تمہیں پتا چل ہی گیا ہے تو میں تمہیں بتا دیجی ہوں۔“ اسماء نے کہا۔

”بھابی! کیوں نہ ہم کہیں بیٹھ کر اطمینان سے بات کر لیں۔ یہاں کھڑے رہ کر بات کرنا مناسب نہیں۔“

ہسپانوی یہاں دو سو سال سے زائد عرصے تک جبر ہے۔ 1704ء میں وائس ایڈمرل آف انگلینڈ سر جارج روک نے سہ روزہ جنگ کے بعد ہسپانیوں کو یہاں سے مار بھگایا اور اس پر برطانیہ کا تسلط قائم ہو گیا۔ 1713ء میں ہسپانیہ نے اٹریخت کے معاہدے کی رو سے جبل الطارق پر برطانیہ کا اور سسلی پر سپوائے کا اقتدار تسلیم کر لیا۔ 13 ستمبر 1779ء کو ہسپانوی فوجوں نے جبل الطارق پر حملہ کر دیا اور تین سال، سات ماہ بارہ دن اس کا محاصرہ کیے رکھا لیکن برطانوی گورنر جنرل آکسٹس ایلیٹ کے کامیاب دفاع کے سبب ہسپانیہ کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔

1965ء میں ہسپانیہ نے دوبارہ جبل الطارق کی جزدی ناکہ بندی کر دی۔ 1967ء میں یہاں ریلیف ٹیم کر دیا گیا جس میں آبادی کی غالب اکثریت نے برطانوی اقتدار کے حق میں ووٹ دیے۔ اسی سال نئے آئین کا نفاذ ہوا جس کی رو سے مقامی آبادی کو اندرونی معاملات میں خود مختاری دے دی گئی۔ 1968ء میں اقوام متحدہ نے برطانیہ کو ہدایت کی کہ وہ یہ نوآبادی اسپین کے حوالے کر دے۔ برطانیہ کے انکار پر اسپین نے اس کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔ 1985ء تک ناکہ بندی جاری رہی۔

مرسلہ: احمد توفیق۔ میر پور خاص

بتایا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھ سکا۔“

”ارے میں ان ہی کے پاس جاتی ہوں۔ تم نے سر جانی میں جس گھر کو دیکھا ہے محمود صاحب اس گھر میں موجود ہیں۔ ان کی صحت اس قابل نہیں کہ وہ اپنا کوئی کام کر سکیں۔ اس لیے میں یہاں آکر ان کے لیے کھانے بنادیتی ہوں۔ ان کے برتن وغیرہ موجود ہیں۔“

”خدا کی پناہ۔ یہ تو عجیب انکشاف کیا ہے آپ نے۔“

”ہاں اس لیے سلیم کو بھی نہیں معلوم کہ میں کس کے پاس جاتی ہوں۔“ اساء نے کہا۔

”لیکن محمود صاحب سے آپ کا ایسا کیا تعلق ہے؟“

”ایک باپ اور بیٹی کا۔“

”کیا؟“ یہ ایک دوسرا انکشاف تھا۔ ”کیا محمود صاحب آپ کے والد ہیں؟“

”ہاں۔“

”حیرت کی بات ہے۔ سلیم نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”انہوں نے مجھے اسکول میں پڑھایا ہے۔“ اساء نے بتایا۔ ”میں ان کی سب سے چیتھی شاگردی۔ کیا استاد باپ کا درجہ نہیں رکھتا۔“

”بالکل رکھتا ہے۔ خاص طور پر محمود شیرانی جیسا استاد لیکن آپ کو یہ سب سلیم سے نہیں چھپانا چاہیے تھا۔“

”خوشیہ، سلیم بہت اچھے انسان ہیں۔“ اس نے کہا۔

”بہت اچھے لیکن یہ مرد کی نیچر ہے کہ وہ کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کرتا اگر میں کسی پر چھائیں تو کبھی اپنا آئیڈیل کہوں تو سلیم کہتے تو کچھ نہیں۔ لیکن ہمیں نہ کہیں حاسد ضرور ہوجاتے۔“

اسماء صبح کہہ رہی تھی۔ مرد کی فطرت ایسی ہی ہوتی ہے۔ خاص طور پر شوہر کی۔

”کیا تم محمود صاحب سے ملنا چاہو گے؟“ اساء نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ میں بھی ان کو اپنا آئیڈیل سمجھتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”حالانکہ انہوں نے قسم دی تھی کہ ان کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہو لیکن اب بات میری وفا اور عزت کی آگئی ہے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم بھی ان سے مل لو۔

تاکہ سلیم کو یقین دلا سکو کہ میں ایسی دیکی نہیں ہوں۔“

کچھ دیر بعد ہم پھر سر جانی کے اس مکان کے سامنے تھے۔ اساء نے دستک دی۔ اندر سے کچھ کہا گیا جس کا جواب اس نے دیا تھا۔ پھر اس کے لیے دروازہ کھول دیا گیا۔

اسماء اندر چلی گئی، جب کہ میں اس دوران باہر کھڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آئی۔ اس نے پہلے اشارہ کیا تو میں بھی اس مکان میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔

میرے سامنے محمود شیرانی صاحب کھڑے تھے۔ وہ شخص جن کی شاعری میں پڑھتا چلا آیا تھا۔ جن کے تقریریں

وڈیوز پر کئی تھیں۔ اخباروں میں پڑھی تھیں۔

وہ حق گو تھے، ایسے لوگ بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ ان کو دیکھنے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا تھا اور اس وقت اندازہ ہوا کہ وہ کتنے وجہ پر اور خوب صورت انسان تھے۔

عمر کا اندازہ پچاس اور پچھن کے لگ بھگ ہوگا۔ وہ بیساکھی پر تھے۔ ان کی ایک ٹانگ پولیس تشدد کے نتیجے میں ضائع ہو چکی تھی۔ یہ خبر بہت پہلے میں نے اخباروں میں پڑھی تھی۔

”خوش آمدید“ شيروانی صاحب نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ”اسماء بیٹی نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔“

”سر! میں بھی آپ کے بے شمار عقیدت مندوں میں سے ایک ہوں۔“ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“ اسماء نے کہا۔

ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ شاید بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا اور شيروانی صاحب جیسوں کا کمرہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بے شمار مسودے بھی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ جو شاید ان کی تقریروں کے ہوں گے۔

”معاف کرنا میاں یہ کمرہ اس سے بھی کہیں زیادہ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ اسماء بیٹی نے آکر بڑی حد تک اس کو سید کر دیا ہے۔ یہ قابل فخر شاگردوں میں سے ایک ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا ایسی شاگرد ہر استاد کو دے۔“

”جناب! ایسی شاگردی کو پروڈیوس کرنے کے لیے آپ جیسا قابل فخر استاد بھی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”اسماء بھائی کمرے سے باہر چلی گئیں۔“

شيروانی صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے اور میں ان کی باتیں پوری توجہ اور عقیدت سے سنتا رہا۔ ان کی باتوں میں وہی ملک اور قوم کے لیے درد مندی تھی جو شيروانی صاحب جیسے آدمیوں کا حراج ہوتا ہے۔ جس طرح علامہ اقبال اس امت کے لیے تڑپا کرتے تھے۔ اس طرح شيروانی صاحب تڑپ رہے تھے۔

شيروانی صاحب تو اپنی جگہ تھے لیکن اسماء کا کردار بھی کم نہیں تھا۔ وہ جس طرح اپنے استاد اور ایک بڑے انسان کی خدمت کر رہی تھی وہ جذبہ قابل قدر تھا۔ اس وقت میں نے مناسب سمجھا کہ سلیم کے بارے

میں بھی بات کر لی جائے۔ میں نے اسماء سے کہا۔ ”بھائی! اب میں خود اس بات کی گواہی دے سکتا ہوں کہ آپ ایک باوقار خاتون ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ شيروانی صاحب کی خدمت کر کے آپ نے خود کو بہت عظیم ثابت کر دیا ہے تو کیوں نہ سلیم کو بھی اس راز میں شامل کر لیا جائے۔“

”کیا مطلب؟“ شيروانی صاحب چونک پڑے۔

”آپ کس راز کی بات کر رہے ہیں۔“

”اسماء بھائی نے آپ کے بارے میں اپنے شوہر کو بھی نہیں بتایا ہے۔ یہ ان سے چھپ کر آپ کے پاس آیا کرتی ہیں۔“

”ارے یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔“ شيروانی صاحب جلدی سے بولے۔ ”اس طرح تو شوہر کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔“

”جی تو پراہم ہو گئی ہے۔“

”میں نے یہ سوچا کہ آپ اگر کسی کے سامنے نہیں آ رہے تو سلیم کو بھی نہ بتایا جائے۔“ اسماء نے کہا۔

”نہیں بیٹی ایسا مت کرو۔“ شيروانی صاحب نے کہا۔ ”اچھا ہوا جو آج یہ بات میرے سامنے آ گئی۔ تم اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دو۔ میں تم پر کوئی حرف برداشت نہیں کروں گا۔“

”جناب میں ان کے شوہر کو خود آپ کے پاس لے کر آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”تاکہ وہ ہر طرح سے مطمئن ہو جائے۔“

”ہم کچھ دیر اور بیٹھ کر واچس آ گئے۔ میں اس کو لے کر سیدہ حلیمہ ہی کے گھر گیا تھا۔“

”سلیم گھر پر ہی موجود تھا۔“

”وہ ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔“

”سلیم آج میں بھائی کا معاملہ کر کے آیا ہوں۔“

”تم اپنے شک کے لیے ان سے معذرت کرو۔“

”ان کے کردار کا ایک زبردست پہلو ہمارے سامنے آیا ہے۔“

”وہ کیا ہے۔“

”تم نے محمود شيروانی صاحب کا نام تو سنا ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم بھی ان کا ذکر کرتے ہو۔“

”خود میں نے ان کی کئی کتابیں پڑھی ہیں۔“

”اور شاید تمہیں بھی یہ معلوم ہو کہ کسی زمانے میں وہ

جگر مراد آبادی لاہور تشریف لائے تو کچھ مقامی ادیب و شاعر نیاز حاصل کرنے کے لیے ان کی قیام گاہ تک پہنچے۔ جگر صاحب نہایت اخلاص اور تپاک سے ہر ملاقاتی کا خیر مقدم کر رہے تھے کہ ایک دم سعادت حسن منٹو نے آگے بڑھ کر جگر صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قبلہ! اگر آپ مراد آباد کے جگر ہیں تو یہ خاکسار لاہور کا گردہ ہے۔“

سعادت حسن منٹو جب لمبے لمبے ڈگر بھرتے ہوئے تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوئے تو وہاں برآمدے میں ڈگڑوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے رک گئے۔ پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک لہر دوڑی اور وہ جیچ جیچ کر کہنے لگا۔ ”راشد صاحب! ذرا جلدی سے باہر تشریف لائیے۔“ یہ شور سن کر ن۔م۔ راشد کے علاوہ کرشن چندر اور اپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے پاس جمع ہو گئے۔

”راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔“ منٹو نے سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بغیر ڈگڑوں کی سائیکل خدا کی قسم سائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی لٹم ہے۔“

”اس کی آواز بہت تھکی ہوئی اور افسردہ تھی۔“ ان دونوں نے نل کر گل کھلا دیا ہے۔

”کن دونوں نے۔“

”اسمٰ نے اور اس دانشور شیروانی نے۔“

”بھائی صاف صاف بتاؤ۔ کیا سلسلہ ہے۔“

”تم ہمارے گھر آؤ۔ یہاں آکر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ تم جو بیوت کی بات کرتے تھے نا تو ایک جیتا جاگتا بیوت تمہارے سامنے ہوگا۔“

اب تو مجھے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ اس کی آواز بتا رہی تھی کہ معاملہ واقعی بہت سیریس ہے لیکن کیا معاملہ تھا یہ اس کے گھر جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

میں جلدی جلدی تیار ہوا۔ اپنی بایک سنبھالی اور سلیم کے گھر پہنچ گیا۔

گھر پر سوگوار کی کیفیت تھی۔ اسماء ایک طرف بیٹھی ہوئی رو رہی تھی جب کہ سلیم غصے اور پریشانی سے ہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اسماء نے کہا۔ ”خورشید! اچھا ہوا تم آگئے۔ مجھ پر بے وفائی کا الزام لگا تھا۔ اب مجھ پر بدکاری کا بھی لگ گیا ہے جب کہ خدا گواہ ہے کہ میں بے گناہ اور بے قصور ہوں۔“

اسماء کے استاد رہ چکے ہیں۔“

”ہاں یہ معلوم ہے لیکن وہ تو پرانی بات ہوگئی۔“

”اسماء! اپنے استاد کی خدمت کے لیے جایا کرتی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“

میں نے سلیم کو سب کچھ بتا دیا۔ میری بات سن لینے کے بعد سلیم اسماء پر برس پڑا۔ ”بے وقوف عورت تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپالی۔“

”میں ڈرتی تھی کہ کہیں تم ان کا راز فاش نہ کر دو۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔ میں تو خود ان کا عقیدت مند ہوں۔“ سلیم نے کہا۔

”اب یہ بتاؤ تمہارا شک دور ہوا یا نہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے یار۔ اب تو میں اپنی بیوی کا سرید بھی ہو گیا ہوں۔“

”شیروانی صاحب تم سے ملنا بھی چاہتے ہیں۔“ اسماء نے بتایا۔

”میں تو سر کے بل جاؤں گا۔“ سلیم نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ”یار تمہارا بہت شکر ہے کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میں تو نفسیاتی مریض بننا جا رہا تھا۔“ میں اور اسماء ایک دن سلیم کو بھی شیروانی صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ سلیم ان کا معتقد ہو کر واپس آیا تھا۔

بظاہر تو یہ کہانی ختم ہو گئی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ ابھی اور بھی بہت کچھ دیکھنا تھا۔ اس کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آنے والا تھا۔

اور وہ موڑ اس وقت سامنے آیا جب ان کے یہاں پہلی اولاد ہوئی۔

پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے لیکن میں اسے دیکھنے اسپتال نہیں جاسکتا تھا اور نہ ہی گھر جاسکا۔ کئی دنوں کے بعد میں نے سلیم کو مبارک باد کا فون کیا۔

”کس بات کی مبارک باد۔“ سلیم نے کہا۔

”کمال کرتے ہو، بیٹی ہونے کی مبارک باد دے رہا ہوں۔“

”تم یہ مبارک باد اس شیروانی کو دو۔“ سلیم نے مجھ سے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“

”بکواس نہیں ہے یار۔ حقیقت ہے۔“ اس نے کہا۔

”خورشید تم ثبوت کی بات کرتے تھے نا جاؤ کمرے میں جا کر دیکھ لو۔“ بچی سو رہی ہے تم خود سمجھ جاؤ گے کہ بدکاری کس کو کہتے ہیں۔“

میں کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کمرے میں آ گیا۔ ان دونوں کی نواز سیدہ بچی بستر پر سو رہی تھی۔ میں خود اس کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

وہ تو بڑا بوجھو شیر وانی جیسی تھی۔ ویسا ہی خوب صورت چہرہ اور ویسا ہی رنگ۔ جب کہ یہ دونوں میاں بیوی گہرے سانولے تھے اور بچی بہت خوب صورت۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہوں۔ وہ بچی میرے سامنے تھی۔ ایک واضح ثبوت بچی کی صورت میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔

”دیکھ لیتا تم نے۔“ سلیم کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”ہاں دیکھ لیا۔“ میری آواز بھی نڈھال ہو رہی تھی۔ سلیم میرے پاس آ گیا۔ ”جانتے ہو یہ سب کیا ہے۔“

یہ تنہائی ہے۔ ایک عورت جب ایک تنہا شخص سے ملنے جاتی ہے تو شیطان ان کے درمیان آ بی جاتا ہے۔ اب وہ شخص چاہے محمود شیر وانی ہی کیوں نہ ہو یہ سب تو ہوتا تھا۔“

اس دوران اسماء بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے سلیم کی باتیں سن لی تھیں۔ ”میں کس طرح یقین دلاؤں۔ کس طرح۔ اگر میں نے ذرا برابر بھی بے وفائی کی ہو تو میرے لیے جہنم کے دروازے کھول دیئے جائیں۔“

”وہ تو کھل ہی چکے ہیں۔“ سلیم کا لہجہ بہت سرد ہو رہا تھا۔ ”تم نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔“ وہ بولتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد اسماء نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”خورشید! خدا کے لیے سلیم کو یقین دلاؤ کہ میں ایسی نہیں ہوں۔“

”میں کیسے یقین دلاؤں بھابی کیونکہ آج خود میں بہت کمزور پڑ گیا ہوں۔“

میں بھی اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ جہاں سلیم ایک کرسی پر نڈھال بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔

”کیا سوچا ہے تم نے؟“ میں نے پوچھا۔ ”پہلے تم بتاؤ۔ کیا میں غلطی پر ہوں۔ لیکن اس عورت نے میرے ساتھ بے وفائی نہیں کی ہے؟ کیا اس سے بڑا کوئی اور ثبوت ہو سکتا ہے؟“

”اب میرے پاس اس سوال کا جواب ہی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو بھی یقین ہے۔“

”اب میں کیا کہوں۔“ ہاں بھابی سے غلطی ہو گئی ہو گی۔ انسان کو دیکھتے دیر نہیں لگتی لیکن اچھا ہے کہ درگزر کر جاؤ۔“

”خورشید! تم میری نیچر جانتے ہو میں ہر معاملے میں درگزر کرنے والا انسان ہوں لیکن یہ معاملہ ایسا ہے جس نے مجھے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ میں اندر سے کمزور پڑ گیا ہوں۔ برباد ہو گیا ہوں میں۔“

”تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے۔“ ”اب یہی بہتر ہوگا کہ راستے الگ کر لیے جائیں۔“

اس نے کہا۔ ”دیکھو یہ بہت بڑا فیصلہ ہوگا۔“ ”اب ہمیں فیصلہ کرنا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”خورشید اب تم ذرا اس معاملے کو۔۔۔ دوسرے اینگل سے دیکھو۔ اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ اس انداز سے انوالو ہو جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے شوہر میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ وہ اس سے خوش نہیں تھی۔ اس لیے اس نے کسی اور کو اپنا سہارا بنا لیا۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں؟“

”ہاں شاید ایسا ہی ہے۔“ ”شاید نہیں یقیناً۔“ اس نے کہا۔ ”ورنہ کسی اور کے پاس جانے کا جواز ہی نہیں بنتا۔ وہ اس دوسرے مرد کے پاس جا کر خوش رہتی ہے تو مہذب طریقہ یہی ہے کہ شوہر اس کے راستے سے ہٹ جائے۔“

”لیکن اگر وہ عورت اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی ہو تو؟“

”بھی تو براہِ علم ہے کہ وہ اپنی غلطی نہیں مان رہی۔“ سلیم نے کہا۔ ”تم نے خود دیکھ لیا۔ وہ ہٹ دھرم ہو گئی ہے۔ اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے۔ کہتی ہے اس نے کچھ نہیں کیا۔“

”میں کوشش کروں گا کہ بھابی اپنی خطا مان لیں۔ پھر تو تم اپنا فیصلہ بدل لو گے نا۔“

”بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی نہیں مانے گی اور دوسری بات یہ ہے کہ اس کی طرف سے میرا دل کھٹا ہو گیا ہے۔“

”سلیم یہ تو سوچو کہ تمہاری ایک بچی بھی ہے۔“ ”میری بچی یا۔۔۔!“

انور شعور

انور شعور غزل کے مستند شاعر ہیں۔ ان کی غزلیات کے تین مجموعے آچکے ہیں، جن کے نام بالترتیب اندوختہ، مشق سخن اور ی رقص ہیں۔ یہ تقریباً 15 سال سے معروف روزنامہ میں مسلسل ”قطعہ“ لکھ رہے ہیں۔ انور شعور کے ہاں دو موضوعات واضح طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں رومان اور حالات و واقعات ہیں۔ ان کی شاعری کا محور بالخصوص یہ دو موضوعات رہے۔ انکساری اور عاجزانہ طبیعت کے مالک انور شعور نے اس عہد کے تمام لوگوں سے روابط رکھے جن میں رئیس امر وہوی، فیض، جون ایلیا، حافظ الرحمن اور دیگر کئی لوگ شامل رہے۔ آپ سیاسی و سماجی اتار چڑھاؤ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کے خیال میں حالات کی خرابی کے چچے ایک اجالا ہے جس کا اپنے وقت پر ظہور ہوگا اور پاکستانی عوام کے لیے اچھا وقت لے کر آئے گا۔

عزم بھڑاد

اجما مصرعہ کہنے کی جستجو دل میں لیے ایک شاعر تمام زندگی بھی گزرا سکتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ آج کے دور میں شعرا مشق کو تخلیق کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عزم بھڑاد نے ایک خصوصی نشست میں کیا۔ ان کا شعری مجموعہ 1997ء میں ”تعبیر سے پہلا“ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اشتہاری کمپنی میں بحیثیت ”کونسپٹ رائٹر“ اس فانی دنیا سے کوچ کرنے تک وابستہ رہے۔ مختلف اشتہارات کے لیے بے شمار گیت اور لازوال مصرعے تخلیق کر چکے ہیں، عزم بھڑاد کے خیال میں شاعری کے علاوہ تمام اصناف میں اظہار صرف کس معاش کی سبیل ہے، اس کو ہم تخلیق نہیں کہہ سکتے تخلیق ہمارے اندر کو در یافت کرتی ہے جب کہ کمرشل ازم میں ہم ”ماہر“ کو دریافت کرتے ہیں۔ دل سے جنم لینے والی خواہش تخلیق کہلاتی ہے اور تقاضے کے تحت کچھ لکھا جائے تو وہ کمرشل ازم کہلاتا ہے۔

انتہاس: باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چائے از: خرم بیل

”اب جس کی بھی ہو۔ یہ بہر حال بچی ہے۔“
یہ جان لینے کے باوجود کہ اس بچی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس کی پرورش کے اخراجات برداشت کرتا رہوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”چاہے اسماء کہیں بھی رہے۔ کسی کے ساتھ بھی رہے۔“

اس نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی محاش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ویسے بھی اسماء کی غلطی نے کوئی گنجائش کہاں رہنے دی تھی۔

میں نے اتمام حجت کے طور پر ایک بار پھر اسماء کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اگر اپنی غلطی مان لے تو ہو سکتا ہے کہ سلیم معاف ہی کر دے۔ کیونکہ وہ ایک بڑے دل کا انسان ہے۔

لیکن اس کی وہی رٹ تھی کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔

میں ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر واپس آ گیا۔ کچھ دنوں کے بعد خبر مل گئی کہ سلیم نے اسماء کو طلاق دے دی ہے اور اسماء اپنے گھر والوں کے پاس واپس چلی گئی ہے۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ محمود کے پاس کیوں نہیں گئی۔ کیسی عجب پتویش تھی۔ حالانکہ ان دونوں میں عمر کا بہت فرق تھا۔ لیکن اس گندے فعل کو انجام دیتے ہوئے یہ فرق کہاں دیکھا گیا تھا اور اب تو وہ سلیم سے آزاد ہو چکی تھی اب اس کو کون روک سکتا تھا۔

وہ اب محمود شیروانی سے شادی بھی کر سکتی تھی لیکن وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔ بہر حال یہ اس کا اپنا معاملہ تھا۔

اس کے بعد پھر میری اسماء سے ملاقات نہیں ہوئی اور آج تک نہیں ہو سکی۔ جب اس کہانی کا ایک اور موڑ سامنے آ چکا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد اخبار میں ایک خبر پڑھنے کو ملی کہ سر جانی ٹاؤن کے ایک گھر سے مشہور دانشور اور شاعر محمود شیروانی کی لاش ملی ہے۔

خبر کے مطابق شیروانی صاحب وہاں روپوشی اور تنہائی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ایک رات ان پر دل کا دورہ پڑا۔ چونکہ وہ بالکل تنہا تھے۔ اس لیے کوئی ان کی مدد نہیں کر سکا اور اسی عالم میں ان کا انتقال ہو گیا۔

لاش اس وقت دریافت ہوئی جب آس پاس کے گھروں کو سخت بدبو محسوس ہونے لگی۔ پولیس کو بلا کر دروازہ

یہ بات جان لیا گیا۔

اس وقت بچے کی ماں اپنے ماحول سے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر ماں کو خوب صورت بچوں کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ اس طرح ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والا بچہ بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اگر ماں کا کوئی آئیڈیل ہو اور وہ اس آئیڈیل کے بارے میں سوچتی رہتی ہو تو اس آئیڈیل کے نفوس اس کے پیٹ میں پرورش پانے والے بچے میں چلے جاتے ہیں۔ ”جب میری تخلیق ہوئی تو میری ماں کی آنکھوں میں کس مرد کا چہرہ تھا۔“



لب باک

جناب ایڈیٹر

السلام علیکم

ایک بار پھر میں ایک سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سرگزشت میری ایک دیرینہ دوست کی ہے جسے میں نے کہانی کا رنگ دیا ہے۔ کچھ تبدیلی بھی کی ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔

راحت وفا راجپوت

(لاہور)

مجھے سلام کیا مگر میں تو جیسے سرزد ہی ہو گئی تھی۔ اس شخص میں عجیب سی کشش تھی۔ میں ایک تک اسے دیکھ رہی تھی۔ میرے اس طرح دیکھنے سے اس کے چہرے پر ہنس بکھری۔ تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے ایک بار کمر مانا، اٹھ کر

میں اپنے آفس میں بیٹھی تھی کہ چڑا اسی نے کسی آدمی کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے دوپٹا سلیپے سے سر پر اوڑھ لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد ایک جوان آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ اس نے

ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

لی اور شان و شوکت سے شادی کرادی۔

”جی بیجیے۔“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بچے اس کے قریب کھڑے تھے۔ ”جی۔“ میں نے کہہ کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ ”اپنے دونوں بچوں کو آپ کی اکیڈمی میں داخل کروانے آیا ہوں۔ ہم اس محلے میں سنے شفٹ ہوئے ہیں۔“ اس کی آواز بھی بہت سحر انگیز تھی۔

ضروری کاغذی کارروائی کے بعد بچوں کا داخلہ ہو گیا۔ اس نے فیس ادا کی اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔ دل و دماغ میں عجیب سی پہل چلی ہوئی تھی۔ وہ میری ذات کے سمندر میں سمندر ڈال گیا تھا۔ پتا نہیں اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اب تک میں نے بھی کسی مرد کے لیے اپنے اندر کوئی کشش محسوس نہیں کی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ پھر کیا ہوا یہ بتانے سے پہلے میں اپنے ماضی کا تعارف کروا دوں۔

میرا تعلق ایک سفید پوش گھرانے سے ہے۔ ہم دو بہنیں اور ایک بھائی تھے۔ بھائی بڑا تھا اور اس سے پانچ سال چھوٹی میں یعنی آمنہ اور مجھ سے چھ سال چھوٹی رابعہ تھی۔ اولاد میں اتنا وقفہ قدرتی طور پر ہی تھا۔ ابا ایک پرائمری اسکول میں پٹی پی ٹی تھے۔ محدود آمدنی میں اسی جان بہت سلیقے سے گھر چلا رہی تھیں۔ ندیم بھائی نے میٹرک کرنے کے بعد ٹیکنیکل کالج سے الیکٹریشن کا ڈپلوما کورس کیا تھا اور انہیں ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری مل گئی تھی۔

ان کا اصرار پر بہت مہربان تھا۔ اس کے گھر میں جب بھی بجلی سے متعلق کوئی کام نکلتا تو وہ بھائی کو بلا دیتا تھا۔ یہ روز روز کا جانا رنگ لے آیا۔ اسفر کی بیٹی نے ندیم بھائی کو پسند کر لیا۔ ندیم بھائی خوب صورت اور اونچے لمبے قد کے جوان تھے۔ وہ لڑکی عمر میں ان سے بڑی تھی اور صحت مند بھی تھی۔

پتا نہیں اس نے کیسا چکر چلایا کہ ندیم بھائی اسی جان کے سامنے تن گئے کہ شادی کروں گا تو فرزند سے۔ اسی ابو نے بہت سمجھا لیکن وہ نہ مانے تو ہم سب بھائی کا رشتہ لے کر فرزند کے گھر پہنچ گئے۔ اس کے والدین نے رسما بھی

وقت نہیں مانگا اور فوراً ہی ہاں کر کے دو ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی دے دی۔ اسی نے جو پیسے جمع کر رکھے تھے وہ سب لگا دیے۔ بھائی کا کہنا تھا کہ دلیر کسی بہت اچھے ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ ان کی یہ ضد پوری کرنے کے لیے ابا نے

کچھ دوستوں سے قرض لیا۔ اسی نے محلے کی کیمپن فیل از وقت

فرزاند بھائی چڑچڑ سی تھیں، پہلے دن سے تو انہوں نے ہم گھروالوں کو کوئی لفٹ نہیں کرائی اور شادی کے ایک ماہ بعد ہی اپنے گھر چلی گئیں۔ بقول ان کے یہاں چھوٹے سے گھر میں ان کا دم گھٹتا ہے۔ بھائی نے بھی اس کی تائید کی اور یوں وہ اپنے والدین کے گھر ہی رہنے لگیں اور پھر بھائی بھی ہفتے میں چار دن ادھر گزارنے لگے۔ شادی کے بعد تنخواہ لے کر آئے تو آدمی امی کو دی ساتھ ہی یہ کہا کہ اب بیوی کو خرچہ بھی دینا ہے۔

امی پریشان بیٹھی رہ گئیں۔ کیمپیاں اور قرضے سب منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد کیمپی دیتا رہے گا۔ ابا بھی فکر مند تھے اور اسی فکر مندی میں وہ بلڈ پریشر کے مریض بن گئے۔ ستم در ستم یہ کہ شادی کے تین ماہ بعد بھائی کا سالہا جو کہ وہی میں ہوتا تھا اس نے ندیم بھائی کو دینے بلوانے کا کہہ دیا۔ بھائی دل و جان سے تیار ہو گئے۔ امی نے کہا۔ دو بیٹیوں کے ساتھ ہم بوڑھے ماں باپ کیا کریں گے مگر ہوا وہی جو بھائی کی مرضی تھی۔ بھائی وہی چلے گئے ہم حیران اور بے بس تھے۔ ابا دونوں میں بوڑھے گلنے لگے تھے۔ امی روٹی رنجیں۔ میں میٹرک کا

استحان دے کر فارغ تھی اور میرا ارادہ کسی اچھے کان میں داخلہ لینے کا تھا مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی بندگی میں آگئے ہوں فکر سے ابا دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔

قرضہ دینے والے اب واپسی کا تقاضا کر رہے تھے۔ دو ماہ تک تو بھائی نے دو چار پارسل کا فون کیا اور اپنے سیٹ ہونے کے بعد کچھ پیسے بھیجے کا وعدہ بھی کیا۔

تقدیر نے ایک اور کاری وار کیا۔ ایک رات ابا کو ہارٹ ایک ہوا اور وہ ہم تینوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ہم روتے جیسے دکھ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ماں کا ویران چہرہ ہم بہنوں کو دہلائے دیتا تھا۔ امی کم صدمہ ہو گئی تھیں۔ بھائی کا فون آتا تھا۔ وہ بھی رورہا تھا۔ باپ کا آخری بار منہ نہ دیکھنے پر غم زد تھا۔

صدمہ کچھ کم ہوا تو ارد گرد دیکھا کہ اب زندگی کیسے گزرے گی۔ امی سیدی سادی عورت تھیں۔ ابا ہی گھر اور باہر کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔ اب ہم تین عورتیں تھیں۔ رابعہ چوتھی جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ اسے اس

تعلیم حالات کا ادراک نہیں تھا۔ ہم ماں بیٹی ایک دوسرے کی غم گسار تھیں۔ ابا کی تنخواہ بند ہو گئی۔ ان کی پنشن ادا ہونا جات کے ملنے میں ابھی کچھ عرصہ لگتا تھا۔ جمع پونجی کچھ نہیں

تھی۔ بھائی نے ابھی تک ایک روپیہ بھی نہیں بھیجا تھا۔ بھائی اور اس کے گھر والے ابا کے مرنے پر تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے پھر دوبارہ کسی نے ہٹ کر نہ پوچھا۔

میں بہت پریشان تھی۔ اس زمانے میں موبائل فون نہیں آئے تھے۔ میں نے ایک دن بھائی کو امی سے چھپ کر فون کیا اور گھر کے حالات پتائے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی کچھ کریں گے۔ چند دن بعد بھائی کا فون آیا کہ انہوں نے فرزندہ بھائی کو پیسے بھیجے ہیں وہاں جا کر پانچ ہزار روپے لے لیں۔ امی بہت خوش ہوئیں مگر مجھے اس بات کا شدید دکھ ہوا کہ ماں کو پیسے بھیجنے کی بجائے بیوی کو بھیجے ہیں اور اب ماں وہاں جا کر بہو سے پیسے مانگے گی مگر امی اسی بات پر خوش ہو گئی تھیں کہ چلو آمدنی کا کوئی سلسلہ تو ہوا۔ اگلے دن امی بھائی کے پیسے جا پنہیں اور پیسے لے آئیں۔ ہم نے کچھ راشن اٹھایا فون اور کھلی، عیس کے بل ادا کیے۔

میرا رزلٹ آ گیا تھا۔ میں نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ کالج کا خیال تو کب کا بھول چکی تھی۔ پرائیویٹ ایف اے کرنے کی تیاری شروع کر دی اس طرح تین ماہ اور گزر گئے۔ امی بھائی کی طرف ا کیلی ہی جاتی تھیں۔ ایک بار میں نے کہا تو ٹال گئیں اور بھران کی داپھی بھی کافی دیر بعد ہوئی تھی۔ اگلے ماہ جب بھائی سے پیسے لینے جانا تھا تو امی کو بہت تیز بخار ہو گیا ہر ماہ پانچ تاریخ کو وہ جاتی تھیں۔ بخار کی وجہ سے دو دن نہ بستر سے اٹھ سکیں پھر رابہ کو ساتھ لے کر چلی گئیں۔ واپسی پر ان کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ پریشانی یہ ہوئی تھی کہ بھائی نے کہہ دیا کہ آپ مقررہ دن نہیں آئیں تو پیسے خرچ ہو گئے ہیں۔ اب اگلے ماہ ملیں گے۔

”مجھے شدید غم آ گیا۔ بھائی کا فون آیا تو میں نے حکایت کی تو وہ اتنا مجھے ڈانٹنے لگے اور بھائی کی طرف داری کرتے رہے۔ میں خون کے کھونٹ پی کر رہ گئی۔“

اگلے ماہ میں نے فیصلہ کیا کہ امی کے ساتھ خود جاؤں گی۔ امی مسلسل انکار کرتی رہیں مگر میں بھی ڈٹ گئی۔ ہم دونوں ماں بیٹیاں صبح دس بجے بھائی کے گھر پہنچے۔ رابہ کو ہم نے بھائی کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ سخت گرمی کے دن تھے۔ بہت بار تیل دینے کے بعد ایک ملازمہ نے دروازہ کھولا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ اگلے ایک گھنٹے تک ہم وہیں بیٹھے رہے۔ ملازمہ نے پانی تک کا نہ پوچھا۔ امی کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔ ملازمہ صفائی کر رہی تھی۔ بھائی اور ان کی والدہ سو رہی تھیں۔ میں نے پانی مانگا تو سادہ پانی لے کر

آئی۔ میں نے کہا۔ ”بھائی کو بتاؤ ہم آئے ہیں۔“ وہ کہنے لگی۔ ”مالکن بہت ناراض ہوئی ہیں اگر سوے میں اٹھایا تو۔“ تب میں نے سمجھا کہ ہر بار یہاں سے واپسی پر امی اتنی تڑھا ل کیوں ہوتی ہیں۔ بہو کے سامنے ہاتھ پھیلائے کی ذلت، بھوک اور پیاس کی اذیت۔ اپنی بے بسی اور کسٹری کا احساس لے کر وہ یہاں سے لوٹتی تھیں۔

دو چہر کا ایک نچ گیا ہم بیٹھے رہے۔ آخر بھائی اپنے کمرے سے باہر نکلیں اور بغیر کسی سلام دعا کے کچن میں چلی گئیں۔ تو بین کے احساس نے میری رگوں میں دوڑتے لہو کو گرما دیا۔ میں نے بھائی کے پاس جا کر کہا۔ ”ہم دس بجے کے آئے ہوئے ہیں۔ امی آپ کے شوہر کی ماں ہیں اور ان کی ذرا براہ عزت نہیں آپ کے دل میں۔“

بھائی بڑبڑ گئیں اور کہنے لگیں۔ ”شکر نہیں کرتیں تم کو میرا شوہر اب بھی اپنی کمائی کھلا رہا ہے، احسان ماننے کی بجائے بدتمیزی کر رہی ہو۔ چلو کوئی پیسے نہیں ہیں، آ جاتی ہیں فقیر نیاں میرے دروازے پر۔“

امی مجھے روکے لگیں۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ میرے مبر کا پانچ لہر ہز ہو گیا۔ میں نے بھی بہت سنائیں بھائی کی والدہ بھی باہر آ گئیں۔ وہ بھی بنی کو شہید دیے لگیں۔ امی نے بھائی کے آگے ہاتھ جوڑے کہ آمنت کی جگہ میں معافی مانگتی ہوں۔ بھائی نے امی کو غصے سے پیچھے دھکا دیا۔ امی پیچھے گر پڑیں۔ غصے سے میری ٹانگیں کا پھٹنے لگیں۔ میں نے امی کو اٹھایا اور بھائی سے کہا۔ ”تمہارے شوہر کا فون آئے تو اس سے کہنا اس کی ماں اور ہمیں آج سے مرگئی ہیں۔ اب یہ پانچ ہزار بھی وہ اپنے سسرال والوں کو ہی کھلائے۔“ یہ کہہ کر میں امی کو لے کر باہر آ گئی۔

گھر سے نکلتے ہی ہم ماں بیٹیاں ایک دوسرے سے لٹ کر رونے لگیں۔ کتنی دیر گزرتی۔ کلی میں آتے جاتے لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رکنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے دوپٹے سے امی کا چہرہ صاف کیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھر آ گئی۔

”میں ندیم کو بتاؤں گی کہ اس کی بیوی نے میری کتنی بے عزتی کی ہے۔ میں ہر بار چپ چاپ بے عزتی کر دیا کرتی تھی کہ میرا بیٹا پردیس میں ہے وہ پریشان ہو گا۔“

میں ماں کی سادہ دلی پر ہنس دی۔ رات کو ندیم بھائی کا فون آ گیا اور ہماری کوئی بات سنے بغیر انہوں نے امی اور مجھے وہ سنائیں، بیوی کے آنسوؤں نے انہیں مشتعل کر دیا

تھا۔ میں نے بتانے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک نسی۔ عادت کی وجہ سے ریسپونڈ نہیں اٹھایا تھا اسبیکر آن کر دیا تھا کہ امی بھی سن سکیں وہ کم صم سب باتیں سن رہی تھیں پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور سیٹ کے قریب جا کر کہا۔ ”آج کے بعد تم میرے لیے مر گئے ہو، میرا اور میری بیٹیوں کا تم سے کوئی رشتہ نہیں۔ میں آج یہ کہہ دیتی ہوں کہ میرے جنازے پر بھی تمہیں نہ آنے دیا جائے۔“ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

میں خود ہٹا بکا رہ گئی۔ امی کے چہرے پر اب سکون تھا۔ ایک ماں کا دل ہی جانتا ہے کہ اس پر کیا طوفان گزر گیا ہے مگر باہر سے امی پرسکون تھیں۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا کہ رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ زندگی کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اُمید تھی کہ چند دن تک ابا کی چٹن شروع ہو جائے گی اور کچھ رقم بھی مل جائے گی۔

وہ رات میں نے جاگ کر گزاری اور آئندہ کے لیے پلاننگ کرتی رہی۔ وقت نے مجھے بڑا کر دیا تھا۔ ابا کی چٹن لگ گئی جو کہ بہت معمولی سی رقم تھی۔ بہر حال نہ ہونے سے تو بہتر تھی جو پیسے ملے ان سے بھائی کی شادی پر لیا ہوا قرضہ واپس ہوا۔ کمپنیوں کا حساب کیا گیا۔

ہمارا گھر اپنا تھا۔ نیچے دو کمرے باورچی خانہ اور چھوٹا سامن تھا اور ایک کمرہ اور باہر دوم تھا جو کہ بھائی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ امی سے مشورہ کر کے میں نے اوپر ایک اور کمرہ، باورچی خانہ بنوانے کا فیصلہ کیا۔ مناسب پیسوں میں یہ کام ہو گیا تو ہم اوپر شفٹ ہو گئے اور نیچے والا حصہ کرائے پر دے دیا۔

ہماری گلی سے ڈرائیوٹ پر ایک پرائیویٹ اسکول کھلا تھا۔ میں نے وہاں جاب کر لی۔ میرے میٹرک کے بہترین نمبر میرے کام آئے اور چھوٹی کلاسز کو پڑھانے کے لیے مجھے رکھ لیا گیا۔ شام کو محلے کے بچے مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آنے لگے۔ میں نے اپنے آپ کو شیٹین بنا لیا۔ دن رات محنت، بھائی نے کئی بار فون کیا۔ سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر ہم لائن کاٹ دیتے۔ گھر میں بھائی کا ذکر بھی نہیں ہوتا تھا۔ زندگی آسان ہونے لگی۔ میں ایف اے کر کے بی اے کر رہی تھی۔ جب سنا کہ بھائی کو بیٹا ہوا ہے اور وہ ندیم بھائی کے پاس دینی چلی گئی ہیں۔ اس خبر کو ہم نے بڑی بے نیازی سے سنا مگر چھپ کر ہم تینوں ہی رونے لگے اور پھر جب میں نے بی اے کر لیا تو ٹیوشن والے بچے اتنے ہو گئے کہ میں نے

نیچے والا حصہ خالی کر دیا امی کے نام سے اکیڈمی بنائی۔ چند سالوں میں ہی اللہ کی مہربانی اور ہماری محنت سے حالات بدل گئے۔ آہستہ آہستہ میں نے چند لڑکیوں کو سمجھ رکھ لیا۔ راجہ بھی پڑھانی تھی۔ میں بھی بڑی کلاسز کے بچوں کو پڑھاتی تھی۔ ارد گرد میری اکیڈمی کا نام مشہور ہو گیا۔ پہلے ٹیل تک تھی پھر میں نے میٹرک تک کر لی۔ اب امی جانتی تھیں کہ میری شادی ہو جائے ہر ماں کی طرح انہیں میری فکر تھی مگر میں اپنی ماں اور بہن کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتی تھی، جب امی نے زیادہ اصرار کرنا شروع کیا تو میں نے کہا۔ ”میری شرط ہے کہ کوئی ایسا بندہ ڈھونڈیں جو میرے گھر میں رہے۔“

امی خاموش ہو گئیں مگر وہ میرے لیے رشتہ دیکھتی رہتی تھیں۔ اتنے سالوں میں ندیم بھائی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ انہوں نے گویا ہمیں بھلا دیا تھا۔ ہم نے بھی ان سے رابطے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ایک بار ایک محلے دار نے بازار میں انہیں دیکھا تھا، ان سے ملا بھی تھا۔ پتا چلا کہ دو بچے ہیں تین ماہ کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ بقول اس محلے دار کے کہ ندیم نے ایک بار بھی ماں اور بہنوں کا نہیں پوچھا تھا۔ شاید ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ بیٹے اور ماں اللہ کی آزمائش ہیں۔

ہم نے بھی صبر کر لیا تھا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ میری عمر پچیس سال ہو چکی تھی۔ میں بہت خوب صورت اساتذہ تھی مگر اب تک کسی کو دیکھ کر دل دھڑکا نہیں تھا پہلی بار جمال کو دیکھا تو دل میں جیسے خواب یکا یک بیدار ہو گئے۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ وہ اعیال دار ہے۔ اسی لیے تو دل کو پاگل کہا گیا ہے۔ یہ پاگل پن ہی تو تھا جو مجھے پاگل بنائے دے رہا تھا۔

جمال اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والے گھر میں کرائے پر شفٹ ہوا تھا۔ یہ مکان دو سال سے خالی تھا۔ مالک مکان نہیں اور پلے تھے۔ اب جمال کو کرائے پر دیا تھا۔ جمال کا تعلق کسی گاؤں سے تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ کسی سرکاری محلے میں اچھی پوسٹ پر ملازم تھا۔ جو بات اس سے پہلے میں نے بھی محسوس نہیں کی تھی وہ اب سرچڑھ کر محسوس ہونے لگی تھی۔ بالکل فلموں جیسی پھوٹیشن ہو گئی تھی۔ بچوں کا داخلہ ہو گیا تھا۔ اگلے دن وہ اکیڈمی آ گئے۔

ٹوانہ

شاہ پور کوہستان نمک کے دامن علاقہ میں ٹوانہ آباد ہیں اور انہوں نے پنجاب کی تاریخ میں اس سے کہیں زیادہ نمایاں کردار ادا کیا جو محض ان کی تعداد دیکھتے ہوئے مشکل نظر آتا ہے۔ انہیں پنوار راجپوت اور سیال دگھیا والے مورث اعلیٰ کی نسل سے ہی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ پنجاب میں غالباً سیالوں کے ساتھ ہی آئے اور یقیناً پندرہویں صدی ختم ہونے سے پہلے۔ وہ سب سے پہلے دریائے سندھ پر جہانگیر کے مقام پر آباد ہوئے لیکن انجام کار شاہ پور قلعہ میں اپنے موجودہ مسکن کو چلے گئے جہاں ٹوانہ میں اپنا مرکزی قصبہ تعمیر کیا۔ اس سے بعد کی تاریخ ”دی چینس آف پنجاب“ کے صفحات 519 تا 534 اور کرنل ڈیویز کی شاہ پور رپورٹ کے صفحہ 40 سے آگے بیان کی گئی ہے۔ باقی کا ضلع سکھوں کا مطیع ہو جانے کے لیے کافی عرصہ بعد تک ٹوانوں نے اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ اب وہ ایک نیم گلہ بان، نیم کاشکار قبیلہ، سپاہی پیدا کرنے والے مضبوط آدمیوں کی نسل ہیں۔ تاہم ان کے اوصاف افسوس ناک طور پر ان کی انتہائی جھگڑالو افتاد سے داغدار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندرون خانہ اور جس کسی کے ساتھ بھی واسطہ پڑا ان کی غیر محنت شورش جاری ہے۔

اقتباس: پنجاب کی اقلیتیں

از: سر ایڈلر

مرسلہ: ندیم حسن صدیقی

انہیں جمال ہی چھوڑنے آیا تھا۔ ایک بار پھر اسے سامنے دیکھ کر میری دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔ دودن گزرے تھے کہ اسی نے مجھے بتایا کہ ہمارے ساتھ والے گھر میں نئے لوگ آئے ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے، بیوی آج ملنے آئی تھی۔ گاؤں کی ہے۔ ادھر کوئی رشتہ دلدہی نہیں ہے۔ میں نے جمعہ والے دن ان کو اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔

میرا تو خوشی سے دل ہی کل گیا۔ جمال سے ملاقات کا راستہ ہموار ہو گیا تھا۔ جمعہ والے دن میں نے بہت اہتمام سے شاندار کھانا بنایا۔ بہترین برتن نکالے۔ اپنے نئے اسٹائش ریکی میڈ سوٹ کا انتخاب کیا۔ میرے بال بہت لمبے اور سیاہ تھے۔ اسے میں نے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ میں ایسا کیوں کر رہی تھی مجھے خود پتا نہیں تھا۔ مقررہ ٹائم پر وہ لوگ آ گئے۔ جمال بلیک ٹیٹ اور سرخ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ سیاہ بال اس کی پیشانی پر بکھرے بکھرے تھے۔ وہ بہت ہینڈم لگ رہا تھا۔ مجھے اس کی بیوی کو دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ ایک کم صورت اور دیہاتی سی لڑکی تھی۔ اتنی گرمی میں بھی اس نے ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا۔ بچے بھی عام سی شلوار قمیصوں میں تھے۔ مجھے جمال کی بیوی عابدہ پر بہت رشک آیا۔ اس عام سی لڑکی کی قسمت کتنی اچھی تھی۔ انہیں کھانے کی دعوت دی تو جمال نے کہا۔ ”آپ

نے تو بہت تکلف کر لیا ہے۔“

میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ عابدہ بہت انارڈی پن سے کھا رہی تھی۔

بچوں کو کھانا میں نے ہی کھلایا۔ کھانے کی جمال نے بہت تعریف کی۔ میری تو جیسے محنت ہی وصول ہو گئی۔ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں عابدہ سے کہا۔ ”باجی! بہت گرمی ہے آپ موسم کے کپڑے پہنیں۔ ریشمی کپڑوں میں آپ کو گرمی لگ رہی ہوگی۔“

”ہاں لے لوں گی۔“ اس نے بے پردائی سے جواب دیا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ عابدہ کو بازار سے کچھ اچھے کپڑے دلا دیں۔ اسے فیشن اور کلرز کا کچھ پتا نہیں ہے۔“ جمال نے مجھ سے کہا۔

”جی ضرور۔ جب آپ کہیں۔“ میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ رات گئے تک ان کا ہمارے گھر رہتا میری زندگی کا خوب صورت لمحہ تھا۔ عابدہ نے امی کو کہہ دیا کہ آپ میری امی ہیں تو میری امی نہال ہو گئیں۔ امی کو جمال میں

ناپا ہونا بیٹا نظر آ گیا تھا۔ باتوں باتوں میں چپ امی ندیم ہماری لے بارے میں بتاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں تو جمال نے کہا۔ ”آئی آپ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیں اور عابدہ کو بہو اور بچوں کو اپنے بھوتے۔“

ای خوشی سے رو پڑیں۔ اگرچہ وہ میرے سامنے ندیم بھائی کا کبھی نام نہیں لیتی تھیں مگر میں جانتی تھی کہ بیٹے کی جدائی کا دکھ انہیں اندر سے کھا رہا ہے۔ اس دن کے بعد عابدہ بے تکلفی سے ہمارے گھر آنے جانے لگی۔ جمال کم ہی آتا تھا۔

میرے کمرے کی کھڑکی سے جمال کے گھر کا صحن صاف نظر آتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے وہ لوگ صحن میں سوتے تھے۔ ایک بچہ جمال کے ساتھ اور دوسرا عابدہ کے ساتھ سوتا تھا۔ میں رات گئے تک اسے دیکھتی رہتی تھی۔ کھاتے پیتے ہنستے مسکراتے دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی تھی۔

اسی نقش نے مجھے بیمار کر دیا۔ بہت تیز بخار تھا۔ گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے اکیڑی میں بچوں کی تعداد بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ رابعہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ وہ بھی کالج سے آکر بچوں کو پڑھاتی تھی۔ دو دن سے مجھے بخار تھا۔ عابدہ کئی بار میری خبر لینے آ چکی تھی مگر وہ ستم گرد آیا نہ حال پوچھا۔ تیسرے دن بخار کچھ ہلکا ہوا۔ امی میرے لیے کھجری بناری تھیں۔ رابعہ نیچے اکیڑی میں تھی کہ جمال آ گیا۔ امی نے کمرے میں آکر مجھ سے کہا کہ میں دوپٹا وغیرہ درست کر لوں۔ جمال میری خبر لینے آیا ہے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ سبھل کر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ میرے ہاتھ لرز رہے تھے۔ پھر کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ بڑے غور سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں ملیں تو جیسے دل میں طوفان سا آ گیا۔ میں نے جلدی سے نگاہ جھکا لیں۔ پھر اسے پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ ایک دم اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

بیماری کے دوران بھی میں رات کو کھڑکی سے ان کے صحن میں ضرور دیکھتی تھی۔ اگرچہ دماغ مجھے سمجھاتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ مرد اور دو بچوں کا باپ ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ جمال کی بہن کی شادی عابدہ کے بھائی سے ہوئی ہے۔ یعنی وٹے سٹے کا معاملہ ہے۔ یہ ایسی صورت حال تھی کہ جمال ساری زندگی عابدہ کے ساتھ رہنے کا پابند تھا۔ مگر دل

یہ ساری باتیں نہیں مانتا تھا۔ وہ تو ضدی بچے کی طرح چل رہا تھا کہ جمال ہی چاہیے۔ جب بھی عابدہ اور جمال ہمارے گھر آتے یا ہم ان کے گھر جاتے، میں جان بوجھ کر عابدہ پر ہمدردی کے انداز میں تنقید کرتی تو جمال کے ماتھے پر ہل گہرے ہو جاتے۔ عابدہ گاؤں کی لڑکی تھی۔ اس کی چال ڈھال رہن بہن سب میں گنوار پن جھلکتا تھا۔ یہی ایک بات تھی جس کا میں نے فائدہ اٹھایا۔ رفتہ رفتہ جمال سب کے سامنے ہی عابدہ سے بے زاری اور اسٹلٹ کا انداز اختیار کرنے لگا۔ دوسری طرف میں نت نئے لباس خوب صورت ہمیں اسٹائل اور اپنے ہر انداز سے جمال کو متاثر کرنے میں لگی ہوئی تھی جس طرح عورت کو خدا نے ایک خاص حس دی ہے کہ وہ مرد کی نگاہ کو سمجھ جاتی ہے اسی طرح مرد کے پاس بھی وہ نظر ہوتی ہے جس سے عورت کی نظر پچان لیتا ہے کہ اس میں نفرت ہے یا محبت۔

عابدہ اور جمال کی شادی کی سالگرہ تھی۔ یہ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ فضا میں ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس رچا ہوا تھا۔ شام کو ہلکی سی خشکی محسوس ہونے لگی تھی اور موسم بے حد دلکش ہو گیا تھا۔ امی کے کہنے پر میں نے عابدہ کے لیے خوب صورت ساجیوری سٹ اور جمال کے لیے پنٹ شرٹ خرید لی تھی۔ بچوں کے لیے بھی گفٹ تھے۔ شام کو ہم ان کے گھر گئے۔ میں ہمیشہ کی طرح اسٹائلش کپڑوں میں ملبوس تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جمال کی آنکھوں میں پسندیدگی اتر آئی جس نے میری دھڑکن تیز کر دی۔ عابدہ تیار ہو رہی تھی۔ میروں رنگ کا سٹلٹ ستارے سے سجاوٹ اس نے پہن رکھا تھا۔

”آج آپ کو ساڑی باندھنی چاہیے تھی۔“ میں نے جمال کے سامنے ہی اسے کہا۔ ”مجھے نہیں پہننی آتی۔“ وہ بولی۔

”آمنہ جی آپ اسے ساڑی باندھنا سکھا دیں اس جال کو تو کچھ پتا نہیں ہے۔“ جمال مسخرانہ انداز میں بولا۔ ”میں دو ساڑیاں لایا تھا۔ ایک بھی نہیں پہنی اس نے۔“

”کوئی بات نہیں میں سکھا دوں گی۔ میں آپ کے لیے پنٹ شرٹ لائی ہوں۔ آپ یہیں بیٹھ تب تک میں عابدہ کو تیار کرائی ہوں۔“

ایک ہلکے رنگ کا سوٹ اور اپنی لائی ہوئی جیولری عابدہ کو پہنا کر اس کا میک اپ کیا تو وہ ایک دم بدلی ہوئی

کلنے لگی۔ جمال بھی تیار ہو کر باہر آیا تو بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔
 ”شکر ہے۔“ وہ میری طرف جبک کر آہنگی سے بولا۔ ”یہ میرا بھی فورٹ لکڑ ہے۔ ہم دونوں کی پسند کتنی ملتی ہے۔“

میں خاموش رہی۔ امی اور رابعہ، عابدہ کے ساتھ مل کر ٹیبل پر کھانا لگا رہی تھیں۔
 ”آپ کو پسند آیا مجھے خوش ہوئی۔“
 ”کاش کبھی عابدہ میرے لیے شاہنگ کرتی مجھے تو حسرت ہی رہی۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ میں نے کہا۔
 ”جی ضرور۔“

”آپ اتنے بڑے لکھے ہیں تو آپ کے والدین نے کوئی پڑھی لکھی لڑکی نہیں نہ دیکھی۔“
 ”بس آمنہ جی، میری بہن جو مجھ سے بڑی ہیں عابدہ کے بھائی کے گھر ہے۔ وہ بے اولاد ہیں ان کا گھر نہ اجڑے اس لیے مجھے یہ قربانی دینا پڑی۔“
 ”ہنہ!“ میں نے ہنکارہ بھرا۔

”مگر زندگی کا سبھی ہم حراج نہ ہو تو سفر بہت مشکل کلنے لگتا ہے۔ میں عابدہ کو کسی دوست کے گھر نہیں لے جاسکتا۔ وہ اپنی زندگی میں مگن ہے مگر میرے اندر کا انسان نا آسودہ ہے۔ میں زندگی گزار نہیں سکتی رہا ہوں۔“ پہلی بار جمال نے تفصیل سے بات کی اور اپنے دل کا درد بتایا۔
 میں اسے تسلی دینے لگی۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔
 ”آپ سے بات کر کے دل کو عجیب سا سکون ملا ہے، اگر آپ براندہ نامیں تو آپ کو فون کر لیا کروں۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے برا نہیں لگے گا۔“ یہ کہہ کر میں اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

اس دن کے بعد سے تو اتر سے اس کے فون آنے لگے۔ کافی دیر دیر تک باتیں ہونے لگیں۔ پھر ایک دن جمال نے مجھ سے اظہار محبت کر دیا۔ اس نے کہا۔ بہت عرصے سے جس خوشی کی مجھے تلاش تھی وہ تم سے ملی ہے۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں بھی تو یہی چاہتی تھی، سو ہواؤں میں اڑنے لگی۔

دوپہر میں اکیڈمی کے فون پر اس سے بات ہوتی بہانے بہانے سے ایک دوسرے کو دیکھنے اور باتیں کرنے

کے موقع تلاش ہونے لگے۔ پھر کبھی کبھار باہر بھی ملنے لگے۔ میری بے رنگ اور ساپٹ زندگی میں بہار آگئی۔ ادھر عابدہ سارا وقت امی کے ساتھ لگی رہتی۔ کبھی کھانا پکاتی تھیں کبھی کپڑوں کی سلائی، بچے بھی اسی کو داد دے کھاتے تھے۔ میں نے صاف طور پر جمال سے کہہ دیا کہ مجھے اس کا عابدہ کو چھوٹا بھی پسند نہیں۔

اس نے کہا۔ ”جب سے تم میری زندگی میں آئی ہو مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ صرف میرے بچوں کی ماں ہے۔“

ہماری محبت کو سات ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میرے لیے کئی رشتے آئے مگر میں نے امی کو صاف منع کر دیا۔ جمال نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد مناسب طریقے سے امی سے میرا ہاتھ مانگے گا۔ مجھے اس کی بیوی کا تعلق بھی منظور تھا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ عابدہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ میں اسے گاؤں میں رکھوں گا اور ہم دونوں یہیں رہیں گے۔

جمال سے میری محبت عشق کا روپ دھار چکی تھی۔ وہ بھی میرے لیے جنونی ہو رہا تھا۔

ایک شام عابدہ اور جمال آئے ہوئے تھے۔ سردیوں کے دن تھے۔ امی نے گجریلا بنایا تھا اور انہیں دعوت پر بلایا تھا۔ بچے رابعہ کے ساتھ شرارتوں میں لگے ہوئے تھے۔ عابدہ اور امی باتیں کر رہے تھے۔ جمال سے بھی بات ہو رہی تھی۔ سب کی نظر بچا کر وہ مجھے کوئی اشارہ کرتا یا ذرا معنی بات کہتا تو میرا دل دھڑک اٹھتا۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک عابدہ اٹھی اور بھاگ کر دوش آدم کی طرف چلی گئی۔ امی بھی اس کے پیچھے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد امی عابدہ کو پکڑے واپس آئیں اور اسے صوفے پر لٹا دیا۔

”کیا ہوا امی۔“ میں نے پوچھا۔

جمال بھی عابدہ کے پاس جا کر پوچھنے لگا۔ ”کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟“

”اس حالت میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔“ امی نے محتاط الفاظ میں جمال سے کہا اور میرا دماغ جھک سے اڑ گیا۔ میں بچی نہیں تھی۔ سب سمجھ گئی۔ مارے طیش کے میری رگوں میں خون اگلنے لگا۔ وہ تو کہتا تھا جب سے تم ملی ہو میں نے عابدہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور اب عابدہ کیسے امید سے مٹی میں نے بڑی کاٹ دار نظروں سے جمال کو دیکھا۔ اس چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجھ سے نظر ہٹا کر

نہ سے باہر آگئی۔ پھر وہ لوگ اپنے گھر چلے گئے۔ میں ساری رات غصے سے کھولتی رہی کہ وہ کس قدر دھوکے باز ہے۔ مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ کبھی روتی کبھی ہنسی عجیب پاگلوں جیسی حالت ہوگئی تھی۔

دوسرے دن میں نیچے اکیڑی میں بھی نہیں گئی کیونکہ میں جانتی تھی وہ ضرور آئے گا۔ رابعہ نیچے چلی گئی۔ اگلے دن آئس میں جا کر بیٹھی تھی کہ اس کا فون آگیا۔ سی ایل آئی میں نمبر دیکھ کر میں نے ریسیور ہی نہیں اٹھایا۔ بیل پر بیل ہوتی رہی۔ شام کو دونوں میاں بیوی گھر آئے، میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کمرے میں لیٹی رہی۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ ساتویں دن وہ آفس میں آگیا۔ عجیب اجڑی سی حالت ہو رہی تھی۔ میں اسے دیکھ کر اٹھ کر جانے لگی تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ہم کئی بار تنہائی میں ملے تھے مگر اس کی اس بات نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا تھا کہ وہ کبھی تنہائی کا فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ کبھی کبھار ساتھ تھانے کے علاوہ اس نے میرے قریب ہونے کی کبھی کبھار کوشش نہیں کی تھی۔ اس وقت میں اکیلی تھی کوئی ٹیچر یا بچہ کسی ناظم بھی آسکتا تھا۔

”چھوڑیں میرا بازو آپ بہت.....“ میری بات مکمل نہ ہوئی اور آنسوؤں نے روک لی۔

”مجھے معاف کر دو آئینہ میری جان۔ بس مجھ سے غلطی ہوگئی۔ شاید میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں کمزور پڑ گیا۔ مجھے معاف کر دو۔ چلو اسی وقت میں تمہاری امی سے تمہارا ہاتھ مانتا ہوں۔“

”نہیں مجھے اب آپ کا اعتبار نہیں آپ نے میری توہین کی ہے۔“ میں بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

اس نے جھکے سے مجھے اپنی طرف کھینچا۔
”نہیں آپ جائیں میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

اچانک وہ میرا بازو چھوڑ کر میرے پیروں میں بیٹھ گیا۔ ”صرف ایک بار مجھے معاف کر دو۔“

میں سشدردہ گئی۔ وہ میرے دل کا کینک تھا۔ میری پہلی محبت۔ میرا عشق تھا۔ میرا جنون تھا۔ میں اس کی بہت عزت کرتی تھی۔ اسے اپنے قدموں میں پیٹھا دیکھ کر ترپ گئی۔ ”پلیز ایسا نہ کریں۔“ میں دور ہوگئی۔ میرے دل میں فخر کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ ایک مرد اپنا وقار کسی عورت کے سامنے اسی وقت کم کرتا ہے جب اس کے دل میں محبت کا

طوفان اٹھتا ہے۔ اب میں اور کتنا ناراض رہتی۔ اس کی اس ادانے میرا دل پانی پانی کر دیا۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس نے کہا۔ ”آئینہ تم مجھے دھوکے باز اور جھوٹا نہ سمجھو۔ میں نے تمہیں چاہا ہے اور اپنا دل کا بھی۔ اس بار میں گاؤں جاؤں گا تو اباداری سے بات کروں گا۔ پہلے تمہاری امی راضی ہو جائیں۔ میں اور وہ مل کر پھر خواب بننے لگے۔ امی اب عابدہ کا اور بھی خیال رکھنے لگی تھیں۔ اکثر کھانا ہمارے گھر سے ہی جاتا۔ جمال امی سے بات کرنا چاہتا تھا مگر میں نے خود ہی منع کر دیا کہ عابدہ کی ڈیوری میں تین چار ماہ ہیں وہ فارغ ہو جائے تو پھر بات کرنا۔“

دن گزر رہے تھے ہماری وہی روٹین تھی۔ فون اور باہر ملنا۔ میری ہر تھڑے آری تھی اور میری خواہش تھی کہ ہم دونوں باہر جائیں کیک بھی کائیں اور کھانا بھی کھائیں۔ جمال نے وعدہ کر لیا۔ اکیڑی سے اس دن میں جلدی اٹھ گئی اور تنہا دھوکہ بہترین سوٹ پہنا۔ امی سے ایک دوست کی طرف جانے اور شاپنگ کا کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ مقررہ جگہ پر میں شام چھ بجے پہنچ گئی تھی۔ جمال نے بھی چھ بجے آنا تھا۔ مگر وہ نہ آیا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ سات بجے، آٹھ بجے اور آخرونچ گئے رات ہوگئی تھی۔ لوگ جو مجھے کافی دیر سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اشارے کر رہے تھے۔ شرمساری اور اذیت سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ گھر پہنچی تو امی گھر پر نہیں تھیں۔ رابعہ نے بتایا کہ عابدہ کو لے کر اسپتال گئی ہیں جمال کے ساتھ۔

”تو یہ بات ہے بیوی کی تیمارداری میں ایک اکیلی جوان لڑکی کو وعدے کا پابند بننا کر انخیاں جگہ پر بٹھا کر بھول ہی گئے کہ میں کتنی پریشان ہوئی۔ کیسے لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کیا اسے کچھ پروا نہیں تھی۔ دوسری بار اس نے میری توہین کی تھی۔ میں کپڑے بدل کر لیٹ گئی۔ صبح امی آئیں تو پتا چلا کہ بیٹی ہوئی ہے۔ امی بہت خوش تھیں۔ وہ عابدہ کے لیے بچی بنا رہی تھیں انہیں دو چہر کو کچھ اسپتال جانا تھا۔ عابدہ کا بڑا آپریشن ہوا تھا۔ مجھے کوئی خوشی نہ تھی۔ میرے دل پر اوس پڑ چکی تھی۔ جسے بس کا احساس سارے وجود پر چھا چکا تھا۔ دو چہر کو رابعہ بھی امی کے ساتھ اسپتال چلی گئی۔ اکیڑی کے ناظم پر میں نیچے آگئی۔ شام کو امی واپس آئیں۔ بتانے لگیں کہ عورتوں کے وارڈ میں مرد نہیں رہ سکتا۔ اس لیے رات کو جمال مجھے لے جانے گا۔ تم دونوں ہمیں دروازہ اندر سے بند کر لیتا۔ جمال بھی خیال رکھے گا۔ جمال کو کھانا دے

دینا۔“

رات آٹھ بجے امی پھر چلی گئیں۔ رابعہ نے دال چاول بنائے تھے۔ میں کھانا کھا کر لیٹ گئی۔ رابعہ نے بتایا کہ ”جمال بھائی آئے ہیں آپ کو بلا رہے ہیں۔ آپ جائیں اور انہیں کھانا بھی دے دیں۔“

”نہیں رابعہ! مجھے بخار ہو رہا ہے تم انہیں جلدی سے کھانا کھلا کر فارغ کرو اور دروازہ بند کر کے آ جاؤ۔“ وہ چلی گئی۔ میں گم صم سوچتی رہی کہ جمال کی زندگی میں میرا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس لیے ابھی بھی وقت ہے پلٹ جانا ہی بہتر ہے۔ چار دن عابدہ اسپتال میں رہی۔ میں ایک بار بھی نہیں گئی۔ جمال سے میرا سامنا نہیں ہوا۔ شاید وہ جان بوجھ کر میرا سامنا نہیں کر رہا تھا۔ عابدہ گھر آ گئی تھی۔ امی اور رابعہ کا زیادہ وقت اسی کے گھر گزر رہا تھا۔ جمال کی غیر موجودگی میں ہی عابدہ سے مل آئی تھی۔ بچی بہت پیاری تھی۔ مجھے بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ کتنی دیر اسے گود میں لے کر بیٹھی رہی۔

یہ میری سالگرہ والے دن کے سات دن بعد کی بات ہے۔ رابعہ عابدہ کے پاس تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ امی کھانا بنا رہی تھیں۔ میں اکیڈمی کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اچانک جمال آ گیا۔ کتنے دن بعد اسے دیکھا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے مجھے دیکھا اور سلام کیا۔ میں جواب دینے بغیر کمرے میں آ گئی۔ وہ امی کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امی نے مجھے آواز دی۔ میں باہر آئی تو دیکھا کہ امی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور جمال سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”آمنہ، جمال نے جواب بھی بات کہی ہے۔ تمہاری شہ پر کبھی ہے یا اس کا اپنا دامغ خراب ہے۔“ امی نے غصے سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں گھبرا گئی۔

”میں نے آٹنی سے کہا ہے کہ میں آمنہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ جمال نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

میں حیران پریشان رہ گئی۔

”بولو آمنہ کیا تم بھی جمال سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“ امی کی آواز شعلہ باریکی۔

میں نے جمال کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ میں سب کچھ بھول گئی۔ ”جی امی۔“

”آمنہ!“ امی لڑکھڑائی۔ جمال تیزی سے آگے

بڑھ کر انہیں سہارا دینے لگا۔

”بٹ جاؤ پیچھے۔“ امی چلائیں۔ وہ وہیں رک گیا۔

”میں نے تمہیں بیٹا سمجھ کر اپنے گھر میں آنے کی اجازت دی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تم میرے ہی گھر نقب لگاؤ گے۔“ امی رونے لگیں۔

”آٹنی پلیر! میری بات ذرا ٹھنڈے دل سے سنیں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”آپ جانتی ہیں عابدہ سے میرا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ میں آمنہ کو راتی بنا کر رکھوں گا۔ سارے حقوق ادا کروں گا۔ کوئی کمی نہ ہوگی۔ آمنہ سے پوچھیں ہم نے ایک ساتھ رہنے کے خواب دیکھے ہیں۔“

میں بے آواز رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جمال آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تسلی دے کر چلا گیا۔ امی سر پکڑ کر بیٹھی تھیں۔

”میں عابدہ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اسے بیٹی بنایا تھا۔ اب اپنے ہاتھوں اپنی بیٹی کے لیے اس کا گھر اجاڑ دوں۔ آمنہ تم تو بہت سمجھ دار ہو، کس راستے کا انتخاب کر لیا تم نے؟“ وہ پھر رونے لگیں۔ جب کافی دیر رونے کے بعد وہ چپ ہوئیں تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”امی جمال میری کانٹوں بھری راہ میں ایک خوش رنگ امید پھول ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو سن لیں۔ جمال میری خوشی ہے۔ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ پہلی اور آخری بار مانگ رہی ہوں۔ جمال سے میری شادی کے لیے مان جائیں۔“

وہ چپ چاپ میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ جمال نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اسی لیے تو میرا ہاتھ مانگ لیا اس نے، اپنی محبت کا ثبوت دے دیا تھا اور اب میں کیسے پیچھے ہٹ جاتی جب کہ میری خواہش بھی یہی تھی۔ اگلے دن امی نے جمال کو بلا لیا اور کافی دیر اس سے نہ جانے کیا باتیں کرتی رہیں۔ جب جمال باہر آیا تو بہت خوش تھا۔ مجھے دیکھ کر ہنس پڑا۔

”میری جان! ایک مرحلہ طے کر لیا ہے، آٹنی مان گئی ہیں۔ اب ابا اماں کو منانے گاؤں جا رہا ہوں۔ دعا کرنا۔ کامیاب لوٹوں پھر ہم ایک ہو جائیں گے۔“ میں شرما گئی۔

جمال گاؤں چلا گیا۔ عابدہ کو کسی بات کی خبر نہیں تھی۔ امی اس کی پہلی جیسی تیار داری کرتی رہیں۔ جمال کو گئے تیسرا دن تھا کہ عابدہ کا بھائی اسے لینے آ گیا۔ عابدہ بھی چلی گئی۔ دن پہ دن گزرتے رہے۔ جمال ابھی تک نہ لوٹا تھا۔

مہرے تو دن رات انگاروں پر گزر رہے تھے۔ امی سے نظریں چرائے پھرتی تھی۔ رابعہ تمام باتوں سے لاعلم تھی۔ پندرہ دن کے بعد جمال آیا تو میری سانس میں سانس آئی۔ وہ بہت کمزور ہو رہا تھا۔ کہنے لگا۔ بہت بڑی جنگ لڑ رہا ہوں۔ عابدہ کا بھائی جمال کی بہن کو میکے چھوڑ گیا تھا اور اپنی بہن عابدہ کو ساتھ لے گیا تھا۔ جمال نے بتایا کہ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس بار میں کسی قسم کی بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گا۔

میں ہر کون ہو گئی۔ کافی دن گزر گئے۔ جمال مطمئن تھا کہ امی اس بار میرا ساتھ دیں گی۔ امی خاموش تھیں۔ جمال آتا میرے ساتھ باتیں کرتا۔ کھانا کھاتا امی خاموش دیکھتی رہتیں۔ پھر جمال گاؤں چلا گیا اور جب لوٹا تو اس خوشخبری کے ساتھ کہ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہو گئے ہیں۔ اس کی بہن اپنے گھر چلی گئی تھی۔ عابدہ کو بھی اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جمال کے امی ابا آئے اور باقاعدہ میرا رشتہ طلب کیا اور تین ماہ بعد شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ امی مان گئیں مگر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”آمنہ! میں صرف تمہاری خاطر راضی ہوئی ہوں تم نے بہت دکھ میرے ساتھ اٹھائے ہیں۔ بیٹا بن کر میرا ساتھ دیا ہے۔ اللہ کرے جمال تمہیں ساری خوشیاں دے۔ کوئی محرومی نہ رہے۔ میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“ ہم دونوں ماں بیٹی گلے گلے کر رونے لگیں۔

بھائی نے تو مزہ کر خبر نہ لی تھی۔ اب کون ہاتھ بٹاتا اس لیے امی میرے جھجکے تیار کر کے لگیں۔ عابدہ گاؤں سے آچکی تھی۔ میں شرمندہ ہی تھی مگر اس نے مجھے گلے لگا کر کہا۔ ”میں تو شروع سے جانتی ہوں کہ جمال کو میری جیسی بیوی نہیں، کوئی خوب صورت بڑی لکھی بیوی چاہیے گی۔ تم میری بہن ہو۔ مجھے تم سے کوئی ٹکڑ نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک ساتھ خوش رہیں گی اس لیے کہ ہم دونوں کی خوشی ایک ہی شخص ہے۔“

کتنا بڑا اعتراف تھا اس کا، میں ہر سکون ہو گئی۔ جمال نے سارے کپڑے جو تے میری پسند سے خریدے۔ ہم دونوں نے اکٹھے شادی کی شاپنگ کی۔ شادی میں پندرہ دن تھے۔ میرا سرخ رنگ کا لہنگا آچکا تھا۔ امی نے اب جمال اور میرا پردہ کر دیا تھا۔ عابدہ نے مجھے بلوایا تھا کہ ایک بار لہنگا اور اس کی کہیں چپک کر لوں کہ فٹنگ ٹھیک ہے۔ رابعہ نے بتایا کہ جمال گھر پر نہیں ہے۔ میں امی سے

اجازت لے کر عابدہ کے پاس آ گئی۔ لہنگا دیکھا۔ بھر ادرھر ادرھر کی باتیں کرنے لگی۔ میں واپس آنے لگی تو چائے کے لیے روک لیا۔ کہنے لگی اب تو تم نے دہن بن کر ہی ادرھ آنا ہے۔ میں شرم کر چپ رہی۔

چائے پیتے ہوئے عابدہ نے کہا۔ ”آمنہ تم واقعی جمال سے بہت سچی محبت کرتی ہو۔ ورنہ کوئی بھی لڑکی اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔“

”میں بھی اس کا شاعرہ اپنی طرف ہے کہ بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے جمال کو قبول کرنا بڑے حوصلے کا کام ہے۔ میں خاموش رہی۔ میں مسکرا کر بات سنتی رہی۔ پہلے تو جمال اس شرط پر راضی نہیں ہوتا تھا اسے اپنے بچوں سے بہت پیار ہے۔ اسی لیے مان گیا مگر میرا خیال تھا کہ تم نہیں مانو گی۔“ عابدہ نے مسکرا کر کہا۔ اب ذرا میں نے دھیان دیا اس کی بات پر۔ کون سی شرط۔ مجھے تو کسی بات کا علم نہیں ہے۔ ”اچھا کیا جمال نے تمہاری رضامندی کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ چراغی سے بولی۔

”کیسا فیصلہ باجی پلیز مکمل کر بتائیں۔“ میرا دل ایک دم گھبرانے لگا۔

”نہیں جب جمال نے جہیں نہیں بتایا تو میں کیوں بتاؤں۔“ وہ حتیٰ لچھے میں بولی۔

میں نے اصرار کیا کہ قسم دی تو تب اس نے جو انکشاف کیا اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ جمال کو شادی کی اجازت اس شرط پر دی گئی ہے کہ چونکہ جمال کے بچے ہی خاندان کے اصلی وارث ہیں ان کے ساتھ کوئی حصہ دار نہ ہو۔ ان کے ساتھ کوئی حق تلفی نہ ہو اس لیے جمال کی خد پر گھر والوں کو ماننا پڑا۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھی کہ شادی سے پہلے ہی جمال ایک آپریشن کروائے گا جس سے اولاد نہ ہوگی اور اس طرح میں صرف جمال کی بیوی تو بن جاؤں گی لیکن اس کے بچوں کی ماں نہیں بن سکوں گی۔ تاکہ صرف عابدہ کے بچے ہی ہر چیز کے حقدار ہیں۔ پہلے تو جمال نہ مانا پھر شادی اسی صورت میں ہونے کی وجہ سے اس نے رضامندی دے دی۔

میرے سر پر تو جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ میری حالت سے بے خبر کھد رہی تھی۔ ”یہ شرط کسی بھی لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے مگر تم بہت اعلیٰ ظرف ہو اور واقعی جمال سے پیار کرتی ہو۔“

میں نے کوئی بات نہ کی اور اٹھ کر چلی آئی۔

جنگلاتی جھلسلاتی تحریریں لیے ستمبر 2017ء کا دہن نمبر

سیما رضا ردا نے اپنے نئی ناول

ہم کو عبث بدنام کیا

میں دکھائے کرداروں کے نت نئے رنگ

ماہنامہ
ایکینہ
کراچی

شیریں حیدر اور افعت سراج کے خوب صورت سلسلے وار ناول..... نئی اقساط لیے

سحرش فاطمہ کے سحر انگیز بیان کا ترجمان مکمل ناول..... میری دھوپ کی تم ہی چھاؤں

عالیہ حرا کی نفسیاتی تحقیق کا نچوڑ ایک جاندار ناول..... اشک جگنو اور ستارے

نگہت اعظمی، سعدیہ رئیس اور فرح طاہر کی خصوصی کہانیاں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی قرآنی تحقیق اور ج کی باسعادت مناسبت سے اختر شجاعت کا پر شکوہ مضمون

وہ آنے بزم میں.....

ہماری سنہرے رائٹر صبیحہ شاہ

کی صباحت بھری آمد

شائستہ زین کا سنہرے اردو پہلا روپ لیے ایک جامع سروے

ایک کلمہ علانہ

دہن نمبر کے لیے شوخ و شنگ اور کہیں سنجیدہ رنگ لیے فوزیہ احسان رانا، المیس جبار، ہالہ احمد،

اُم ثمامہ، ضادیہ احمد، دانیہ آفرین، نگہت غفار و دیگر ہنرمند لکھاریوں کی حسین تحریریں

اس کے ساتھ، ہمارے دلچسپ اور پُر تحقیق کارنر، سحر انگیز شاعری، خوش ذائقہ پکوان،

قابل عمل نسخے اور بہت بہت چرلطف احوال..... صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر

والا مرد نہیں ہوتا ہے۔ میں ساری زندگی تمہاری شکل نہ دیکھنے کی دعا کرتی ہوں۔“

اگلے ہی دن جمال، عابدہ کے ساتھ وہ مکان چھوڑ گیا۔ مجھے اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ میں نے امی سے کہہ دیا کہ جو رشتے میرے لیے آئے ہیں ان میں سے جو مناسب ہو منتخب کر لیں مگر شرط یہ ہے کہ میں اکیڈمی چلائی رہوں گی۔ امی نے دور پرے کے ایک رشتے دار خاور سے رشتہ طے کر دیا۔ چھ ماہ بعد میری شادی ہو گئی۔ خاور میرے لیے بہترین شوہر ثابت ہوئے۔ وہ پڑھ لکھے، باوقار شخص تھے۔ ان کا اپنا کاروبار تھا۔ مجھے انہوں نے عزت محبت سب کچھ دیا مگر جب میرا بیٹا میری بانیوں میں آیا تو لگا کہ کائنات میرے قدموں میں آ گئی ہے۔ میری بچپنی کو تہرا گیا۔ ایک بار پھر بوجہ شکر ادا کیا کہ میں جمال کی شرط کا شکار نہیں ہوئی۔ آج میری شادی کو چوبیس سال ہو چکے ہیں۔ میرے چار بچے ہیں دو بیٹے دو بیٹیاں۔ میری کل کائنات میری ہستی کا عرور ہیں۔ میں اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے نہیں کھلتی۔

امی کی وفات ہو چکی ہے۔ رابعہ اپنے گھر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش ہے۔ پندرہ سال پہلے ندیم بھائی آئے تھے۔ ماں سے معافی مانگنے مگر معاف کرنے والی جا چکی تھی۔ بہت روئے، مجھ سے معافیاں مانگتے رہے۔ میں نے کہا ماں روئی چلی گئی۔ آپ کی اولاد جب آپ سے ایسا سلوک کرے گی تب پتا چلے گا۔ گویا میں نے انہیں دھکا دیا تھا۔

خاور اور بچوں کے ساتھ میں ایک خوش حال زندگی گزار رہی ہوں۔ اکیڈمی کے ساتھ ساتھ ہم نے اسکول بھی شروع کر دیا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ جمال کا بھی بھولے بیٹکے تصور آتا ہے تو بے اختیار شکر ادا کرتی ہوں۔ بعض اوقات محبت میں ہمیں لگتا ہے کہ ایک شخص ہی ساری زندگی ہے، اس کے بعد ہمیں کسی کی ضرورت نہیں رہتی۔ وقت ہمیں بتاتا ہے کہ جس کے لیے ہم نے ساری دنیا سے لے کر لی ہے اس کے علاوہ بھی ہمیں بہت کچھ چاہیے۔ کوئی بھی شخص ساری دنیا نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی کی رہ ہی جاتی ہے لیکن اس دن سر راہ عابدہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بالکل شہری ماحول میں ڈھلکی لگ رہی تھی۔ مجھے سمجھ کر ایک بڑے رستورنٹ میں لے گئی۔ وہیں اس نے بتایا کہ اپنے نوٹے گھر کو بجانے کے لیے اس نے جھوٹ بولا تھا کہ جمال نے گاؤں میں کس شرط پر ہامی بھری ہے۔

گھر آئی تو سامنے ہی امی میرے لیے لائے گئے پھر کے برتن کا سیٹ رابعہ کو دکھا رہی تھیں۔

”امی جی!“ میں دوڑ کر ان کے گلے گئی اور اونچی آواز میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رابعہ اور امی گھبرا گئیں۔ مجھے سنہلنے لگیں۔ میں روتے روتے نڈھال ہو کر گر پڑی۔ امی مجھے کے ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ اس نے انجکشن لگایا اور میں سو گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر سوئی رہی۔ جب اُمی تو سامنے امی کو دیکھ کر پھر زخم تازہ ہو گیا۔ پھر رونے لگی۔

”کیا بات ہے بیٹی۔ مجھے بتاؤ۔“

”امی! میں جمال سے شادی نہیں کروں گی۔ خدا کے لیے نہیں منع کر دیں۔“

امی تو پریشان ہو گئیں۔ ”کیا بات ہے آمنہ۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔ عابدہ نے کچھ کہا ہے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں۔“ وہ غصے لگیں۔

”نہیں امی کسی سے کچھ نہ کہیں۔ آپ منع کر دیں اور جمال سے کہہ دیں میرے سامنے نہ آئے۔“ میں نے ہاتھ جوڑ دیے امی اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

میں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا۔ میری محبت اور اعتماد کے ساتھ اتنا بڑا کھیل کھیل جمال نے۔ ہر لڑکی پیدا انہی متا کے جذبے سے پڑھتی ہے اور میں تو بچوں کی دیوانی تھی۔ اس نے سوچا ہوگا میرے اپنے بچے تو ہیں اور نہ بھی ہوئے تو کیا فرق پڑے گا۔ نئی عورت مل رہی ہے یہی بہت ہے۔ میری ہمتا کو تو اس نے زندہ درگور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے اعتماد میں لیتا تو میں اس کی محبت میں اندھی ہو کر مان بھی جاتی۔ کیونکہ میں تو اس کے لیے پاگل تھی۔ اتنی بڑی قیمت محبت کو پانے کے لیے میں ادا کر دیتی اور میں ساری عمر خالی ہاتھ رہ جاتی۔ ایک ویران باغ جیسی زندگی ہو جاتی میری۔ میں سوچتی رہی روئی رہی۔

”بابی دروازہ کھولیں۔“ باہر سے رابعہ کی آواز آئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔ اس نے میری طرف بڑھایا۔ جمال کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

”آمن! ایک بار صرف ایک بار مجھ سے مل لو۔ خدا کے لیے ایک بار سامنے آ کر میری بات سن لو۔“

میں نے خط کھلے کھلے کر کے رابعہ کو دیا۔ ”اے کہہ دو تم ایک کمزور مرد ہو۔ دوسروں کے اشاروں پر چلنے

گدھ

محترم مدیر
السلام علیکم

میں پہلے بھی جتا چکا ہوں کہ میرا تعلق صحافت سے ہے۔ اس پیشے کی وجہ سے لاتعداد واقعات میرے سامنے آتے رہتے ہیں۔ رانو سے بھی میری ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ لوگ اسے خونی، سزا یافتہ جیسے القاب سے یاد کرتے ہیں لیکن میں جب اس سے ملا اور اس پر گزرتے واقعات سنے تو حیران رہ گیا۔ آپ خود بھی اس کی خود بیٹی پڑھ کر حیران رہ جائیں گے۔
وسیم بن اشرف
(ملتان)



آ کر اس نے رانو کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا، رانو اس اچانک پرنے والی افتاد سے گھبرا گئی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اسے سوچوں کے گہرے سمندر سے نکالنے والی کے گال پر ہائیں ہاتھ کا ایسا تھپڑ مارا کہ وہ دو قدم دور جا کر سنبھل۔

”اے کیا گل کھلا کے آئی ہے۔“ ایک خزانہ عورت رانو سے مخاطب مئی، رانو ہر ذی نفس سے بے خبر بیرک کی چھت کو گھور رہی تھی۔
”اے گلاب میں تیرے سے پوچھ رہی ہوں۔“ قریب

”اری، تھپڑ وہ بھی بانو کو۔“ وہ گرجی اس کا نام شاید بانو تھا جس نے رانو کا آتے ہی انٹرویو شروع کر دیا تھا۔ ”اے تو جانتی نہیں مجھے۔“ یہ کہتے ہی بانو نے لات گھمائی جو رانو کے پیٹ میں لگی۔ وہ تکلف سے دہری ہو گئی، سیدھی ہونے سے پہلے ہی بانو نے اس کی چوٹی پر کڑک جڑو در کا جھنکا دو رانو کو دونوں میں تارے نظر آ گئے۔ وہ بری طرح بوکھلائی، یہ کیا آفت اس پر ٹوٹ پڑی ہے۔ رانو بھی دیہات کی پٹی بڑھی تھی، موقع ملتے ہی بانو کو ایک اور تھپڑ جو سید کیا تو اسے چھٹی کا دودھ یا دودلا دیا، اب ہیرک میں باقاعدہ وحید کا مستی شروع ہو چکی تھی، کبھی رانو نیچے اور بانو اوپر، کبھی رانو کا پلڑہ بھاری اور بانو زمین یوس، دوسری قیدی عورتیں ہیرک کی دیوار سے جا لگی تھیں اور تماشا دیکھ رہی تھیں۔ پھر رانو کا جو داؤ چلا تو اس نے بانو کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ ہیرک کے جھنگے سے بری طرح ٹکرائی اور اس کی پیشانی سے خون لکیر کی صورت میں بہتا اس کے رخسار تر کرتا گردن کیلی کر گیا۔

”تیرا خون نہ بی جاؤں تو بانو نام نہیں۔“ وہ دھاڑی اور رانو کی طرف لپکی، رانو نے جھکا دی تو اپنے ہی زور میں وہ دیوار سے جا ٹکرائی، چوٹ پر چوٹ کھانے سے وہ نیم پاگل ہو گئی اور ڈر کراتی ہوئی بدست گائے کی طرح پھر رانو کی طرف بڑھی۔ شور شرابے سن کر جیل کا عملہ بید کی چھڑیاں لہراتا آیا، دروازہ کھولا اور بنا تصور پہنچے بانو کو کم مارا، رانو کو دھنک کر رکھ دیا۔ بید کی چھڑیاں پے در پے پڑنے سے رانو کے منہ سے سکسکاریاں نکلنے لگیں، دو چار بانو کو بھی پڑیں، تھوڑی دیر کی پٹائی نے سب شامت کر دیا، اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی بید لہرائی پہنچ گئی۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔“ اس کا رعب اور دبدبہ دیدنی تھا، چھوٹا عملہ الٹ کھڑا تھا۔ ”میں پوچھتی ہوں یہ کیا اودھم مچا رکھا تھا؟“ اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ چلائی پھر وارڈرز کو گھورا تو ایک لیڈی وارڈر نے کہا میڈم ہم بھی شورش کر رہیں ہیں سچے تھے، دیکھا تو آج آنے والی نئی قیدی رانو اور بانو تھم گئے تھیں، بانو کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

”دونوں کو لاؤ ڈرامیر سے کمرے میں، وہاں ان کی خدمت کرتی ہوں۔“ وارڈرز نے سیلیوٹ کیا، دونوں کو اپنے حصار میں لے کر اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے کمرے کی طرف چل پڑیں، 2 لیڈی وارڈرز آگے، پیچھے رانو، پھر دو وارڈرز اور پیچھے بانو، آخر میں بھی دو لیڈی وارڈرز، چھ الہنگاروں کی گھرائی میں انہیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں لایا گیا، رات کے 9 بجے والے تھے، اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے معاملے کی چھان بین کی

ضرورت بھی محسوس نہ کی اور رانو پر پل پڑی، بد معاش، قاتلہ، آتے ہی ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں نہ تو بڑی بڑی خراٹ قیدیوں کو سیدھا کر دیا۔ تیری اوقات ہی کیا ہے؟“

رانو کے اوسان خطا ہو گئے، وہ سمجھ ہی نہیں پاتی تھی کہ یہ آتے ہی اس پر کیا عذاب نازل ہو گیا، پانچ جید، دو چار تھپڑ کھانے کے بعد رانو کی آنکھیں چھلک پڑیں، بمشکل اس کے لب پہ ”بی بی صاحبہ یہاں بھی نا انصافی۔“

”نا انصافی، تو نے بانو کا سر پھاڑ دیا، تھپڑے مارے اس کے گال لال کر دیئے اور بات انصاف کی کرتی ہے۔“ آفیسر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں نے کیا کیا۔ میں تو خاموش بیٹھی تھی، اسی نے بدتمیزی کی، جس سے بات بڑھ گئی، کیا میں اس کے ہاتھوں ذلیل ہوتی، مار کھاتی اس سے، اس کے ٹکڑے چائے لگ جاتی۔“ رانو بولی۔

”بھاش نہ بگھا، جو ہوا وہ بتا۔“ آفیسر نے اسے ڈانٹا۔

”بی بی وہی بتا رہی ہوں۔ آپ افسر ہیں انصاف آپ خود کرنا، پہلے اس نے مجھے چٹنی کہہ کر پکارا، میں نے جواب نہ دیا تو کندھے سے پکڑ کر مجھ کو زنا، غصے میں میرا بھی ہاتھ چل گیا، اس نے بھی مارا اور میں نے بھی۔“

”ہوں“ اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ہنکارا بھرا اور حکم دیا رانو کو فی الحال دوسری ہیرک میں بند کر دو، وارڈرز اسے لے گئیں۔ بانو کمرے میں ہی رہ گئی، اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے اسے گھور کر دیکھا۔

”مجھے سے دو روز بھی صبر نہ ہوا، آج ہی وہ جیل آئی اور تو اس سے بھڑکی، بانو اس طرح نہیں چلے گا، کسی نے اوپر شکایت کر دی تو میں انکواریاں بھینکتی پھروں کی، تیرا کیا ہے تو دوسروں پر دھونس بجا کر اپنا اوسیدھا کئے رکھے گی، یہ رانو ایک بد معاش کا قاتل کر کے آئی ہے اور تو نے پہلے ہی روز اس سے پنگا لے لیا، ہوش کے ناخن لے، یہ نہ ہو جو جھوٹ میں نے تجھے دے رکھی ہے وہ وہاں لے لوں، اور باقی کی قید تو مشقت کر کے گزارے۔ جا چلی جا موقع محل، اونچ نیچ دیکھ کر قدم اٹھایا کر، سیر کو سوا سیر سے بھی بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔“

”بانو جیل کی غنڈی تھی، خواتین قیدی اس کے سائے سے بھی دور بھاگتی تھیں، افسروں کی آتشیں باد سے اس نے وہاں اپنی دھاک بٹھائی ہوئی تھی، جیل کے باہر کی بڑی شخصیات سے اس کے مراسم تھے۔ قیدی عورتوں سے پیسے، خوراک، زور زبردستی،

سہولیات کے عوض رشوت لے کر جیل حکام تک پہنچانا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا، بدلے میں اسے جیل میں ہر سہولت میسر تھی۔

رانو کو دوسری بیرک میں پہنچادیا گیا، یہ جیل میں اس کا پہلا دن تھا، پہلے ہی روز اس کے ساتھ جو بیٹی یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ وہ تو پہلے ہی ظلم و جبر سچے، زمانے کی ٹھوکریں اور اپنوں کے گلے گھاؤ کھا کر یہاں پہنچی تھی۔ جیل میں پہلے ہی دن جو کھیل کھیلایا گیا وہ سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ زندان میں تھی، پایہ زنجیر تھی، زمانے کی زنجیر تو زکر زندگی کے زندان میں ایک جنگ لڑ کر بھی وہ نظارہ پارک تھی لیکن اپنے جیسی کئی لڑکیوں کو یہ خاموش پیغام دے آئی تھی کہ سسک سسک کر مرنے سے، جبر کے سامنے سر ٹکونے سے بہتر ہے ظلم کے سامنے سر اٹھا کر چلا جائے، موت تو آتی ہے پھر روزِ روز مر کے کیوں جیا جائے، اس نے بھی اپنے زور بازو سے ان بد معاشوں کو وہ سبق سکھادیا تھا کہ آئندہ کوئی اس جیسی لاچار رانو پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہزار بار سوچے گا۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی ٹانگیں نیند سے جو جمل ہونے لگیں۔ اس نے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ ٹانگیں پہاڑیں، جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا، جلد ہی اسے نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا، صبح کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

دوسرے روز منہ اندھیرے سب کو اٹھانے کا عمل شروع ہوا، یہ سب اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ زندان کی زندگی کا بردن اس کو نیا سبق پڑھا رہا تھا، مگر کمن کر قیدی عورتوں کو نکالا گیا، سارا دن ان سے مختلف کام کرائے جاتے رہے، شام کو بھیڑ بکریوں کی طرح نکلتی کر کے پھر بھانے میں بند کر دیا گیا، اسے یہ جیل بھی بھانہ ہی تھی۔ روزانہ مشقت، بیماریاں جیسا کھانا اور چمچروں سے بھری بیرک، خواتین، بچے، شور شراب، رونا دھونا، مصائب و آلام، دکھڑے، ماتم، یہ سب دیکھتے تین دن گزرے تو ایک رات ایک قیدی عورت اس کے پاس چلی آئی، دیکھنے میں ادھر عورت تھی، لب کھولے تو لگا گیا پھول چھڑنے لگے ہوں، اتنا میٹھا لہجہ تھا۔ وہ قریب آئی اور بولی۔ ”بیٹی نہ جانے کون سی خطا تھے اس جنم زار میں لے آئی ہے۔ نصف شب کو تو میرے بستر کے پاس آنا۔“ چند جیلے کہہ کر وہ دوبارہ اپنی جگہ پر چلی گئی، بیرک کے باہر وارڈرز الارٹ تھیں، چکر پہ چکر لگا کر سب پر ایسے نظر رکھی ہوئی تھیں جیسے ان میں سے کوئی نظر بچا کر بھاگ کھڑی نہ ہو، حالانکہ اس زندان سے نکلتا مشکل تو کیا ناممکن تھا۔ رات آدھی بیت گئی، کسی شرمیلی لہن کی طرح

چاند نے بدلیوں کی چادر اوڑھ لی، رات گہری ہو گئی، چاند کے سامنے معدوم ہو گئے، بیرک کے اندر ان کی آوازیں اب بھی دالے بلب لگے ہوئے تھے۔ مگر ان کی آوازیں اب بھی تھیں، چاق و چوبند تھی وارڈرز نے راولڈز شروع کر دی، رانو کو اس خاتون میں کچھ خاص نظر آیا تھا۔ یہ نہالے لہو، اس کے لب و لہجے میں اسے اپنائیت محسوس ہوئی تھی، نصف شب اسی خاتون نے رانو کو دیکھا، دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اس خاتون نے رانو کو خفیف سا اشارہ کیا، رانو غیر محسوس انداز میں مٹکتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں کسی اور کے لینے کی گنجائش تو نہ تھی لیکن کچھ حرکت برکت سے انہوں نے جگہ بنائی لی، وارڈرز کی نظر ان پر نہ پڑی تھی، خاتون نے آہستہ سے پوچھا۔ ”بیٹی کون سی افتاد ان بڑی جوتو اس بھری جوانی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے رنگ لگانے چلی آئی ہے۔“

”میں آپ کو کیا کہوں؟ کس نام سے پکاروں؟“

”آپ! پہلے آپ بتاؤ آپ یہاں کیسے؟“

”بتاؤں گی انہوں کے دُرخ بھی دکھاؤں گی، کچھ نہیں چھپاؤں گی؟ لیکن تم اتنی خوبصورت ہو، کس کے قسم کا نشانہ بنی ہو، یہ جیل نہیں محبوت خانہ ہے، دیکھ کی طرح چاٹ لیتا ہے۔“

”میں اپنے باپ کے باپ کے نتیجے میں یہاں ہوں۔“

”میں کچھ سمجھ نہیں، مجھے اپنا سمجھو تو تفصیل سے سب بتاؤ، شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“

”آپ تو خود یہاں بے بس ہیں، میری کیا مدد کریں گی۔“

”اس کی فکر نہ کرو، اللہ مسبب الاسباب ہے۔“

”تو ٹھیک ہے آپ، نہ جانے کیوں مجھے آپ میں الہی ماں کا عکس دکھتا ہے، کل رات کو میری زندگی کے ادراک کا ہلکا سا جن پر جبر اور ظلم، کڑوے کیلے، حالات، دکھ بھرے، القاعدہ کی تازہ داستان رقم ہے۔ زمانے کے فرعونوں سے لڑتی لڑتی، لاچار چار دیواریں میں آئی ہوں مجھے بھی خواب میں بھی۔“

”ہوں آپ کا؟“

”شرنام ہے میرا، لیکن ہمیشہ بے گناہ رہا، ابھی آپ ہی کہتا، مجھے اس بے شرنام سے نفرت ہے۔“

اندراہسم ہونے لگتی ہوں۔“

”آپا زندگی تو میری بھی دہکنے کو کھولیں جیسی ہے، محبت نفرت میں بدلی، نفرت نے انتقام کو جنم دیا، انتقام پیار کو نکلنے لگا تو ہوس کے آسیب نے ایسا سحر پڑھ کر پھونکا کہ زندگی تتر بتر کر کے رکھ دی، میں نے اس آسیب کا قصہ تمام کر دیا۔ لاج نے خون کے رشتوں کو اندھا گونا گونا بھر کر دیا تو مجھ سے قتل ہو گیا۔“

”قتل.....“ آپا بھونچکی رہ گئی۔
”ہاں آپا قتل۔“
”کسے قتل کیا؟“

”اسے جسے ظالم رسم و رواج اور مکروہ روایات کے علمبردار میرا سر تاج بنانا چاہتے تھے ساٹھ سال کا بوڑھا سر تاج، ہونہ۔“ اس نے نفرت سے ہونٹ کھینچ لیے۔

”اس داستانِ اہلِ کائنات نظر مجھے سناؤ۔“ آپا اس کی باتیں سن کر بے تاب ہو گئی تھی۔

”کل سناؤں گی اپنی زندگی کا لوح۔ اب سوتے ہیں۔“ رانو یہ کہہ کر آپا کا جواب سے بغیر ہلکتی ہوئی اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔

اگلا روز بھی معمول کے مطابق تھا۔ اس نے جیل میں قیدی اور حوالاتی عورتوں کی بے عزتی کرنے کے لیے انتہائی شرمناک، جھکنڈوں کا استعمال دیکھا، اسے لگا جیسا زنانہ اسٹاف اجرام خواتین، عزت نفس، اخلاق اور شرافت کے اصولوں سے بے بہرہ ہے۔ اس نے خواتین کو کرسیاں، بیڈ شیٹ، بڑھائی والی شائیں، ڈوبے، کشن، ٹی کوزی کور، ٹی ٹرائی سیٹ، سینریوں والے فریم بھی بناتے دیکھا۔ کھلے ہاتھوں بیروں اور بھر پور جسم والی رانو کو بھی جیل کا مخصوص لباس پہنا دیا گیا تھا، اس لباس میں وہ یوں پھنس کر رہ گئی تھی کہ جسم کے بعض اعضاء براہِ ہنڈ کرنے کی حد تک نمایاں ہو گئے تھے، شلوار خنٹوں سے اوپر تھی، بازو بھی چھوٹے تھے، یوں لگ رہا تھا جیسے اسے زبردستی لباس پہنا یا گیا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی، اسے یہ لباس زبردستی ہی پہنا گیا تھا، لگ رہا تھا جیل میں تمام خواتین کے لیے ایک ہی سائز کا لباس ہوتا ہے۔

موج پاتے ہی آپا اس کے قریب چلی آئی اور اسے دوسری عورتوں سے تھوڑا دور لے گئی۔

”رانو یہ قتل تو نے اپنی آبرو اور جان بچانے کے لیے کیا ہے ناں۔“ آپا نے تصدیق نہ چاہی۔

”ہاں آپا۔“
”تو پھر تو زیادہ دیر جیل میں نہیں رہے گی۔“

”وہ کیسے، رانو دیکھ بھاڑے آپا کو نکلنے لگی۔“

”تو قاعدہ قانون نہیں جانتی، اگر مناسب وکیل تیرا کیس لڑے تو اگلی پستی پر تیری ضمانت اور چند مزید پیشیوں کے بعد تو باعزت بری ہو جائے گی۔“

”آپا گھر میں چوہے آگ نہ لڑھے پانی، وکیل کون کرے گا؟“ وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔

”اچھا میں کچھ کرنی ہوں، تو فکر نہ کر، میں تیری جوانی کو یہاں کی دیمک نہیں لگنے دوں گی، خیر سے چار دن یہاں کاٹ لے، جب بھی تجھ سے ملاقات کے لیے کوئی آئے تو مجھے بتانا۔“ آپا نے اسے تسلی دی۔

”مجھ سے کون ملاقات کے لیے آئے گا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”کیوں، کیا اس جہان میں تیرا کوئی نہیں؟“ آپا کو حیرانی ہوئی۔

”ہے آپا لیکن صرف سرور۔“
”سرور کون؟“

”وہی جو مجھ پر جان چڑھتا ہے۔“
”ادھ میں بھی؟“ آپا کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”چلو! جو بھی آئے اسے ایک خط دینا، جو میں کسی کے نام لکھوں گی، بس تیرا کام ہو جائے گا اور تو ان سلاخوں سے باہر ہوگی۔“ آپا نے اسے تسلی دی۔

”دیکھیں آپ سب یہ.....“
آپا نے اسے ٹوکا اور بات جاری رکھی ”تجھے پریشان ہونے کی ضرورت ہے نہ نیران ہونے کی، ہمیں ایس جی اوڈ کا نام سنا ہے؟“

”نہیں آپا یہ کیا چیز ہے؟“
”چیز نہیں لیکن!“ آپا نے اسے ہلکی سی چپٹ لگائی۔ ”یہ ایسی تنظیم ہوتی ہیں جو سماج میں بھلائی کے کام کرتی ہیں اور کوئی معاوضہ نہیں لیتیں، ایسی ہی ایک تنظیم میں میرے جانے والے اہم عہدیدار ہیں، تیرا ملاقاتی جب میرا خط ان تک پہنچاے گا تو وہ تمہارے سے ایف آئی آر کی نقل لے کر وکیل کا بندوبست بھی کریں گے، تیرا کیس بھی مفت لڑیں گے اور تو ایک دو ماہ میں ہی بری ہو جائے گی۔“

”آپا یہ آپ کیسے سہانے سننے دکھا رہی ہیں، اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ اب تک اس جہنم میں کیوں جل رہی ہیں۔“ وہ مجھے کاٹھا کر گئی۔

”سن میری بچی! سانپ کا ڈسا تو شاید بچ جائے، لیکن انسان اتنا زہریلا ہے کہ اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ میں اپنی مرضی سے یہاں ہوں۔“

”کیا اپنی مرضی سے؟“ آپا کی بات سن کر اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

”ہاں! کبھی آزاد فضاؤں میں ملاقات ہوئی تو تفصیل بتاؤں گی۔“ آپا نے پیار سے اسے سمجھایا۔

”رانو بھی سشدر تھی کہ قیدی عورتوں پر بے پناہ سختی کے باوجود اس نے کسی کو بھی آپا سے بد نظری کرتے یا سخت رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا تھا، وہ سوچنے لگی آپا کی حقیقت کیا ہے؟ شاید آپا کے نہ بتانے میں کوئی مصلحت تھی۔“

”اچھا سنو۔“ آپا نے اسے سوچوں کے سمندر سے نکالا، یہ سب بھی ممکن ہو گا جب تو مجھے اپنی ساری داستان سنائے گی، اور آج کی رات کا تو نے وعدہ بھی کر رکھا ہے۔

”ہاں آپا آج کی رات میں تجھے وہ سب بتاؤں گی جو مجھ پر بستی۔ دل میں پیوست ظلم کا ایک ایک تیر نکال کر سارے گھاؤں کو نکال دیا۔ تو بچ کبھی ہے انسان بہت زہریلا ہے۔“

دن ڈھلنے لگا تو آواز پڑ گئی خواتین کو قطاروں میں بیروں میں جانے کا حکم ملا، ایک ایک کو گنتی کے بعد بیروں میں ٹھوس دیا گیا۔

☆.....☆

سردیوں کے دن تھے سورج ڈوبے ہی رات کا راج ہو گیا، قیدی عورتیں، غلط بستروں پر میل سے اٹے مکمل اوڑھ کر لیٹ گئی تھیں، جاگ رہی تھیں تو صرف رانوارو آپا تھوڑی سردی بڑھی اور کچھ اندھیرا مزید گہرا ہوا تو رانوارو آپا کے کپل میں تھی، رانوارو اپنی زندگی کے اوراق پلٹنے لگی۔

”احمد پور شریف سے کوئی 20 میل کی دوری پر چولستان سے کچھ پہلے بمشکل 20 سے 22 گھروں پر مشتمل بستی آباد تھی۔ دس بارہ جھوپڑے، سارے گھر کچے تھے، چھوٹی چھوٹی دیواریں مکینوں کی غربت کو بے پردہ کیے ہوئے تھیں، کوئی مکان ایک کمرے کا، کسی کے دو تو شاید ہی کسی کے تین ہوں گے، البتہ ہر گھر کا چھوٹا بابا یا بچہ ضرور تھا، کئی گھروں میں درختوں کی اٹھان اس قدر تھی کہ گویا دوسرے گھروں میں جھانک کر وہاں کی خیر خیر لے رہے ہوں۔ اسی بستی میں دو گھر پختہ تھے، ایک وہاں کے چودھری نواد کا اور دوسرا بد قماش، نشیات فروش، عورتوں کے شکاری اور بیوپاری نذیر کے، کئی مریخ اراضی کا مالک چودھری

فواد وہاں کا کرتا دھرتا تھا۔ پنجایت کا سرخ دھوتا، ہنس، ہنس کی زندگی اس کی مرضی کے مطابق بسر ہوتی تھی، بستی کے بیشتر افراد تو اس کے کھیتوں میں ہی اپنا خون پسینا ایک کر کے پیٹ کا جہنم سرد کرتے تھے، کچھ بستی کے باہر محنت مزدوری کر کے روزی روٹی کا بندوبست کر لیا کرتے۔ اسی بستی سے ایک کلومیٹر دور بھی چند گھروں پر مشتمل ایک بستی اور تھی، کچے مکانوں کے مکینوں کا جو بھٹہ خشک پر مزدوری کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ کچھ میلوں ٹھیلوں پر کھیل تماشے دکھا کر جسم اور روح کا ناٹ برقرار رکھے ہوئے تھے، چند ایک ایسے بھی تھے جو چودھری کے ظالمانہ فیصلوں کی بجائے چڑھنے کے بعد بستی سے نکال دیئے گئے اور یہاں آ بیٹھے تھے۔ یوں یہاں دس چندہ گھروں کی ایک بستی آباد ہو گئی تھی۔ یہاں بمشکل ہی کوئی مکان دو کمروں کا تھا اور ایک کچا کمرہ اور کچن میں جانور باندھنے کے لیے لکڑی اور گھاس چوٹس سے چھپر ڈال رکھے تھے۔ جس گھر میں بھی نظر ڈالیں اس کی کل متاع دو تین چار پائیاں، ایک آدھ جستی ٹرک یا بچنی تھی، دونوں بستیوں میں کوئی اسکول تھا نہ ہی اسپتال، چودھری نے تو اپنی بستی تک سولنگ لگو کر کھیلتی تھی تاکہ اس کی شانیں ساری آرام سے آجائیں۔ دوسری بستی کی حالت اس قدر، مگر کوئی گھر نہ تھا کہ سڑک تو دور کی بات انہیں پینے کا پانی بھی قریباً دو سو سے گھروں میں بھر کر لانا پڑتا تھا۔ زیر زمین پانی نہ رہتا تھا، ان کی پیاس بجھانے کا واحد ذریعہ وہاں سے گزرنے والی نہر تھی۔ اکثر اوقات یہ نہر خشک رہتی، تب مکین چودھری کے پاؤں پڑتے۔ اس کی اجازت سے اس کی زمینوں پر نصب ٹیوب ویل سے کڑوا پانی بھرتا لے اور پیاس بجھاتے۔ یہ اس زہریلے پانی کا شاخسانہ تھا کہ وہاں کے متعدد مکین یہ قان کے موذی مرض کا شکار تھے۔ چودھری اور نذیر بے نشیات فروش کے گھروں میں بچلی تھی۔ پانی غربت کے مارے اس قابل ہی نہ تھے کہ بچلی کا نکلتن لینے اور بل بھرتے۔ ان کے گھروں میں دو وقت کی روٹی پک جائے یہی بہت تھا۔ چند ایک کے پاس بکری، بھینس اور گائے یا بار برداری کے لیے گدھے تھے۔

بستی کے آدھے سے زیادہ مکین چودھری فواد کے مقروض اور باقی کے سود خور نذیر کے ڈسے ہوئے تھے، وہی صبح، وہی شام، وہی کام۔ بس لوگ جی رہے تھے، اس بستی میں شروع کا تیسرا گھر رانوارو کا تھا۔ دو کمرے، کچن، گھر میں نیم کا درخت، کمرے کے کچے، سامان اتنا کہ گزر بسر ہو سکے، بوڑھا لڑکی باپ، ماں، ایک بھائی جو شہر میں کسی موٹر مکینک کے پاس مزدوری کرتا اور رات گئے لوٹتا تھا، رانوارو اس کی ماں چودھری

کے کھیتوں میں کام کرتیں، بوڑھا گھر بڑا چار پائی توڑتا رہتا، یوں اس گھرانے کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ چودھری کے ظلم اور نذیر کے چیرہ دستیوں کے خلاف کسی کو آواز اٹھانے کی جرأت نہ تھی، دونوں اس قدر بااثر تھے کہ علاقے کی پولیس بھی ان کے ٹکڑوں پر ہل رہی تھی، گاڑی خراب ہو گئی تو پیسے چودھری نے دے دیئے، کسی کے بچے کی شادی ہوتی تو وہ چودھری کے در پر آ جاتا، قرضی پولیس چوکی میں کسی میز، کرسی یا کچلے کی ضرورت پڑتی تو چودھری کام آتا، پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ چودھری کی مرضی و منشاء کے بغیر علاقے میں برہنہ مٹی پر مار سکے۔

بستی چونکہ صحرا کے قریب تھی اس لیے رات کا منظر بہت مسکون ہوتا تھا۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے پرندے جو سارا دن جھاڑیوں میں چھپے رہتے تھے باہر نکل آتے اور ان کے چھپوں سے بستی کی فضاء میں ایک رونامی گونج پیدا ہو جاتی، افق کی سرخی خاکسری رنگ میں بدل جاتی۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگتا اور دن کے پرندے اور انسان شب باشی کے لیے گونگوں اور گھروں میں چلے جاتے اور ان کی جگہ رات کے پرندے اپنا راگ الاپنے لگتے یا پھر نذیر کے کارندے کمرہ دھندے کا آواز کرتے، چاند نکل کر درختوں کی چوٹیوں سے سرکھتا ہوا کھلے آسمان پر آ جاتا اور جب اس کی روشنی چمن چمن کر کے چھوٹی آواز میں پر روشنی اور سائے تل کر عجیب نقش و نگار بناتے تھے پھر طلوعِ صبح کی گھڑیوں میں چڑیاں چھبھاتیں، فاختاں امن کے سریلے گیت چھیڑتیں، جمبی بھار گول کی کوک غنہ سرا ہوتی، لہلہاتے کھیتوں کے آخر میں آسمان جبک کر زمین سے ٹکے ملتا تھا، یہاں باہمی محبتیں کچے گھروں کا خاصہ تھیں، گھنے درختوں کی مہربان چھاؤں سخت چتتی دوپہر کو یہاں کے کینوں کے لیے نعمت سے کم نہ تھی، اس بستی کی بد قسمتی تھی کہ چودھری فواد اور نذیر جیسی چمکاڑیں آزادانہ ہر طرف گھومتی پھرتی تھیں۔

☆.....☆

سرحدوں کے دن تھے، ایک دوپہر کو چمن والے شور نے وہاں کے کینوں کو حیران و پریشان کر دیا کہ نذیر کے ڈیرے پر چوری کی واردات ہو گئی، بستی کے کینوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ چوروں کو سو پر گئے ہیں، لیکن نذیر کے اور اس کے کارندوں نے یہ باور کرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی کہ ڈیرے سے چور ایک ٹیپ ریکارڈ، ایک استری اور چند دوسری اشیاء چرا کر لے گیا ہے، کھوئی کو بلایا گیا، کھراڈھوڑتے ڈھونڈتے وہ سرور ساربان کے دروازے پر رک گئے، بجائے پولیس

کا رروائی کے نذیر نے سرور ساربان کو اپنا ملزم قرار دے دیا، سرور اپنی غربت کی دہائیاں دیتا رہا، چور نہ ہونے کی یقین دہائیاں کراتے کراتے رو بڑا، غریب کے پاس ایک ہی سوٹی تھی، اس جو تے کو کھو جی نے اترا کر دیکھا، سرور کو چلنے کو کہا گیا، اس نے دو چار چکر لگائے، کئی لوگوں نے دیکھا کہ جوتے کے ٹکڑے کے نشان ہو، بہو دیے ہی تھے جیسے نذیر کے ڈیرے سے سرور کے چھپر فرامکان تک آئے تھے، نذیر کے کارندوں نے دھولیں اور دھاندلی سے سرور سے سامان کی برآمدگی کا مطالبہ کیا، ”میرے خلاف الزام ہے، میں نے چوری نہیں کی، میرے گھر کی تلاشی لے لو۔“ سرور نے بے بسی سے کہا۔

”چور تو ہی ہے، مان یا نہ مان، گھر اتیرے دروازے تک آیا، نشان بھی تیرے جوتوں کے ہیں، ہماری مان، سامان دے دے ورنہ پھر پولیس کا مہمان بننے کے لیے تیار ہو جا۔“ نذیر احمکیوں پر اتر آیا۔

بات چودھری فواد تک پہنچ گئی، پنجایت بلائی گئی، دو چار بانیاں، دو کرسیاں چودھری کے گھر کے وسیع و عریض لان میں موجود تھیں، کرسیوں پر چودھری فواد اور نذیرا فرعون بنے بیٹھے تھے، چار بانیاں پر ان کے کارندوں کا قبضہ تھا، بستی کے چند بوڑھے زمین پر آگتی پاتی مارے بیٹھے تھے اور بانیں جانب مینہ چور سرور ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”حالات و واقعات سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ چوری تم نے کی ہے۔“ چودھری سرور سے مخاطب ہوا۔

”مائی باپ! اگر میں چور ثابت ہو جاؤں تو میرا آپ کے جوتے، یہ مجھ پر الزام ہے۔“ سرور نے صفائی پیش کی۔ غریب شاید جانتا نہیں تھا کہ اندھوں کی بستی میں آئینہ کون خریدتا ہے۔

”گھر اتھارے گھر تک گیا، واردات میں جو جوتا چور نے پہنا وہ تم نے پہن رکھا ہے اور پھر بھی کہتے ہو کہ چور نہیں ہو۔“ چودھری بولا۔

”سرکار! یہ میرے خلاف کوئی سازش ہے، میں تو صبح اپنا اونٹ لے کر نکلتا ہوں، دن بھر کھیتی باڑی، کھیتی سواری، اور کھیتی کھیل تماشا دکھا کر چند روپے کماتا کرات گئے گھر آ کر سو جاتا ہوں، مجھے کسی نے پھنسا یا ہے۔“ سرور نے جھینس کے آگے بین بجا لی۔

”سنو بستی والو! سر، بیچ چودھری فواد بولا ”میں نہیں چاہتا بات پولیس تک جائے وہ اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دیں

گے، یہ وہ چوریاں بھی تسلیم کر لے گا جو اس نے کی بھی نہیں ہوں گی، نذریر اس کو اپنا چور قرار دے رہا ہے اور یہ بعد ہے کہ اس نے چوری نہیں کی، رسم و رواج کے مطابق گھر اس کے گھر تک نکلا ہے، لہذا چور سرور رہی ہے، سامان برآء کر دے تو سرامش کی کر دیں گے ورنہ اسے بستی سے نکال دیا جائے گا اور بطور جرمانہ اس کا گھر نذریرے کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

بستی کے کسی شخص کی مجال تھی جو اس ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا، سرور نے پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تو چودھری نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور حکم دیا کہ کل وہ اپنا اونٹ لے کر بستی سے چلا جائے۔

سرور دوسرے روز پنجابی فیصلے کا پھندا گلے میں ڈالے بستی چھوڑ گیا اور ایک میل کے فاصلے پر دوسری بستی میں چلا گیا۔ رانو کو سارے واقعہ کا پتا چلا تو چلا آگئی، سرور چور نہیں ہے، اسے پھنسا گیا ہے۔

”تو بڑی اس کی طرف داری کر رہی ہے۔“ اس کا باپ بولا۔

”باپو، بات طرفداری کی نہیں، وہ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے اونٹ کا پیٹ پالتا تھا، اس بستی میں پلا بڑھا، والدین کے مرنے کے بعد ورثے میں لے اونٹ کو اس نے روزی روٹی کا ذریعہ بنایا، آج تک اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے بستی والوں کو کوئی شکایت ہوئی ہو، ایک دم سے وہ چور کہے بن گیا؟“ رانو نے اس کی صفائی دی۔

”جپ بیٹی رہ۔“ باپ نے ڈانٹا۔ ”چودھری کے کانوں میں جھک بھی بڑگئی تو ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔“

”باپو! بات کچھ کچھ میری سمجھ آ رہی ہے، تیرے کان اور آنکھیں بند ہیں میرے نہیں۔“ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”رانو کی ماں اسے چپ کرانے کی یا میں پھر.....“ باپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”رانو چل میری بیٹی کرے میں جا، کیا ہوا، کس کے ساتھ ہوا، ہمیں اس سے کیا لینا دینا۔“ ماں کے سمجھانے پر وہ خاموش ہو گئی۔

ساتھ والے گھر میں اس کی بچپن کی سہیلی اور ہم راز خالہ رہتی تھی، وہ ماں کو بتا کر خالہ سے ملنے چلی گئی۔

☆.....☆

رات کسی گناہگار کے دل کی طرح انتہائی تاریک تھی، آستان گھر سے سیاہ بادلوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، طوفانی بارش

نے ہر طرف جل تھل کر دیا تھا، دونوں بستیوں میں کئی مکان پانی سے بھر گئے، چھتیں ٹپک پڑیں، غریبوں کے لیے رحمت بھی زحمت ثابت ہو رہی تھی، ایک طرف سردی دوسری طرف بارش، ہر طرف گھٹاؤ پڑ گیا، تاریکی کا راج تھا۔ بارش ٹھم ٹھم کی لیکن کچے راستوں پر آمدورفت انتہائی دشوار ہو کر رہ گئی تھی۔ سرور کے راستے میں تاریکیاں حائل تھیں نہ کسی سانپ بچھو کے خوف نے اس کا راستہ کھٹا کیا، سرشام ہی خالہ کے ڈریلے رانو کا پیغام

ملنے ہی وہ بے چینی سے رات کا انتظار کر رہا تھا، بارش بھی دونوں کے ارادوں میں رکاوٹ بن نہ سکی تھی، محبت کا جوش اور پیار کی لگن ہر خطرے کو دل و دماغ سے محو کر دیتی ہے، رانو نے اسے دونوں بستیوں کے درمیان نیلے کے پیچھے ملنے کا پیغام بھجوایا تھا، اندھیری رات میں وہ تیز تیز قدموں سے نیلے کی جانب جا رہا تھا۔ کئی بار اس کا پاؤں چھوٹے موٹے کڑھوں میں بھی پڑا، لیکن وہ سب سے بے پروا اپنی لگن میں چلا جا رہا تھا، اس سردی میں اس نے لنڈے کا ایک پٹا پرانا سویر پکین رکھا تھا، دل میں جب محبت کا لالہ روشن ہو تو باہر کی سردی وجود پر اثر نہیں کرتی، وہ دیوانہ وار نیلے کی جانب بھاگنے لگا، کسی پتھر کی ٹھکر لگی تو شہاب سے پانی میں گرا، کپڑے بچھڑ میں لت پت ہو گئے، اس نے وچیں پر جمع پانی سے کچھ بچھڑ صاف کیا اور پھر چل پڑا کہیں رانو

ماپوں ہو کر واپس نہ چلی جائے، نیلے کے قریب پہنچ کر اس نے دو تین بار آہستہ سے رانو، رانو پکارا۔ رانو نیلے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئی، سرور کو دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ”میں تو سرور سے ملنے آئی تھی کسی محبت سے نہیں۔“

اس کی بات سن کر سرور نے رخ پھیر لیا۔ ”تو ٹھیک ہے محبت واپس چلا جاتا ہے۔“ اس نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ رانو نے پیار سے پکارا۔

”اے سرور، تو محبت بھی دکھانے لگا ہے تو اچھا لگتا ہے۔“ دونوں یونگی جھپٹ جھاڑ کرتے ہوئے ریت ہٹا کر نکل ریت پر بیٹھ گئے۔ رانو نے سرور کا ہاتھ پکڑا اپنے سر پر رکھ لیا ”کھائیں میری اور بتا تو نے چوری کی یا نہیں۔“

”تیری قسم بالو! نہ جھوٹ ہے، جہتان ہے، مجھے بستی سے نکالنے کے لیے سازش کی گئی ہے۔“

”مجھے پتا ہے لیکن میں ایک بار تجھ سے یقین دہانی چاہتی تھی۔“

”کس نے کیا یہ سب؟“

”میں جانتی ہوں، تو بھی غور کرے تو سب کچھ جانے گا۔“

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

”تمہارا مطلب نذیرا؟“
”صرف نذیرا نہیں بلکہ چودھری کا بیٹا نواز بھی اس سازش میں ملوث ہوگا۔“

”مگر کیوں اور کس لیے؟“ سرد کو حیرانی ہو رہی تھی۔
”بڑا بھولا ہے تو بھی، جب سائنوں نے کہہ دیا کہ عشق اور ملک چھپائے نہیں جیتھے، تو تیری اور میری محبت کی تھوڑی بہت خبر تو کسی کو ہوگی ناں۔“

”کل کرتا، بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔“
”مٹی کے مادھون، جب میں اماں کے ساتھ اور دوسری عورتوں کے ہمراہ چودھری کے کھیتوں میں کپاس کی چٹائی کے لیے گئی تھی تو نواز بہانے سے میرے قریب آیا اور عشق جھانڈنے لگا، میں نے سخت لہجہ اپنایا تو پتا ہے اس نے کیا جواب دیا تھا؟“

”مجھے کیا پتا تو ہی بتا۔“
”اس نے کہا تھا ہم چودھریوں سے تو ساربان اچھے ہیں جو دودھ ملائی کھاتے ہیں۔“ بات آئی تیرے کھوپڑے میں بائیس۔

”ہوں تو یہ بات ہے، اس کا مطلب ہے باقاعدہ منصوبہ بندی سے ہم میں دو دریاں پیدا کر گئیں۔“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔
”کیا ہم دور ہو گئے ہیں۔“ رانو مصنوعی غصے سے بولی۔

”نہیں بلکہ چاہت میں اور شدت آ گئی ہے۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”اس کا مطلب ہے میرا جوتا چرا کر کسی کو پہنا کر نذیرے کے ذریعے سے میرے گھر تک لایا اور لے جایا گیا، پھر جوتا محن میں رکھ کر چوری کا ڈراما چا کر مجھے ہستی بدر کر دیا گیا، دیکھ لوں گا میں ان بدقماشوں کو۔“ سرد کا چہرہ سردی میں بھی چپانے لگا تھا۔

”نہ بے وقوفی نہیں کرنی، اب تک چند ایک کو پتا ہے پھر پورا جگہ ہماری محبت کا بھری ہو جائے گا۔“ رانو نے اسے سمجھایا۔ ”ایسے وقت کا انتظار کر، رانو تیری ہے اور تیری ہی رہے گی چاہے جان نہ چلی جائے۔“

”جی نہیں کی، جان جانے کی بات پھر نہ کرنا تو جانتی ہے میں تیرے بغیر نہیں جی سکتا، رانو! زندگی گزرے گی تو تیرے سنگ، نہیں تو محبت کے دشمنوں پر زندگی تنگ کر دوں گا، بناوت پر آکسایا گیا تو پھر دشمنی کی آگ میں سب جھلسیں

گئے۔“ سرد جذباتی ہو رہا تھا۔
رانو نے اسے پیار سے چپت لگائی، ”تیرے مغز میں میری بات نہیں بیٹھی، میں کہہ رہی ہوں کہ کچھ وقت کے لیے خاموشی سادھ لے، اپنے کام سے کام رکھ، مناسب موقع ملے ہی میں خود ماں سے بات کروں گی۔“

”اور وہ تیرا پو، وہ کسی جلا دے کم تو نہیں۔“
”شرم کر میرے باپ کو جلا د کہہ رہا ہے، انہوں نے افسوس سے اسے ناکارہ کر دیا ہے، اس کی فکر نہ کر، ہاں بھائی رکاوٹ نہ ڈالے تو ہماری شادی کو کوئی نہیں روک سکتا۔“

”تو پھر ملا تھ اور کوعده کر مریں گے تو ساتھ اور جنیں گے تو ساتھ۔“ سرد نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”مریں ہمارے دشمن۔“ رانو نے اس کا ہاتھ لیا، اور پھر جلدی سے چھڑا کر بولی ”خود بھی مرے گا مجھے بھی مردائے گا، سویرا ہونے میں دیر لگتی ہے، چل اٹھ جلیں، اندھیرا ہمارا راز دار ہے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو مر مٹنے والی نگاہوں سے دیکھا اور اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔

شریزا نے نفرت اور غصہ سے رانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”مجھے لگتا ہے تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی، تو اس چور ساربان سے اب بھی ملتی ہے۔“

سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رانو ایک دم سے بولی۔ ”یہ تجھ سے کس نے کہا؟ کسی غیر فقیر نے تیرے کان میں کچھ پھونک دیا ہے۔“

”بکواس کرتی ہے میں تجھے ٹوٹے ٹوٹے کر کے پھینک دوں گا۔“ وہ پھسکارتے ہوئے بولا، اسی اثناء میں ماں اور باپ آ گئے۔

”اماں اس کو سمجھاؤ، یہ ہر وقت میرے پیچھے بڑا رہتا ہے، ایسا نہ ہو میں اپنی جان دے دوں۔“ رانو متسورہ لگی۔

”بات کیا ہے؟“ باپ نے پوچھا۔
”یہ اب بھی اس ساربان سے ملتی ہے۔“

”یہ جھوٹ بولتا ہے پو۔“
”باپو یہ کوئی کل کھلائے گی، ہمیں سر اٹھانے کے قابل بھی نہ چھوڑے گی۔“

”اچھا تو جا کام پر دیر ہو جائے گی۔“ باپ نے اسے ڈانٹا۔

”ٹھیک ہے باپو میں جاتا ہوں جس دن کوئی چاند چڑھا دیا ناں تو یاد کرے گا۔۔۔۔۔“ شریزا پاؤں پٹختا چلا گیا۔

ایک پیسے کا حساب اور تیرے انگوٹھے لگے کاغذ اور گواہ موجود ہیں۔” سب کچھ کر بھی تو میرے پیسے ادائیگیں کر پائے گا۔

”میں کچھ سوچتا ہوں۔“ اللہ رکھا کے اوسان خطا ہو رہے تھے، پیسے لیتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ وقت بھی آئے گا! بیوقوف جانتا نہ تھا نذیرا جس کی گندی نظر ایک عرصہ سے رانو پر لگی وہ تو اسے پھانسا رہا تھا، پیسے بھی دیتا، وہی پیسے واپس لے کر اسے نفیم بچتا، اس کے اڈے پر جوا ہوتا، اور اس سے پیسے لے کر اس کے اڈے پر بار جاتا۔ نذیرا اسے بدھو ہونا گیا اور وہ جتا گیا۔

”سن میں تجھے ایک تجویز بتاتا ہوں۔“ نذیرا کہنے لگا، اللہ رکھا کے کان کھڑے ہو گئے، نذیرا اسے دھیرے دھیرے کچھ بتانے لگا، وہ سہ ہلاتا رہا، چائے پینے کے بعد نذیرے نے چند کاغذ منگوائے جن پر کچھ لکھا ہوا تھا، اللہ رکھا کو کیا پتا کہ ان پر کیا لکھا ہے، جہاں جہاں نذیرے نے کہا وہ انگوٹھے لگاتا گیا، بات طے ہو گئی۔ نذیرے نے بوڑھے کو برے طریقے سے پھانس لیا تھا، اسے واپسی کے وقت 5 ہزار روپے دیئے، اللہ رکھا کے چہرے پر اب اطمینان تھا، غیرت اور بے میری کا فرق وہ مٹا چکا تھا، ڈیرہ لاکھ میں وہ بیٹی بیچ چکا تھا، نذیرے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆

معابد کے مطابق اللہ رکھا نے ٹھیک ایک ماہ بعد رانو کو نذیرے کے نکاح میں دے دینا تھا۔ تین ہفتے آنا فانا کر رہ گئے، دسمبر کا آخری عشرہ تھا، رانو، شیراز، اس کی ماں اور پوروی سولہ کھانچے کو اللہ رکھا نے یہ بتا کر سب کو حیران کر دیا تھا کہ اس نے رانو کا رشتہ طے کر دیا ہے اور اسی مہینے کے آخر میں رخصتی ہے۔

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا، رانو کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، حوصلہ کر کے بولی۔ ”پاپو ایہ تیرا فیصلہ ہوگا، میرا نہیں، کسی سے شادی نہیں کروں گی میں اس سے تو بہتر تھا تو مجھے دیوار میں چنوا دیتا۔“

”تو اپنا منہ بندھ رکھ، جو کر رہا ہوں تیرے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔“

شیراز سے رہنا نہ گیا بولا۔ ”پاپو تو نے اکیلے ہی اتنا بڑا فیصلہ کر لیا، کون ہے وہ؟“

”نذیرا بھنے والا۔“

سب کو زور کا جھٹکا لگا، ایسے لگا جیسے اللہ رکھا نے نام

”سرم پر چڑھا رکھا ہے تو نے رانو کو۔“ ماں نے باپ بٹی کو زہرا کو لڑ نظر دے سگھو اور پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

اگلے روز ابھی دن چڑھا ہی تھا کہ نذیرے کا کارندہ رانو کے گھر آیا، اللہ رکھا کو بلایا اور نذیرے کا پیغام دیا کہ آج دوپہر کو اس سے ملے۔

”بچہ جاؤں گا۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا، کارندہ چلا گیا۔ دوپہر کو رانو کا باپ اللہ رکھا نذیرے کے ڈیرے پر پہنچ گیا، نذیرا اسے علیحدگی میں لے گیا، ایک نوکر سے چائے لانے کو کہا اور اللہ رکھا کو کتاب کر کے کہنے لگا۔ ”اللہ رکھا تو جانتا ہے اب تک کتنے پیسے مجھ سے سو پرلے چکا ہے، اور کئی ماہ سے سود بھی نہیں دیا۔“

”نذیرے بھائی میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں، آپ ہی بتا دو۔“ اللہ رکھا نے پوچھا۔

”تھوڑے تھوڑے کر کے ایک لاکھ لے چکا ہے تو۔ اور سود ملا کر ڈیرہ لاکھ سے اوپر بننے ہیں۔“ نذیرے کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔

اللہ رکھا کا رنگ پیلا پڑ گیا، اتنی رقم وہ لے چکا تھا، جوئے اور نفیم نے سارا پیسا کھل لیا تھا۔

”نذیرے بھائی! میں تیرے آگے ہاتھ باندھتا ہوں، میرے گھر والوں کو پتا نہ ملے، میں تیری رقم لوٹا دوں گا۔“ وہ گڑ گڑایا۔

”کیسے لوٹاؤں گا، تیرے گھر میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں، ہاں اگر تو میری ایک بات مان لے تو سارے پیسے پھوڑ دوں گا۔“ نذیرا اہل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔

”سک، کون سی بات؟“ اللہ رکھا کو تعجب ہو رہا تھا کہ نذیرے جیسا کمینہ اتنی بڑی رقم معاف کرنے کے عوض کون سی بات منوانا چاہتا ہے۔

”رانو کی شادی مجھ سے کر دے۔“ نذیرے نے جیسے ہم پھوڑ دیا ہو۔ اللہ رکھا کا داغ بھک سے اڑ گیا۔

”یہ کیا کہہ دیا ہے تو نے نذیرے بھائی۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے؟“

”تو میری عمر کا ہے، رانو تو ابھی چوبیس کی بھی نہیں ہوئی۔“

”میں سود نہیں کر رہا، شرعی بات کہہ رہا ہوں۔“

”نہیں، نہیں، رانو، شیراز، اس کی ماں کوئی بھی میری نہیں مانے گا۔ وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔“

”دیکھ لے اسوچ لے، ورنہ ڈیرہ لاکھ، میرے پاس

”یہ وقت تو نہیں ہے کسی سے ملنے کا خیر تو اسے اسٹور کے ساتھ والے کمرے میں لے جا۔“ نذر پر اربع سے بولا۔
 ”جانبی بیٹہ، میں اپنے مہمانوں کی تحویلی خاطر داری کر کے آتا ہوں۔“ نذر بولا۔

کار میں دو خواتین اور ایک لڑکا بچھلی سیٹ پر برا بھلا تھے۔ شیراز نے جلتے کڑھتے ایک ٹھکانا انتظار کیا جب نذر بے کو آتے دیکھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کمینہ بی بی پلا کر آیا ہے۔

”ہاں بول کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ جو میرا وقت برباد کرنے آ گیا۔“ نذر بے نے نفرت سے ہونٹ سکڑتے ہوئے کہا۔

”کیا بی بی پڑھائی ہے تو نے میرے باپ کو، کیوں ہمارا گھر چلانے پر تل گیا، کیا لگاڑا ہے، ہم غریبوں نے تیرا۔“ شیراز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”سیدمی بات کر جو میری کھوپڑی میں بھی آئے، بجھارتیں نہ بھال۔“ نذر ابھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

”تو میری بہن کے قابل ہے؟ ہم غریب ہیں، بے غیرت نہیں۔ ہماری غربت کو ہماری کمزوری نہ سمجھ، دوبارہ میری بہن کا نام بھی لیا تو بستی والے وہ ہوتا دیکھیں گے جو اس سے پہلے انہوں نے نہ دیکھا ہوگا۔“ شیراز کا غصہ عروں پر تھا۔

”ذرا چھری تلے سانس تو لے بچہ۔“ نذر بے کے بھدے لبوں پر وہی مسکراہٹ تھی جو اس کے بد نما چہرے کو اور بھیایک بنا دیتی تھی۔

”اچھو، اچھو۔“ اس نے کسی ملازم کو پکارا۔

”جی مائی باپ۔“ ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ ”بات سن، نذر بے نے اس کے کان میں کچھ کہا، وہ چلا گیا، دس منٹ بعد 20،15 کاغذ اٹھائے آ گیا، نذر بے کو تھمائے اور چلا گیا، نذر بے نے وہ کاغذ شیراز کے سامنے میز پر پھینک، دیئے اور بولا ”دیکھ ان کو، پڑھ ان کو، پھر بات کرنا۔“

”میں کیا پڑھوں؟ کیا ہے یہ سب؟“ شیراز نے کاغذات کو گھورتے ہوئے کہا۔

”تیرا باپ میرا ڈیڑھ لاکھ کا مقروض ہے، اس نے سودا کیا ہے میرے ساتھ، ڈیڑھ لاکھ کے عوض بیٹی کے رشتے کا، نہیں یقین، تو لے جا، کسی وکیل سے پڑھوائے میں نے کوئی زور نہ دیتی تھیں کی۔“ شیراز کا غصہ جھماک کی طرح بیٹھ گیا، اسے اپنا باپ گدھ لگا جو مردار کھا رہا ہے۔

”اگر تم لوگوں کو یہ سب نہیں منظور تو پھر فیصلہ بناؤ۔“

نہیں بتایا بلکہ ان کو آگ کے الاؤ میں دھکا دے دیا ہو۔
 ”پاپو! تیرا دماغ تو نہیں چل گیا، اس بدنام زمانہ سے بیٹی بیاہے گا، اس ساٹھ سال کے بھیا تک بوڑھے سے، اس نشیات فروش اور سودخور سے۔“ شیراز سے غصہ ضبط نہیں ہو رہا تھا۔

ماں بھی اپنے حواس کو بیٹھی تھی۔ بالآخر حواس میں آتے ہوئے بولی۔ ”تو میرے سر کا سائیں ہے تو رانو میرا خون ہے، نہ جانے تو کیا کرتا پھرتا ہے، اپنی چار پائی اٹھا اور جا کسی درخت کے نیچے بٹھا کر دن رات افیم کھا کر، دماغ تو تیرا ویسے ہی ٹھکانے پر نہیں ہے، اب جو تو نے رانو کے بارے میں کوئی بات کی تو ہم تجھے اس گھر سے دھکے دے کر نکال دیں گے، شرم نہیں آتی ایسی بات کرتے، دنیا سے گی تو ہم سب پر تھو تھو کرے گی۔“ ماں نے دل کا غبار نکالا۔

رانو کمرے میں بیٹھی تھی، آنسو رکنے کا نام نہ لے رہے تھے، شیراز نے ایک قہر آلود نظر باپ پر ڈالی اور گھر سے نکل گیا، ماں روکتی رہ گئی، باپ کی اس بے غیرتی پر اسے کسی پل چین نہ آ رہا تھا، جوان خون تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ غربت سے تنگ باپ کے اس فیصلہ نے زہر تلے بختری طرح اس کے دل پر گھاؤ لگایا ہے، اسے کچھ بھائی نہ دیا تو بے دھڑک، ہر خوف و ڈر کو بالائے طاق رکھ کر نذر بے کے ڈیرے کی طرف چل دیا، دور دراز قتل ہونے والی موسلا دھار بارش کے باعث ابھی بھی کہیں کہیں کچھڑ تھا، اسے لگا باپ نے رانو، ماں اور اس کے منہ پر بھی بے غیرتی کا کچھڑل دیا ہے۔

نذر بے کے ڈیرے کے مرکزی دروازے پر کھڑے بندوق بردار نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکا۔ ”کہاں منہ اٹھائے جا رہا ہے؟“

”نذر بے سے ملتا ہے۔“

”احترام سے نام لے، چودھری نذر بے بول۔“

”چودھری ہو گا تمہارا، مجھے کھانے کو نہیں دیتا۔ جا بول

اسے جا کے اللہ رکھا کا بیٹا آیا ہے۔“

”اگر نہ بولوں تو۔“

”تو مجھے دوسرا راستہ آتا ہے۔“ شیراز پھٹکا رہا۔

اس سے پہلے کہ بات بڑھتی ایک کار آ کر رکی، نذر بے بڑی شان سے اترا۔ ”کیا لخوا ہے؟“ اس نے چوکیدار اور شیراز

کو تواتر کی حالت میں دیکھ کر پوچھا۔

”آپ سے ملنے آیا ہے لیکن بدخیزی کر رہا تھا

جناب!“ چوکیدار بولا۔

میں ہو گا؟“ شیراز کے سینے میں انگارے دھک رہے تھے، دماغ میں خوفناک خیالات کا ہیرا تھا۔
سرور ساربان کو رانو نے ملاقات کر کے سب بتا دیا تھا۔

”ہم اس بدقماش کے پیچے لوٹا دیں گے۔“ سرور نے بڑے غم سے کہا۔ ”مجھے گاؤں بدر کرنا بھی اسی سازش کا حصہ تھا، خیر، میں اپنا اونٹ بیچ دوں گا۔ باقی کی ادا نیکی کے لیے وقت لے لیں گے۔“

”کیا میرے گھروالے تیری اس قربانی کو قبول کر لیں گے، میں مرنے کی بجائے جلا تک لگا دوں کی، رانو تیری نہیں ہوگی تو پھر کسی کی بھی نہیں ہوگی۔“ اس کی آنکھیں نم اور لہجہ جذباتی تھا۔

”ہلکی کہیں کی، رب سب کا ہے، کچھ نہیں ہوگا۔ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا، سرور جان تو دے دے گا لیکن یہ برداشت نہیں کرے گا کہ تیرے وجود کو کوئی ادا پسپوئے۔“ وہ جذباتی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

☆.....☆

رانو نے گھر آ کر ماں سے بات کی، ماں نے شیراز کو بتایا، بیٹیوں خاموش بیٹھیں تھے، اللہ رکھانے انہیں جس دلدل میں دھکا دیا تھا وہ اس میں ڈوبنا نہیں چاہتے تھے، بے بسی کی آگ انہیں جھلسائے دے رہی تھی۔ شیراز نے سرور ساربان کی پیشکش پر غور کیا، وہ جانتا تھا کہ سرور اور رانو ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی اسے خوب معلوم تھا کہ سرور میں اس نے بھی کوئی برائی نہیں دیکھی تھی، چوری کے الزام میں سرور کو جتنی بدر کرنا بھی اب اسے اسی سازش کا ایک حصہ لگ رہا تھا، نذیرے منشیات فروش نے انہیں ایک ایسے حال میں جکڑ دیا تھا بظاہر جس سے رہائی ناممکن نظر آ رہی تھی، لیکن ساربان کا احسان انہیں اس مصیبت سے چھٹکارا دلایا تھا، بالآخر اس نے خود سرور سے ملنے کا وعدہ کیا، اگلے ہی روز وہ سرور سے ملا، سرور نے اسے احترام سے اپنے چیمبر نما گھر میں اگلی چارپائی پر بٹھایا، محبوبہ کا بھائی آیا تھا، احترام تو واجب ہو گیا تھا۔

”سرور ہوشیار رہنا۔“ شیراز نے کہا۔ ”ہمارا واسطہ جن سے پڑا ہے وہ بڑے عیار اور مکار ہیں۔ اپنا اور اپنے اونٹ کا خاص خیال رکھنا۔ وہ اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ پہلے بچائے ہو جائے، پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔“

دونوں کے پیار کا دشمن دوست بن کر آیا تھا، سرور کے

دل میں شک کا سی پڑ گیا تھی، اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب تو خود کو بھی بچنا پڑا تو بیچ ڈالے گا لیکن شیراز اور اس کے گھروالوں کی ان جرائم پیشہ کے آنکھیں نہیں کھلنے دے گا، دونوں نے کچھ اہم فیصلے کیے اور شیراز کھر چلا آیا۔

☆.....☆

دسمبر کی 28 تاریخ تھی، دھوپ نے ہر چیز کو روشن کر رکھا تھا لیکن دل سیاہ تھے تو ان کے جو سرخ اور اس کے سامنے تھے، جنہوں نے من مرضی کا فیصلہ ٹھوس کر غریب کی عزت کو اپنے کپڑوں کی زینت بنانا تھا، غلیظ لوگوں کی کونھیاں بھی کوٹھے ہی ہوتے ہیں، جہاں وہ خود بھی غلامت کا ناچ ناچتے ہیں اور دوسروں کا تماشا بھی دیکھتے ہیں۔

منہر چودھری کی کوٹھی کا لان تھا، دسمبر کی دوپہر کی دھوپ سکون دے رہی تھی، لان میں دو کرسیاں، ایک بیچ، تین چار پائیاں چھپی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر چودھری نواد بڑے ٹھنڈے سے پھیل کر بیٹھا تھا، دوسری کرسی پر بستی کا نام نہاد محرز بوڑھا بیٹھا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ چودھری کے کھڑوں پر مل رہا ہے، بیچ پر نذیر کے حواری اور ایک چارپائی پر شیراز اس کا باپ اور ان کے دو تین حامی بیٹھے تھے۔ بستی کے کچھ لوگ، ان پائنتی مارے گھاس پر بیٹھے تھے۔

”ہاں تو نذیر بتا کیا معاملہ ہے؟“ چودھری نے بچائے کا آغا کیا۔ نذیر نے اللہ رکھا کے وقتاً فوقتاً ڈیڑھ لاکھ قرض لیے، اور پھر قرض معافی کے عوض بیٹی کا نکاح اس سے کرنے کی تفصیل بتادی، ساتھ ہی کاغذوں کا ایک پلندہ بھی چودھری کے آگے رکھ دیا۔

”اللہ رکھا تم کیا کہتے ہو؟“

وہ کیا کہتا، خاموشی سے نظریں جھکائے بیٹھا رہا، شیراز باپ کے دفاع میں بولا ”چودھری صاحب! ہمارے باپو سے جو کچھ سرزد ہوئے، اس کی سزا اولاد کو کیوں دی جائے، باپو نے سب قبول کر لیا، ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں، اس کے ساتھ ایک التجا بھی کرتے ہیں۔“

”بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ چودھری نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”ہم نذیر کے ڈیڑھ لاکھ لوٹا دیں گے، اپنی بہن فروخت نہیں کریں گے۔“

”کیسے لوٹاؤ گے؟“

”ہمیں ایک ماہ کا وقت دے دیں۔“

”نذیرے تم کیا کہتے ہو؟“

”چودھری صاحب ایک ماہ بہت زیادہ ہے یہ میری رقم لوٹا دیں، میں ان کو محاف کردوں گا لیکن ایک شرط پر۔“

”ٹھیک ہے اپنی شرط بتاؤ۔“

”ابنہیں ادا کیجی کے بعد یہ بستی بھی چھوڑنا پڑے گی ورنہ

کسی بھی وقت کوئی لغو ہو جائے گا۔“

”تم نہیں کہنے دن کی مہلت دینا چاہتے ہو؟“

”صرف پانچ دن۔“

”یظلم ہے، صرف پانچ دن۔“ شیراز کا ایک حامی بولا۔

”مدی پانچ دن کا کہتا ہے اور طرم ایک ماہ مانگتے ہیں تو

فیصلہ ہم کر دیتے ہیں۔“ چودھری بولا۔

”آپ سرخچ ہیں، آپ کا فیصلہ سب کو قبول ہوگا۔ عدم

قبولیت پر دوسرا کا حق دار ہوگا۔“ ملی جلی آوازیں گونجیں۔

”ٹھیک ہے! دس دن کا وقت دیتا ہوں، اللہ رکھا کے

گھر والے اس دوران رقم کا بندوبست کر لیں بصورت دیگر اسی

سوڈے پر عملدرآمد ہوگا جو اللہ رکھا نذیر سے کر چکا ہے۔“

چودھری نے نیکٹنی کا مظاہرہ کر دیا۔ طوہا کر ہا یہ فیصلہ سب کو قبول

کرنا پڑا، پہچانت ختم ہو گئی۔

چودھری اور نذیر سے نہ کھری چال چلی تھی، دس دن

میں وہ ڈیڑھ لاکھ تو کیا دس ہزار کا بندوبست بھی نہ کر سکتے!

سر اسر گھمانے کا فیصلہ تھا، فریقین میں ایک کا دل بلیوں اچھل رہا

تھا اور دوسرا پریشانیوں کی مالا گلے میں ڈالے، کمال ضبط کا

مظاہرہ کرتے ہوئے گھر آ گیا۔

☆.....☆

سرور نے رات کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اگلے دس

پندرہ روز کہیں نہیں آئے جائے گی، راتوں اس کے ہاتھ کو

بوسا دے کر وعدہ کیا تھا کہ جیسے وہ کہے گا اسی طرح کرے گی،

اس نے چھپ کر کالج کی ایک بوتل کہیں سے ڈھونڈ کر اسے

توڑا اور کرے میں کپڑوں کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اس کے

پیچھے اس کی یہی سوچ پنہاں تھی کہ اگر برا وقت نہ ملا تو اپنی

جان تو لے لی سکتی ہے، عزت گنوانے سے بہتر ہے سرور اور

گھر والوں کو ایک بے جان جسم دے جائے جس پر مندی کا

ایک دھبہ بھی نہ ہو، اچلے کنفن میں اجلا جسم ہی اس کے گھر

والوں کی عزت کو قائم رکھ سکتا تھا۔

☆.....☆

آج پھر بادل جو بر سے تو رکنے کا نام نہ لیا، جگہ جگہ کئی

فٹ پانی جمع ہو گیا، غریبوں کے چھوٹے اور مکان ٹپک

پڑے، نذیر ایک کمرے میں بیٹھا کھڑکی کھولے موسم سے لطف

اندوز ہو رہا تھا، ام الغائبہ بھی پاس پڑی تھی، اس کا سر چڑھا

گرگالطیف بھی قریب بیٹھا تھا۔ اس کے پاؤں دبا رہا تھا۔

”سائیں! بڑی زوردار تجوڑ ہے میرے ذہن میں،

سانپ بھی مرجائے گا لاشی بھی نہ ٹوٹے گی۔“

”اگر تیرا مشورہ کام کا نہ ہوا تو لاشی ٹوٹے نہ ٹوٹے تیرا

ایک آدھ ہاتھ بیڑ ضرور توڑ دوں گا۔“ نذیر اترنگ میں بولا۔

”سائیں، سننے سے پہلے تو سزا نہ سائیں۔“ وہ

گڑگڑایا۔

”اچھا اب جب جو کہنا ہے۔“

”نہ سائیں، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ پھر

وہ نذیر سے قریب ہوا اور بڑبڑانے لگا۔

”شاباش اولطفے۔“ نذیر سے نے زور کا ہاتھ اس کی

پٹھے پر مارا۔ محبت کے اس پھٹے سے لطیف زمین پر گرتے گرتے

بچا۔

”واہ سائیں، تیریاں تو ہی جانے۔“ نذیر سے نے

اسے سو کا ایک ٹوٹ دیا اور حکم دیا پاؤں ذرا زور سے دبائے۔

☆.....☆

سرور اور شیراز میں پھر ایک طویل ملاقات ہوئی،

دونوں اونٹ لے کر منڈی گئے، نوے ہزار ریٹ لگا، دونوں

جو پارسی سے سوچ بچار کا وقت لے کر واپس آ گئے، شیراز اپنے

مالک کے پاس بھی گیا، اسے تمام بات بتا دی، مالک نے رقم

کھاتے ہوئے اسے دس ہزار بطور قرض دینے کا وعدہ کیا، جو

اس کی تنخواہ میں سے کتنا رہے گا۔ ایک لاکھ ہو چکے تھے، پچاس

ہزار کے بندوبست کی کہیں آس امید نظر نہیں آ رہی تھی، لوہے کو

لوہا کا غٹا ہے، سازشیوں کو سازش سے مات دی جاتی ہے،

دونوں نے گھنٹوں کی ملاقات میں ایک بے عیب منصوبہ بنایا

جس پر مشکل ترین وقت میں عمل کرتا تھا۔ کھولتا ہوا جوان لہو اور

غریت، مخزب کاری کو جنم دے رہی تھی، چودھری نوادیا نذیر

بد محاش، دونوں میں سے کسی ایک کو اس جوڑی کے ہاتھوں لٹنا

تھا، لیکن یہ سب انہوں نے راتوں پوشیدہ رکھا تھا۔

☆.....☆

ادھر دارو کے دھندے کا بادشاہ نذیر اللہ رکھا سے

ایک خفیہ ملاقات کر رہا تھا، اس نے دس ہزار اللہ رکھا کے

ہاتھ پر رکھے، آنے والے وقت میں اس کے نشہ پانی کا وعدہ

کر کے محلول سے بھری چھوٹی سی شیشی اسے دی۔ اللہ رکھا سر

ہلاتا رہا اور شیشی دھونی کی ڈھب میں مضبوطی سے اڑس لی

اور گھر کی راہ لی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ اک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ اک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یاد کی طرف اپنے پیادوں کیلئے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شہر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی من کو رنگ روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فکس: 021-35802551

☆.....☆

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی، ایک کمرے میں شیراز، رانو، ان کی ماں بے سمدھ سو رہے تھے دوسرے اندھیرے کمرے میں اللہ رکھا جاگ رہا تھا، لالچ اور بے غیرتی کے نشے نے نیند کو اس کی آنکھوں سے کوسوں دور بھگا رکھا تھا، وہ ننگے پاؤں چارپائی سے اتر، آواز پیدا کیے بغیر دوسرے کمرے کا دروازہ ہٹکے سے کھولا، شیشی والا سارا نکلوا وہ رات کو سالن میں انڈیل چکا تھا۔ بہانے سے اس نے کھانا نہیں کھایا، جن تینوں نے کھایا تھا، وہ بے ہوشی کے عالم میں پڑے تھے، چند منٹوں کے بعد بیرونی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، اللہ رکھا دھیرے سے بیرونی دروازے پر گیا، کواڑ کھولے، ڈھانا باندھے چار آدمی کھڑے تھے۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ وہ بولا، میں کمرے میں جا رہا ہوں، تم بھی اپنا کام کر کے نکلنے کی کرنا، کوئی دیکھ نہ لے۔ چاروں اندر آ گئے، ایک ہٹے آدی نے آگے بڑھ کر رانو کو کندھے پر ڈالا۔ پھر وہ دہے پاؤں گھر سے نکل گئے، لالچ کی پٹی اللہ رکھا کی آنکھوں سے نہ اتر سکی تھی۔ اس نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار میں رانو کو تھیرے کی ”ڈلہن“ بنا کر رخصت کر دیا تھا۔

☆.....☆

رانو کو ہوش آیا تو وہ یکبارگی تڑپ کر اٹھ بیٹھی، حواس ڈراٹھکانے پر آئے تو ماحول کو پھنپی پھنپی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ ایک سچا سچا کرا تھا، اس نے بار بار آنکھوں کو ملا، وہ بدبائی۔ ”یہ کیسا پستانہ مالک۔“ اور پھر دم بخود رہ گئی۔

نذیر اس کے سامنے ہی کمرے کے کونے میں کھڑا اسے نکلے جا رہا تھا، وہ مکروہ ہنسی ہنسا۔

”چنیچنے چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔“ اس نے اپنی مونچھوں کو تاد دیا تھیرے باپ نے تجھے مجھ سے بیاہ دیا ہے، نوٹ کمرے کیے ہیں اس نے تو میری زرخیر ہے۔“

رانو لڑکے رہ گئی، سبھی نظروں سے نذیر کی طرف دیکھ کر گھٹکیا تے ہوئے کرب کے ساتھ ساتھ جوڑ کر بولی۔ ”میرے کو چھوڑ دے چا چا، تم میرے باپ کی عمر کے ہو، جانے دے مجھے، زندگی بھر تیرا احسان نہیں بھولوں گی، رحم کر میرے پر۔“

”باگل تو نہیں ہو گئی، کب سے تیرے لیے تڑپ رہا ہوں، ہاتھ آئی پری کو جانے دوں۔“ وہ شیطانی ہنسی ہنسا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

”ساربان کی دلہن بننا چاہتی تھی نا، سب جانتا ہوں، آج ہم دونوں سہاگ رات منائیں گے۔“

”دور ہٹ۔“ رانو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ”میں سرور کے لیے جان بھیل جاؤں گی۔“

وہ پیچھے ہٹ رہی تھی لیکن نذیرانے میں دھت آگے بڑھ رہا تھا۔

”تو میری بیوی ہے، نکاح بھی ہو جائے گا۔“ وہ ہنسی بھکی باتیں کرتا رانو کے نزدیک ہوتا چلا گیا۔

”بس اور آگے نہ بڑھنا، خدا قسم۔“

”چپ رہ کی کہیں۔“ بد معاش نذیرانے اپنی جانب کھینچے ہوئے بولا۔ ”دور دور تک تیری آنکھوں سے دلا کوئی نہیں۔“

رانو نے اسے زور کا دھکا دیا اور دروازے کی طرف لپکی، دروازہ باہر سے بند تھا، وہ گھبرا کر زور زور سے دروازہ پینے لگی، کھولو دروازہ کھولو، خدا کے لیے، رحم کرو، دروازہ کھولو۔ وہ

چپ رہی تھی، لیکن صدایہ صحر، اس کی آواز زون ستا، وہ تو آبادی سے دور ایک بے نشست پر ایک کمرے میں تھی، جہاں دور دور

تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا، وہ بھاگ جانے کی جدوجہد میں پاگل ہوئی جارہی تھی کہ پیچھے سے نذیر نے دبوچ لیا، دونوں

میں دھیکہ دھتی شروع ہو گئی، رانو نے بھی جان بھیلنے کا فیصلہ کر لیا، نذیر نے تیز پھل والا چاقو نکالا اور اس کی نوک رانو کے

سینے میں جھسادی، رانو کے منہ سے سکاری نکل گئی۔

”سیدھی طرح بات باتی ہے یا اتاروں چاقو سینے میں۔“ وہ گر جا۔

”مر جاؤں گی لیکن اپنی عزت پہ حرف نہیں آنے دوں گی۔“ وہ حلق بھاڑ کر چیختی۔

”چپ رہ۔“ نذیر نے چاقو پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا۔ ”ساتھ اس کے گال پر زور سے گھوسنا مارا۔“

رانو نے دانٹ بچھ کر ایک زوردار دھکا دیا، نذیرا

چھرے سمیت دور جاگرا، رانو بھوکی شیرنی کی طرح اس پر چبھتی، اس کھینچا تانی میں چاقو رانو کے ہاتھ لگ گیا، اس نے ایک پل

ضائع کیے بغیر پورے زور سے چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ایک دل دوز چبھی، خون کا ابلتا فوارہ، رانو نے اس پر ہی بس

نہ کی چاقو بچھ کر نکالا اور اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ دو تین وار کیے، نذیر بے کا سینہ چاک ہو گیا، کسی ذبح ہوتے بکرے کی

طرح ڈکڑا تا، ہاتھ پاؤں مارتا، لوٹنیاں لگا زندگی کی بازی ہار گیا، کمرے کا دروازہ زور زور سے پینا جانے لگا، رانو بھی خون

میں لت پت تھی۔

”کون ہے اندر، دروازہ کھولو۔“ دروازہ اب پٹٹا

جانے لگا۔ رانو نے چیختے ہوئے کہا دروازہ باہر سے بند ہے،

میں یہاں قید ہوں، پھر دروازہ باہر سے کھلا، چار پولیس والے اندر گھس آئے، ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں، اندر کا منظر

دیکھ کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”کون ہو تم؟ یہ کون ہے؟ کس کو قتل کر دیا۔“ ایک پولیس والا بولا، چٹائیں وہ رات کو کھٹ برتے یا پھر نذیرے کی

حفاظت پر مامور تھے۔ حالات بگڑتے دیکھ کر آدھکے تھے، لیکن نقشہ بدل چکا تھا۔

”یہ میری عزت کوٹنے کی کوشش کر رہا تھا، چھرے کی نوک میرے گلے پر رکھ کر مجھے برا دکھانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی

آبرو بچانے کے لیے اسی کے چھرے سے وار کر دیا۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆

رانو کی ساری، انکھیں، آرزوئیں اور تمنائیں خاک اور خون میں لتھڑ کر رہ گئیں، اس کی مسرتوں پر اس کے بے رحم

باپ کی مینگی کا کفن پڑ چکا تھا۔ پولیس نے 302 کا کیس بنادیا، سرور، شیراز، اس کی ماں، آنکھوں میں آنسو اور چہروں پر

بدحواسیاں لیے بیٹھے تھے، رانو ملزموں کے کٹھنوں میں بت بنی کھڑی تھی۔

سرکاری دکیل نے جرح شروع کی۔ ”تم نے نذیر احمد کو جان بوجھ کر قتل کیا۔“

”اس کا جواب میں دے چکی ہوں۔“ رانو نے اسے نفرت سے دیکھا۔ ”بار بار مجھ کو کیوں دکھ دیتے ہو۔“

”تم نے قانون کو کیوں ہاتھ میں لیا۔“

”قانون تب کہاں تھا جب وہ مجھے اپنے ہاتھوں میں لے رہا تھا۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ تم نے ایک انسان کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں، تم نے بہت بڑا جرم کیا، قانون

اور انصاف کی توہین کی ہے۔“ سرکاری دکیل دلائل کم دے رہا تھا مگر ج زیادہ رہا تھا، شاید چودھری فواد نے اچھی خاصی

”سرمایہ کاری“ کی تھی، اس سے قتل کہ دکیل وہی گھسے پٹے دلائل دہراتا رانو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور بولی۔

”حضور! بڑے صاحب، مالی باپ، میں غریب، ان پڑھ، جاہل، قانون تو نہیں جانتی، لیکن جب مجھ پر ظلم ہو رہا تھا، جب ایک بھیڑیا میرے جسم پر اپنے پنجے گاڑنے والا تھا، اس

وقت یہ پولیس والے کہاں تھے؟ جب مجھے اغوا کیا گیا تب یہ

مجبوری چہرے مہرے سے خوشی کا اظہار نہیں بھی کر رہا تھا تو دل میں ضرور خوش تھا کہ ایک گناہگار سے تو کینوں کو نجات ملی۔

☆.....☆

آپا رانوی دکھ بھری کہانی سن کر دل میں بہت دکھ محسوس کر رہی تھی، نہ جانے روزانہ حوا کی کتنی بیٹیاں، کار و کاری، کالا، کالی، وٹی اور دیگر مکروہ رسوم کی بیعت چڑھا دی جاتی ہیں، وہ دل میں اٹل فیصلہ کر چکی تھی کہ رانوی کو ہر صورت با عزت بری کرانے گی، وہ سمجھ گئی تھی کہ کیس بہت کمزور ہے، اس نے اپنے دفاع میں ٹٹل کیا تھا، اغوا بھی ملزم نے کیا، ٹھکانا بھی اس کا، مجرمانہ حملہ بھی اس نے کیا، دروازے کی چوٹی بھی باہر سے اس نے لگوائی، ایک دو چوہتر تھانے میں لگتے تو اس کا باپ بھی سب بک دیتا کہ اس نے نذیرے سے مل کر کیا گل کھلایا تھا، اگلے

کہاں تھے؟ میں چیخی، چلائی، دہائی دی، لیکن اس نشتا فروش، عورتوں کے پو پاری کو رحم آیا نہ کسی نے میری چیخ و پکار پر کان دھرے جب اس بھڑے نے میرے سینے میں چاٹو کی نوک چبھوئی تو میری سکاریاں کسی نے نہیں سیں، کمر اندر سے نہیں باہر سے بند تھا، میرا وار چل گیا، میں نے اس ناسور کو ختم کر دیا تو پولیس بھی آ چکی۔ اگر کمر اندر سے بند ہوتا تو میں اس کو قتل نہ کرتی بلکہ بھاگ نکلتی۔ یہ پولیس والے بھڑا اس سے ملے ہوئے تھے، صاحب! مائی باپ، انصاف آپ کریں۔ میں نے اپنی آبرو بچائی ہے، اپنے دفاع میں وار کیا تھا۔ حضور! شاید آپ کو میری بات بری لگے، اگر ان پولیس والوں کی بہن بیٹی یا آپ میں سے کسی کی آبرو کسی غنڈے کے ہاتھوں پامال ہو تو کیا آپ خاموش بیٹھے رہیں گے، قانون کی مدد کا انتظار کریں گے؟ بتائیں حضور؟“

عدالت میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا تھا، اس سے پہلے کہ سرکاری وکیل کچھ بولتا وہ بھر دھکی لیے میں بولی۔ ”اگر سزا دینی ہے تو میرے اس پاپی باپ کو دو اور دنیا کے ایسے تمام باپوں کو سولی چڑھا دو جو اپنی بیٹیوں کا سودا کرتے ہیں“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

”آرڈر آرڈر.....“ جج نے سب کو متوجہ کیا اور کہا کہ ”کیس کی باقاعدہ سماعت سے قبل ملزم کو وکیل کرنے کا قانونی حق ہے۔“

”لیکن حضور! اپنے گھر میں تو ایک روز کھانا پکا ہے اور دو روز پیاز یا گڑ سے روٹی کھانا پڑتی ہے۔“ وہ جج سے مخاطب تھی۔

”اگر تم وکیل نہ کر سکی تو ریاست تمہیں وکیل فراہم کرے گی، جج نے اسے 14 دن کے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج کر حکم دیتے ہوئے عدالت پر خاست کر دی۔“

لیڈی پولیس نے اسے پھٹکڑی پہنائی اور جیل پہنچانے کے لیے گاڑی کی طرف لے کر چل پڑی، اسی دوران جب ضروری قانونی کارروائی ہو رہی تھی تو اسی اور بھائی شہناز کو اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”رانو فکر نہ کرنا، ہم وکیل کریں گے چاہے کچھ بھی ہو۔“

ایک کوئے میں سرور کھڑا تھا اس کی آنکھیں میٹکی ہوئی تھیں، وہ لکٹی باندھے رانو کو کنگے جا رہا تھا، وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وکیل کیسے کرتا ہے؟ ہستی میں یہ بات پھیلی تو سب غنڈے نذیرے پر تھوٹھو کر رہے تھے اور رانوی کی بہادری کے من گارہے تھے، ایک شیطان سے سب کو امان مل گئی تھی، اگر کوئی سماعت

کراچی

پاکستان

ماہنامہ

میں، قاری، بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کر الیں

چاہیے تھی۔

☆.....☆

بھٹکل چار پیشیوں کے بعد عدالت نے رانو کو باعزت بری کر دیا۔ بھی کے چہرے خوشی سے تھمنا رہے تھے۔ ماں نے رانو کو گلے لگا کر اس کا ہاتھ چومنا، شیراز نے بھی بہن کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا تو ایک بہادر بہن ہے، ہمیں تم پر ناز ہے۔ جان پر کھیل گئی لیکن عزت پر حرف نہ آنے دیا، پھر ازراہ مذاق کہنے لگے پیارے سرور کا اونٹ دوبار بکتے بکتے بلا خرچ ہی گیا، رانو کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ سرور نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے دل میں لٹو پھوٹ رہے تھے کہ اب اسے اور رانو کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

☆.....☆

کوئی ایک ماہ بعد رانو نے ماں، بھائی اور سرور کو ساتھ لیا۔ ملتان جیل میں آپا سے ملاقات کرنے، شکر یہ ادا کرنے اور لٹو دینے کی، جیل انتظامیہ کا کہنا تھا کہ یہاں تو آپا نام کی کوئی قیدی یا حالاتی نہیں۔

”میرے ساتھ ہی تو جھ نمبر بیرک میں تھی۔“ رانو حیرت سے بولی۔

”لیکن اب نہیں ہے۔ کل رات ہی اسے موت ملے گئی۔“ جیل ملازمہ کا جواب تھا۔

ان تینوں کو حیرت کا جھکا لگا، رانو کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

پھر تینوں اداسی کے عالم میں اپنی جگہ بستی کی جانب لوٹ گئے، رانو محسوس کر رہی تھی آپا کو وہ بھی نہیں بھول پائے گی، آپا نہ ہونی تو نہ جانے وہ کہاں ہوئی۔

وہ آپا نے ایک طویل خط لکھا اور رانو کے حوالے کرتے ہوئے اسے سمجھا بھی دیا کہ شیراز اور سرور کو کیا کہنا ہے۔

☆.....☆

ایک دو روز بعد شیراز، اس کی ماں اور سرور تینوں اس سے ملاقات کو آئے، رانو نے حال احوال کے بعد وہ خط انہیں دیا اور انہیں سب سمجھا بھی دیا، یہ آپا کا جیل میں اثر و رسوخ ہی تھا کہ خط لکھنے سے پہنچانے تک کوئی ملازمہ رکاوٹ نہیں بنی تھی، دوسرے روز ہی بہادر پوری ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم کے وکیل نے جیل کچھ کر دکالت نامے پر اس کے انگوٹھے لگوائے۔

کیس کی باقاعدہ سماعت کے پہلے ہی روز رانو کے وکیل کے سامنے سرکاری وکیل کی ایک مذہبی، عدالت نے پچاس پچاس ہزار کے چٹکوں کے عوض اس کی ضمانت منظور کر لی، اس روز بھی خوش تھے، بس ایک معاملہ تو آپا کا کردار؟ اسی روز روڈ پر بکارت جیل پہنچی اور شام کو اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

☆.....☆

دن ڈوب چکا تھا، ملتان جیل سے رہائی کے بعد وہ اڑھائی سے تین گھنٹے وکیل کی کار میں سفر کر کے پہنچے تھے۔ ایک پرچند زیرے اور رانو کے باپ کے خلاف بھی درج ہو چکا تھا۔ پولیس نے بہت کوشش کی تھی کہ یہ ایف آئی آر درج نہ ہو لیکن رانو کے وکیل ارشد ایڈووکیٹ نے عدالت سے رجوع کیا، عدالت کے حکم پر بند زیرے کے خلاف انخوا، جس بے جا قتل کی کوشش، عزت لوٹنے کا مقدمہ درج ہوا اور رانو کے باپ کے خلاف مذہرے کا ساتھ دینے، ان سب کو کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملانے اور بیٹی بیچنے کی دفعات کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا تھا۔

چودھری نواز نے اس دوران کئی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس نے دیکھا کہ ایک غیر سرکاری فلاحی تنظیم کی لیگل ٹیم سارے معاملے کو دیکھ رہی ہے تو اس نے دم دبا کر روپوش ہونے میں عافیت سمجھی۔ اس لیگل ٹیم نے رانو سے مشورہ کیا تھا کہ وہ لوگ چاہیں تو اس معاملے میں نام نہاد سرخ چودھری نواز کو بھی سمیٹ لیتے ہیں، لیکن رانو نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس کے کرموں کی سزا اب اسے دے گا، ایک مذہبی روز وہ ضرور رب کی پکڑ میں آئے گا، رانو کے باپ کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا، اسے بھی اس کے سیاہ کرتوتوں کی سزا ملنی ہی

شمارہ اگست 2017ء کی منتخب جہانیاں

ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: نقب..... انیلہ (کراچی)

☆ دوم: نجات..... زویدا اعجاز (لاہور)

☆ سوم: بدگمان..... وردہ خان (کراچی)

پہلے دو سرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جیتی منتخب کیجئے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے